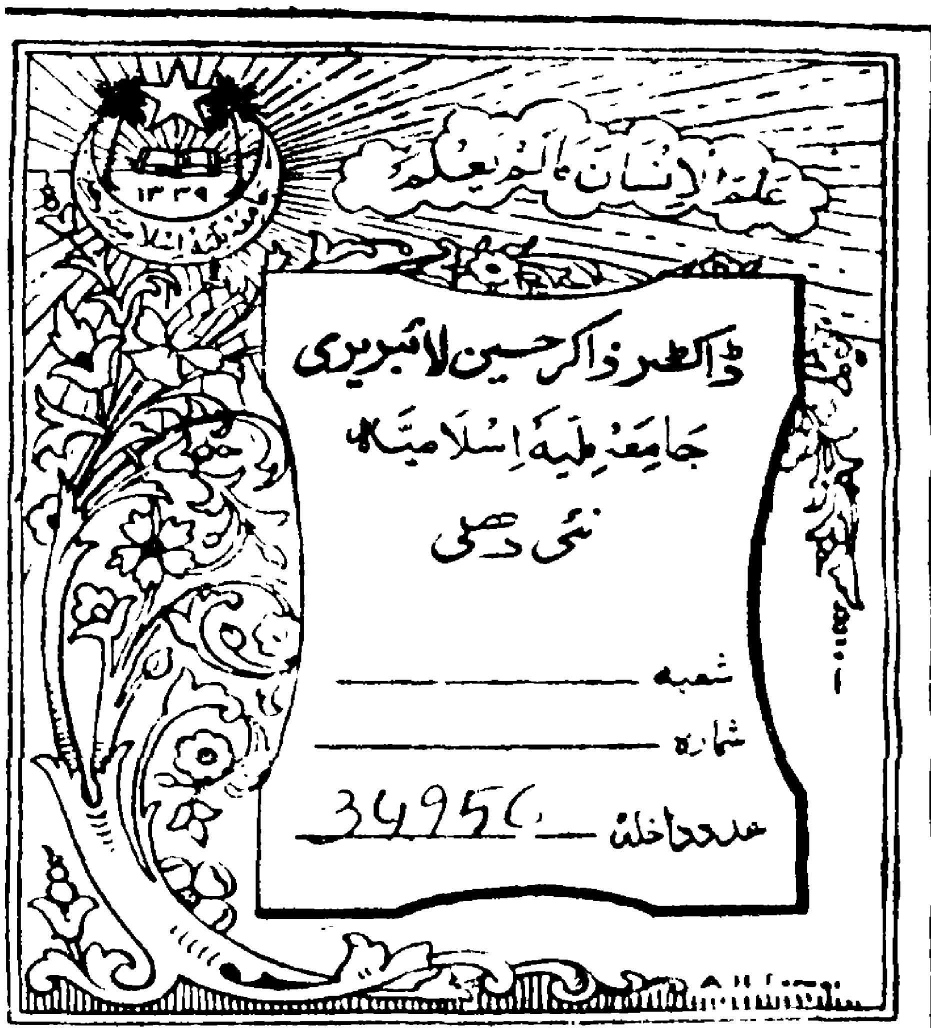

علم الانسان ما لم يعلم
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی
شعبہ
شمارہ
عدد داخلہ 34956


ماہنامہ
تجلی
دیوبند
ایڈیٹر۔ عامر عثمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ **تجلی** دیوبند

خلافت نمبر

شمارہ ۹و۱۰ — جلد نمبر ۱۱

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

اکتوبر و نومبر ۱۹۵۹ء

سالانہ قیمت چھ روپے۔ فی پرچہ آٹھ آنے ——— غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۵ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر یا

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا وی پی چھ روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائینگے

پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائے گا۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

دفتر تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)



پاکستان کا پتہ:۔ **جناب شیخ سلیم اللہ صاحب**

۴۲ بی۔ ۵/۲۰ ناظم آباد کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "کوہ نور" پریس دہلی سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

جس وقت یہ سطور لکھی جارہی ہیں اُس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ جناب محمود احمد عباسی کی کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" کے خلاف شیعہ حضرات نے یوپی کے ایک دو شہروں میں کچھ ہنگامہ سا برپا کر رکھا ہے اور حکومتِ ہند سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ اس کتاب کو ضبط کرلیا جائے۔ نہیں معلوم کہ جس وقت یہ سطور چھپ کر آپ کے سامنے آئیں گی اُس وقت یہ کتاب ضبط ہوچکی ہوگی یا حکومت نے یہ لایعنی اور نامعقول مطالبہ مسترد کردیا ہوگا۔ ہر صورت میں ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ایک اس طرح کی سنجیدہ، علمی و تحقیقی کتاب کی ضبطی کا مطالبہ تاریخی عجائب میں سے ایک عجوبہ ہے اور جو حکومت اس مطالبہ کو تسلیم کرلیتی ہے وہ علم و فن اور فکر و تحقیق کے ساتھ اتنی بڑی ستم ظریفی کرتی ہے کہ فریاد و احتجاج کے سارے الفاظ دم بخود ہو کے رہ جاتے ہیں۔

کمال ہے شیعہ حضرات خود تو تقریراً و تحریراً برملا اُن عالی مرتبت اصحابؓ اور ازواج مطہراتؓ پر تبرا اور توہین کے سارے ترکش خالی کردیتے ہیں جن کی فلک رسا عظمت و رفعت پر نہ صرف مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کا کلّی اتفاق ہے بلکہ غیر مسلم محققین و مؤرخین نے بھی انھیں خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ ان کی کتابوں میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے اعاظم و اکابر کے لئے ایسا گھٹیا اسلوب ملتا ہے کہ عقل و شرافت پانی پانی ہوجاتے ہیں، ان کا لب و لہجہ متعدد جلیل القدر صحابہؓ کی تغلیط و تخطیے میں ایسا رکیک ہوجاتا ہے کہ عفت و اخلاق کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ لیکن دوسروں کو وہ اس کی بھی اجازت دینا نہیں چاہتے کہ ان کی دروغ بافیوں اور افسانہ طرازیوں کی مدلل تردید کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کی حقیقی عظمت و حیثیت کو اجاگر کرسکیں۔ وہ ایک ایسی کتاب پر دانت پیس رہے ہیں جس میں نہ تو کسی بزرگ پر تبرا کیا گیا ہے، نہ استدلال غیر علمی ہے، نہ متانت اور شرافت سے صرفِ نظر کیا گیا ہے، نہ خالی خطابت کے ذریعہ غلط سلط خیالات دوسروں پر مسلط کرنے کا عامیانہ فن برتا گیا ہے، نہ ماتم و شیون اور جذباتی افتادگی کی آڑ لے کر خواہ مخواہ کے افسانے تراشے گئے ہیں۔ اس کے برعکس اس میں جو کچھ ہے علمی و تحقیقی انداز میں ہے، حوالوں کے ساتھ ہے، شہادتوں اور دلیلوں کی کمک لئے ہوئے ہے۔ کوئی تُک نہیں ہے کہ اس پر محرمی قسم کی واویلا کی جائے۔ اگر کسی کو اس سے اختلاف ہے تو وہی معلوم و معروف طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو علمی اختلافات میں ہمیشہ اختیار کیا جاتا رہا ہے یعنی اس کے رد میں یاد مدلل و مبسوط کتاب پیش کی جائے۔ یہ کیا کہ جواب نہیں بن پڑتا تو حکومت کو پکارا جاتا ہے کہ خدا کے لئے ہماری مدد کیجئے ہمارے خیالات و عقائد کی لرزہ براندام دیوار کو سہارا دیجئے اور اس کتاب کو ضبط کرلیجئے جو ہمارے طلسماتی افسانوں کے پرزے اڑائے دے رہی ہے۔

پاکستان میں یہ کتاب ضبط کرلی گئی ہے۔ وہاں کے بارے میں کوئی کیا کہے۔ فوجی حکومت کچھ بھی کر گذرے دنیا کی کوئی جمہوری مملکت اسے اپنے لئے نظیر قرار نہیں دے سکتی۔ پھر فوجی حکومت ہو یا کسی اور طرح کی۔ پاکستان یا مصر و عراق میں کچھ بھی ہوتا رہے ہم اپنی جمہوری مملکت میں اس سے دلیل نہیں پکڑ سکتے، ہمیں اپنے قانون، اپنے تصورِ انصاف، اپنے جمہوری مزعومات کی لاج رکھنی ہے۔ آج اگر کچھ لوگوں کے بے بنیاد اور لایعنی احتجاج کی بنا پر "خلافتِ معاویہؓ و یزید" جیسی علمی و تحقیقی کتاب پر بھی حکومتِ ہند پابندی لگا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کل ہم اس سے بے شمار اُن کتابوں کی ضبطی کا مطالبہ نہ کریں جن میں صحابۂ کرام اور امہات المومنین رضوان اللہ علیہم کی شان میں گستاخیاں کرکے امتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم کا دل دکھایا گیا ہے اور بعض مقامات پر تو تہذیب و شرافت تک کی معروف قدروں کو اشہبِ قلم کی خرمستیوں سے روند کے رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم ایسی ہر کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے جس کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہو کہ اس سے ہمارے جذبات مجروح ہ

ہیں۔

اگر سچ مچ حکومت نے اس کتاب پر قدغن بٹھایا تو ہم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھیں گے کہ اس اقدام کے جواز میں آپ کے دلائل کیا ہیں؟ اگر صرف یہ دلیل ہے کہ کچھ من چلوں نے دو چار جلسے کر کے ہاؤ ہو کا سوانگ رچایا ہے اور تار دیئے ہیں کہ ہماری دل آزاری ہو رہی ہے تو حکومت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دینی و علمی کتابوں میں نوے فیصدی کتابیں ایسی ہیں جن کے خلاف بہ آسانی یہی ہنگامہ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ کیا وہ تمام کتابوں پر اسی طرح پہرے بٹھاتی چلی جائے گی۔ اگر یہی ارادہ ہو تو بسم اللہ۔ مُردے پر جہاں سو من مٹی وہاں نو من اور سہی۔ ہم پہلے ہی زخموں کے خوگر ہیں کوئی نیا چرکہ کون سی قیامت توڑ دے گا۔ لیکن شیعہ دوستوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ زیادہ تر انھی کی کتابیں اس استبداد کی لپیٹ میں آئیں گی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ معدودے چند صحابہ کو چھوڑ کر باقی تمام اصحاب کرام خصوصاً ابوبکرؓ و عمرؓ کو جب تک صلواتیں نہ سنالیں ان کا مذہب ہی منعقد نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف ہمارا موقف یہ ہے کہ جن بزرگوں کی شان بڑھانے کے لئے وہ یہ پاپڑ بیلتے ہیں ہم خود ان کے ثناخواں ہیں اور ہماری زبانیں ہمیشہ ان کی توصیف و منقبت کے گیت گاتی رہی ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم عقائد کے معاملہ میں شاعری کے قائل نہیں۔ ان کا تمام سرمایہ ہی شاعری ہے۔ ہم فرطِ جذبات میں عقل کو قلابازی کھانے نہیں دیتے وہ جذبات کے آستانے پر عقل کو ذبح کر دینا ہی عینِ مذہب خیال کرتے ہیں۔ ہم سالانہ ماتم و شیون کے خود ایجاد ہنگاموں کو لہو و لعب سے زیادہ وقعت نہیں دیتے وہ اس لہو و لعب ہی کو افرض الفرائض سمجھتے ہیں۔ ہمیں جمہوریت کی اس روح پر اعتماد ہے کہ تختِ حکومت وراثت میں ملنے کی چیز نہیں وہ تا ناشاہی کے اس اصول کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں کہ تختِ حکومت بھی مال وراثت ہی کی طرح بٹنا چاہیئے چنانچہ اسی بنیاد پر وہ مسلمانوں کے پہلے خلیفہ ابوبکرؓ اور دوسرے خلیفہ عمر فاروقؓ کو غاصب و ظالم قرار دیکر فیصلہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ کے بعد اصل مستحق خلافت حضورؐ کے ہاشمی داماد حضرت علیؓ ہی تھے اور علی کے بعد ان کے بیٹوں ہی کو خلافت ملنی چاہیئے تھی۔ ہم حضرت علی، ان کے عالی مقام بیٹوں اور دیگر اہل بیت رضوان اللہ علیہم کو محترم و مکرم سمجھنے کے باوجود انسان ہی تصور کرتے ہیں۔ ایسے انسان جو غلطی بھی کر سکتے تھے، دھوکا بھی کھا سکتے تھے — لیکن وہ زبان سے انھیں انسان ہی کہنے کے باوجود ذہنی طور پر نبی بلکہ کبھی کبھی تو خدا تک تصور کر لیتے ہیں۔ انہی میں وہ روشن فکر حضرات ہیں جو گمان کرتے ہیں کہ وحی تو دراصل حضرت علی پر بھیجی گئی تھی مگر وحی لانے والے فرشتے سے بھول ہوگئی کہ محمدؐ کو دے آئے (نعوذ باللہ من ذلک) ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا وہی ہے جو زیادہ متقی ہو وہ کہتے ہیں کہ بڑائی کا مدار نسل و نسب پر ہے چنانچہ حضرت حسینؓ نے جب حکومتِ وقت کے سرکاری محاصل لے جانے والے ایک قافلہ کو لوٹ لیا تھا تو ان حضرات نے اس کے جواز بلکہ استحسان کی یہی دلیل دی تھی کہ امام حسین تو اللہ ہی کی طرف سے مسلمانوں کے امور کا انتظام و انصرام کرنے کے لئے مقرر ہیں۔ ظاہر ہے یہ دلیل وہی لوگ دے سکتے ہیں جو نسل و نسب ہی کی برتری اور تقدم پر مکمل یقین رکھتے ہوں ورنہ رسول اللہ کا نواسہ ہونے کے سوا دینی یا دنیاوی کسی بھی قانون کی رو سے حضرت حسینؓ کو یہ حق کیونکر پہنچ سکتا تھا کہ ایک پُرامن، باضابطہ اور مسلّمہ حکومت کے محاصل کو زبردستی ماخوذ کریں۔ ہمیں بتاؤ کس قرآن کس حدیث میں یہ آیا ہے کہ امور مسلمین کا انتظام و انصرام اللہ تعالیٰ نے حضرت حسین کے سپرد کیا تھا؟

شیعہ سنی اختلاف کی کہانی بہت پرانی ہے۔ ہم اسے یہاں تازہ کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں بطور نمونہ یہ دکھانے کے لئے کہ ان حضرات کو مبالغہ آرائی اور ہوائی قلعہ بندی کا کتنا شوق ہے ایک معمولی سی تازہ مثال پیش کرتے ہیں تاکہ حکومت کے ذی فہم افراد دیکھ سکیں کہ "خلافتِ معاویہؓ و یزید" جیسی محققانہ کتاب پر سینہ پیٹنے والے اوہام پرستی کی کس منزل میں ہیں۔

لکھنؤ سے انھی حضرات کا ایک ہفت روزہ اخبار "سرفراز" نکلتا ہے۔ نہ جانے کس نے اس کا ۹ ستمبر کا شمارہ ہمیں ڈاک سے بھیج دیا ہے۔ اس کے صفحہ اولیٰ پر "سلام" کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ لکھنے والے ہیں "شاعرِ اہلِ بیت جناب نجم آفندی" ہم اس کا صرف ایک شعر پیش کر کے دعوتِ فکر دیں گے کہ اس میں بولنے والے ذہن کو نفسیات کی کسوٹی پر گھس کر دیکھئے۔

نبی کے نور کو دو آفتاب کا نہ مثال
وہ آفتاب کا خالق ہے آفتاب نہیں

ہم ان عالی مرتبہ افرادِ حکومت سے جو "خلافتِ معاویہؓ و یزید" جیسی تحقیقی کتاب کو سمجھنے اور اس کے بارے میں منصفانہ فیصلہ کرنے کا خود کو اہل سمجھتے ہوں عرض کریں گے کہ اگر نفسیات کا کوئی سبق آپ نے پڑھا ہے تو اس کی روشنی میں اس شعر کو جنم دینے والے شاعر اور اسے سفر اول پر عزت کے ساتھ شائع کرنے والے عاشقانِ حسینؓ کی ذہنیت، مزاج، افتادِ طبع اور فکر و بصیرت کا ماہرانہ مطالعہ فرمائیے۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے ــــــ اور قرآن و حدیث کے محکم نصوص اس پر شاہد ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ہی طرح کے ایک انسان تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا تھا۔ خدا کا رسول ہونے کی حیثیت سے ان کا مقام چاہے کتنا ہی بلند ہو لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا کہ اللہ نے انھیں اپنی اس قدرتِ بے نہایت میں بھی شریک کر لیا ہو جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن میں "خلق" یعنی پیدا کرنے کو اور "امر" یعنی حکم چلانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اور صرف اپنی ہی مخصوص صفت قرار دیا ہے اسی لئے ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ زندگی اور موت چاند اور سورج، سمندر اور پہاڑ وغیرہ تو بڑی چیزیں ہیں ایک حقیر سا ذرۂ بے مقدار اور مورِ بے مایہ بھی سوائے خدا کے کسی کی تخلیق نہیں ہے۔ تب ذرا شاعرِ محترم سے پوچھئے کہ یہ جو شعر مذکور میں آپ نے مضمونِ بلیغ عطا فرمایا ہے اس کی کیا تشریح و توجیہ ہے؟

شاید آپ کہیں کہ یہ تو شعر کا معاملہ ہے اور شعر میں بے پر کی اڑانا شاعروں کا پیدائشی حق ہے۔ تو ہم عرض کریں گے کہ فی الحقیقت "خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں بھی تحقیقی و تاریخی دلائل کے ساتھ یہی بات واضح کی گئی ہے کہ واقعاتِ کربلا اور حسینؓ و یزید کی آویزش وغیرہ کے سلسلہ میں قصیدہ طرازوں اور داستان سراؤں نے جو کچھ مشہور کر چھوڑا ہے وہ شاعری سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اسے مذہبی عقیدہ بنا کر مسلمانوں کو اپنی عاقبت برباد نہیں کرنی چاہیئے۔

اس ملک میں آئے دن ایسی ایسی کتابیں چھپتی رہی ہیں ــــ اور اب بھی ان کا سلسلہ بند نہیں ہوا ہے کہ جن میں کھلم کھلا ایک عظیم امت کے جذبات کو مجروح کیا گیا ہے جن میں مقدس ترین انسانوں پر گندگی اچھالی گئی ہے جن میں معقول دلائل کی بجائے نعرہ بازی اور افترا پردازی کی تکنیک استعمال ہوئی ہے۔ پھر ان پر چھوٹے اور بڑے احتجاج بھی ہوئے ہیں۔ ملک میں ادھر سے ادھر تک بے چینی کا لاوا بھی پھوٹا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا کہ انھیں حکومتِ ہند نے ضبط کر لیا ہو۔ ضبط کرنا تو کجا انھیں کی متعدد تو آج تک بعض سکولوں اور کالجوں میں سبقاً سبقاً پڑھائی جا رہی ہیں اور نئی نسل کو علم کے نام پر جہل و تعصب کے ڈوز پلائے جا رہے ہیں۔ تب آخر کونسا نیا قانون اور کونسی نئی حکمت ہے جس کے تحت "خلافتِ معاویہ و یزید" جیسی ٹھوس کتاب کو ممنوع قرار دیدینا جائز ٹھیرایا جا سکتا ہو۔ اسمیں آخر اس کے سوا کیا ہے کہ جس یزید کو پروپیگنڈے اور افسانہ طرازی کے ذریعہ لوگوں نے شیطان بنا کے رکھدیا ہے اور جسے گالی دینا، اس پر لعنت بھیجنا اور اس کی شان میں برے سے برا لفظ استعمال کرنا کارِ ثواب سمجھ لیا ہے۔ اس کی برأت کے لئے مؤلف نے تاریخی شواہد پیش کئے ہیں اور علمی و تحقیقی انداز میں واضح کیا۔ ہے کہ وہ ایسا نہیں تھا جیسا مشہور کر دیا گیا ہے۔ دوسرا عنصر اس کتاب کا حضرت حسینؓ کی ذات ہے۔ اگر خدانخواستہ حضرت موصوف کی ذاتِ گرامی پر مؤلف نے خلافِ شان لے دے کی ہوتی اور اس طرح کے اتہام رکھے ہوتے جیسے شیعہ حضرات رسول اللہ کے برگزیدہ صحابہ پر رکھتے ہیں تب تو بے شک کہا جا سکتا تھا کہ یہ قابلِ اعتراض ہے لیکن کتاب اٹھا کر دیکھئے مؤلف تو کہیں بھی حضرت کی اس رفعت و عظمت کا انکار نہیں کرتا جو واقعی ان کا حق ہے اور جس پر عقلی و نقلی دلائل شاہد ہیں۔ وہ انھیں بڑا مانتا ہے قابلِ عزت قرار دیتا ہے، البتہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کا جو اقدام انھوں نے اپنے وقت کے اہل الرائے، دانشور، اصحابِ بصیرت اور سیاست دانوں کی رائے کے خلاف اٹھایا تھا وہ سلجھا ہوا تھا۔ نہ وہ یہ ماننے پر آمادہ ہیں کہ قتل و غارت اور ظلم و طغیان کی جو داستانیں جھوٹے راویوں، شاعروں اور افسانہ طرازوں کی مدد سے تاریخی حقیقتیں قرار دے لی گئی ہیں وہ سچ مچ اس قابل ہیں کہ ان پر بھروسہ کر لیا جائے۔ یہ ہے کل کائنات اس کتاب کی جسے ہوّا بنا کر حکومتِ وقت کو برائے مدد پکارا جا رہا ہے۔ حکومت اگر غیروں کی ہوتی تو اس کے ہر اقدام پر یہ کہکر صبر کیا جا سکتا تھا کہ

رجوع کیجئے

امور مصلحت خویش خسرواں دانند

لیکن اب خسرو و پرویز نہیں خود ہم حاکم ہیں۔ ہمارا ملک ہے۔ ہمارا آئین ہے۔ ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہم نے اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کرکے اختیارات کی مسند سونپی ہے انھیں ٹوکیں اور مخلصانہ مشورہ دیں۔ ہمارا مشورہ اس بارے میں یہ ہے کہ احتجاج کرنے والوں کے بے سود یا شور و شر کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یا اگر انصاف کی رگ بھی زور پھڑک رہی ہے تو احتجاج کرنے والوں سے کہا جائے کہ جن وجوہات سے تم اس کتاب کو لائق ضبطی قرار دے رہے ہو انھیں وضاحت کے ساتھ تحریراً پیش کرو۔ جب یہ وجوہات پیش ہو جائیں تو ان پر بالغ نظر قانون دانوں اور اہل علم ججوں کی رائے لی جائے۔ اسکی روشنی میں جو قدم اٹھایا جائے گا وہ فی الجملہ جمہوری اور منصفانہ کہا جاسکیگا لیکن اگر اس طرح کے کسی معقول طریقے کو اختیار کئے بغیر ہی محض اس بنا پر عمل میں لائی گئی کہ کچھ لوگ اس کتاب کو اپنے لئے دل آزار ہو رہے ہیں اور خوامخواہ ہاؤ ہو کا طوفان اٹھا رہے ہیں تو بعید نہیں کہ یہ اقدام حکومت کے لئے درد سر بن جائے اور ایک ایسے فتنے کا دروازہ کھل جائے جو ناک میں دم کر دینے والا ہو۔ آخر عقائد کے معاملات کچھ مسلمانوں ہی کا طرۂ امتیاز تو نہیں ہیں۔ اہل ہنود میں یہ اختلافات مسلمانوں سے زیادہ ہی ہیں۔ ان میں تو اساسیات تک میں بے حد تفرقہ ہے حتیٰ کہ کچھ فرقے جن ہستیوں کو نبی، اوتار اور دیوتا مانتے ہیں دوسرے فرقے انھیں اچھے انسان ماننے تک کو تیار نہیں ہیں۔ کچھ افراد جن مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں کچھ اور افراد انھیں اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ ان کا وجود ہی برقرار رہنے دیا جائے۔ ایک ایسی کتاب کو ضبط کرکے جس میں نہ کسی کو گالی دی گئی، نہ فحش بکا گیا، نہ کسی کا مضحکہ اڑایا گیا، نہ بے دلیل باتیں گھڑی گئیں، نہ بے حوالہ گفتگو کی گئی، نہ کوئی اور ایسا اسلوب ایسا اختیار کیا گیا جو قانون، شرافت یا علمی و تحقیقی تقاضوں کے خلاف ہو آپ گویا ہندوستان کے تمام فرقوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ہر اس کتاب کے خلاف شور مچانا شروع کر دیں جو ان کے مخصوص خیالات و عقائد کی تائید نہ کر رہی ہو۔ ہر اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کریں جو انھیں پسند نہ آئے۔ شیعہ دوستوں نے اگر دو چار جلسے کئے ہیں، سو دو سو تار دیئے ہیں تو اطمینان رکھیئے دوسروں کے لئے بھی یہ راستہ کھلا ہوا ہے۔ ہندوستان کا ایک ٹوٹا پھوٹا سا فرقہ بھی نہایت آسانی سے مہینے میں بیس جلسوں اور ہر روز پچاس تاروں کا ریکارڈ قائم کر سکتا ہے۔ بس جلسے اور تار ہی نہیں ستیاگرہوں اور بھوک ہڑتالوں کا کھٹراگ بھی پھیلانے والے یہاں بہت ہیں۔ آپ کیا جواب دیں گے اگر فریادی ہائیکورٹ کی بارگاہ انصاف میں "خلافت معاویہؓ و یزید" پیش کرکے کہے کہ مائی لارڈ! اس کتاب میں نہ گالیاں ہیں نہ فحش عریاں باتیں۔ نہ کسی کی پگڑی اچھالی گئی ہے۔ نہ کسی کا منہ چڑایا گیا ہے۔ اس میں تو پوری متانت و شرافت کے ساتھ علمی و تحقیقی دلائل سے کچھ تاریخی واقعات و شخصیات پر گفتگو کی گئی ہے۔ جب اسے بھی حکومت نے صرف اس لئے ضبط کر لیا کہ کچھ لوگ اسے اپنے لئے دل آزار کہتے ہیں اور دو چار جلسے کرکے تار کھڑکھڑاتے ہیں تو عالی مقام جج! فلاں فلاں کتاب کو بھی لائق ضبطی قرار دیجئے کہ اس سے ہمارا دل بہت دکھا ہے اور اس کے خلاف ہم نے دگنے جلسے کرکے چوگنے تار کھڑکھڑا دیئے ہیں۔

حکومت کرے گی تو وہی جو اسے کرنا ہے۔ ہم اتنا اور بتا دیں کہ اس کتاب کے بارے میں بعض اُن حضرات کے تاثرات کیا ہیں جو علم و فضل کے اعتبار سے ملک بھر میں مشہور ہیں یا جنھیں بڑی بڑی تنظیموں کی سربراہی حاصل ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے

جب یہ کتاب قسط وار مقالہ کی شکل میں ایک ماہنامے میں چھپ رہی تھی تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے ماہنامے کے مدیر کو لکھا تھا۔

" یہ مقالہ بہت ہی جامع، نافع، بصیرت افروز ہے اسے کتابی صورت میں جلد سے جلد لائیے"۔ (خط مرقومہ ۱۰ر فروری ۱۹۵۹ء)

اس کے بعد ابھی ۱۸ر ستمبر ۱۹۵۹ء کے صدق میں بھی انھوں نے مختصراً اس پر کچھ لکھا ہے۔ افسوس صدق اس وقت ہمیں مہیا نہیں تاہم موصوف کی تحریر کا لب لباب یہ ہے کہ جسے کتاب سے اختلافات ہو وہ علمی طریقے سے اس کے دلائل و شواہد کا نقص واضح کرے ضبطی کا کیا سوال ہے۔

مولانا عبدالوہاب آروی۔ صدر آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس دہلی کی رائے

مولانا آروی صاحب لکھتے ہیں

" واقعی جناب مولانا محمود احمد عباسی صاحب (مؤلف کتاب ہذا) صدآفریں کے مستحق ہیں کہ صدیوں سے جن واقعات پر پردہ پڑا ہوا تھا جو آج تک کسی سے نہ اُٹھ نہ سکا تھا مولنا نے اسے اُٹھاکر ان کی اصل و حقیقت کو نمایاں کر دیا۔ جزاھم اللّٰہ خیر الجزاء مولانا کی تاریخی نظر بہت وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اسلام کی اس جلیل القدر خدمت کے انجام دینے پر میں مولنا موصوف کو مبارک باد اور ان کے زورِ قلم کی داد دیتا ہوں۔"

ان دو آرار کے علاوہ جمعیۃ العلمائے ہند کے سرکاری آرگن " الجمعیۃ دہلی" کا شذرہ اور امارت شرعیہ بہار کے سرکاری آرگن " نقیب" کا تبصرہ آگے ملاحظہ فرمائیے۔

ان آرا کی نقل سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اب یہ کتاب ہر اعتبار سے لائق تائید ہوگئی اور اس سے اختلاف کرنا فعلِ مذموم ٹھیرا۔ نہیں جسے اختلاف ہو بے شک وہ شوق سے اس کا رد لکھے۔ اس کے ایک ایک استدلال کے بخیئے ادھیڑ کے رکھدے لیکن ان آرا سے کم سے کم یہ تو ثابت ہوگیا کہ یہ کتاب کوئی عامیانہ قسم کی مناظراتی چیز نہیں ہے۔ نہ اس میں شرافت و دیانت کے خلاف کوئی اسلوب اختیار کیا گیا ہے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ذمہ دار حضرات اسے برسرِ عام سراہنے لگتے۔

مقامِ عبرت ایک عبرت انگیز بات یہ ہے کہ ہندوستان میں آئے دن ایسی کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں جن میں صریح غلط بیانیوں اور افسانہ طرازیوں کے ذریعہ مسلمانوں کی کھلی دل آزاری کی جاتی ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک مبسوط تاریخ "دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل" آر سی موجدار کے قلم سے چھپی ہے جس پر مقدمہ کے ایم منشی سابق گورنر یوپی کا ہے۔ بقول مدیر معارف (اعظم گڈھ) اس کی پانچویں جلد میں مسلمانوں کے متعلق نہایت دل آزار باتیں لکھی ہیں۔ لیکن کوئی نہیں سنے گا کہ " خلافت معاویہؓ و یزید" پر واویلا مچانے والے نازک مزاجوں کے کانوں پر جوں رینگی ہے۔ کیوں رینگے۔ انھیں تکلیف اسلام اور مسلمانوں کی توہین و تضحیک سے نہیں ہوتی بلکہ صرف اس بات سے ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگا ہے کہ صدیوں کی کوشش سے انھوں نے تاریخی حقائق کا جو حلیہ بگاڑا تھا اس کے نوک پلک

کوئی کیوں درست کرنے چلا ہے۔

برقعے کے اندر ہم سنی بھائیوں سے متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ یزید کے فسق و فجور کی کہانیاں تصنیف کرنے سے یاروں کا اصل منشا حضرت امیر معاویہؓ کی توہین و تفسیق ہے اور یہ ایک بغلی گھونسہ ہے جو مکاری کے ساتھ صحابہ کے رخسارِ عزت و حرمت پر مارا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ۳۰ ستمبر ۵۹ء کے سرفراز میں جو طویل ہذیانی اداریہ لکھا گیا ہے اس میں ہمارے دعوے کی کتنی کھلی شہادتیں ہیں۔ ارشاد ہے۔

" ظلم و جور اور مسلمانوں کی خوں ریزی کرنے میں معاویہ کا پلہ یزید سے بہت بھاری تھا اور تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت بھی ہوتی ہے کہ اگر یزید کے نامۂ اعمال سے واقعۂ کربلا اور واقعہ حرہ کو نکال دیا جائے تو یزید کا کریکٹر معاویہ سے بہت بلند نظر آئے گا تعداد کے لحاظ سے جتنے انسانوں کو معاویہ نے قتل کرایا ہے یزید نے اس تعداد کے عشرِ عشیر کا دسواں حصہ بھی قتل نہیں کرایا۔ آپ کو تاریخوں کا مطالعہ بتائے گا کہ معاویہ کی گردن پر لاکھوں مسلمانوں کا خون ہے۔ اور اس شخص نے جسے عظیم اور جلیل القدر صحابی بتایا گیا ہے اور جن کے ساتھ سوءِ ظن رکھنے والے کو عذاب الٰہی کا مستوجب ٹھیرایا گیا ہے ظلم و بربریت اور درندگی و دحشت میں ہلاکو، چنگیز، محمود غزنوی، تیمور، اور نادر شاہ کو بھی مات کر دیا ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے۔ یہ ہے وہ اصل چہرۂ زیبا جسے یزید کے برقعے میں چھپاکر عوام کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے۔ یہ بحث تو ہم یہاں اٹھانا نہیں چاہتے کہ جن تاریخوں کے مطالعہ کا ذکر مذکورہ سطور میں کیا گیا ہے کیا واقعی وہ تاریخیں ہیں یا افترا، دروغ بافی، ایجادِ و بلید الذہنی کا پلندہ۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ " اسلام کی مذہبی تاریخ کی گمراہ کن ترجمانی" اور " تاریخی غلط بیانی" کا جو الزام " خلافت معاویہؓ و یزید" کے مؤلف پر مدیر سرفراز نے " احتجاجی تجویز" میں لگایا ہے وہ جہاں تمام شیعہ لٹریچر پر نہایت عمدگی سے چسپاں ہوتا ہے وہاں خود اس اداریے پر بھی بداہتہً چسپاں ہو رہا ہے علا

سلے ۱۵ اسر ۱۳ بر جو اکتوبر ۱۹۵۹ء کے روزنامہ الجمعیۃ دہلی، مرتب غلط تاریخ اور گمراہ کن تبصرہ کے عنوان سے اداریہ لکھا گیا ہے

ازیں نقل کردہ چند سطروں ہی میں جسقدر توہین و تذلیل حضرت معاویہؓ جیسے صحابیٔ گرامی کی ہے جتنے زہریلے تیر ہم عقیدت مندانِ معاویہؓ کے سینوں پر چلائے گئے ہیں اس کی مثال "خلافتِ معاویہ ویزید" کے چار سو صفحات میں بھی نہیں ملتی۔

کیسی دھاندلی ہے کہ جو گروہ تاریخی غلط بیانی اور تحریف و تسخر میں سب سے آگے ہو، جو نام لے لے کر امتِ مسلمہ کے مسلمہ بزرگوں کی توہین کرتا ہو جسکا قومی نشان ہی ہو تبرّا کرنا، اول فول بکنا اور نسل و نسب کے آستانے پر بجبہ گذار ہونا وہ اُس متین و ثقہ کتاب کو ضبط کرانے کا شور مچائے جس میں استدلال ریسرچ اور بے تعصبی کا حق ادا کر دیا گیا ہو۔

آنکھیں کھولیں وہ اہلِ سنت جو جذباتی فراڈ کا شکار ہو کر عاشقانِ حسینؓ کی لے میں لے ملاتے ہیں اور یزید کو گالیاں دیکر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا تیر مارا۔ کیا اب بھی انھیں شک ہے کہ ہدف اصل میں یزید نہیں امیر معاویہؓ ہیں۔ وہ امیر معاویہؓ جنکے قدوم عزت پر ہم بڑے سے بڑے ولی کو قربان کر سکتے ہیں پھر معاویہ ہی تک بس نہیں ہے۔ بڑا مقصد ہے نفسِ صحابیت کی تخریب صحابیت ہی کی حرمت ختم ہو جائے تو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی توہین و تذلیل کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ یہی دونوں بزرگ ہیں جن سے من گھڑت تاریخ سازوں اور برہمنی ٹائپ کے نسل پرستوں کو سب سے زیادہ کد ہے۔ اللھم احفظنا

ایک تماشے کی بات یہ ہے کہ فریاد کچھ اس انداز میں کی جا رہی ہے گویا اسلامی تاریخ فریادی حضرات کی ذاتی جائداد ہے جسے دشمن نے خورد برد کر دی ہے۔ اسلامی تاریخ ہی نہیں یہ حضرات حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ وغیرہ کو بھی اسی طرز میں پیش کرتے ہیں جیسے ان کے بارے میں گفتگو کرنے کا بس انھی کو حق ہے اور ان کے دھڑے سے باہر کا کوئی شخص اگر زبان کھولے گا تو اس پر نجی معاملات میں دخل اندازی کا الزام لگا دیا جائے گا۔

اللہ کے بندو۔ تاریخ تمہاری ہے نہ ہماری۔ اہلِ بیت تمہارے کنبے تک محدود ہیں نہ ہمارے۔ یہ تو تمام عالم کا سرمایہ ہیں۔ ان کے بارے میں یہ نہیں ہو سکتا کہ تم جو رائے دو وہ تو وحی مان لی جائے اور دوسرے جو نقد کریں اس پر شور مچا جائے کہ لینا پکڑنا گھیرنا مارنا! — تاریخ اور اس کی تحقیقات پر تمہیں بھی اظہارِ رائے کا حق ہے اور ہمیں بھی۔ تم اس حق کو اس بری طرح استعمال کرتے ہو کہ تہذیب و نجابت کو استفراغ ہونے لگتا ہے۔ یہی دیکھئے "مدیر سرفراز" نے خاندانِ بنوامیہ کو "چھٹے" ہوئے لوگوں کا خاندان کہہ دیا ہے۔ لیکن ہم کبھی اس پست سطح پر نہیں اُترتے۔ ہم تو شرافت و تہذیب کی قدریں جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ معقولیت اور جذباتی مدہوشی میں کیا فرق ہے۔ اسی لئے ہمیں کبھی یہ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ اسے وزیرِ مملکت دوڑیئے ہمارے معتقدات کے پیروں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے "خلافتِ معاویہؓ ویزیدؒ" ضبط نہ ہوئی تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔

خلافتِ معاویہؓ و یزید

پر

جمعیۃ العلمائے ہند کے آرگن روزنامہ الجمعیۃ دہلی کے فاضل مدیر کا شذرہ

ایک علمی کتاب

اگر کوئی شخص ایسی کتاب لکھے جس میں اونچے خیالات کے ساتھ علمی رنگ میں کسی اختلافی مسئلہ پر ریسرچ کی گئی ہو اور اس کے ذریعہ تاریخ کے بعض مخفی گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہو، ساتھ ہی اس میں کسی طبقہ کی دلآزاری بھی نہ کی گئی ہو، نہ اس کے بزرگوں کو برا کہا گیا ہو تو ایسی علمی کتاب کی قدر کرنی چاہیئے۔ اگر کوئی حکومت تحقیقی لٹریچر پر بھی قدغن لگادے تو یہ علم اور ریسرچ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ ابھی حال میں پاکستان سے معاویہ یزید پر ایک کتاب شائع کی گئی ہے جو ہماری نظر سے بھی گزری ہے اور جو اپنے موضوع پر اس قدر محققانہ اور مورخانہ ہے کہ اس سے بہتر ریسرچ کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی ساتھ ہی اس کی متانت قابل داد ہے۔ مگر ہمیں یہ سنکر تعجب ہوا کہ پاکستان نے اسے ضبط کرلیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کتاب مذکور کے دلائل کمزور ہوں اور ان سے کسی کو اتفاق نہ ہو، اس کا علاج یہ ہے کہ تحقیق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہی اسے زیر تنقید لایا جائے اور علمی رنگ میں اس کا جواب دیا جائے لیکن علمی باتوں میں حکومت پاکستان کا دخل دینا حدود کار سے تجاوز کرنا ہے۔ اس طرح تو تحقیقات کا سلسلہ یکسر منقطع ہوجائے گا اور تاریخی لٹریچر کو دریا برد کرنا پڑے گا حکومت پاکستان نے اس کتاب کو ضبط کرکے ایک بری مثال قائم کی ہے جسے بہرحال جمہوری ممالک میں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد سے لیکر خلافت یزید تک مسلمانوں میں جو اختلافات ہوئے اہل سنت الجماعت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ ان کو گذری ہوئی بات سمجھیں اور کسی فریق کو برا بھلا نہ کہیں۔ امت کا اختلاف کم کرنے کے لئے شاید اس سے بہتر راہ عمل کوئی متعین ہو بھی سکتی تھی، لیکن مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے جس کو تبرا سب وشتم اور گالی پر اصرار ہے۔ مغلیہ عہد میں جن ایرانیوں نے ہندوستان کا رخ کیا ان میں اسی فرقہ کے لوگ تھے۔ ان ایرانیوں نے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کو فارسی زبان کا قیمتی ذخیرہ دیا، شعر و شاعری کے معیار کو اونچا اور یہاں کے طرز زندگی میں لطافت اور خوبی پیدا کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے دین کو کھیل تماشہ بنادیا اور ان مسلمانوں کو جن کے ذریعہ دین کو قوت حاصل ہوئی غیر وقیع بنانے کے لئے جو کچھ وہ ایران میں کرتے تھے وہ ہندستان میں بھی کرنا شروع کردیا۔ اس سے اہل سنت والجماعت کے افراد بھی متاثر ہوتے۔ چنانچہ اس طرف سب سے پہلے حضرت مولانا شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے توجہ فرمائی اور اصلاح حال کے لئے "ازالۃ الخفا فی خلافۃ الخلفا" کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کی نظیر اس عہد کے پورے عالم اسلام میں نہیں مل سکتی۔ اس کے فوراً ہی بعد ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تحفۂ اثنا عشری کے نام سے ایک دوسری کتاب مرتب کی، پھر دور سرسید میں نواب محسن الملک نے، جو خود اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، آیات بینات لکھی۔ اس طرح حقائق کو پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کی سیرۃ الصدیق، علامہ شبلی کی کتاب الفاروق ان کی اکاڈمی سے تاریخ اسلام سے مختلف ادوار کا روشنی میں آنا، مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم کی تاریخ الامت وغیرہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ خاندان ولی اللہی

"خلافتِ معاویہؓ و یزید"

پر

امارت شرعیہ بہار کے آرگن "نقیب" کا تبصرہ

معاویہؓ و یزید — مرتبہ:۔ محمود احمد صاحب عباسی۔ قیمت:۔ چھ روپے۔

علماء دیوبند کی بدولت احادیث کی اشاعت نے بھی حقیقت پرسے پردہ اٹھایا۔ جناب محمود احمد صاحب عباسی کی یہ کتاب "معاویہؓ و یزید" اسی احقاق حق کی آخری کوشش ہے۔ صاحب کتاب نے بنی امیہ اور بنی ہاشم میں عموماً اور یزید اور حسنین رضی اللہ عنہما میں خصوصاً جو رشتہ داریاں تھیں اور واقعہ کربلا کے فوراً بعد حضرت زین العابدین وغیرہم سے جو رشتہ داریاں قائم ہوئیں ان کو بہ تفصیل پیش کر کے یہ سوال کھڑا کر دیا ہے کہ اگر واقعہ کربلا اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ تبرائی مورخین نے بنا دیا ہے تو یہ رشتہ داریاں کیونکر قائم ہو سکیں۔ کینہ و بغض و حسد اور فسق و فجور کا جو تصور باندھا گیا ہے اگر ان پر یقین کیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا آل بیت نعوذ باللہ بزدل اور بے غیرت تھے کہ کھلی ہوئی سفاکی اور ظاہر فسق و فجور کی موجودگی میں یزید اور اس کے خاندان سے رشتہ داریاں قائم کرنے میں انھوں نے کوئی نقصان نہ سمجھا۔ شیر خدا کی اولاد سے اس کی توقع تبرائیوں اور ماتم عزا منعقد کرنے والوں کو ہو سکتی ہے۔ حاشا و کلا محبان اہل بیت کو نہیں ہو سکتی۔

فاضل مؤلف نے بتایا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں بنی ہاشم کو کسی جگہ کا عامل نہیں بنایا۔ کبھی مدینہ میں اپنی نیابت کسی بنی ہاشم کو نہیں دی۔ اِلّا یہ کہ امہات المومنین کی دیکھ بھال کے لئے ایک دفعہ حضرت علیؓ کو چھوڑ دیا تو کیا غضب ہوا اگر آپ کے بعد مسلمانوں نے بنی ہاشم کو منصب خلافت پر سرفراز نہیں کیا۔ یہ کام تو عین منشائے نبوت کے مطابق تھا۔

عباسی صاحب نے، اس میں کوئی شک نہیں، یہ کتاب بہت محنت سے لکھی ہے۔ عہد رسالت سے لیکر اس دور تک کے سب مسلم و غیر مسلم مورخین سے استفادہ کیا ہے اور مخالف و موافق رائیں پیش کر کے ان پر جرحیں کی ہیں اور سچ اور جھوٹ کو الگ کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔

اس کتاب سے تبرائی حضرات آتش زیرپا ہیں۔ پاکستان کی حکومت نے اس کتاب کو ضبط بھی کر لیا ہے اور پاکستان کی حکومت سے اسی کی توقع بھی تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کو جس کی بدولت تقسیم ہونا پڑا اس کا مذہب وہی تھا جس مذہب کے ماننے والوں کی طبع نازک پر یہ کتاب گراں گزر رہی ہے پاکستان کی قسمت بنانے میں اس مذہب کے لوگوں کا حصہ ہے۔ مسلم لیگ کے جس اجلاس لکھنؤ نے جناح صاحب کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ بنایا اس کے روح رواں اسی مذہب کو ماننے والے ایک نواب صاحب تھے۔ اس مذہب کے لوگ پاکستان میں وزیر اعظم رہے ہیں، صدر جمہوریہ رہے ہیں۔ اسی مذہب کے ایک رکن نے وہاں جمہوریت ختم کر کے ڈکٹیٹر شپ قائم کی اور اسی مذہب کے ایک فوجی افسر نے جنرل ایوب کو یہ مقام بخشا۔ ایسے ملک میں اگر احقاق پر پابندی لگائی جائے تو کیا تعجب ہے جس ملک میں آزادی رائے نہ ہو اس ملک میں تحقیق حق کا دروازہ بند بھی رہتا ہے وہاں علم و حکمت کے پنپنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ یورپ نے شاہی اور پاپائیت کے بندھنوں سے نجات پائی اور جمہوری نظام کو اپنایا تو سائنس میں محیر العقول ترقیاں کیں۔ ایٹمی انرجی کا پتہ چلایا چاند پر کمند پھینکے، ناقابل علاج امراض کے لئے تیر بہدف دوائیں ایجاد کیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک جمہوری راستہ پر چل پڑا ہے اور پاکستان کی رجعت قہقہری کو اس نے قبول نہیں کیا ہے۔ تبرائی حضرات کی یہ مذموم خواہش کہ اس کے لئے زبان و قلم پر پابندی لگا دی جائے ہرگز اس ملک میں پوری نہیں ہو سکتی اور جس دن ایسا ہوگا وہ دن ہندوستان کے مستقبل کے لئے ماتم کا دن ہوگا۔

لکھنؤ کا ایک تبرائی معاصر اس کتاب پر مضامین کا سلسلہ شائع کر رہا ہے۔ اس عاجز نے ان مضامین کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اس نے پایا کہ ان میں زیادہ زور مصنف کتاب کو ڈوم اور مراسی ثابت کرنے میں صرف کیا گیا ہے۔ اگر مصنف کتاب ڈوم ہیں یا اس کے مخالف بھٹیارے تو اس سے اصل واقعہ میں کیا فرق پیدا ہو سکتا ہے؟ ہاں ان کے لئے یہ بڑا استدلال ہوگا جو گذشتہ تیرہ سو برسوں سے اسلام میں برہمنی عقیدہ داخل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور جن کو اصرار اس پر ہے کہ حضرت علی کو خلیفہ اس لئے ہونا چاہئے تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت قریبہ رکھتے تھے ہم تو اسے بہت کمزور بنیاد سمجھتے ہیں۔ حکومت کے لئے صلاحیت ضروری ہے قرابت ضروری نہیں ہے۔

معاصر مذکور کے مضامین میں اقرار کیا گیا ہے کہ اکابر صحابہ یزید کے ساتھ تھے اور امت اس پر جمع ہو گئی تھی اور کہا گیا ہے کہ صحابہ انسانی کمزوریوں سے خالی نہ تھے اور یہ کہ حق کبھی تنہا بھی ہوتا ہے۔ ہم

بھی اقرار کرتے ہیں کہ صحابہ معصوم نہ تھے اور حق کا معیار کثرت و قلت نہیں۔ لیکن معاصر موصوف کو یہ ثابت کرنا چاہیئے تھا کہ صحابہ کرام حق پر نہ تھے اور امام حسین حق پر تھے۔ اسے بتانا چاہیئے تھا کہ حق کا معیار کیا ہے اور وہ امام حسین رضی اللہ عنہ کو کن بنیادوں پر معصوم سمجھتا ہے۔ اگر سبط رسول ہونے کی بنا پر معصوم تھے تو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے بھی معصوم ہوتے۔ اگر خونی رشتہ فضیلت کی چیز ہوتی تو ابولہب کے دوزخی ہونے پر قرآن شہادت نہ دیتا اور اگر محض تنہا ہونا حق کا معیار ہے تو کتنے جرائم پیشہ معیار حق قرار دے دیئے جائیں گے جنہیں عدالتیں سزائیں دیتی رہتی ہیں اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔

بیشک ہم امام حسینؓ کی فضیلت کے قائل ہیں اس لئے کہ وہ مسلمان تھے تابعی تھے اور بعض دلائل کی بنا پر صحابی تھے اور جس بات کو حق سمجھا (گو اس میں اجتہاد کی غلطی ہوئی ہو) اس بات کے لئے مردانہ وار اپنی جان دے دی۔ کاش ہمارے تبرائی بھائی اس مرد شجاع کی پیروی کرتے اور زمانہ کی پیروی نہ کرتے کہ کل مسٹر جناح کے ساتھ تھے اور آج نہرو حکومت کی خوشامد کر رہے ہیں اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ اس وقت بھی اندرونی طور پر پاکستان کے ساتھ ہوں۔

بیشک ہم محبت کرتے ہیں اللہ سے، اللہ کے رسول سے، رسول کی بیویوں سے جو ہماری مائیں تھیں، آل بیت رسول سے، صحابۂ رسول سے، مجاہدین و شہدائے اسلام سے، علمائے دین و مبلغین اسلام سے اور جمیع مسلمانوں سے لیکن ہم اللہ اور اللہ کے رسول کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے۔ جو اختلافات ہوئے ان میں دونوں طرف سے غلطیاں ہوئی ہوں گی، ہم سب کا احترام کریں اور ان غلطیوں کو نہ دہرائیں جو اختلافات کو بڑھانے والی تھیں جس میں سب صحابہ متحد تھے اس میں ہمارے لئے روشنی ہے جس میں اختلاف تھا اس میں کتاب و سنت ہمارے لئے کافی ہے۔

معاصر موصوف کو افضل البشر بعد الانبیاء سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں کوئی فضیلت نہیں ملتی۔ سچ ہے ؂

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ میں وہی فرق تھا جو ایک بادشاہ، ایک وزیر اور ایک سپاہی میں ہوتا ہے اور اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنے سے ہی مسلمانوں میں انتشار و اختلاف کا زہر پھیل گیا۔

گذشتہ تیرہ سو برس سے اہل سنت والجماعت نیش کو نوش بنائے ہوئے ہیں۔ بہتان اور افترا، سب و شتم، تبرا اور گالیاں، سازشیں اور بغاوتیں سب برداشت کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مقتضائے طبیعت ہے تا زیبے کیں است پھر بھی معاصر موصوف اور اس کے ہم خیالوں کو یہی شکوہ ہے کہ ہمارے لئے نیش کو نوش بنانا آسان نہیں ہے۔ معاصر موصوف کو اختیار ہے کہ وہ غیر حقیقت کو حقیقت، سیاہ کو سفید، جھوٹ کو سچ، بزدلی کو تقیہ، جنوں کو خرد، بدصورت کو نیک صورت قرار دے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں ہے کہ سب سے زبردستی اپنی تائید بھی چاہے اور حق پسندوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرے اسے جاننا چاہیئے کہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے محض کسی کتاب کو ضبط کرا دینے سے حقیقت نہیں چھپ سکتی۔

ہمارے اس مضمون میں ناظرین خلاف معمول تلخی محسوس کریں گے لیکن یہ گنبد کی صدا ہے جیسی کہے ویسی سنے۔

فدک، واقعۂ قرطاس

اور دوسرے اہم مسائل

سید ابوالاعلیٰ مودودی

روشن تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر اور ان میں حسبِ ضرورت حذف و اضافہ کر کے ایک گروہ صدیوں سے صحابۂ جلیل کے خلاف جو افسوسناک پروپیگنڈہ کرتا چلا آرہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، غضب یہ ہے کہ جن بوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی لانہایت سعی و جہد اور بیکراں بصیرت و حسنِ عمل نے اقتدار اسلام کے پودے کو بیخ کرتن ومند کیا وہی ــــ علیہ الرضوان والرحمۃ ــــ اس گروہ کی دریدہ دہنیوں، الزام تراشیوں اور بغض و عناد کے سب سے زیادہ ہدف ہیں اللہ تعالیٰ اسے نیک توفیق دے، اس نے جہاں اور ہفوات اختراع کیں وہیں باغ فدک اور واقعۂ قرطاس کے صاف و سادہ حقائق کو ایسے لغو و لاطائل جامے پہنائے کہ الامان والحفیظ۔

علمائے حق برابر اس کے پروپیگنڈے کا توڑ کرتے آئے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک کرتے رہیں گے یہ مولانا ابوالاعلیٰ کے جوابات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں، اور آپ دیکھیں گے کہ موصوف نے محققانہ بصیرت اور ناقدانہ بالغ نظری کے ساتھ بہت کم لفظوں میں بڑے اہم حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جسے حق کی طلب ہو اسے اتنا ہی کافی ہے، اور جو محض بات کی پچ کرنا چاہے اس کے لئے دفتر بھی کافی نہیں۔ وللہ عاقبۃ الامور۔

(مدیر)

سوالات

۱:۔ باغ فدک کے مسئلہ پر آپ کی تحقیق درکار ہے، اس مسئلہ کو ایک گروہ اس انداز میں پیش کرتا ہے جیسے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ظلم کیا گیا۔

۲:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت مشہور واقعہ قرطاس کی اصل نوعیت کیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس معاملہ میں کیا موقف ہے ؟

۳:۔ اسلام میں جب چار شادیوں کی اجازت ہے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب دوسری شادی کرنی چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کیوں روک دیا ؟

جوابات

مسئلہ فدک

باغ فدک کے مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی وفات کے وقت کوئی ذاتی جائداد تھی بھی کہ جس میں میراث جاری ہوتی؟ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضورؐ کا تمام وقت دعوت حق کے کام پر صرف ہونے لگا تھا اور کاروبار تجارت بند ہوگیا تھا۔ مکہ معظمہ میں جب تک قیام رہا اس اثاثے پر گزر بسر ہوتی رہی جو آپ کے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پہلے کا بچا کھچا موجود تھا۔ ہجرت فرمائی تو گویا دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ طیبہ پہنچ کر آپ بالکل بے سروسامان تھے۔ ابتدائی زمانہ انتہائی عسرت اور تنگدستی کے ساتھ گزرا۔ پھر جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اموال غنیمت میں سے پانچواں حصہ نکالنے کا حکم دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا کہ جس قدر مناسب سمجھیں اور ضرورت محسوس فرمائیں اپنی ذات پر اور اپنے قرابت داروں کی حاجات پر صرف کرنے کے لئے اس حصے میں سے لیا کریں۔ باقی اللہ کے کام میں اور یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کی خبرگیری میں صرف فرمائیں۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ .... (الانفال آیت ۴۱) یہ پہلا ذریعہ معاش تھا جو آپ کو عطا کیا گیا۔

اس کے بعد ہجرت کے چوتھے سال اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے یہودی قبیلے بنی النضیر پر آپ کو فتح عطا فرمائی اور وہ اپنی جائدادیں چھوڑ کر شہر سے چلے گئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:۔

وَمَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ (الحشر آیت ۶-۷)

اور جو کچھ دلوایا اللہ نے ان سے اپنے رسولؐ کو نہیں دوڑائے اس پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ، مگر اللہ مسلط کر دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جو کچھ دلوائے اللہ (اس طریقے پر) اپنے رسول کو بستیوں کے لوگوں سے تو وہ اللہ کے لئے ہے اور رسول کے لئے ہے اور قرابت داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لئے تاکہ یہ مال تمہارے دولت مندوں ہی کے درمیان نہ گردش کرتا رہے"۔

اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے ان تمام اموال، جائدادوں اور علاقوں کو جو براہ راست جنگی کارروائی کے ذریعے سے فتح نہ ہوئے ہوں بلکہ اسلامی حکومت کے رعب و اثر سے مسخر ہو جائیں۔ غنیمت سے الگ کر کے حکومت کی ملک قرار دے دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے قرابت داروں کی ضروریات کے لئے اس سرکاری مال میں سے جس قدر مناسب سمجھیں لے لیں۔

ان احکام کے مطابق حضورؐ نے مدینہ طیبہ میں بنی النضیر کے چھوڑے ہوئے باغوں میں سے چند نخلستان، خیبر میں سے کچھ اراضی، اور فدک میں سے کچھ اراضی اپنے لئے مخصوص کر لی تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی سے حضورؐ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت پوری کرتے تھے اپنے قرابت داروں کی مدد فرماتے تھے۔ اور جو کچھ بچتا تھا اسے اللہ کی راہ میں صرف فرما دیتے تھے۔

غور کیا جائے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ان دونوں ذرائع (غنیمت اور فے) سے جو کچھ حضورؐ کو عطا کیا گیا اس کی نوعیت یہ نہیں تھی

کہ آپ نے اپنے ذاتی کاروبار سے کوئی جائداد پیدا کی ہو اور وہ آپ کے بعد بھی آپ کی ملک رہے اور آپ کے وارثوں میں تقسیم ہو۔ بلکہ اس کی نوعیت یہ تھی کہ آپ اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا سارا وقت سرکاری کام پر صرف فرماتے تھے اور اپنا کوئی ذاتی ذریعۂ معاش نہ رکھتے تھے۔ اس لئے آپ کو یہ حق عطا فرمایا گیا کہ حکومت کی املاک میں سے اتنی جائداد اپنے تصرف میں رکھیں جس سے آپ کی ضروریات پوری ہو سکیں ظاہر ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے نبوت کا کار عظیم اپنے لئے جائدادیں اور جاگیریں پیدا کرنے کے لئے تو نہیں کیا تھا۔ یہ تو ایک خدمت تھی جو خالص اللہ کے لئے آپ انجام دے رہے تھے اور اس کا اجر اللہ ہی کے ذمہ تھا۔ دنیا کے مال میں آپ کا حصہ بس اتنا تھا کہ آپ اپنے نفس کے اور اپنے اہل و عیال اور حاجت مند قرابت داروں کے حقوق ادا کرسکیں۔ یہ حصہ آپ کی حیات طیبہ تک ہی باقی رہ سکتا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اس کو ذاتی املاک کی طرح وارثوں میں تقسیم کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بات کو حضورؐ نے خود اپنی زندگی میں ہی صاف کردیا تھا۔

لا تقتسم ورثتی دینارا ولا درهما ما ترکت بعد نفقة نسائی ومونة عاملی فهو صدقة
(بخاری، مسلم، موطا، مسند احمد)

میرے وارث کوئی دینار و درہم آپس میں تقسیم نہ کریں۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے، میری بیویوں کا نفقہ اور میرے عامل کا۔۔۔ حق الخدمت ادا کرنے کے بعد وہ سب صدقہ ہے۔

لا نورث ما ترکنا فهو صدقة انما یاکل آل محمد من هذا المال لیس لهم ان یزیدوا علی الماکل
(بخاری، مسند احمد۔ مسلم)

ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ محمدؐ کے گھر والے تو اس مال میں سے بس کھا لیتے ہیں کھانے بھر سے زیادہ لینے کا انہیں حق نہیں ہے۔

ان اللہ عزوجل اذا اطعم نبیا طعمة ثم قبضه جعله للذی یقوم بعده
(مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیقؓ)

اللہ عزوجل کسی نبی کو بسر اوقات کے لئے جو کچھ دیتا ہے وہ اس کی وفات کے بعد اس شخص کے حوالے ہو جاتا ہے جو اس کا جانشین ہو۔

اس مال کے متعلق حضورؐ کی یہ ہدایات کچھ خفیہ نہ تھیں بلکہ تمام جلیل القدر صحابہ ان کو جانتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی تنہا ان کے راوی نہیں ہیں۔ حضرت علی، حضرت عباس، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر، حضرت عثمان، حضرت ابوہریرہ اور تمام ازواج مطہرات کی یہ شہادت نہایت مستند روایات سے ہم تک پہنچی ہے کہ حضورؐ نے اپنے ترکے کی یہی نوعیت بیان فرمائی تھی۔ اس فرمان مبارک کے ہوتے کون شخص یہ تصور کرسکتا ہے کہ حضورؐ کے خلفا آپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کے معاملہ میں کوئی دوسرا فیصلہ کرنے کے مجاز ہوسکتے تھے۔

اب دیکھئے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد مطالبۂ میراث کس طرح اٹھا اور آپ کے خلفاء نے اس پر اپنے اپنے زمانوں میں کیا کارروائی کی۔ شرعی قاعدے کے مطابق میراث کا مطالبہ کرنے کے حق دار تین فریق ہوسکتے تھے۔ ایک سیدۃ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بیٹی کی حیثیت سے۔ دوسرے حضرت عباس چچا کی حیثیت سے۔ تیسرے جملہ ازواج بیویوں کی حیثیت سے۔ ان میں سے پہلے ۲ دو فریقوں یعنی سیدہ فاطمہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ مقرر ہونے کے فوراً بعد خیبر، فدک، اور مدینۂ طیبہ کی اس تمام جائداد کے متعلق، جو حضورؐ کے تصرف میں تھی۔ اپنا دعویٰ پیش کیا، اور بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہ نے استدلال کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ جب تمہاری وفات کے بعد تمہارا ترکہ تمہارے اہل و عیال ہی میں تقسیم ہوتا ہے تو آخر میرے باپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ان کے ترکے میں سے مجھے کیوں میراث نہ ملے؟ اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ یہ تھا:-

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا نورث ما ترکنا صدقۃ وقال لست تارکاً شیئاً کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعمل بہ الا عملت بہ فانی اخشی ان ترکت شیئاً من امرہ ان ازیغ (بخاری، کتاب الفرض الخمس، مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں کوئی ایسا کام نہ چھوڑوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور میں وہ نہ کروں۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے آپ کے اوامر میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔

ولکن اعول من کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعولہ وانفق علی من کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینفق علیہ (ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی ترکۃ النبی صلعم، مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)

مگر میں ان سب لوگوں کی عیال داری کروں گا جن کی عیال داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ اور ان سب لوگوں پر خرچ کروں گا جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خرچ فرمایا کرتے تھے۔

واللہ لقرابۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احب الی ان اصل من قرابتی (بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر)

خدا کی قسم میرے لئے اپنے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنے کی بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا زیادہ محبوب ہے۔

جناب سیدہ اور حضرت عباس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو کے متعلق جتنی مستند روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں سے کسی میں یہ بات کہیں اشارۃً وکنایۃً بھی مذکور نہیں ہے کہ جناب سیدہ یا حضرت عباس نے حضرت ابوبکر کی یہ بات سن کر جواب میں فرمایا ہو کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط بات منسوب کر رہے ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب حضور کی طرف اس فرمان کی نسبت صحیح تھی تو پھر خلیفہ رسول کے لئے واجب العمل قانون اس کے سوا کوئی نہ ہو سکتا تھا جو رسول پاک سے ثابت تھا۔ آخر اس فرمان کی زد صرف جناب سیدہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما ہی کے مفاد پر تو نہ پڑتی تھی۔ خود خلیفہ کی اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مفاد بھی اسی کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اسی کی بنا پر اپنے شوہر کی میراث سے محروم ہوئی تھیں۔ خلیفہ برحق نے آخر انہی کو اس قانون سے کب مستثنیٰ کیا؟ [1]

اب رہ گیا تیسرا فریق۔ یعنی ازواج مطہرات، تو انھوں نے بھی ارادہ کیا تھا کہ حضرت عثمان کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت ابوبکر کے پاس بھیجیں اور حضور کے ترکے میں سے اپنے آٹھویں حصے کا مطالبہ کریں۔ مگر حضرت عائشہ نے اس کی مخالفت کی اور تمام ازواج مطہرات کو خطاب کرکے فرمایا:۔

الا تتقین اللہ، الم تعلمن ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول لا نورث ما ترکنا صدقۃ یرید

کیا آپ لوگ اللہ سے نہیں ڈرتے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ہماری وراثت

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل اور مستند روایات کے لئے ملاحظہ ہو:۔

بخاری:۔ کتاب فرض الخمس۔ کتاب فضائل اصحاب النبی۔ کتاب المغازی۔ کتاب الفرائض۔

مسلم:۔ کتاب الجہاد، باب حکم الفیٔ۔

نسائی:۔ کتاب قسم الفیٔ۔

ترمذی:۔ کتاب السیر، باب ماجاء فی ترکۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسند احمد:۔ مرویات ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

بل الکے نفسہ) انما یاکل آل محمد فی ھذا المال　　جاری نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے، محمدؐ کے اہل و عیال تو بس اس مال میں سے کھا سکتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضؓ کی یہ بات سُن کر سب ازواج مطہراتؓ اپنے دعوے سے دست بردار ہوگئیں۔

ایک بات اس سلسلہ میں یہ کہی جاتی ہے کہ فدک کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ حضرت فاطمہؓ کو دیا جائے گا۔ چنانچہ اسی بنا پر جناب سیدہ نے حضرت ابوبکرؓ سے خاص طور پر اس کا مطالبہ کیا تھا۔ اور شہادت میں حضرت علیؓ اور ام ایمنؓ کو پیش کیا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے انکی شہادت قبول نہ کی اور فدک کی جائداد انکے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔

مگر یہ قصہ حدیث کی مستند روایات میں سے کسی میں بھی مذکور نہیں ہے۔ البتہ بلاذُری اور ابن سعد نے اسے نقل کیا ہے، اور ان کے بیان میں بھی کافی اضطراب ہے۔ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے یہ بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی تھی بلکہ ام ایمن سے سُنی تھی اور انہی کو شہادت میں پیش کر دیا۔ بخلاف اس کے بلاذری کی روایت یہ ہے کہ جناب سیدہ نے خود یہ دعویٰ کیا تھا کہ میرے والد نے فدک مجھے دیا ہے۔ پھر ایک روایت کی رو سے انھوں نے حضرت علی اور ام ایمن کو شہادت میں پیش کیا اور دوسری روایت کی رو سے ام ایمن اور رَباح (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کو۔ [۳]

یہ تو ہے اس قصے کی حیثیت باعتبار روایت۔ اب ذرا قانونی حیثیت سے دیکھئے تو حضورؐ کا یہ فعل یا تو ہبہ ہو سکتا تھا یا وصیت۔ اگر کہا جائے کہ ہبہ تھا۔ تو وہ اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جبکہ حضورؐ نے اپنی زندگی ہی میں فدک کا قبضہ حضرت فاطمہؓ کو دیدیا ہوتا۔ ورنہ محض زبان سے کسی چیز کو کسی کے لئے نامزد کر دینا اور یہ نیت کرنا کہ وہ چیز مالک کے مرنے کے بعد معطیٰ لہٗ کو ملے گی۔ ہبہ نہیں بلکہ وصیت ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ یہ وصیت تھی، تو قرآن مجید میں میراث کا قانون نازل ہو جانے کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود یہ اعلان فرما چکے تھے کہ "لا وصیة لوارث" اب ترکے کی تقسیم کے معاملہ میں کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔" پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے ہی اعلان کردہ قانون کے خلاف دوسرے وارثوں کو چھوڑ کر ایک خاص وارث کے حق میں کوئی وصیت فرمائی ہوگی۔ علاوہ بریں ہبہ یا وصیت کے سوال کو نظر انداز کر کے صرف اس شہادت ہی کو دیکھا جائے جو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی گئی تھی تو وہ صریح قرآنی قانون شہادت کے لحاظ سے ناکافی تھی۔ قرآن کی رو سے یا تو دو مردوں کی شہادت معتبر ہے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت۔ جناب سیدہ (اگر یہ قصہ درست مانا جائے تو) صرف ایک عورت، یا ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی لائی تھیں۔ اس صورت میں قانون کیخلاف فیصلہ کیسے کیا جا سکتا تھا۔ کیا شخصیتوں کو دیکھ کر شہادت کا شرعی نصاب بدل دیا جاتا؟

اس کے بعد یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دوبارہ اٹھا۔ انکی خلافت پر دو سال گزر چکے تھے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکے کا مسئلہ پیش کیا۔ اور انھوں نے خیبر و فدک کو مستثنیٰ کر کے مدینے والی جائداد دونوں صاحبوں کی تولیت میں اس شرط پر دیدی کہ وہ اسکی آمدنی انہی مصارف میں صرف کریں گے جن میں حضورؐ اپنی حیات طیبہ میں صرف فرمایا کرتے تھے [۳]۔ لیکن اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے درمیان اس جائداد کے انتظام پر نزاع واقع

---

[۱] بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر۔ کتاب الفرائض، باب قول النبی صلعم لانورث

مسلم:- کتاب الجہاد۔ باب حکم الفئ۔

موطا۔ باب ما جاء فی ترکة النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

[۲] طبقات ابن سعد، ذکر میراث النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ فتوح البلدان للبلاذری، ذکر فدک۔

[۳] بخاری کتاب فرض الخمس و کتاب المغازی، مسند احمد مرویات ابوبکر صدیقؓ۔ مسلم کتاب الجہاد، باب حکم الفئ۔

ہو گئی اور وہ اس قضیے کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے۔ اس کا نہایت مفصل واقعہ مالک بن اوس بن حدثان کے حوالہ سے تمام معتبر کتب حدیث میں روایت ہوا ہے۔

حضرت مالک کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے حاجب نے آکر عرض کیا عثمان بن عفان، عبدالرحمان بن عوف، زبیر بن العوام اور سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) حاضری کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی اور وہ تشریف لے آئے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر بعد وہ پھر آیا اور اطلاع دی کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب اور علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہما)... تشریف لاتے ہیں اور وہ بھی اجازت کے طالب ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اجازت دینے پر دونوں صاحب اندر تشریف لے آئے اور سلام کے بعد بیٹھتے ہی حضرت عباس رضؓ نے کہا کہ اے امیرالمومنین، میرے اور اس کے (اپنے بھتیجے حضرت علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) مقدمے کا فیصلہ فرما دیجئے۔ اس کے ساتھ چچا نے بھتیجے کے حق میں کچھ سخت سست الفاظ بھی استعمال کئے۔ دوسرے حاضرین نے کہا واقعی امیرالمومنین، ان کا قضیہ بہت طول کھینچ گیا ہے، آپ انہیں اس جھگڑے سے نجات دلا دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ٹھیریئے۔ میں آپ صاحبوں کو اس خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں، کیا آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے؟" چاروں صاحبوں نے کہا، ہاں، حضورؐ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے علی رضؓ اور حضرت عباس رضؓ سے اسی طرح اللہ کا واسطہ دے کر پوچھا۔ کیا آپ دونوں صاحب جانتے ہیں کہ حضورؐ نے ایسا اور ایسا فرمایا تھا؟ دونوں نے جواب دیا۔ جی ہاں، واقعی حضورؐ نے یہ فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا، اچھا اب میں آپ لوگوں کو اس معاملے کی حقیقت بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فے کے معاملہ میں اپنے رسولؐ کو وہ مخصوص اختیارات عطا فرمائے تھے جو کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائے۔ پھر سورۂ حشر کی آیت وما افاء اللہ علیٰ رسولہ... آخر تک تلاوت کر کے حضرت عمرؓ نے فرمایا اس آیت کی رو سے یہ اموال فے خالصۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھے، مگر خدا کی قسم، حضورؐ نے آپ لوگوں کے بجائے ان سب کو اپنے لئے نہیں سمیٹ لیا اور نہ ان کے معاملے میں کوئی خود غرضی برتی، بلکہ انہیں آپ ہی لوگوں میں تقسیم کر دیا یہاں تک کہ یہ تین جائدادیں (مدینہ، فدک اور خیبر والی) بچ گئیں۔ ان جائدادوں میں سے حضورؐ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا سال بھر کا نفقہ لے لیتے تھے اور باقی ساری آمدنی انہی کاموں میں صرف فرماتے تھے جن میں اللہ کا مال صرف کیا جاتا ہے۔ یہی حضورؐ کا عمل اور ان اموال کے معاملے میں زندگی بھر رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ یہ بات آپ سب لوگوں کے علم میں ہے۔؟ چاروں صاحبوں نے جواب دیا جی ہاں، پھر حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر کہا، میں آپ دونوں کو بھی اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، آپ یہ بات جانتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا، جی ہاں ہم جانتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا، پھر اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا اور ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر کہ اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ولی ہوں، ان اموال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کے معاملہ میں اسی طریقے پر عمل کیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ بالکل سچے اور ٹھیک ٹھیک حق کے تابع تھے۔ پھر اللہ نے ابوبکر رضؓ کو بھی اٹھا لیا اور میں ان کا ولی ہوں۔ میں نے اپنی امارت کے پہلے دو سال تک ان اموال کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسی طرح عمل کیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر کرتے تھے۔ اللہ جانتا ہے کہ میں بھی اس میں سچا اور تابع حق تھا۔ پھر (حضرت علی اور عباس رضی اللہ عنہما سے مخاطب ہو کر فرمایا) آپ دونوں صاحب میرے پاس آئے اور آپ نے مجھ سے اس جائداد کے معاملے میں گفتگو کی۔ اس وقت آپ دونوں کے درمیان اتفاق تھا۔ اے عباس آپ نے مجھ سے اپنے بھتیجے کی میراث طلب کی، اور اے علی رضؓ آپ نے مجھ سے اپنی بیوی کے واسطے سے ان کے والد کی میراث مانگی۔ میں نے آپ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لا نورث ما ترکنا صدقۃ" لہٰذا اگر آپ چاہیں تو میں اس شرط پر یہ جائداد آپ کے حوالے کر سکتا

ہیں کہ آپ اس میں اسی طرح عمل کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد ابوبکر رض عمل کرتے رہے اور خلیفہ ہونے کے بعد سے میں عمل کر رہا ہوں۔ لیکن اگر یہ شرط آپ کو منظور نہ ہو تو مجھ سے اس معاملہ میں بات نہ کیجئے۔ پھر حضرت عمر رض نے چاروں صاحبوں کو خدا کا واسطہ دے کر پوچھا۔ کیوں حضرات۔ میں نے اس شرط پر یہ جائداد ان دونوں اصحاب کے حوالہ کی تھی؟ انھوں نے کہا، ہاں، پھر حضرت علی اور حضرت عباس کو بھی اسی طرح خدا کا واسطہ دے کر پوچھا کہ اس جائداد کو حوالے کرتے وقت میری یہی شرط تھی؟ انہوں نے بھی اسے تسلیم کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رض نے کہا کہ اب آپ چاہتے ہیں کہ میں اس سے مختلف کوئی فیصلہ کروں۔ اس خدا کی قسم جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ میں کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کرونگا۔ اگر آپ اس شرط پر عمل نہیں کرتے تو یہ جائداد میرے حوالے کر دیجئے، میں اس کا... انتظام خود کر لوں گا۔ [1]

یہ ہے اس مسئلہ کی پوری تاریخ جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں پیش آئی۔ اسے دیکھ کر ہر شخص خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس معاملہ میں جو کچھ کیا گیا وہ ظلم تھا یا عدل اور حق۔ اس کے ساتھ دو باتیں اور بھی ہیں جو صحیح رائے قائم کرنے کے لئے نگاہ میں رہنی چاہئیں۔ اول یہ کہ اصل بحث صرف یہ تھی کہ اس جائداد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میراث میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ بحث نہ تھی کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال اور قرابت داروں کو بیت المال سے نفقہ پانے کا حق ہے یا نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض نے خود اپنی ذات اور اپنے خاندان والوں سے بدرجہا زیادہ ان حضرات کی خدمت کی، ان کے حق کو ہر دوسرے حق پر مقدم رکھا۔ اور جو وظائف ان کے لئے جاری کئے وہ خیبر اور فدک اور مدینہ طیبہ کی جائدادوں کے محاصل سے کہیں بڑھ کر تھے۔ دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بلکہ اس مسئلے میں فیصلہ کن ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی اس جائداد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث قرار دے کر وارثوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ اسے بدستور وقف فی سبیل اللہ ہی رہنے دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعی میراث ہی تھی تو حضرت علی رض کے لئے اپنے زمانہ اقتدار میں وارثوں کو اس سے محروم رکھنا کیسے جائز ہو گیا؟ اسے ظلم ہی کہنے کو کسی کا جی چاہتا ہو تو پھر اسے اتنا انصاف تو کرنا ہی چاہئے کہ جس جس نے اس کا ارتکاب کیا ہو کیا ہے ان سب کو ظالم کہے۔ ایک ہی فعل پر کسی کے حق میں ایک فیصلہ اور کسی دوسرے کے حق میں دوسرا فیصلہ کرنا حق پرست آدمی کا کام نہیں ہے۔

واقعہ قرطاس

اس واقعہ کے متعلق امام بخاری نے کتاب العلم، کتاب الجزیہ، اور کتاب المغازی میں۔ امام مسلم نے کتاب الوصیۃ میں، امام احمد نے مسند ابن عباس میں متعدد روایات مختلف سندوں سے نقل کی ہیں۔ جن کا سلسلہ ابن عباس رضی اللہ عنہ پر تمام ہوتا ہے۔ کسی دوسرے صحابی سے اس باب میں کوئی صحیح روایت منقول نہیں ہوئی ہے۔ خلاصہ ان سب روایات کا یہ ہے کہ وفات سے چار روز پہلے جمعرات کے دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدید تکلیف طاری تھی اور آخری وقت قریب معلوم ہو رہا تھا۔ اس حالت میں آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ لکھنے کا سامان لاؤ۔ میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو۔ اس وقت مکان میں

---

[1] بخاری:- کتاب فرض الخمس، کتاب المغازی، کتاب النفقات، کتاب الفرائض، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ۔

مسلم:- کتاب الجہاد، ترمذی:- کتاب السیر، باب ماجاء فی ترکۃ النبی صلعم۔

ابوداؤد:- کتاب الخراج والفئ، باب صفایا رسول اللہ صلعم

مسند احمد:- مرویات عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

بہت سے لوگ جمع تھے حضرت عمرؓ نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سخت تکلیف میں ہیں، ہمارے پاس قرآن موجود ہے، اللہ کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔" اس پر اختلاف ہوگیا بعض لوگوں نے کہا نہیں، سامان کتابت لے آنا چاہیئے تاکہ حضورؐ وہ چیز لکھوا دیں جس کے بعد ہم گمراہ نہ ہوسکیں۔ اور بعض اصحاب نے حضرت عمرؓ کے خیال کی تائید کی۔ کچھ اور لوگوں نے کہا کہ حضورؐ سے پھر دریافت کرلو۔ آپ واقعی کچھ لکھوانا چاہتے ہیں یا یہ بات آپ نے غلبہ مرض کی وجہ سے گھبراہٹ میں فرمائی ہے[1] اس طرح بعض لوگ آپس میں بحث کرنے لگے اور بعض حضورؐ سے آپ کا منشا پوچھنے میں لگ گئے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو"....

"میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ میرے پاس جھگڑا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" اس کے بعد حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ ایک یہ کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دینا۔ دوسری یہ کہ جو وفود باہر سے آئیں ان کی اسی طرح خاطرداری کرنا جس طرح میں کرتا تھا۔ اور تیسری بات یا تو حضورؐ ہی کی زبان سے ادا نہ ہوئی یا راوی سے فراموش ہوگئی۔ روایات اس باب میں بھی واضح نہیں ہیں کہ ابن عباس نے اس کو فراموش کیا یا بیچ کے کسی راوی نے۔

یہ ہے پورا تفصیلی قصہ کی۔ اگر کسی کو بغض و عناد کینہ توزی اور عیب جوئی کی بیماری لگی ہوئی نہ ہو تو اصل صورت معاملہ کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی اپنے محبوب ترین پیشوا اور رہبر کو دنیا سے رخصت ہوتے دیکھ کر سب لوگوں پر اضطراب کا عالم طاری تھا مرض شدت پکڑ چکا تھا۔ سب کی آنکھوں کے سامنے حضورؐ سخت کرب کی حالت میں مبتلا تھے۔ ابن عباس کا اپنا حال یہ تھا کہ اس واقعہ کے بہت سال بعد ایک روز شاگردوں کے سامنے ان کی زبان پر جمعرات کا لفظ آیا اور یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شاگردوں نے پوچھا جمعرات کا کیا قصہ ہے جسے یاد کرکے آپ یوں بدحال ہوتے جارہے ہیں۔ فرمایا وہ دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت تکلیف کا تھا۔ (اشتد بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عین اس وقت جبکہ حضورؐ پر یہ حالت طاری تھی آپ کے جانثار رفیقوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس حالت میں قلم دوات منگانے کے لئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا اور غرض یہ بیان فرمائی کہ ایسی کوئی چیز لکھوا دیں جس سے امت بعد میں گمراہ نہ ہونے پائے۔ مرض کی شدت میں ممکن ہے کہ بات صاف بھی زبان مبارک سے ادا نہ ہوئی ہو۔ اسی وجہ سے بعض حاضرین کو شبہ ہوا کہ گھبراہٹ میں آپ نے کچھ فرمایا ہے جسے پھر پوچھ کر تحقیق کرلینا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر جو کچھ کہا اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ "حضورؐ اس وقت سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اس حالت میں آپ امت کے لئے فکرمند ہو رہے ہیں اور کچھ لکھوانے کی زحمت اٹھانا چاہتے ہیں تاکہ لوگ آپ کے بعد گمراہ نہ ہونے پائیں، لیکن اس وقت آپ کو یہ زحمت دینی مناسب نہیں ہے۔ امت کی ہدایت کے لئے قرآن موجود ہے۔ انشاءاللہ وہی گمراہی سے بچانے کے لئے کافی ہوگا۔ ممکن ہے اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کو یہ بھی اندیشہ ہو کہ اگر تحریر لکھاتے لکھواتے حضور کا وقت آن پورا ہوا اور بات ادھوری رہ گئی تو کہیں وہ الٹی فتنے ہی کی موجب نہ بن جائے۔ بہرحال یہ بالکل فطری امر تھا کہ اس موقع پر کوئی تو علم اور ہدایت کی حرص میں اس بات کا طالب ہوا کہ حضورؐ سے کچھ لکھوا لیا جائے، اور کسی نے محبت کی وجہ سے بھی اور دوراندیشی کی بنا پر بھی آپ کو یہ زحمت دینا مناسب نہ سمجھا، اور کوئی اس شک

---

[1] اصل الفاظ ہیں "ما شانہ اَھَجَرَ استفہموہ" بعض لوگوں نے غلطی سے اَھْجَرَ سمجھ لیا ہے، حالانکہ تمام معتبر روایات میں اَھَجَرَ آیا ہے۔ یعنی اس میں ہمزہ استفہام کا ہے۔ اور ھجر یھجر کے معنی ہیں وہ باتیں جو مریض غلبہ مرض کی حالت میں گھبراہٹ کی وجہ سے اضطراب کے عالم میں کرتا ہے۔ نیز یہ قول کسی روایت میں بھی حضرت عمرؓ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا ہے بلکہ "قالوا" کے ساتھ منقول ہوا ہے، یعنی جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے بعض نے یہ کہا۔

میں پڑ گیا کہ حضورؐ واقعی کچھ لکھوانا ہی چاہتے ہیں یا شدت مرض کی وجہ سے گھبراہٹ میں کچھ فرما رہے ہیں۔ ان تینوں قسم کے لوگوں میں سے کسی کی بات بھی ایسے موقع پر نہ تو خلاف توقع ہی تھی اور نہ اسے نامناسب ہی کہا جا سکتا ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ حضورؐ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے آیا اس کی نوعیت عام نصائح کی سی تھی، یا کسی ایسے اہم حکم کی جسے ثبت کرا دینا امت کی ہدایت کے لئے ضروری تھا۔ تو اس کا فیصلہ بعد کے واقعات نے خود ہی کر دیا۔ حضورؐ اس واقعہ کے بعد بھی چار دن تک زندہ رہے ان دنوں میں مرض کی شدت کا حال بھی یکساں نہیں رہا۔ اور اس زمانے میں وہی سب لوگ آپ کے پاس بیٹھے بھی نہیں رہے جو جمعرات کے دن اس وقت خاص طور پر موجود تھے، بلکہ اس مدت میں آپ کو مسجد نبوی میں تشریف لے جانے اور جماعت صحابہ سے خطاب کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اگر واقعی کوئی اہم حکم ایسا ہوتا جسے ضبط تحریر میں لانا ضروری تھا تو حضورؐ ان دنوں میں کسی وقت بھی اپنے کاتبوں میں سے، یا خود اہل بیت میں سے کسی کو بلا کر اسے لکھوا سکتے تھے۔ یا زبانی ارشاد فرما سکتے تھے۔ اس سے حضرت عمرؓ کے موقف کی صحت بالکل واضح ہو جاتی ہے انھوں نے ٹھیک سمجھا تھا کہ شدت مرض میں امت کی فلاح کے لئے حضورؐ فکرمند ہو رہے ہیں اور کچھ نصائح لکھوانا چاہتے ہیں۔ کسی بنیادی مسئلے کا فیصلہ لکھوانا اس حالت میں پیش نظر نہیں ہے۔ اس لئے اس تکلیف اور کرب کے عالم میں حضورؐ کو یہ زحمت دینا ٹھیک نہیں ہمیں قلم دوات لانے کے بجائے حضورؐ کو یہ اطمینان دلانا چاہئیے کہ آپ ہمارے لئے پریشان نہ ہوں۔ آپ اپنی امت کو وہ کتاب ہدایت دے کر جا رہے ہیں جو انشاءاللہ اسے کبھی گمراہ نہ ہونے دے گی۔

ابوجہل کی بیٹی سے حضرت علیؓ کے پیغام نکاح کا معاملہ

اس واقعہ کو امام زین العابدین بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ اور ابن ابی ملکیہ نے حضرت مِسوَر بن مَخرمہ سے روایت کیا ہے، اور اس کی تائید حضرت عبداللہ بن زبیر کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔ نیز ابوحنظلہ اور سُوَید بن غَفلہ کی مُرسَل روایات بھی اس کی مؤید ہیں۔ امام بخاریؒ نے کتاب فرض الخمس، کتاب فضائل اصحاب النبی اور کتاب النکاح میں۔ مسلم نے کتاب فضائل الصحابہ میں۔ ابو داؤد نے کتاب النکاح میں۔ ابن ماجہ نے بھی کتاب النکاح میں۔ ترمذی نے کتاب المناقب میں اور حاکم نے کتاب معرفۃ الصحابہ میں متعدد سندوں سے ان روایات کو نقل کیا ہے۔

تفصیل اس قصے کی یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب ابوجہل کا خاندان مسلمان ہو گیا۔ تو حضرت علی رضؓ نے اس کی بیٹی سے (جس کا نام کسی نے جُوَیریہ، کسی نے عوراء اور کسی نے جمیلہ بیان کیا ہے) نکاح کرنا چاہا۔ لڑکی کے خاندان والوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی پر بیٹی نہ دیں گے جب تک آپ سے پوچھ نہ لیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا ذکر حضورؐ سے کیا۔ ایک روایت کی رو سے خود حضرت علی نے بھی اشارۃً کنایۃً حضورؐ سے اجازت طلب کی۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی ان باتوں کا چرچا سن لیا اور جا کر اپنے والد ماجد کی خدمت میں عرض کیا کہ "یہ آپ کی قوم کے لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ کو اپنی بیٹیوں کی پروا نہیں ہے، دیکھئے۔ یہ علی رضؓ اب ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنے والے ہیں" اس پر حضورؐ نے ایک خطبہ میں فرمایا:۔

ان بنی ھشام بن المغیرۃ استاذنونی ان ینکحوا ابنتھم علی بن ابی طالب فلا آذن ثم لا آذن ثم لا آذن الا ان یرید ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی وینکح ابنتھم فانما ھی بضعۃ منی یریبنی ما ارابھا ویوذینی ما آذاھا

بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اس بات کی اجازت مانگی ہے کہ وہ اپنی بیٹی علیؓ بن ابی طالب کے نکاح میں دیں۔ میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ نہیں دیتا۔ نہیں دیتا۔ الّا یہ کہ ابو طالب کا بیٹا میری لڑکی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح کرے۔ میری لڑکی میرا ٹکڑا ہے۔ جو کچھ اسے ناگوار ہوگا وہ مجھے ناگوار ہوگا۔ اور جو چیز

اسے تکلیف دے گی وہ مجھے تکلیف دے گی۔

وانی لست احرم حلالاً ولا احل حراما ولکن واللہ لا تجتمع بنت رسول اللہ وبنت عدو اللہ ابداً

میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا۔ مگر خدا کی قسم اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

(وفی روایۃ) منی وانا اتخوف ان تفتن فی دینھا

(ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا) فاطمہ مجھ سے ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں اپنے دین کے معاملہ میں فتنے میں نہ پڑ جائے۔

اس واقعہ پر آدمی کو یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہت سی شادیاں کیں اور عام لوگوں کو بھی چار تک بیویاں بیک وقت رکھنے کی اجازت دی۔ مگر خود اپنی بیٹی پر ایک سوکن کا آنا بھی آپ نے گوارا نہ کیا۔ سوکن کے آنے سے جو اذیت آپ کی بیٹی کو۔ اور بیٹی کی خاطر خود آپ کو ہو سکتی تھی۔ وہی اذیت دوسری عورتوں اور انکے ماں باپ کو بھی تو لاحق ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اپنے حق میں تو اسے برداشت نہ کیا اور دوسروں کے حق میں اسے جائز رکھا۔

بظاہر یہ ایک سخت اعتراض ہے اور معاملے کی سادہ صورت دیکھ کر آدمی بڑی الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ایک عورت کا شوہر اگر دوسری بیوی لے آئے تو اس عورت کو فطرۃً یہ ناگوار ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی اس سے اذیت ہوتی ہے۔ شریعت نے ایک سے زیادہ نکاحوں کی اجازت اس مفروضے پر نہیں دی ہے کہ یہ چیز اس عورت کو اور اس کے رشتہ داروں کو ناگوار نہیں ہوتی جس پر سوکن آئے۔ بلکہ اس امر واقعہ کو جانتے ہوئے شریعت نے اسے اس لئے حلال کیا ہے کہ دوسری اہم تر اجتماعی اور معاشرتی مصلحتیں اس کو جائز کرنے کی متقاضی ہیں۔ شریعت یہ بھی جانتی ہے کہ سوکنیں بہر حال سہیلیاں اور شوہر شریک بہنیں بن کر نہیں رہ سکتیں۔ ان کے درمیان کچھ نہ کچھ کش مکش اور چپقلش ضرور ہوگی اور خانگی زندگی تلخیوں سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ لیکن یہ انفرادی قباحتیں اس عظیم تر اجتماعی قباحت سے کم تر ہیں جو یک زوجی کو بطور قانون لازم کر دینے سے پورے معاشرے میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شریعت نے تعدد ازدواج کو حلال قرار دیا ہے اب دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں کیا پیچیدگی واقع ہوتی ہے۔ شرعاً آپ کی بیٹی پر بھی سوکن لانا آپ کے داماد کے لئے حلال تھا۔ اسی وجہ سے حضرت علیؓ نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اسی وجہ سے حضورؐ نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ ان کے لئے یہ فعل حرام ہے۔ بلکہ آپ نے خود تصریح فرمائی کہ میں حلال کو حرام نہیں کرتا۔ لیکن یہاں حضورؐ کی ایک ہی شخصیت میں دو مختلف حیثیتیں جمع تھیں۔ ایک حیثیت میں آپ انسان تھے۔ اور فطرۃً یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کی صاحبزادی کے گھر میں سوکن آنے سے جو تلخی پیدا ہو اس کا تھوڑا یا بہت اثر آپ کی طبیعت پر نہ پڑے۔ دوسری حیثیت میں آپ اللہ کے رسول تھے اور رسولؐ کی حیثیت سے آپ کا مقام یہ تھا کہ آپ کے ساتھ اگر کسی شخص کے تعلقات خراب ہو جائیں یا کوئی شخص آپ کے لئے اذیت کا موجب بن جائے۔ تو اس کے دین و ایمان کی بھی خیر نہ تھی۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے حضرت علی رضؓ کو بھی اور بنی ہشام بن مغیرہ کو بھی اسی کام سے روک دیا۔ کیونکہ اگرچہ شرعاً یہ حلال تھا۔ مگر اس کے کرنے سے یہ اندیشہ تھا کہ یہ چیز حضرت علی رضؓ اور انکی دوسری بیوی اور اس کے خاندان والوں کے ایمان اور انکی عاقبت کو خطرے میں ڈال دے گی۔

ایک اور بات جس کا حضورؐ نے اپنے خطبے میں ذکر فرمایا وہ یہ تھی کہ بنی ہشام بن مغیرہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن رہ چکے تھے۔ اور فتح مکہ کے بعد تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے۔ خود اس لڑکی کے باپ ابوجہل کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ حضورؐ کی دشمنی میں وہ تمام کفار سے بازی لے گیا تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ جنگ بدر میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کا خاندان برسوں اس کے جذبۂ انتقام میں تڑپتا رہا۔ اب اگرچہ یہ لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن یہ تحقیق ہونا ابھی باقی تھا کہ یہ قبول اسلام واقعی

پورے اخلاص اور قلوب کی مکمل تبدیلی کا ثمرہ ہے، یا محض شکست کا نتیجہ۔ اس حالت میں اس خاندان کی لڑکی، اور وہ بھی خاص ابوجہل کی بیٹی کا اس گھر میں سوکن بن کر پہنچ جانا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ملکۂ بیت تھیں، بڑے فتنوں کا سبب بن سکتا تھا۔ ان لوگوں کی تالیف قلب تو کی جاسکتی تھی اور کی بھی گئی لیکن اسلام کے ساتھ ان کے تعلق کا حال جب تک ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہوجائے انہیں عین خاندان رسالت میں گھسالانا اور خود رسول اکرمؐ کی صاحبزادی کے بالمقابل لاکھڑا کرنا سخت نامناسب اور پرخطر تھا۔ اس وجہ سے بھی حضورؐ نے اس رشتے کو ناپسند فرمایا اور علی الاعلان کہا کہ خدا کے رسولؐ کی بیٹی اور خدا کے دشمن کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ نیز اس بات کی طرف بھی آپ نے اشارہ فرمادیا کہ اس سے فاطمہ کے فتنے میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کو اپنے بیاہ شادی کے معاملے میں (اگرچہ وہ بجائے خود حلال ہی سہی) ایسی آزادی نہیں دی جاسکتی جس سے ایک پوری ملت کے لئے فتنہ وشر کا خطرہ پیدا ہوجائے۔

دوسرا مکتوب :-

مولانا مودودی صاحب کے ان جوابات کے بعد سائل نے ان کو ایک اور خط لکھا، جس میں اپنے اس شبہ کا اظہار کیا کہ ابوجہل کی بیٹی کے خانوادۂ اہل بیت میں آجانے سے جس خطرے کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے ———— تو کیا حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے خود حرم نبوی اور اہل بیت میں آجانے سے اس "خطرہ" کا امکان نہ تھا ———— دوسرا سوال سائل نے یہ کیا کہ صحابۂ کرام پر معترضین بہت کچھ طنز کرتے ہیں کہ وہ تو خلافت کے دھندے میں مصروف رہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور تدفین حضورؐ کے اہل بیت نے انجام دی؟ اس کے جواب میں موصوف نے لکھا:-

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ابھی ابھی آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کے حسن طلب کی تو داد دیتا ہوں۔ مگر اب میں اتنا علیم الفرصت ہوں کہ کوشش کرکے بھی مزید کچھ لکھنے کے لئے وقت نکالنا مشکل ہے۔ مختصراً اس خط میں آپ کے دونوں سوالات کا جواب لکھے دیتا ہوں اگر آپ اسے کافی سمجھیں تو میرے اس "جواب نامے" کے ساتھ شامل کردیں۔

بے شک یہ اعتراض اٹھ سکتا ہے کہ ابوجہل کے خاندان سے ابوسفیان کا خاندان اسلام کی عداوت میں کچھ کم نہ تھا پھر اگر ابوجہل کے خاندان کی لڑکی کا خانوادۂ رسالت میں گھس آنا موجب فتنہ ہوسکتا تھا تو ابوسفیان کی صاحبزادی (حضرت ام حبیبہؓ) کا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں شامل ہوجانا کیوں خطرے سے خالی تھا؟ لیکن دونوں کے حالات کا فرق نگاہ میں ہو تو یہ اعتراض آپ سے آپ ختم ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوجہل کی لڑکی اور ام المومنین حضرت ام حبیبہ کا سرے سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ ابوجہل کی لڑکی اور اس کے چچا اور بھائی۔ سب کے سب فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ ان کے بارے میں یہ امتحان ہونا ابھی باقی تھا کہ ان کا ایمان کس حد تک اخلاص پر مبنی ہے اور کہاں تک اس میں شکست خوردگی کا اثر ہے۔ بخلاف اس کے حضرت ام حبیبہ اس بڑے سے بڑے امتحان سے گزر کر، جو اکابر صحابہ میں سے بھی کم ہی کسی کو پیش آیا تھا۔ اپنے کمالِ اخلاص اور اپنی صداقت ایمانی کا ثبوت دے چکی تھیں۔ انھوں نے دین کی خاطر وہ قربانیاں کی تھیں جن کی نظیر مشکل ہی سے کہیں اور نظر آسکتی ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ ابوسفیان کی بیٹی، ہندہ بنت عتبہ (مشہور ہندہ جگر خوار) کی لخت جگر، جن کی پھوپھی وہ عورت تھی جسے قرآن میں حمالۃ الحطب کا خطاب دیا گیا ہے جس کا نانا عتبہ بن ربیعہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بدترین دشمن تھا، اس خاندان سے اور اس ماحول سے نکل کر وہ حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہ سے بھی پہلے ایمان لاتی ہیں۔ اپنے شوہر کو مسلمان کرتی ہیں۔ حبش جاکر شوہر عیسائی ہو جاتا ہے اور وہ دین کی خاطر اس کو بھی چھوڑ دیتی ہیں۔ غریب الوطنی کی حالت میں تن تنہا ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ رہ جاتی ہیں، اور ان کے عزم ایمانی میں ذرہ برابر تزلزل نہیں آتا۔ کئی برس اسی حالت میں جب گزر جاتے ہیں اور ایک بے سہارا خاتون دیارِ غیر میں ہر طرح کے مصائب جھیل کر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ دین کو جس پائے کا خلوص، جس مرتبے کی سیرت اور جس درجے کا کردار مطلوب ہے وہ سب یہاں موجود ہے۔ تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ انتخاب ان پر پڑتی ہے اور آپ حبش ہی میں ان کو نکاح کا پیغام بھیجتے ہیں۔ غزوۂ خیبر کے بعد وہ حبش سے واپس آ کر حرم نبوی میں داخل ہوتی ہیں۔ اس کے تھوڑے ہی مدت بعد قریش صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اب مکہ پر چڑھائی کر دیں گے۔ اس موقع پر ابو سفیان صلح کی بات چیت کے لئے مدینے آتا ہے اور اس امید پر بیٹی کے یہاں پہنچتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے صلح کی شرائط طے کرنے میں سہولت ہوگی۔ برسوں کی جدائی کے بعد پہلی مرتبہ باپ سے بیٹی کو ملنے کا موقع ملتا ہے۔ مگر جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرش پر بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو بیٹی فوراً یہ کہکر فرش اٹھا لیتی ہے کہ رسولؐ کے فرش پر ایک دشمن اسلام نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسی خاتون کا خانوادۂ رسالت میں داخل ہونا تو ہیرے کا ہار میں ٹھیک اپنی جگہ پالینا تھا۔ اس سے کسی فتنے کے رونما ہونے کا کوئی بعید ترین امکان کیا، وہم بھی نہ ہو سکتا تھا۔ البتہ اس لڑکی کا اس خاندان میں آنا ضرور فتنے کے امکانات اپنے اندر رکھتا تھا جسے اور جس کے خاندان کو صرف فتح نے اسلام میں داخل کیا تھا اور اسلام میں آئے ہوئے جس کو ابھی صرف چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ اسی کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے اثرات سے اس کا اور اس کے خاندان والوں کا دل پوری طرح پاک ہوا ہے یا نہیں۔

رہا یہ قصہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ بے گور و کفن پڑا تھا اور صحابہ کرام حضورؐ کی تجہیز و تکفین کی فکر چھوڑ کر خلافت کی فکر میں پڑ گئے۔ تو درحقیقت یہ بالکل ایک بے سروپا داستان ہے جو طعن و تشنیع اور عیب جوئی کے مواقع ڈھونڈنے والوں نے عوام کو فریب دینے کے لئے آراستہ کی ہے۔ اصل واقعات یہ ہیں کہ حضورؐ کی وفات پیر کے روز شام کے قریب ہوئی بخاری و مسلم میں حضورؐ کے خادم خاص انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے "آخر یوم" کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ــــ یہ سانحۂ عظیم عصر و مغرب کے درمیان پیش آیا تھا۔ فطری بات یہ ہے کہ اس سے پوری جماعت اہل ایمان کے ہوش پراگندہ ہو جانے چاہیئے تھے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو یہی یقین نہ آتا تھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے آکر جب تقریر کی تو لوگوں کو پوری طرح یہ یقین ہوا کہ وہ ناگزیر بات جو پیش آنی تھی پیش آچکی ہے۔ اتنے میں رات آگئی۔ یہ ممکن اور مناسب نہ تھا کہ راتوں رات تجہیز و تکفین کر کے حضورؐ کو دفن کر دیا جاتا، کیونکہ جنازے میں شرکت کی سعادت سے محروم رہ جانا ان ہزاروں مسلمانوں کو ناگوار ہوتا جو مدینہ طیبہ اور اس کی نواحی بستیوں میں رہتے تھے۔ لازماً ان کو شکایت ہوتی کہ آپ لوگوں نے ہمیں آخری دیدار اور نماز جنازہ کا موقع بھی نہ دیا۔ اس لئے رات بہرحال گزارنی تھی۔ اس رات صحابہ کے مختلف گروہ اپنی اپنی جگہ جمع ہو کر سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ ازواج مطہرات حضرت عائشہؓ کے ہاں گریہ و زاری میں مشغول تھیں۔ حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور دوسرے قرابت داران رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے گھر میں جمع تھے۔ مہاجرین کی ایک اچھی

خاصی تعداد حضرت ابوبکرؓ کے پاس غمگین و متفکر بیٹھی تھی۔ انصار کے مختلف گروہ اپنے اپنے قبیلوں کی چوپالوں (سقیفہ کے اصل معنی چوپال ہی کے ہیں) میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے آکر خبر دی کہ بنی ساعدہ کی چوپال میں انصار کا ایک بڑا گروہ جمع ہے اور وہاں خلافت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا مسئلہ چھڑ گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہ بن الجراحؓ، جو حضورؐ کے بعد مسلمانوں کی جماعت میں "بڑے" (Seniors) سمجھے اور مانے جاتے تھے، یہ خبر سن کر فکرمند ہوئے کہ ابھی سردار ملت کی آنکھ بند ہوئی ہے، ساری امت اس وقت بے سر ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فتنہ کھڑا ہو جائے اور جماعت کا نظم از سرِ نو قائم ہونے سے پہلے ہی بدنظمی اپنے قدم جمالے۔ اس لئے یہ تینوں حضرات فوراً برسر موقع پہنچ گئے اور راتوں رات انھوں نے حضورؐ کی جانشینی کے مسئلے کو، جو ایک فتنہ خیز صورت میں طے ہوا چاہتا تھا، اس صحیح شکل میں سلجھا لیا جس کے صحیح ہونے پر تاریخ اپنی مہر تصدیق ثبت کر چکی ہے۔ یہ سارا واقعہ پیر اور منگل کی درمیانی شب کا ہے۔ صبح سویرے مسجد نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان ہوا۔ مہاجرین و انصار سب نے اسے قبول کر کے جماعت کا نظام بحال کر دیا۔ اور اس کے بعد بلا تاخیر حضورؐ کی تجہیز و تکفین کا کام شروع ہو گیا۔ بالکل جھوٹ کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ صحابہ اپنی خلافت کی فکر میں لگے رہے اور حضورؐ کی تجہیز و تکفین بس آپ کے اہل بیت نے کی۔ یہ تجہیز و تکفین کسی نے بھی پیر اور منگل کی درمیانی شب میں نہ کی تھی۔ اس کا آغاز منگل کی صبح کو اس وقت ہوا ہے جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو چکی تھی۔ اور یہ کام حضرت عائشہ رضؓ کے حجرے میں ہوا ہے جس کا ایک دروازہ اسی مسجد نبوی میں کھلتا تھا۔ جہاں مدینہ طیبہ کے تمام صحابہ جمع تھے، گرد و نواح کے لوگ، وفات کی خبر سن سن کر چلے آ رہے تھے، اور جہاں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی تھی۔ جن لوگوں کو کبھی مسجد نبوی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے اور جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حجرۂ عائشہ (جس میں سرکار مدفون ہیں) اور مسجد نبوی کا کیا تعلق ہے وہ یہ بات سن کر ہنس دیں گے کہ صحابہ مسجد نبوی میں اپنی خلافت کی فکر میں لگے ہوئے تھے اور بیچارے اہل بیت حجرۂ عائشہ میں حضورؐ کی تجہیز و تکفین کر رہے تھے۔ بہتان گھڑنے کے لئے کم از کم کچھ سلیقہ تو چاہیئے۔

یہ بات کہ حضورؐ کو غسل و کفن صرف آپ کے اہل بیت نے دیا۔ یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے۔ اس خدمت کو انجام دینے والے حضرات علی، حضرت عباسؓ، فضل بن عباس، قثم بن عباس، اسامہ بن زید اور شقران (حضورؐ کے آزاد کردہ غلام) تھے۔ اور انھوں نے اس خیال سے حجرے کا دروازہ بند کر رکھا تھا کہ لوگوں کا ہجوم باہر زیارت کے لئے بے چین کھڑا تھا۔ اگر دروازہ کھلا رہنے دیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ زیادہ لوگ اندر آجائیں گے اور کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر بھی انصار نے جب شور مچایا کہ ہمیں بھی تو اس سعادت میں حصہ ملنا چاہیئے تو ان میں سے ایک صاحب (اَوس بن خَولِی) کو اندر بلا لیا گیا۔ کفن پہنانے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ حضورؐ کے لئے قبر کہاں تیار کی جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حدیث پیش کی کہ ما قبض نبیٌّ الا دُفن حیث یقبض (نبی کا انتقال جہاں ہوتا ہے وہیں اس کو دفن کیا جاتا ہے) اور اسی پر فیصلہ ہوا کہ حجرۂ عائشہ ہی میں آپ کے لئے قبر تیار کی جائے۔ حضرت ابوطلحہ زید بن سہل انصاری نے قبر کھودی۔ پھر لوگوں نے گروہ گروہ اندر جاکر نماز جنازہ پڑھنی شروع کی اور رات تک مسلسل یہ سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو نصف شب کے قریب دفن کی نوبت آئی۔ معلوم نہیں کہ اس پوری مدت میں آخر وہ کونسا وقت تھا جب صرف حضورؐ کے اہل بیت یا رہ مددگار آپ کے جسد اطہر کو لئے بیٹھے رہے اور صحابہ کرام اپنی خلافت کی فکر میں مشغول رہے!

(خاکسار — ابوالاعلیٰ)

عامر عثمانی

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کیسی ہولناک صبح تھی جو اپنے دامن میں رنج و بلا کی سیاہیاں سمیٹے افقِ مدینہ پر طلوع ہوئی۔ دنیا کا بے مثال حکمراں بے نظیر قائد و امیر اور فرید و وحید مدبر عمر ابن الخطابؓ نمازِ فجر کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔ یکایک ایک دو دھارا خنجر گردش میں آتا ہے' پے درپے چھ وار ہوتے ہیں اور لہو کی دھاریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ یہ اُس یکتائے روزگار خلیفہ کا لہو ہے جس کے پلٹے تدبر کی دھمک سے شاہی ایوانوں میں لرزہ تھا جس کی سطوت سے بڑے بڑے کج کلاہوں کے دل دہلے ہوئے تھے۔ اور جس نے دیوزادوں کی کلائیاں اُتار دی تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ ایک بے حقیقت نصرانی غلام کے ہاتھوں یہ اتنی سہولت سے ابدی نیند سو جائے گا اور اُس عظیم انقلاب کا دروازہ کھل جائے گا جس کی راہ سے فتنے اور ہنگامے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح در آئیں گے۔

خلیفۂ ثانی کی شہادت سے دیکھنے اور سُننے والوں پر جو کچھ گذری اس کا بیان مشکل ہے۔ آنکھیں برس پڑیں۔ سماعتیں تھرا گئیں' ایسے میں اگر زخمی باپ کا جواں سال بیٹا عُبیداللہ ابن عمرؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ ذرا سوچئے عمر ابن الخطابؓ کون تھے' کیا تھے' ایک فقید المثال رہنما' ایسے بیدار مغز' روشن ضمیر اور زندہ دل قائد و سالار جن کی نظیر ان کے بعد چشمِ فلک کو دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ ان کی شہادت جذبات کی زبان میں قوم کے ولولوں' اُمنگوں اور حوصلوں کی موت تھی' تدبر' فراست' بصیرت اور دور بینی کی موت تھی' انھیں اگر ایک بے سواد غلام ناحق شہید کردے تو ان کے جواں سال بیٹے پر جو کچھ بھی گذر جائے کم ہے۔

کچھ روایتیں بتاتی ہیں کہ عُبیداللہ نے صرف ہرمزان (مسلمان) کو قتل کیا اور جُفَینہ کو قتل کرنے کے لئے بڑھ رہے تھے کہ سعد بن وقاصؓ نے گرفتار کرلیا۔ کچھ روایتیں کہتی ہیں کہ انھوں نے جُفینہ کو بھی قتل کردیا اور کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو کے علاوہ قاتل فیروز کی بیٹی بھی ان کی تلوار کا شکار ہوئی۔ گویا باپ کے بدلے جوشِ غضب میں انھوں نے تین جانیں لیں۔ زیادہ مضبوط یہی روایت معلوم ہوتی ہے۔

کچھ بھی رہا ہو بہرحال عبیداللہ ابن عمر کا یہی حد سے متجاوز جوشِ غضب حضرت عثمانؓ کے حق میں پہلی سخت ترین آزمائش بنا تھا اور اسی لئے ان کے تذکرے میں اس کا ذکر ناگزیر ہے۔

حضرت عمر زخموں سے جاں بلب تھے اور حکیم کی پلائی ہوئی نبیذ اور دودھ زخموں کی راہ سے بہہ نکلا تھا۔ تب لوگ انکی زندگی سے مایوس ہوگئے اور بعض نے عرض کیا کہ اپنی جگہ کسی کو خلیفہ تجویز کردیجئے۔ حضرت عمر نے جواب دیا:—

"میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کردوں تو بے شک اسمیں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا تھا' لیکن نامزد نہ کروں تب بھی کوئی حرج نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا۔"

اس کے بعد کچھ توقف فرمایا۔ پھر کہا:—

"اگر ابوعُبیدہ بن الجراحؓ زندہ ہوتے تو انھیں نامزد کردیتا۔ یا سالم مولائے ابی حُذیفہؓ حیات ہوتے تو انھیں نامزد کردیتا۔"

یہاں ابن عساکر نے خالد بن ولیدؓ کا بھی نام لیا ہے۔ یعنی حضرت عمرؓ نے کہا:—

"اگر خالد بن ولیدؓ زندہ ہوتے تو انھیں نامزد کردیتا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سُنا ہے کہ خالد اللہ کی تلوار (سیف اللہ) ہیں۔"

لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ یہ البتہ یقیناً درست ہے کہ حضرت عمرؓ سے کہا گیا:—

"اپنے بیٹے عبداللہ کو خلیفہ بنا دیجئے" وہ اپنے علم و فضل، حق گوئی اور قدامتِ اسلام کے باعث قطعی طور پر موزوں ہیں"

حضرت عمر نے جواب دیا:-

"بس کرو! خانوادۂ خطاب کا ایک ہی شخص امت کی ذمہ داریوں کا حساب چکانے کے لئے کافی ہے۔ اگر قیامت کے دن عمرؓ اس محاسبے میں برابر سرابر بھی چھوٹ جائے تو بڑا غنیمت ہے۔"

صحابہ کو سکوت اختیار کرنا پڑا۔ پھر دوسرے وقت یہی سوال اٹھا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

"دوستو! جو بوجھ میں جیتے جی اٹھا رہا ہوں اس کی ذمہ داری اب مرنے کے بعد قبول نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے چھ شخصوں کے نام میں تمہیں بتائے دیتا ہوں جنکے جنتی ہونے کی خوشخبری رسول اللہ ﷺ نے دی ہے — علی(۱) عثمان(۲)۔ عبدالرحمٰن(۳) بن عوف۔ طلحہ(۴) بن عبیداللہ۔ سعد(۵) ابن ابی وقاص۔ زبیر(۶) بن عوام۔ انھیں اختیار ہے کہ اپنے میں سے ایک امیر چن لیں۔"

پھر آپ نے مقداد بن اسودؓ کے ذریعہ یہ بھی طے کر دیا کہ یہ انتخاب تین دن کے اندر اندر ہو جانا چاہئے۔ طلحہ بن عبیداللہ ان دنوں مدینے سے باہر گئے ہوئے تھے۔ آپ نے کہا کہ اگر وہ ان تین دنوں میں نہ لوٹیں تو ان کے بغیر ہی انتخاب ہو جانا چاہئے اتفاق سے وہ اس مدت میں نہ لوٹ سکے اور انتخاب انکے بغیر ہی ہوا

صورت یہ ہوئی کہ پانچ آدمیوں کی یہ کمیٹی کافی بحث و تمحیص کے بعد بھی جب کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم میں سے ایک شخص اپنے حق سے دست برداری دیدے اور اسی کو خلیفہ چننے کا اختیار ہو۔ چاروں حضرات نے یہ بات مان لی اور اب عبدالرحمٰنؓ نے مدینے کے عوام و خواص کے احساسات معلوم کرنے میں دوڑ دھوپ شروع کی۔ اس وقت کے محدود وسائل اور قلیل مدت میں جتنی بھی کوشش ممکن تھی وہ کر گذرے۔ پتہ چلا کہ بنو ہاشم کو چھوڑ کر مدینے کی اکثریت حضرت عثمان کے حق میں ہے، لہذا متعینہ مدت کے بالکل آخری حصے میں انھوں نے مسجد کے اندر بہت بڑے مجمع کی موجودگی میں حضرت عثمانؓ کو خلیفہ چنا اور سب نے حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر سب سے اہم اور نتائج کے اعتبار سے دور رس وہ عہد ہے جو عبدالرحمٰنؓ نے حضرت عثمان سے لیا۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے پہلے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑا اور کہا:-

"کیا آپ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اور سیرتِ شیخین (ابوبکر و عمرؓ) پر میری بیعت لیتے ہیں؟"

حضرت علیؓ نے جو کچھ جواب دیا اسے اردو ترجمے کی شکل دینا بہت مشکل ہے۔ الفاظ یہ ہیں:-

اللھم لا۔ ولکن اجتھد فی ذالک رائی ما استطعت

ان کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہیں میں علی الاطلاق پیروی کا وعدہ نہیں کر سکتا، بلکہ نئے حالات میں اپنی رائے سے اجتہاد بھی کروں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہیں میں غیر مشروط عہد نہیں کر سکتا، بلکہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جس حد تک میرے بس میں ہوا سیرتِ شیخین کی پیروی کروں گا۔ دونوں مفہوموں میں ایک لطیف فرق ہے۔ دونوں ہی اپنی جگہ اس تقویٰ راست گوئی اور دیانت کے عین مطابق ہیں جو حضرت علیؓ کے شایانِ شان تھی۔ ان میں سے کوئی مفہوم حیلۂ و گریز پر مبنی نہیں، بلکہ احساسِ ذمہ داری اور احتیاط سے معمور ہے۔ وہ جانتے تھے کہ انسان صرف اپنی استطاعت کی حد تک مکلّف ہے اور بعض حالتوں میں قطعاً بے بس ہو جاتا ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کسی نئے معاملے میں یہ متعین کرنا کہ سیرتِ شیخین کیا ہے اتنا آسان نہیں ہے جتنا بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ بعض خاص حالات میں سیرتِ شیخین کی پیروی سے قدرے انحراف یا تھوڑا سا تغیر دین ہی کے مفاد میں اولیٰ اور انسب بھی ہو سکتا ہے، جس کی مثال حضرت معاویہؓ کے منفرد طرزِ حکومت کی شکل میں سامنے تھی۔ انھی نزاکتوں کی بنا پر انھوں نے ایسا جواب دیا جو گنجائش اور وسعت رکھتا تھا۔ لیکن عبدالرحمٰنؓ کو اس پر اطمینان نہ ہوا اور انھوں نے حضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے الفاظ دہرائے۔ حضرت عثمانؓ نے صاف صاف "ہاں" کہی تو آپ ہی کو خلیفہ چن لیا گیا۔

ہمیں گمان ہوتا ہے کہ یہ روایت درست نہیں ہے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ عبدالرحمٰن یہ جان لینے کے بعد بھی کہ زیادہ لوگ عثمانؓ کے طرفدار ہیں علیؓ کو خلیفہ چن لینے کا فیصلہ کر چکے تھے اور یہ فیصلہ محض

اتفاقاً جامۂ عمل نہ پہن سکا۔ پھر اگر وہ کسی خاص خیال کی بنیاد پر حضرت علیؓ کو مقدم رکھنے کا فیصلہ کر ہی چکے ہوتے تو اس خیال کی تبدیلی اتنی آسان نہیں ہونی چاہئے تھی جتنی روایت سے ظاہر ہو رہی ہے بلکہ حضرت علیؓ کے الفاظ کو بلا ادنیٰ تکلف اچھے محمل پر لیا جا سکتا تھا اور اس کے نتیجے میں بجائے عثمانؓ کے ان کی بیعت کی جا سکتی تھی۔

زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتداءً ہی حضرت عثمان کا ہاتھ پکڑا اور انھی سے مذکورہ عہد لیا۔ حقیقت کچھ بھی ہو، بہر نوع یہی عہد تھا جو لوگوں کے حافظوں میں ثبت ہو کر رہ گیا اور یہی آئے دن ہر اس موقعہ پر اُبھرتا رہا جب لوگ حضرت عثمانؓ کے حاکمانہ اقدامات اور پالیسیوں پر رائے زنی کرتے۔ شیخین کی سیرت ان کے آگے کھلی کتاب کی طرح تھی خصوصاً سیرتِ فاروقؓ تو ابھی منہ سے بول رہی تھی۔ نہ صرف قربِ زمانی کی وجہ سے بلکہ اپنی خصوصیت و انفرادیت کے باعث بھی یہ رعایا کے دل و دماغ پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑ گئی تھی۔ لوگوں کے لئے یہ موازنہ کرنے میں کوئی بھی دشواری نہیں تھی کہ حضرت عثمانؓ کا فلاں فعل و عمل سیرتِ شیخین کے مطابق ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہی وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہے اور نقد و جرح کی رَو میں بارہا ان ہی کمزوریوں کی اُس دلدل میں اُتر گئے جہاں خود پر قابو پانا ممکن نہیں ہوتا اور جہاں قدم جمانے کی کوشش میں دوسرا قدم خود بخود اُٹھ جاتا ہے۔ یہیں یقیناً مان لینا چاہئے کہ سیرتِ شیخین کے معنوی خطوط معین کرنے میں حضرت عثمانؓ کا زاویۂ نظر اکثر صحابہؓ کے زاویۂ نظر سے بمراتب مختلف تھا جس کے نتیجے میں اکثر وہ اقدامات جو انھوں نے اپنی دانست میں سیرتِ شیخین کے مطابق ہی کئے تھے اکثر لوگوں کے نزدیک سیرتِ شیخین سے کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے، ایسا ماننا اسلئے ضروری ہے کہ حضرت عثمان کے مقابلے میں صرف عوام کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ بعض جلیل القدر صحابۂ کرامؓ کا معاملہ ہے۔ یہ کوئی معقولیت نہ ہوگی کہ حضرتِ عثمانؓ کے زاویۂ نظر کی تائید و حمایت کے جوش میں صحابہؓ کے ایک بہترین گروہ کی واضح تخفیف کر دی جائے۔ ہاں یہ ضرور کہنا چاہئے کہ بہت سے لوگوں نے حالات کے زیر و دار دباؤ میں اول تو مزاج و طبیعت کے اُس عظیم فرق کو نظر انداز کر دیا جو شیخین اور حضرت عثمانؓ کے مابین ایک جانی پہچانی مسلم حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ دوسرے انھوں نے ---- اور ان کے بعد آنے والے کتنے ہی ناقدین نے "سیرت" اور "سیاست" کا لطیف فرق ملحوظ نہیں رکھا جس کے نتیجے میں انھیں وہ تمام اُمور سیرتِ شیخین کے خلاف نظر آنے لگے جو فی الحقیقت سیرتِ شیخین کے خلاف نہ تھے، بلکہ سیاسی نوعیت کا فرق رکھتے تھے اور ان کی اصل و اساس میں وہی مقدس جوہر موجود تھا جس نے شیخین کے کارناموں میں چار چاند لگائے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اپنی افتادِ طبع، ترحم مزاجی اور حد درجہ مروّت و رافت سے متأثر بصیرت کے تحت سیاست کی ایک ایسی راہ اختیار کی جو سیاستِ شیخین کی راہ سے مختلف تھی۔ اس راہ نے ریاست کو، رعایا کو اور خود حضرت عثمانؓ کو جہاں کہیں بھی پہنچا دیا ہو، لیکن یہ بہرحال مسلم ہے کہ اس کے اختیار کرنے میں رعایا کی غمخواری، حسن سلوک، راحت رسانی اور ہمدردی کے سوا کوئی ایسا جذبہ کام نہیں کر رہا تھا جس سے دین مجروح ہو جاتا یا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ حضرت عثمانؓ کی عظمتِ صحابیت اور دیانت پر حرف لانے والا ہے۔

پہلا ہی مقدمہ جس نے حضرت عثمانؓ کو سخت آزمائش میں ڈالا کتنا پیچیدہ تھا۔ ایک طرف آئینِ شریعت کے تقاضے تھے دوسری طرف جذبات کے مطالبے۔ آئین کہہ رہا تھا عبید اللہ ابن عمرؓ کو موت کی سزا دی جائے، کیونکہ ان کے والد کتنے ہی جلیل القدر سہی لیکن بہرحال ایک انسان تھے اور ان کا شہید کیا جانا ایسا حشر آفریں عجوبہ نہیں تھا کہ اس کے تحیّر میں عدل و آئین کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے۔ پھر تینوں مقتول بھی انسان ہی تھے۔ ایک مسلمان اور دو ذمی۔ ذمی کی جان کا معاملہ تو اسلامی ریاست میں اور بھی نازک ہے کہ اس کا تحفظ اُٹھ جائے تو اسلام کے حصے میں وہ رسوائی آتی ہے جو قتلِ مسلم سے بھی نہیں آتی۔ آخر عبید اللہ کو کیا حق تھا کہ قانون ہاتھ میں لیں، بلکہ قانون کی بھی حد سے گذر کر تین جانیں تلوار کے گھاٹ اُتار دیں ۔۔ عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ کے بیان سے اگر یہ بات ظاہر ہو بھی رہی تھی کہ ہرمزان اور جفینہ سازش میں شریک تھے تب بھی نہ تو یہ ایک شہادت کافی دانی تھی نہ حکومت کے کرنے کا کام عبید اللہ کو کرنا روا تھا۔ مناسب ہوتا کہ اسی طرح مقدمہ چلتا جس طرح شیخین کے زمانے میں چلایا کرتا تھا۔ یہ کیا کہ عبید اللہؓ اٹھیں اور نہ صرف ہرمزان و جفینہ کو بلکہ قاتل کی

بیٹی کو بھی ذبح کر ڈالیں۔ قرآن پکار رہا تھا کہ وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ۔

دوسری طرف جذبات کا مطالبہ تھا کہ جو کچھ ہو چکا ہو چکا۔ اب یہ تو نہ ہو کہ کل باپ شہید ہوا اور آج بیٹا مارا جائے۔ بہت سی زبانیں پکار رہی تھیں کہ عبیداللہ سے درگزر کیا جائے۔ عوامی جذبات اپنے خاص ترازو میں شہید خلیفہ کا وزن تول کر دعویٰ کر رہے تھے کہ ہزار ہرمزان وجفینہ بھی تنہا عمر ابن الخطابؓ کی قیمت نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے یہ دعویٰ قانون کی آہنی گرفت کو ڈھیلا کرنے کی سکت تو نہ رکھتا تھا، لیکن عموماً دیکھا گیا ہے کہ جذبات کے آگے آئین اور عقل کی منطق دھری ہی رہ جاتی ہے۔ حضرت عثمانؓ امتحان کی زد پر آ گئے فیصلہ آسان نہ تھا۔ اصحاب سے مشورہ کیا۔ بعض کی رائے تھی کہ عبیداللہ کو قتل ہی کیا جائے تو انسب ہے۔ لیکن اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ جاں بخشی کی جائے۔ حضرت عثمان نے غور کیا تو آئین شریعت ہی میں انھیں ایک ایسی گنجائش نظر آ گئی جس نے انھیں تامل اور تذبذب سے نکال کر فیصلے کے مقام پر لا کھڑا کیا۔

مقتولین کا کوئی وارث نہیں تھا، اس لئے شریعت ہی کی رو سے خلیفہ ان کا ولی تھا اور ولی کو شریعت نے اختیار دیا ہے کہ چاہے قصاص لے چاہے خوں بہا پر اکتفا کرے۔ حضرت عثمانؓ نے جب شرعی گنجائش بھی دیکھ لی تو دیت (خوں بہا) کا فیصلہ کر دیا اور عبیداللہ چونکہ مالی حیثیت سے رقم ادا کرنے کے قابل نہ تھے اس لئے اپنی ہی جیب سے رقم بھی ادا کی۔

اکثر ناقدین کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے اس فیصلہ کو بہت پسند کیا گیا۔ ہمیں بھی صاف نظر آ رہا ہے کہ اس فیصلہ میں آئین اور جذبات دونوں کی حکیمانہ رعایت ہو گئی ہے۔ نیز شہادتِ فاروقؓ نے حزن و ملال کی جو فضا پیدا کر دی تھی اسے بھی اس نے خوشگوار بنانے میں مدد دی ہے۔ پھر حضرت عثمانؓ اسے صادر کرنے میں خود رائے بھی نہیں تھے بلکہ متعدد صحابہؓ کی تائید انھیں حاصل تھی اور یہ بھی درست ہے کہ اگلے چھ سات سالوں میں اس فیصلے پر اعتراض و حرف گیری کا کوئی ہنگامہ سننے میں نہیں آیا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ فیصلہ خلافتِ عثمانی کے ابتدائی ایام کو عام دل برداشتگی سے بچا لے گیا لیکن ساتھ ہی یہ گہری حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس فیصلہ کا ایک بہت ہی نازک پہلو بھی تھا جس پر نظر کرنے اور جس سے اثر پذیر ہونے میں عوام کے لئے کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ جس وقت لوگ اس حکیمانہ فیصلے کے پیچھے کام کرنے والی دریا دلی، نرمی، شفقت اور فیاضی کی داد دے رہے تھے اسی وقت ان کے حافظوں پر اس عہد کے نقوش بھی اُبھرے ہوئے تھے جو ابھی کل ہی حضرت عثمانؓ نے سیرتِ شیخین کی پیروی کے بارے میں کیا تھا۔ جذبۂ مخالفت نے نہیں، بلکہ طبیعتوں کے تقاضے نے آپ سے آپ ان کے اندر یہ سوال اُبھارا کہ اگر حضرت عمرؓ کو ایسا ہی مقدمہ درپیش ہوتا تو وہ کیا فیصلہ دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ عدلِ فاروقی سنگِ خارا کی طرح بے لچک رہا ہے اور عوام کے چہروں پر جذبات کی تحریریں پڑھنا اس نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ جذبات کے تقاضے سرگراں موجوں کی طرح عدلِ فاروقی کے کوہِ گراں سے ٹکرا کر ہمیشہ بے نیل مرام ہی لوٹتے تھے اور رخصت و گنجائش کے دریچوں پر پردے ہی پڑے رہتے تھے۔ عمرؓ زندہ ہوتے تو عبیداللہ کا تین جانوں کے عوض (اور ایک ہو تب بھی) قتل کیا جانا اتنا ہی یقینی ہوتا جتنا صبح کے بعد شام کا آنا۔

فکر و خیال کی یہ رو ایسی تھی کہ دلوں میں بدگمانی کا بیج بو گئی۔ حضرت عثمانؓ کی فراخ دلانہ داد و دہش اور رعایا پرورانہ مالی پالیسی نے اگرچہ اس بیج کو جلد پھلنے پھولنے کا موقعہ نہیں دیا، لیکن آخر کار جب فتنوں نے پر تولے اور اضطراب و انتشار کی آندھیاں چلیں تو اسے بھی برگ و بار لانے کا موقعہ ملا اور حریفوں نے بہ بانگِ دہل کہا کہ عثمانؓ تو شروع ہی سے سیرتِ شیخین کے تارک رہے ہیں۔

اہلِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ابتدائی خیال ہمیشہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بعد کی آراء میں اکثر و بیشتر اس کی کچھ نہ کچھ مخفی یا عیاں کارفرمائی ضرور رہتی ہے۔ عبیداللہؓ کی جاں بخشی ظاہر ہے عوام کیلئے خوشی ہی کا باعث رہی ہوگی اور حضرت عمرؓ کے سخت گیرانہ انتظامات و اقدامات کے بعد حضرت عثمانؓ کی فیاضانہ داد و دہش اور سلوک و مروت پر مبنی سیاست نے اس خوشی کو خوب ہی فروغ دیا ہوگا، لیکن یہ خوشی اس نفسیاتی ردِ عمل کو نہیں روک سکتی تھی کہ عوام کے تحت الشعور میں خلیفہ کے متعلق سیرتِ شیخین سے انحراف کا تخیل جاگزیں ہو جائے اور وہ اگلے ہر اقدام کو اسی کے مطابق معنی پہنانے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کریں۔

اس مختصر صحبت میں ہم تفصیلی تنقید کا انداز اختیار نہیں کر سکتے مختصر واقعات کا بیان اور پچھلی یادوں کو تازہ کرنا ہمارا مقصود ہے۔ آئیے واقعات کی طرف بڑھنے سے قبل یہ بھی دیکھ لیں کہ حضرت عثمانؓ مرتبہ و مقام اور سیرت و کردار کے اعتبار سے کیا پایہ رکھتے تھے۔ جب تک انسان کا کردار اور مقام نظر میں نہ ہو اس کے افعال کی منصفانہ توجیہہ ممکن نہیں ہے

تعارف تاریخ پیدائش کے باب میں روایات باہم متعارض ہیں راجح یہ ہے کہ آپ واقعۂ فیل کے چھٹے سال پیدا ہوئے تھے ہو کر تجارت کی تو خوب دولت کمائی۔ نہایت بامروّت سیر چشم کنبہ پرور اور دریا دل تھے۔ ضرورت مندوں کی امداد میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، شراب و زنا جیسے فواحشات سے اس وقت بھی بالکلیہ بچے رہے جب عرب کے جاہلی معاشرے میں یہ چیزیں اوڑھنا بچھونا تھیں۔ زبان شیریں، دل دردمند اور اخلاق وسیع تر تھا۔ انھی صفاتِ حسنہ کے باعث آپ کو قریش میں اس حد تک مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی کہ عورتیں بچوں کو لوریاں دیتے ہوئے کہا کرتیں:۔

"پروردگار کی قسم! میں تجھ سے ایسی ہی محبت کرتی ہوں جیسی قریش عثمانؓ سے۔"

اسلام لانے میں آپ کا شمار سابقون الاولون میں ہے۔ ذوالہجرتین ہیں یعنی حبشہ اور مدینہ دونوں کی ہجرت میں آپ شریک رہے۔ ذوالنورین ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں (رقیہ اور ام کلثوم) سے یکے بعد دیگرے آپ کا نکاح ہوا۔ رسول اللہؐ آپ سے اس قدر خوش تھے کہ دونوں صاحبزادیوں کے انتقال کے بعد فرماتے تھے کہ اگر ہمارے کوئی اور بیٹی ہوتی تو اسے بھی عثمانؓ کے نکاح میں دیتے۔ بالفاظ حافظ ابونعیم "مصلی الی القبلتین" بھی تھے یعنی قبلۂ اولیٰ اور قبلۂ موجودہ دونوں کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے کا موقع آپ کو ملا ہے۔ رسول اللہؐ کی سیادت میں لڑی جانے والی تقریباً تمام ہی جنگوں میں آپ نے دادِ شجاعت دی ہے۔ اور دادِ شجاعت کے علاوہ زبردست مالی امداد کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر قیصرِ روم کے متوقع حملے کی مدافعت کے لئے اسلامی لشکر کو پیش قدمی کا مرحلہ درپیش تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مالی امداد چاہی اس پر حضرت عثمان نے نہایت فراخدلی سے عظیم الشان مدد دی۔ روایتیں مختلف ہیں بعض کے لحاظ سے ایک ہزار اونٹ، پچاس گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کئے۔ بعض کے اعتبار سے چھ سو اونٹ اور پچاس گھوڑے۔ بعض کی رُو سے چار سو اونٹ اور دو ہزار اشرفیاں۔ ترمذی کی روایت یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیشِ عسرت (یعنی غزوۂ تبوک والے لشکر) کی مالی امداد کی ترغیب دے رہے تھے تو حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہؐ میں سَو اونٹ مع ساز و سامان کے دوں گا۔ حضورؐ نے مزید زور دیا تو انھوں نے کہا دو سو اونٹ دوں گا۔ حضورؐ نے پھر زور دیا تو انھوں نے کہا تین سو اونٹ دوں گا۔ راوی عبدالرحمٰن بن خبابؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا:۔

يَنْزِلُ عَنِ الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَقُولُ مَا عَلَى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ۔	منبر سے یہ فرماتے ہوئے اُتر رہے تھے کہ آج کے بعد عثمانؓ جو کچھ بھی کریں وہ ان کے لئے ضرر رساں نہ ہوگا۔

یہ بات آپ نے دو دفعہ فرمائی۔ امام احمدؒ روایت کرتے ہیں:۔

جَاءَ عُثْمَانُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَلْفِ دِينَارٍ فِي كُمِّهٖ حِينَ جَهَّزَ جَيْشَ الْعُسْرَةِ فَنَثَرَهَا فِي حِجْرِهٖ فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَلِّبُهَا فِي حِجْرِهٖ وَيَقُولُ مَا ضَرَّ عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ مَرَّتَيْنِ۔	عثمان اپنی آستین میں ایک ہزار دینار لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اُس وقت آئے جب ان کے پیش نظر جیش عُسرت کا ساز و سامان کرنا تھا۔ آپ نے یہ دینار حضورؐ کی گود میں ڈال دیئے۔ (راوی عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کہتے ہیں) میں نے دیکھا حضورؐ ان دیناروں کو الٹ پلٹ رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ آج کے بعد عثمانؓ کو ان کا کوئی عمل نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہ بات دو مرتبہ کہی۔

+ + + +

+ + + +

کتنی محبت اور خوشنودی ظاہر ہو رہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے اور حضرت عثمانؓ کے لئے آپ کے قلبِ مطہر میں اس وقت کیسے نرم گوشے رہے ہوں گے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دیگر مستطیع اور آسودہ حال صحابہؓ نے اس موقع پر کیا دیا[1] اور یہ بھی نہیں معلوم کہ رسول اللہؐ کے ارشاد گرامی کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا تھا؟ آیا انھوں نے خبر دی تھی یا دعا۔ اگر دعا دی تھی تو یقین رکھنا چاہیئے کہ انشاء اللہ یہ قبول ہوتی ہوگی اور خبر دی تھی تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسے آخرت کے

[1] اسی موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنا آدھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنا پورا اثاثہ نذر کر دیا تھا۔ وہ چاہے مقدار میں حضرت عثمانؓ سے کم ہو لیکن اجر و ثواب کے لحاظ سے ناقابلِ مقابلہ ہے۔ ع

متعلق سمجھا جائے یعنی جہاد کے سلسلہ میں حضرت عثمانؓ کی مالی امداد اجر و ثواب کے اعتبار سے اتنی وزن دار ٹھیری کہ اب زندگی بھر وہ جو بھی اعمال کرتے رہیں گے ان میں اگر کوئی عمل غیر پسندیدہ بھی ہو تب بھی اس کی قباحت کالعدم اور بے وزن قرار پائے گی اور جنت میں انھیں بہترین نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ گویا یہ مزید توثیق تھی ان کے مُبشّر بالجنۃ ہونے کی۔ حضرتِ عثمانؓ کے جن حامیوں نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا کہ اب زندگی بھر حضرت عثمانؓ جو کچھ بھی کریں وہ بالیقین حق اور انصاف کے عین مطابق ہوگا انھوں نے بے جا تکلف سے کام لیا۔ اس تکلف کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عثمان کیلئے اس دن سے انبیا والی عصمت مان لی جائے اور یہ ہوگا کہ بعض اُن صحابہؓ کو جنھوں نے حضرت عثمانؓ کے بعض الزامات کو برملا خلافِ عدل اور نامناسب ٹھیرایا قولِ رسول کی صریح تکذیب کرنے والا سمجھ لیا جائے۔ نعوذ باللہ ہمیں جہاں حضرت عثمانؓ کی پاکدامنی اور تکریم محبوب ہے وہیں دیگر جلیل القدر صحابہ کو بھی اعلیٰ معیارِ ایمان سے گرا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرسکتے۔ حضرتِ عثمانؓ کی رفعتِ شان کے لئے ایک اور حدیث بہت کافی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ قَدْ رَضِیْتُ عَنْ عُثْمَانَ فَارْضَ عَنْہُ

اے اللہ! میں عثمان سے راضی ہوں آپ بھی راضی ہو جئیے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لائے تو مہاجرین کے لئے پانی کا کال تھا۔ رومہ نامی صرف ایک کنواں تھا، لیکن یہ یہودی کا تھا جو مسلمانوں کو پانی لینے کی اجازت نہ دیتا تھا حضورؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ کون ہے جو اس کنویں کو خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کرے اور جنت میں اس سے بہتر کا مستحق ہو۔ اس پر حضرتِ عثمانؓ نے باختلافِ روایت آٹھ ہزار یا پچیس ہزار یا ایک لاکھ درہم میں خرید کر وقفِ عام کردیا۔ ایک روایت یوں بھی ہے کہ حضورؐ جب ہجرت کرکے مدینے آئے تو یہ کنواں بگڑا پڑا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے خرچ پہ اسے صاف کرایا، لیکن جب کام بنا ہو گیا تو ہٹ دھرم کفار نے پانی بھرنے میں مزاحمت کی تب حضورؐ کی ترغیب پہ حضرت عثمانؓ نے اسے نقد خرید لیا۔

خلافتِ صدیقی میں ایک بار قحط پڑا اس وقت حضرت عثمانؓ کے ایک ہزار اونٹ غلّے سے لدے پھندے باہر سے آئے۔ تاجر دوڑ پڑے کہ یہ موقع تو کمائی کا تھا۔ حضرت عثمانؓ سے کہا کہ لو ڈیوڑھی قیمت پر سودا اُچکتا کرو۔ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں مجھے اس سے زیادہ نفع درکار ہے۔ تاجروں نے باہم مسابقت کرکے دُگنے دام لگا دیئے۔ جواب ملا یہ بھی کم ہے۔ تاجر چکر میں پڑ گئے۔ وہ جانتے تھے عثمانؓ دولت مند ہونے کے باوجود کبھی حریص و طامع نہیں رہے نہ انھوں نے کبھی لوگوں کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ پھر یہ آج کیا ہوا ہے کہ وہ ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ اِس گتھی کو حضرت عثمانؓ کے اِن الفاظ نے سُلجھایا:-

"لوگو! گواہ رہنا میں نے یہ سب غلّہ اللہ کی راہ میں دیا!"

اور واقعی یہ سودا بڑے نفع کا تھا۔ لیکن کتنے ہیں جو اس سودے کا دل گردہ رکھتے ہوں!

ایک مرتبہ مسجدِ نبوی کی توسیع کی ضرورت کا احساس کرکے رسول اللہؐ نے فرمایا:-

مَنْ یَّشْتَرِیْ بُقْعَۃَ اٰلِ فُلَانٍ فَیَزِیْدُھَا فِی الْمَسْجِدِ بِخَیْرٍ لَّہٗ مِنْھَا فِی الْجَنَّۃِ۔

کون ہے جو "آلِ فلاں" کے حلقۂ زمین کو خرید کر مسجد میں شامل کردے بدلے میں اسے بہتر شے کے جو ہوگی اس کے لئے جنت میں۔

یہ آلِ فلاں" کی زمین مسجد سے متصل تھی حضرت عثمانؓ نے باختلافِ روایت بیس پچیس ہزار درہم میں خرید کر اسے مسجد میں شامل کردیا۔

بیعتِ رضوان کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت لی تھی تو اپنے ہاتھ کو عثمانؓ کے ہاتھ کا قائم مقام ٹھیرایا تھا۔ یہ کچھ معمولی شرف نہیں ہے۔

بدری صحابہؓ کو اہلِ ایمان میں ایک خاص عظمت حاصل ہے۔ حضرت عثمانؓ اپنی زوجہ اور رسول اللہؐ کی صاحب زادی رقیہ کی شدید علالت کے سبب شریکِ بدر نہ ہوسکے تو بعض متاخرین انھیں بدری ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ یا تو تعصب ہے یا پھر یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ دینی عظمت اور اُخروی مرتبت کا جوہر کیا ہے۔ اصل شے ہے اللہ اور رسول کی اطاعت۔ جس وقت کے لئے جو حکم ملے اسوقت اسی حکم کی تعمیل کرنا عینِ عبادت ہے۔ روایات ناطق ہیں کہ حضرت

عثمانؓ کو رسول اللہؐ ہی نے حکم فرمایا تھا کہ گھر پر رہ کر بیوی کی دیکھ بھال کرو وہ بیمار ہے۔ بیماری بھی کیسی کہ اسی دَور ان میں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ پھر حضورؐ نے بدر کے مالِ غنیمت ہی سے حضرت عثمانؓ کا حصّہ دوسرے شرکاءِ بدر کی طرح نکالا اور جنّت کی بشارت بھی دی۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی یہ کہے کہ وہ بدری ہونے کے اُس شرف سے محروم ہیں جو حقیقت میں اطاعتِ خدا و رسول ہی کی ایک اضافی شکل کا نام ہے تو بتلایئے اِس کا مطلب اِس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ رسول اللہؐ کے علم اور فیصلے کو غلط ٹھیرا رہا ہے۔

حضرت عثمانؓ کو دیگر امتیازات کے ساتھ کتابتِ وحی کا بھی شرف حاصل تھا۔ جن دس خوش نصیبوں کو حضورؐ نے جنّت کی خوش خبری دی انھی میں سے آپ بھی ایک ہیں۔ حضورؐ نے چند بار آپ کو مدینے میں اپنا قائم مقام بھی مقرر فرمایا تھا۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بعد حضورؐ کی بارگاہ میں آپ ہی ممتاز تھے اور یہ دونوں حضرات بھی اپنی اپنی خلافت کے زمانے میں برابر آپ کے نیک مشوروں کو اہمیت دیا کرتے تھے

نماز روزے کا یہ عالم تھا کہ بعض مؤرخین کے الفاظ میں آپ کی راتیں قیام سے اور دن صوم سے معمور رہا کرتے تھے۔ زبان اکثر اوقات ذکرِ الٰہی سے تر رہا کرتی تھی۔

یہ تھے حضرت عثمانؓ کے اوصافِ عالیہ اور ان سب میں ایک اور اعلیٰ درجہ کا وصف بطورِ حسنِ مشترک شامل تھا یعنی شرم و حیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا کو ایمان کا جُز فرمایا ہے۔ ظاہر ہے جس میں جتنی زیادہ حیا ہوگی اُتنا ہی اس کا ایمان اِس پہلو سے وافر ہوگا۔ حال یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ غسل کے لئے بھی لباس اُتارتے شرماتے تھے۔ جب کہ خود ان کے یا اللہ کے سوا دیکھنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ عثمانؓ سے تو فرشتے بھی حیا کرتے ہیں مسلم کی روایت ہے کہ ایک بار حضورؐ اپنے دولت خانے میں ویسی ہی بے تکلفی سے لیٹے ہوئے تھے جیسے اپنے گھر میں لیٹا جاتا ہے۔ غالباً آپ کی پنڈلیاں (زانو کی بھی روایت ہے) اُوپر تک کھلی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ابوبکرؓ اذن لے کر داخل ہوئے تو حضورؐ یونہی لیٹے رہے پھر عمرؓ حاضر ہوئے تب بھی کوئی تغیر نہ آیا لیکن پھر عثمانؓ آئے تو سرکارؐ اُٹھ بیٹھے اور کپڑوں کو درست کیا۔ سب کے چلے جانے کے بعد حضرت عائشہؓ نے پوچھا:۔

"آپ نے ابوبکرؓ و عمرؓ کے آنے پر تو اپنی حالت میں تبدیلی نہیں کی لیکن عثمانؓ آئے تو اُٹھ بیٹھے اور کپڑے درست کئے۔"

حضورؐ نے جواب دیا:۔

أَلَا يَسْتَحْيِي مِنْ رَجُلٍ يَسْتَحْيِي مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ۔	کیا میں اُس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔

ایک اور روایت میں یہ جواب منقول ہے:۔

انّ عُثْمَانَ رَجُلٌ حَيِيٌّ وَ إِنِّي خَشِيتُ إِنْ أَذِنْتُ لَهُ عَلَى تِلْكَ الْحَالَةِ أَنْ لَا يَبْلُغَ إِلَيَّ فِي حَاجَتِهِ (مسلم)	عثمانؓ ایک نہایت حیادار آدمی ہیں۔ اگر میں انھیں اپنی اسی حالت میں اندر بلالیتا تو اندیشہ تھا کہ وہ فرطِ حیا سے اپنی وہ حاجت بیان نہ کر پاتے جس کے لئے وہ آئے تھے۔

+ + + + +

اللہ اکبر۔ کیا بات تھی حضرت عثمانؓ کی۔ رضی اللہ عنہ، ان کی عظمت کے اظہار میں جو کچھ عرض کیا گیا بہت کافی ہے پھر بھی ایک خاص آیتِ قرآنی اور پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جو اگرچہ عام ہے، حضرت عثمانؓ کے لئے خاص نہیں، لیکن بڑی وجد انگیز ہے اور حضرت عثمانؓ بھی بداہتہً اس کے زمرے میں شامل ہیں۔ بلکہ ذو ہجرتین ہونے کی وجہ سے بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں۔ آیت کا ترجمہ تو عوام کی خاطر لکھا ہی ہے، لیکن حق یہ ہے کہ ترجمہ کبھی بھی اُس ادبی حُسن و جمال اور مبہوت کردینے والی رعنائی بیان اور دل و نظر کو کیف و ابتہاج سے بھر دینے والے لطفِ کلام کی ترجمانی نہیں کر سکتا جس کا سرور انگیز احساس آیت کو اس کی اپنی ہی زبان میں پڑھ اور سمجھ کر ہوتا ہے۔ ذرا دیکھئے تو اللہ جلّ شانہٗ کیسے نفیس انداز میں کتنا رفیع الشان مژدہ دے رہے ہیں:۔

اَلَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ط وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ط إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (سورہ توبہ)	وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے اپنے مال اور جان سے اللہ کے یہاں انکا بہت بڑا درجہ ہے اور وہی لوگ بامراد و کامیاب ہیں۔ خوشخبری دیتا ہے انکا رب انھیں اپنی مہربانی اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جنمیں ان کیلئے بافراغت آرام و راحت ہے، رہا کریں گے وہ انھیں ہمیشہ ہمیشہ۔ بے شک اللہ کے پاس بڑا عظیم بدلہ ہے۔

کیا کسی کو انکار ہے کہ حضرت عثمان رضؓ ان سارے ہی اوصاف سے کماحقہٗ متصف نہیں تھے جن کا اس آیتِ شریفہ میں ذکر ہوا۔ اگر تھے تو پھر خدا کی صریح و محکم بشارت کو کون رد کر سکتا ہے۔

آئیے اب واقعات پر نظر ڈالیں۔ بارہ سالوں پر پھیلی ہوئی خلافتِ عثمانی کی تفصیل میں جانا ظاہر ہے اِس محدود صحبت میں ممکن نہیں۔ بس جستہ جستہ اُن گوشوں کو لئے لیتے ہیں جن سے دَورِ عثمانی کے المناک فتنوں کا تعارف ہو سکے۔

فتنوں کی نوعیت

مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ فتح و ظفر کی جو دیواریں حضرت عمرؓ اٹھا گئے تھے دَورِ عثمانی میں انھیں خاصی بلندی نصیب ہوئی۔ مسلمانوں نے معرکوں پر معرکے جیتے اور سلطنت کی حدود پھیلتی گئیں۔ یہ اس لئے بھی ہوا کہ اللہ کی دی ہوئی کامرانیوں سے مسلمانوں کے دل بڑھے ہوئے تھے، ان کی جنگی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اہلِ کفر کی ہمتیں پست تھیں۔ اور اس لئے بھی ہوا کہ حضرت عثمان رضؓ نے فوجی اور جنگی معاملات میں حضرت عمر رضؓ ہی کے طریقِ کار کو قائم رکھا تھا اور سپہ سالاروں کو لکھا تھا کہ ہرگز ہرگز اِس طریقے میں تبدیلی نہ کی جائے۔ بڑے بڑے افسروں کے نام ان کے جو سرکاری خطوط بھی کتبِ تاریخ میں ملتے ہیں وہ جہاں ان کی ارفع و مقدس سیرت کے ترجمان ہیں وہیں ان کے اس ذہن کا بھی پتا دیتے ہیں کہ عسکری میدان میں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرز و طریق پر پورا پورا بھروسہ کرتے تھے۔

پھر فتوحات کے طول و عرض میں اضافہ کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ حضرت عمر رضؓ نے بحری جنگ سے سالاروں کو روک رکھا تھا لیکن حضرت عثمان رضؓ کے دَور میں یہ بندش ختم ہو گئی اور تنہا امیر معاویہ رضؓ نے پچاس کے قریب بحری جنگیں لڑیں۔ فتح و ظفر مسلمانوں کے قدم چوم رہی تھی۔ جیت عموماً انھی کے حصہ میں آئی اور اس کے طویل الذیل دامن بے حساب دولت سے مالامال تھے۔ دولت وہ بلا ہے کہ اگر احتساب اور گرفت کے شکنجے سے آزاد ہو جائے تو تکلفات، تن آسانی، فضولیات اور تعیش کا دروازہ چوپٹ کھل جاتا ہے۔ حضرت عمر رضؓ کے دَور میں بھی مسلسل فتوحات نے سیم و زر کی بارش میں بخل نہیں کیا، لیکن وہ ایک عجیب و غریب انسان تھے، ان کی آہنی سیاست، نہ چوکنے والی سخت گیری اور بے نظیر حکمت عملی نے دولت اور اس کے مفاسد کی قیامت کو سانچے میں ڈھال دیا۔ عیش کوشی اور بے راہ روی کے میلانات پر انھوں نے بے دریغ کوڑے برسا کے رکھ دیئے۔ حضرت عثمان رضؓ نیت اور خواہش کی حد تک تو بے شک امیرانہ ٹھاٹ باٹ اور عیش پسند رجحانات کے دشمن تھے اور اپنے عزم و فہم کی حد تک معاشرے کو مفاسد و فتن سے بچائے رکھنے میں انھوں نے امکان بھر کوشش کی لیکن اپنے مزاج و طبیعت کے قدرتی اقتضاء کے طور پر وہ حضرت عمر رضؓ کا دُرّہ ہاتھ میں نہ اُٹھا سکتے تھے اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ عمر رضؓ کا جگر اپنے پہلو میں اور ان کا قلب و دماغ اپنے سینہ و سر میں پیدا کر لیتے۔ یا اُن پیچیدہ مسائل کو سر اُٹھانے سے روک دیتے جو دولت و شوکت کی افراط اور برابر وسیع ہوتے ہوئے حدودِ مملکت کے طبعی نتائج کی سطح پر لازماً اُبھرنے تھے۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ شہادتِ عثمان رضؓ پر منتج ہونے والا فتنہ کبریٰ سب سے پہلے کہاں سے اور کیوں پیدا ہوا؟ یہ کوئی "منفرد" فتنہ نہیں تھا، بلکہ بہت سے ایسے فتنوں کا مرکب تھا جو آگے پیچھے پیدا ہوتے چلے گئے تھے اور انھیں نشوونما سے روکنا اُس نرم سیاست کے لئے ممکن نہ تھا جس میں آئین و عدل کی صلابت پر جذبات کا گداز غالب آگیا ہو۔ جن لوگوں نے یہ کہا کہ خلافتِ عثمانی کو بہالے جانے والا طوفان بیرونِ مدینہ سے آیا اور خود مدینے میں پانی مرنے کیلئے کوئی نشیب نہ تھا انھوں نے صحیح نہیں کہا اور جن لوگوں نے کہا کہ سرچشمہ خود مدینہ ہی تھا انھوں نے بھی صائب نظری کا ثبوت نہیں دیا اور جن لوگوں نے سارا الزام یہودی عبداللہ بن سبا پر تھوپنے کی سعی کی انھوں نے بھی بالکل سطحی کھیل کھیلا۔ حقیقت میں فتنۂ کبریٰ کے وہ اسباب و عوامل جو بجائے خود چھوٹے چھوٹے فتنے تھے زمانی اعتبار سے بارہ سالوں کی وسعت پر پھیلے ہوئے ہیں اور مکانی اعتبار سے یہ حضرت معاویہ رضؓ کی پائگاہ شام کے سوا ریاست کے ہر قابلِ ذکر صوبے میں بفرقِ مراتب پائے جاتے رہے ہیں۔ عبداللہ بن سبا بھی یقیناً ایک بدترین فتنہ تھا اور حضرت عمر رضؓ زندہ ہوتے تو اس کا حشر دیکھنے کے قابل ہوتا، لیکن اِس فتنے کی مثال بہت سے بہت اُس تند ہوا کے جھونکے جیسی تھی جو خرمن میں لگی ہوئی آگ کو ذرا تیز کر کے نسبتاً جلدی دُور تک پھیلا دیتا ہے۔ خرمن پہلے ہی سے نہ سلگ رہا ہو تو ہزار آندھیاں بھی آگ نہیں بھڑکا سکتیں۔ آدمی بڑا ہی خود غرض واقع ہوا ہے۔ وہ

اپنی ذات اور اپنے ممدوحین کے دامن کو داغ دھبوں سے بچانے کے لئے ایسی تاویلات تراشتا ہے کہ اگر ان پر خود اسے ہی غیر جانبداری اور خلوصِ ذہن کے ساتھ غور کرنے کا موقع ملے تو اپنا سر پیٹ لے۔

تاریخ فتنوں کے جن اسباب و علل کی نشاندہی کرتی ہے ان میں بعض تو ایسے ہیں جنھیں صرف عوامل و محرکات کا درجہ دیا جا سکتا ہے اور بعض ایسے ہیں جو مصادر و مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آیئے دیکھیں وہ کیا ہیں۔

(۱)

دولت کی بہتات

پے در پے فتوحات نے رعایا اور بیت المال کی جیبیں پہلے ہی خاصی بھاری کر دی تھیں، غربت و افلاس کا دور جا چکا تھا۔ اب نئی فتوحات نے مال و دولت میں اضافہ کیا۔ ایک طرف مجاہدین کو مالِ غنیمت کے حصوں نے مالا مال کر دیا، دوسری طرف بیت المال کا اثاثہ کہیں سے کہیں پہنچا حضرت عثمانؓ کے لئے دو ہی راستے تھے۔ یا تو حضرت عمرؓ کی طرح احتساب و گرفت کی سخت پالیسی اختیار کرتے اور آہنی دیوار بن کر اُن مفاسد کی راہ میں حائل ہو جاتے جو دولت کی افراط سے ظہور میں آنے والے تھے یا پھر رخصت و رعایت، داد و دہش، نرمی، عطا اور لطف و کرم کی وہ روش اختیار کرتے جو ٹوکنا اور انگلی اُٹھانا نہیں جانتی۔ انھوں نے یہی دوسری روش اختیار کی۔ کیونکہ یہ ان کے مزاج و مذاق کے بھی عین مطابق تھی اور اس میں رسول اللہ صلعم کے اُس ارشاد کا بھی لحاظ تھا جسمیں مخلوق پر شفقت کرنے اور بخل سے بچنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ انھوں نے سوچا اور غلط نہیں سوچا کہ بیت المال کی دولت عوام ہی کے کام آنے کے لئے ہے پھر کیوں نہ انھیں مستفید ہونے کا موقع دیا جائے اور کیوں نہ ان پر آرام و راحت کا وہ دروازہ کھول دیا جائے جس کا کھولنا اللہ کی دی ہوئی کامرانیوں نے آسان کر دیا ہے۔ یہی طرزِ فکر تھا جس پر مطمئن ہو کر انھوں نے نہ صرف پہلے سے جاری شدہ وظیفوں میں خوب اضافے کئے بلکہ نئے وظائف جاری کرنے کیلئے دفتر کھلوائے اور بعض جلیل القدر صحابہ کو اتنی بڑی بڑی قیمتیں دیں کہ تنہا انھی کا مجموعہ ایک ایسی ریاست کے اقتصادی دروبست میں جس کا والی دولت کے پیچیدہ ترین عمل اور ردِ عمل کی فلاسفی کا ماہر نہ ہو بہت کچھ دراندازیاں کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مؤرخین نے اگر مالی پالیسی میں شدت برتی تو یہ امت ہی کے مفاد میں تھی اور یہ جو نرمی اختیار کی، یا یوں وہ بھی امت ہی کے مفاد میں ہے۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا راستہ وہ بھی تھا اور یہ بھی ہے۔

سوچنے کا شاید یہی انداز تھا جس نے حضرت عثمانؓ کو کشادہ دستی پر آمادہ کیا اور کوئی شک نہیں کہ کتاب و سنت کی رُو سے یہ مسلک قطعی پاک و صاف تھا۔ گناہ کا کوئی شائبہ اس میں نہیں تھا، لیکن یہ تسلیم کئے بغیر بھی چارہ نہیں ہے کہ اسباب و نتائج کے فطری قوانین کو صرف حسنِ نیت اور جذبۂ اخلاص نہیں بدل سکتا۔ جس دور میں فتوحات میں دولت سیلِ رواں کی طرح اُمڈی چلی آ رہی ہو اس میں کشادہ دستی اور شفقت و درگذر کا نرم رویّہ اختیار کرنا یقیناً وہی نتائج پیدا کرتا جو عثمانی دور کے معاشرے میں ہر طرف بکھرے نظر آ رہے ہیں اور جن کی ہلاکتیں صرف حضرت عثمانؓ ہی کی جان تک محدود نہیں رہیں، بلکہ حضرت علیؓ جیسے قوی دست ذہین و ذکی اور بیدار مغز مدبّر کو بھی بے بس کر گئیں۔

تاریخ نے حضرت عثمانؓ کی فیاضی کی جو مثالیں محفوظ کر لی ہیں، ان میں اگر راویوں کا شوقِ ایجاد یا غلط فہمی شامل نہ ہو تو ان میں سے چند یہ ہیں۔

انھوں نے حضرت طلحہؓ کو جو عشرہ مبشرہ میں سے ایک جلیل القدر صحابی ہیں دو لاکھ عطیہ دیا اور اپنا ذاتی پچاس ہزار کا قرض جو اُن پر تھا معاف کر دیا۔ حضرت زبیرؓ کو جو طلحہؓ ہی کی طرح عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں چھ لاکھ عطا فرمائے۔ حارث بن الحکم کو تین لاکھ، عبداللہ ابن خالدؓ کو تین لاکھ اور ان کے دو ساتھیوں کو ایک ایک لاکھ اور سعید بن العاصؓ کو ایک لاکھ عنایت کئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بیت المال کے خزانچی عبداللہ بن ارقمؓ نے ایک بار تعمیلِ حکم سے انکار کر دیا تو حضرت عثمانؓ نے کہا کہ تم تو ہمارے خزانچی ہو تمھیں پس و پیش کا کیا حق ہے۔ ابن ارقمؓ نے جواب دیا کہ آپ کا خزانچی تو آپ کا کوئی غلام ہوگا میں تو مسلمانوں کا خازن ہوں۔ پھر وہ مستعفی ہو گئے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ دورِ عثمانی کے تقریباً چھ سات ابتدائی سال امن و فراغت کے گذرے۔ لوگ حضرت عمرؓ کی سخت گیریوں سے تنگ آ چکے تھے اور اب جو انھیں "آزادی" ملی تو نہایت مسرور ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ حالات کی یہ تعبیر حکیمانہ نہیں ہے۔ بے شک حضرت عمرؓ کی کڑی نگرانی اُٹھ جانے اور مال و دولت کی فراوانی نے تن آسانی اور

منافست کی راہیں کھولدی تھیں اور طلائی نہر میں ہاتھ دھونا عوام کے لئے مسرت و انبساط ہی کا باعث ہوسکتا تھا' لیکن حق یہ ہے کہ فراغت و آسودگی کے یہی ابتدائی سال فتنوں کی کھیتی کے لئے زمین کا درجہ رکھتے ہیں۔ جس طرح تخم ایک خاص مدت تک زمین کے اندر ہی اندر نشوونما کے طبعی مراحل طے کرتا ہے اسی طرح غلط رجحانات نے عیش و آزادی کے بطن میں طبعی نشوونما پائی اور آخر کار فتنوں کی شکل میں پھوٹ نکلے دورِ فاروقی کی آب و ہوا انھیں سازگار نہ تھی۔ حضرت عمرؓ کی نگاہِ رسا زمین کا سینہ چیر کر اُس تخم کو دیکھ لیتی تھی جو پانی اور کھاد ملنے پر فتنے کا درخت بننے کی استعداد رکھتا ہو پھر کہاں ممکن تھا کہ اسے پھولنے پھلنے کی آزادی مل جائے۔ اسلام جس معاشرے کا طالب ہے وہ بالیقین ایسے ہی کڑے احتساب' شدید نگہداشت اور تحکم کی گود میں پرورش پاسکتا ہے جس کی جھلکیاں سیاستِ فاروقی میں نظر آتی ہیں۔ اس سے بلاشبہ لوگ تنگ ہیں پڑتے ہیں' لیکن یہ تنگی ظلم نہیں حکمت ہے اور اس کا ذکر ایسے انداز میں کرنا کہ سننے والے اسے قہر و شقاوت محسوس کرنے لگیں انصاف کا خون کرنا ہے تماشائی جب دورِ شیخین کی سیر کرکے دورِ عثمانی میں داخل ہوتا ہے تو اسکی ذکاوتِ حس معاشرے کی فضا میں ایسی تبدیلیاں محسوس کرتی ہے جیسی ایک موسم کے اختتام اور دوسرے موسم کے آغاز پر ہم آئے دن محسوس کرتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان تبدیلیوں کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے' ذہن و فکر کے بدلتے ہوئے زاویے مادّی مظاہر میں ڈھلتے جاتے ہیں' جھونپڑیوں کی جگہ محل بن رہے ہیں۔ ذوقِ تقویٰ کی جگہ تن آسانی لیتا جارہا ہے' فکرِ عاقبت کے افق پر دنیاوی مسابقت کی دُھند پھیلنے لگی ہے۔ رفتہ رفتہ دورِ عثمانی کا وسط آجاتا ہے اور اب نہ وہ زمین ہے نہ آسمان' نہ وہ دل و دماغ ہیں نہ سیرتیں۔ تماشائی کو کتنے ہی ایسے لوگ ملتے ہیں جو (اسی کی طرح خود بھی) اس انقلاب و تغیر پر حیرت زدہ ہیں اور ان کے چہرے صاف بتلا رہے ہیں کہ وہ معاشرے کی سمتِ سفر بدل جانے کا نہ صرف شدید احساس رکھتے ہیں' بلکہ اس سے سخت نالاں اور دلبرداشتہ ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابی تھے جو گذشتہ کل کو آج پر ترجیح دیتے تھے اور آنے والے کل کو آج سے زیادہ پُرخطر سمجھتے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ ظاہری فراغت و آسودگی کی پرسکون سطح کے نیچے ہولناک طوفان انگڑائیاں لے رہے ہیں۔

---

(۲)

بدلی ہوئی رعایا

فتوحات نے دولت کے علاوہ ایک ایسی رعایا بھی مملکت کو دی تھی جو نہ تو مملکت کی پچھلی رعایا سے سیرت' مزاج' اطوار اور خیالات میں کوئی مماثلت رکھتی تھی نہ باہم دگر اس میں خواہشات و میلانات کی کوئی ایسی مناسبت اور ہم آہنگی تھی جو نظم و ضبط میں کام آسکتی۔ گروہ کے گروہ مسلمان ہوتے چلے گئے' لیکن صرف مسلمان ہوجانا اچانک ان کی سیرتیں منقلب نہ کرسکتا تھا۔ اَن گھڑ اور رنگا رنگ طبیعتیں محض کلمہ پڑھ لینے سے سانچے میں نہ ڈھل سکتی تھیں کتنے ہی ہوں گے جنھوں نے کلمہ بھی دل سے نہیں پڑھا' بلکہ فاتح قوم کے دین سے دنیا بنانے کی خاطر مومن ہوگئے' ان ناپختہ اور برائے نام مومنوں کے معاشرۂ اسلامی میں در آنے سے جو اُلجھاوے پیدا ہوئے وہ بجائے خود مستقل فتن ہیں اور جب ریاست کی داخلی فضا خلیفۂ وقت کی نیکدلی' رافت اور نرمی سے ہر طرح کی جولانیوں کے لئے سازگار ہوگئی ہو تو نئے مومنوں کے طالع آزما غول جتنا بھی نہ کھل کھیلیں کم ہے۔ حضرت عثمانؓ کے عاملوں نے بہت کوشش کی کہ فتنوں کو سر نہ اُٹھانے دیں' مگر مشیت یہی تھی کہ فتنے اپنی بازی لے جائیں اور حضرت عثمانؓ کی نیکی غلط کاروں کے گلوں کا جہنمی طوق بن جائے۔

(۳)

خویش پروری کا مغالطہ

صلہ رحمی اور اقربا پروری کی جو ترغیب تعلیماتِ رسولؐ میں ملتی ہے اس کی روشنی میں یقیناً وہ شخص لائقِ تعریف ہے جو رشتہ داروں کو نوازے اور ترقی کے مواقع دے۔ حضرت عثمانؓ نے جہاں عام رعایا اور جلیل القدر صحابہؓ کو عطیوں سے نوازا وہیں اپنے رشتہ داروں پر بھی عنایات کیں۔ انھیں اموال و مناصب سونپے اور انکی نیت یقیناً یہی تھی کہ اللہ اور رسولؐ خوش ہوں' وہ جانتے تھے کہ قرابت دار اگر بدقماش بلکہ کافر بھی ہوں تب بھی ان کی مالی حاجت روائی محمود و مستحسن ہے۔ ان کے رشتہ دار تو بہرحال مسلمان تھے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ زیادہ ان میں کے صحابی تھے۔ انھوں نے جسے اہل پایا مناصب سونپے اور تاریخ گواہ ہے کہ ان کے مقرر کردہ عمّال کارکردگی کے لحاظ سے نااہل ثابت نہیں ہوئے۔ بعض ناقدین ان میں سے اکثر کی

فردِ عمل کو سیاہ بتاتے ہیں مگر ہمیں معلوم ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہو تو ہم حضرت عثمانؓ کے بنائے ہوئے ایک ایک عامل و والی کے متعلق دلائل سے بتا سکتے ہیں کہ کون کون سا الزام اس پر ناروا لگایا گیا۔ ہمیں اطمینان ہے کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ کسی فاسق و فاجر اور ناکارہ رشتہ دار کو گورنر نہیں بنایا اور یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ان کے کسی والی پر — خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو کوئی جرم ثابت ہوا ہے تو وہ حد بھی جاری کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عمّال کو برابر راست روی، عدل اور حق کوشی کی ہدایات دے رہے ہیں۔

لیکن اس کو کیا کیجے کہ اوّل تو کسی حکمراں کا اپنے خاندان والوں کو کثرت سے عہدے دینا اور ترقی کے مواقع بہم پہنچانا بجائے خود ایسی بات ہے جسے عام طبیعت انسانی بلا کراہت قبول نہیں کرتی۔ خواہ اس کے عقب میں حکمراں کی نیت اور دیانت کا کیسا ہی حسن جمال جھلک رہا ہو۔ لوگ لازماً اسے بدگمانی اور رشک کی عینک سے دیکھتے ہیں اور یہ عینک عموماً وہی پہلو نمایاں کر کے دکھاتی ہے جن پر بہ آسانی اعتراض کیا جا سکتا ہو۔ دوسرے یہ چیز حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل کے بھی صریحاً خلاف تھی۔ انھوں نے نہ صرف خاندانِ خطّاب کو بلکہ پورے خانوادۂ عدی کو حکومت اور اس کے منافع سے دور ہی رکھا تھا۔ حتیٰ کہ آخری وقت میں اپنے لائق بیٹے عبداللہ تک کی خلافت کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا تھا۔ لوگ عبیداللہ ابن عمر ہی کے مقدمے میں یہ جان چکے تھے کہ حضرت عثمانؓ اپنے پیشرو عمر ابن الخطابؓ کے نقشِ قدم پر نہیں چلنا چاہتے۔ اب اقربا پروری کی روش نے اس احساس کو اور گہرا کر دیا۔

تیسرے بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ چشمک اموی خلیفہ عثمانؓ کی دیانت اور نیک نیتی کو متّہم کرنے کے لئے مستقل فتنے کی حیثیت سے موجود تھی۔ یہ دونوں خاندان پہلے ہی سے ایک دوسرے کے حریف رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کشیدگی اور دشمنی کو ختم کرنے کی پوری کوشش فرمائی۔ یہاں تک کہ فتح مکہ کے دن ابو سفیانؓ کے گھر کو "دارالامن" قرار دے کر بنو ہاشم کے اُس احساس برتری پر کاری ضرب لگائی جو روایتی نخوت پر مبنی تھا اور اس طرح آپؐ نے بنو اُمیہ کی دنیاوی وجاہت کو بنو ہاشم کی وجاہت سے قریب تر کر دیا۔

لیکن نسل و نسب کے بجا تفاخر کی آگ پوری طرح سرد نہ ہو سکی تھی اور ان دونوں حریف خاندانوں کی چشمک اب بھی باقی تھی۔ شیخین میں سے کوئی نہ ہاشمی تھا نہ اموی۔ اس لئے ان کے معاملے میں یہ چشمک بروئے کار نہ آسکی، لیکن حضرت عثمان اموی تھے اور بنو ہاشم ان کی اقربا نوازی کو تعصب اور بدگمانی سے بالاتر ہو کر نہ دیکھ سکتے تھے۔ خصوصاً جب علیؓ جیسا ممتاز اور باکمال شخص موجود ہو جسے خلیفہ بنا کر بنو ہاشم اپنی عظمت میں چار چاند لگا سکتے ہوں تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ خاندانی رقابتوں کی کجلائی ہوئی آگ شعلہ نہ دے اٹھے اور بنو ہاشم اموی خلیفہ کے فعل و عمل کو ایک اور ہی زاویئے سے نہ دیکھیں۔ جب ان کی آنکھوں کے سامنے اموی خانوادے کے افراد صوبوں کے گورنر بنائے جا رہے ہوں اور خلافتِ راشدہ بظاہر "حکومت بنو اُمیہ" کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہو تو دلوں میں سلگنے والی چنگاریاں کیسے نہ بھڑکتیں اور بنو ہاشم اور ان کے حامی کیونکر حضرت عثمانؓ کے عاملوں اور والیوں کو جا و بیجا رسوا نہ کرتے۔ ان کے عیوب و نقائص کو شہرت نہ دیتے، انھیں غیر مقبول نہ بناتے اور موجودہ خلافت کے در و بام ہلا دینا نہ چاہتے۔ انھوں نے اُن عیوب کا بھی پروپگنڈہ کیا جو واقعتاً حریفوں میں پائے جاتے تھے اور وہ عیوب بھی تصنیف کئے جن سے حریفوں کا دامن پاک تھا اور کچھ عیوب ایسے بھی ہیں جو موجود ضرور تھے لیکن اس مقدار اور کیفیت میں نہیں تھے جس میں انھیں مشتہر کیا جا رہا تھا۔

پھر حضرت عمرؓ کی یاد آئی۔ اللہ اکبر۔ کیا بصیرت تھی بارہ سال پہلے فرما دیا تھا کہ "عثمانؓ! اگر تمھیں خلافت مل جائے تو بنو اُمیہ اور بنو ابی معیط کو لوگوں کے سروں پر مسلط نہ کر دینا ورنہ لوگ تمھاری جان لے لیں گے۔"

یہ کوئی الہام نہ تھا، بلکہ اس دور بیں نگاہِ تدبر کا کرشمہ تھا جو اسباب و علل کے قریبی نتائج پر نہیں رُک جاتی، بلکہ بعید تر نتائج پر کمند ڈالتی ہے اور مستقبل بعید کا سینہ چیر کر حقائق کا جائزہ لیتی ہے۔ وہی ہوا جس پر حضرت عمرؓ نے متنبہ کیا تھا۔ لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی جان لے لی۔ رضی اللہ عنہما

(۴)

فاروقیؓ پالیسی میں تبدیلی

حضرت عمرؓ کی ایک خاص پالیسی یہ تھی کہ قریش، جو بڑے بڑے مہاجرین و انصار صحابہؓ پر مشتمل تھے مدینے سے باہر نہ جانے پائیں انھوں نے اس پالیسی میں یہانتک شدت برتی کہ اگر قریش میں سے کوئی شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کرتا تب بھی آپ منع فرما دیتے اور کہتے کہ تم نے رسول اللہؐ

کے ساتھ غزوات میں شرکت کرکے بہت ثواب کما لیا ہے۔ اب جوارِ رسولؐ میں چین سے بیٹھو۔ یہی تمہارے لئے کافی ہے۔

قریش ظاہر ہے کہ اس پابندی سے گھٹن محسوس کرتے ہونگے بعض کتب سے نہ صرف یہ پتا چلتا ہے کہ ان پر یہ بندش سخت گراں تھی، بلکہ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کے نزدیک حضرت عمرؓ یہ پابندی عائد کرنے میں اپنے اختیارات کی مناسب و جائز حدود سے بھی آگے بڑھ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ میں خلیفہ کو ایسی سخت گیریوں کا مجاز نہیں بنایا گیا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ کتاب و سنت اور اپنے اختیارات کی حدود کو اچھی طرح جانتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جب تک میری جان میں جان ہے حِرا کی گھاٹی پر قریش کی گردن اور کمر پکڑے رکھوں گا تاکہ نہ وہ دنیا کو دیکھیں نہ دنیا ان کو دیکھے۔ ان کے نزدیک قریش کا باہر جانا آگ میں کود پڑنے کے مرادف تھا۔

حضرت عثمانؓ کے برسرِ خلافت آتے ہی یہ بندش اُٹھ گئی۔ یا تو حضرت عثمانؓ نے یہ خیال فرمایا ہو کہ بعض مفروضہ اور خیالی نقصانات کے ڈر سے رسول اللہؐ کے معظم صحابیوںؓ کو سیر و سفر سے روکے رکھنا اور ایک طرح پر قیدی بنا دینا حسنِ سلوک کے شایاں نہیں ہے یا یہ خیال فرمایا ہو کہ اس بندش کو بحال رکھنے کے لئے جس بے لچک صلابت اور آہنی شدت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ قریش خود اس بیڑی کو توڑ پھینکیں میں ہی کیوں نہ اُتار دوں۔

جو کچھ بھی آپ نے سوچا بہرحال بندش اُٹھ گئی اور قریش مدینے سے نکل کر مختلف دیار و امصار میں پھیلتے چلے گئے۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا بصیرتِ عمرؓ بہت پہلے ہی ادراک کر چکی تھی۔ کیسے نہ ہوتا۔ ممتاز قریشی صحابہ میں کا ہر فرد اپنی مسلّمہ عظمت، معروف شخصیت اور ماضی کی شاندار روایات کے تعلق سے اس قابل تھا کہ لوگ اس کے گرد حلقہ باندھیں اس کے حواری اور حاشیہ نشین بنیں اور اس کے وسیلے سے جاہ و مال کے حصول میں ہر طرح کی عیاں اور پنہاں کوششیں کریں۔ قریشی صحابہ صرف ذاتی اوصاف و محامد ہی کے لحاظ سے مقتدا بنائے جانے کے اہل نہ تھے، بلکہ ان کی حیثیت شاہی خاندان کے افراد کی بھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ایک طرف اگر قریش کے نسلی احساسِ برتری کو کچل ڈالنے کی پوری سعی کی تھی تو دوسری طرف یہ حکمت بھی برتی تھی کہ اسلام کے پودے کو جن لوگوں نے لہو دیکر سینچا ہے، جو ابتلا کی ہولناک گھاٹیوں سے گذر سے

ہیں، جو اسلامی قصرِ عظمت کے بانیین و مؤسسین ہیں، جن کی خدمات نے رسول اللہؐ سے دادِ تحسین حاصل کی ہے انھیں امتیاز و شرف کی خاص بلندی سے نیچے نہ گرنے دیا جائے۔ وہ ایک مضبوط گروہ کی حیثیت میں دار السلطنت کا وقار بڑھائے رکھیں، ان کا رعب عوام کے دلوں سے کم نہ ہو اور ان کا مدینے میں ایک ناقابلِ شکست جمعیت کی حیثیت سے موجود رہنا ہی مرکز کی سطوت اور دبدبۂ قوت کا ضامن بنا رہے۔

یہ لوگ جب منتشر ہوئے تو کہاں ممکن تھا کہ بے شمار خلقت ان کے گرد جمع نہ ہوتی۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جمع ہونے والے تمام ہی افراد خود غرض، جاہ طلب اور حریص و طامع ہی رہے ہوں، بلکہ حسنِ نیت اور للٰہیت رکھنے والے بھی اس خیال سے جمع ہو سکتے تھے کہ ہمارا ممدوح حکمرانی و اقتدار کا حضرت عثمانؓ یا ان کے فلاں فلاں والی سے زیادہ مستحق ہے۔ آخر خلفاء کی نامزدگی وحی کے ذریعہ تو نہیں ہوتی تھی۔ ہر شخص یہ سوچنے میں آزاد تھا کہ فلاں صحابی حضرت عثمانؓ سے بہتر طور پر اُمورِ خلافت انجام دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینے سے نکلکر دوسرے مقامات پر بس جانے والے ممتاز صحابہؓ کی مجلس میں خود غرض، ہوا پرست اور دنیادار لوگوں کے علاوہ ہمیں وہ حضرات بھی نظر آتے ہیں، جن کی دیانت اور للٰہیت پر انگلی نہیں اُٹھائی جا سکتی۔

دورِ عثمانی کے بعض حضرات نے اور بعد کے کچھ ناقدوں نے سمجھا کہ حضرت عثمانؓ کا قریش کو آزاد کر دینا اُس عہد کے خلاف ہے جو انھوں نے سیرتِ شیخین کی اتباع پر کیا تھا۔ لیکن ہم کہیں گے کہ یہ صحیح نہیں ہے قریش کو مدینے میں روکے رکھنا حضرت عمرؓ کی "سیرت" نہیں تھی بلکہ سیاست تھی۔ حکمتِ عملی، پالیسی یا جو کچھ آپ چاہیں اسے کہہ لیں مگر "سیرت" کا اطلاق اس پر ہرگز نہیں ہوتا۔ سیاست کا تعلق ہمیشہ موجود الوقت حالات سے ہوا کرتا ہے۔ حضرت عثمانؓ یا کوئی بھی حکمراں کسی بھی عہد یا آئین کی رُو سے اس کا پابند نہیں ہو سکتا کہ سابق حکمراں نے سیاست کی راہ میں جہاں جہاں نقش پا چھوڑا ہے ٹھیک اسی پر قدم رکھ کر چلے اور تغیرِ احوال کی کوئی رعایت نہ کرے۔ اگر حضرت عثمانؓ نے موجودہ حالات کا اپنے طور پر جائزہ لینے کے بعد یہ ثابت ہی بہتر جانا کہ شدت کی بجائے رخصت اختیار کی جائے تو چاہے بعد کے حالات کی روشنی میں رخصت کتنی ہی ضرر رساں ثابت ہوئی ہو، لیکن اسے سیرتِ شیخین سے گریز و انحراف کا نام نہیں دینا چاہئے۔ یہ تو ایک اجتہاد ہے جو غلط ہو یا

بھی اجر کا استحقاق رکھتا ہے۔ بڑی زیادتی ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ حضرت عثمانؓ کو اپنے نہیں حضرت عمرؓ کے دماغ سے اجتہاد کرنا چاہئے تھا یا یہ کہیں کہ ان کی نگاہِ تدبّر کو مستقبل کے اُن دُور افتادہ دھندلکوں تک ضرور پہنچ جانا چاہئے تھا جہاں تک پہنچنے کی طاقت اللہ نے انسے نہیں دی تھی۔

(۵)

مردم شناسی کے نشیب و فراز

اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں میں سے "مردم شناسی" بھی ایک اہم ترین صلاحیت ہے، بلکہ اسے عقل اور قوتِ فیصلہ کی طرح ایک مستقل جوہر سمجھنا چاہئے مشیت کی مصالح کے تحت یہ کسی کو کم ملتی ہے کسی کو زیادہ۔ کسی کو بالکل نہیں اور کسی کو خوب وافر۔ جن لوگوں کے ذمہ کسی چھوٹی یا بڑی بستی کا نظم و نسق ہوا ہے ہیں جوھر "مردم شناسی" کی کمی اور بیشی بڑے دور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے،

حضرت عثمان نے نیک دلی اور خیرخواہی کے تحت بنواُمیّہ کے جن افراد پر اعتماد کیا ان میں سے اکثر اگرچہ گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے اور ایک پاک طینت انسان ان پر اعتماد کرلے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں دینی اعتبار سے وہ اعلیٰ اوصاف موجود نہیں تھے جو عوام کو اس نازک سوال کا شافی جواب دے سکتے کہ متعدد جلیل القدر صحابہؓ کے ہوتے ہوئے ان کی ولایت و حاکمیت کا کیا موقعہ ہے؟ مثال کے طور پر وہ کیسے اس پر مطمئن ہو جاتے کہ سعد ابن وقاصؓ جیسے ممتاز صحابی کو جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور جن کو رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے فداك أمي وابي سننے کا شرف حاصل ہے اور جو معرکۂ قادسیہ کے فاتح ہیں معزول کرکے ولید بن عقبہ جیسے شخص کو گورنر بنایا جائے جن کا ماضی بڑی المناک روایات سے داغدار ہے اور وہ کیسے اس پر مطمئن ہو جاتے کہ حضرت عمرؓ کے بنائے ہوئے گورنر عمرو بن العاصؓ کو ہٹا کر عبداللہ ابن ابی سرح جیسے شخص کو حاکم بنا دیا جائے جن کا ماضی داغہائے معصیت سے پاک نہیں اور وہ کیسے اس پر مطمئن ہو جاتے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ جیسے برگزیدہ صحابی کو برطرف کرکے نوجوان عبداللہ ابن عامر کو ولایت سونپ دی جائے جن کے منھ سے بقول شخصے ابھی دودھ کی بو آرہی ہے۔

پھر بڑی مشکل یہ تھی کہ ولید اور یہ دونوں عبداللہ حضرت عثمانؓ کے رشتے کے بھائی ہوتے تھے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ معزولیاں بے قصور ہوئی تھیں۔ نہیں۔ حضرت عثمانؓ نے کسی نہ کسی قصور ہی پر گورنروں کو الگ کیا تھا، لیکن عقلی و نقلی شواہد بتاتے ہیں کہ یہ قصور جن لوگوں کی شہادتوں سے ثابت ہوتے تھے وہ اس لائق نہیں تھے کہ ان پر اعتماد کرلیا جاتا۔ پھر اس اعتماد کے نتیجے میں سعدؓ، عمروؓ اور ابو موسیٰؓ رضی اللہ عنہم کی جگہ جنھیں دی گئی وہ بھی اس درجہ قابلِ اعتماد نہ تھے جتنا اعتماد ان پر کیا گیا۔

اور اس غیر اطمینان بخش صورتِ حال کے سر رشتہ بنو امیہ کے مروان بن الحکم کی شخصیت لوگوں کے لئے پیچ و تاب کا سبب بنی ہوئی تھی۔ اسے حضرت عثمانؓ کے میر منشی یا کاتب یا سیکریٹری کی حیثیت حاصل تھی۔ قلبِ عثمان میں موجزن اقربا پروری اور مروت کے پاکیزہ جذبات کو اس نے بڑی عقلمندی سے اپنے مقصد کی راہ پر لگایا اور یہ مقصد تھا تختِ حکومت پر بنو امیہ کی اجارہ داری۔ سعید بن عاص اور معاویہ بن عامر کے تعاون سے یہ حضرت عثمان کی نیک دلی اور فیاضی کو اس چالاکی سے استعمال کررہا تھا کہ بعض مرتبہ تو اُن وعدوں تک معطل کرا چھوڑا جو حضرت عثمانؓ نے احتجاج و شکایت کرنے والوں سے کئے تھے۔ متعدد جلیل القدر صحابہ خصوصاً حضرتِ علیؓ سے حضرت عثمانؓ کو کشیدہ و بدگمان رکھنے میں اس اللہ کے بندے سے بڑھ کر کسی کا ہاتھ نہ تھا بڑی عجیب لگتی ہے یہ بات کہ اُن ممتاز صحابہ کو تو اعتماد میں لینے کی کوشش کما حقہ، نہیں کی گئی جن کی دوستی خلیفہ کی ذات کے لئے فولاد کی ڈھال بن سکتی تھی اور اعتماد میں انھیں لیا گیا جو ملک گیری کی راہ میں چاہے پہاڑوں سے ٹکرا سکتے ہوں، لیکن خلیفہ کی ذات کے لئے سر کی بازی نہیں لگا سکتے تھے۔

یہ تھے وہ عوامل و مصادر جنھیں تاریخ نے نمایاں کیا ہے انکے بیان میں ہم نے "حمایتِ عثمان" کا پہلو اختیار نہیں کیا، بلکہ زیادہ رعایت مخالفین عثمان کے نقطۂ نگاہ کی کی ہے۔ اب شاید ہمیں اس کا حق ہے کہ حضرت عثمانؓ کی وہ تقریر نقل کریں جو بتاتی ہے

کہ ان کا دامن دانستہ بے انصافیوں، ارادی حق تلفیوں اور دینی لغزشوں سے پاک وصاف تھا۔ ان پر غلط الزامات لگائے گئے اور افترا پردازیاں کی گئیں۔

خلافتِ عثمانی کے ثلثِ آخر کا واقعہ ہے کہ مصر اور بصرہ و کوفہ سے تین وفد مدینے کے قریب پہنچکر مل گئے۔ حضرت عثمانؓ نے خبر پاکر دو ایسے آدمیوں کو اُن کے پاس بھیجا جنھیں وہ (وفود) اپنا ہم خیال سمجھتے تھے۔ وفود کے لیڈروں نے ان سے کہا کہ ہم خلیفہ سے فرضی شکایات بیان کرکے ان کے تدارک کا مطالبہ کرنے آئے ہیں۔ ظاہر ہے جب شکایات فرضی ہیں تو ان کا تدارک کیا ہو سکے گا۔ ہم لوٹ کر اپنے اپنے شہروں میں یہ بات پھیلائیں گے کہ ہم نے خلیفہ سے اصلاحِ حال کا مطالبہ کیا تھا مگر انھوں نے ٹھکرا دیا۔ اور پھر اگلے حج کے موقع پر کافی جمعیت ساتھ لیکر آئیں گے اور خلیفہ کو معزول یا قتل کردیں گے۔

مخالفینِ عثمانؓ لیڈروں کے اعترافِ کذب کی اس روایت کو درست نہیں مانتے۔ خیر ہمیں اس پر اصرار نہیں، ہم صرف وہ تقریر نقل کرتے ہیں جو حضرت عثمانؓ نے ان فتنہ پردازوں کے سامنے کثیر مہاجرین و انصار کی موجودگی میں کی اور جسے تاریخ کے صفحات سے کوئی نہیں کھرچ سکتا۔

ارشاد فرماتے ہیں:۔

(۱) لوگ کہتے ہیں کہ میں رشتہ داروں سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اور انھیں عطیات دیتا ہوں۔ رشتہ داروں سے محبت کرنا جرم و گناہ نہیں ہے مگر اس محبت کے جوش میں میں نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ میں بیت المال سے جائز حد تک ان کے حقوق ادا کرتا ہوں اور زائد عطیات اپنے ذاتی روپے سے دیتا ہوں۔ بیت المال کی دولت کو میں نے اپنے یا رشتہ داروں کے لئے ہرگز جائز نہیں سمجھا۔ تم لوگ جانتے ہو کہ میں رسول اللہؐ اور شیخین کے زمانے میں بھی اپنے رشتہ داروں کو بیش بہا عطیات دیا کرتا تھا۔ حالانکہ اس وقت دولت جمع رکھنے کی مجھے ضرورت تھی اور اب تو میں اپنی خاندانی عمر طبعی کو پہنچ گیا ہوں۔ زندگی ختم ہو رہی ہے تو دولت جمع رکھنے کی حرص کا کیا موقع ہے۔ میں نے کسی شہر پر مناسب حد سے زیادہ خراج نہیں لگایا ہے اور ہر جگہ کا خراج وہیں کی ضروریات میں صرف کرادیتا ہوں میرے پاس تو صرف خمس جمع رہتا ہے جس کے صرف پر مسلمانوں کو پورا اختیار حاصل ہے۔ اللہ کے مال میں سے ایک پیسہ بھی غلط جگہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ خود میں اس میں سے کچھ نہیں لیتا یہاں تک کہ اپنی معاش کا بھی بوجھ میں نے اس پر نہیں ڈالا۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ میں نے چراگاہیں مخصوص کرلی ہیں۔ باللہ العظیم میں نے صرف ان چراگاہوں کو مخصوص کیا ہے جو مجھ سے قبل ہی مخصوص کردی گئی تھیں۔ یہ صدقے کے جانوروں کے لئے خاص ہیں۔ پھر کسی کو ان سے فائدہ اُٹھانے سے بھی روکا نہیں جاتا اِلّا یہ کہ کوئی شخص رشوت دے کر اپنے حق سے زائد حاصل کرنا چاہے۔ خود میں ان سے کیا فائدہ اُٹھاؤں گا جب کہ میرے پاس صرف دو اونٹ ہیں جو سفرِ حج کے لئے رکھ چھوڑے ہیں، حالانکہ تم جانتے ہو خلافت سے پہلے عرب بھر میں سب سے زیادہ مویشی میرے پاس تھے۔

(۳) اعتراض کیا جاتا ہے کہ میں نے نوعمروں کو والی بنادیا ہے۔ لیکن یہ تو دیکھو یہ لوگ بہادر، اہل اور کام کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ہیں اور نوعمری کوئی عیب نہیں۔ مجھ سے پہلے خود رسول اللہؐ نے اسامہؓ کو جو میرے بنائے ہوئے ہر والی سے کم عمر تھے سالار مقرر کیا تھا۔

(۴) لوگ کہتے ہیں کہ میں نے منیٰ میں قصر کے بجائے پوری نماز پڑھی جب کہ رسول اللہؐ اور شیخین یہاں قصر کیا کرتے تھے، لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ مکہ میں میرے اہل و عیال تھے اور وہاں پہنچکر میں اقامت کی نیت کرچکا تھا۔ میں نے رسول اللہؐ سے سُنا ہے کہ کوئی شخص جب اقامت کی نیت کرلے تو پوری نماز پڑھے۔

(۵) اتہام اُٹھایا جاتا ہے کہ میں نے اپنے حاشیہ نشینوں کو ناجائز طور پر زمینیں بخش دیں حالانکہ حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ جو مقامات فتح ہوئے وہاں مہاجرین و انصار کو زمینیں ملیں، کچھ لوگ وہیں رہ گئے کچھ یہاں واپس آگئے۔ واپس آنے والے اپنی زمینوں سے نفع نہ اُٹھا سکتے تھے، اس لئے میں نے ان کی منفعت کے پیشِ نظر ان کی دُور افتادہ زمینوں کو وہاں کے مقامی لوگوں کے ہاتھ بیچ دیا اور ان کا روپیہ مالکوں کے حوالے کردیا۔

(۶) شکوہ کیا جاتا ہے کہ میں نے مصحف (قرآن) ایک کرکے باقی مصاحف کو ختم کردیا۔ حالانکہ قرآن ایک ہی کتاب ہے جو ایک ہی خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ ممتاز صحابہؓ موجود ہیں جنھوں نے رسول اللہؐ کی ہدایت کے مطابق اسے قلمبند کیا ہے۔ میں نے انھی کے قلمبند کئے ہوئے

قرآن کو جگہ جگہ بھیجا ہے۔

(۷) طعن کیا جاتا ہے کہ میں نے اُس حَکَم بن العاص کو مدینے بلالیا جسے رسول اللہؐ نے طائف میں جلا وطن کر دیا تھا حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ ہی نے اسے جلا وطن کیا تھا اور آپؐ ہی نے میرے کہنے پر اسے مدینے لوٹ آنے کا اذن مرحمت فرما دیا تھا۔ میں نے اپنے زمانے میں آپ کے اسی اذن کو نافذ کیا ہے۔

(۸) الزام لگایا جاتا ہے کہ میں نے اپنے بھائی عبداللہ بن ابی سرح کو افریقہ کا مالِ غنیمت بطور انعام دیدیا۔ یہ غلط ہے۔ میں نے انھیں صرف پچیسواں حصہ (خمس کا خمس) دیا تھا۔ رسول اللہؐ اور شیخینؓ نے بھی اپنے زمانے میں ایسا کیا ہے، مگر جب مجھے پتا چلا کہ لشکری اس سے ناخوش ہیں تو میں نے عبداللہؓ سے یہ روپیہ واپس لیکر لشکر ہی میں بانٹ دیا۔

اس تقریر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا موقف دین و شریعت کے پہلو سے کتنا مضبوط تھا اور مخالفین کی بدگمانیاں مبالغہ آمیز سوءِ ظن کی کتنی منزلیں طے کر گئی تھیں۔ بعض مؤرخین نے اس تقریر کو مکالمے کے انداز میں بیان کیا ہے یعنی مخالفین اعتراض کرتے اور حضرت عثمانؓ جواب دیتے۔ صحیح صورتِ حال کچھ بھی ہو یہ حل بالکل ظاہر ہے کہ فضا بے حد مکدّر ہو چکی تھی اور حضرت عثمانؓ کے ہر فعل و عمل کو بدگمانی کی اس عینک سے دیکھا جا رہا تھا جو اچھے گوشوں کو دباتی اور بُرے پہلوؤں کو اُبھارتی ہے۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کوئی قدم نہایت نیک نیتی سے اٹھاتا ہے، مگر وہ دوسروں کے لئے نقصان کا باعث بن جاتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کسی اقدام کے مفید پہلوؤں کا لحاظ کر کے اس پر عمل کرتا ہے، لیکن اس میں بعض مضرت رساں پہلو بھی ہوتے ہیں اور انھیں یا تو وہ محسوس ہی نہیں کر پاتا یا محسوس کر لیتا ہے تو افادیت کے مقابلہ میں قابلِ لحاظ نہیں سمجھتا اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی اقدام سے دو طرح کے نتائج کا امکان ہو اور آدمی ایک نتیجے کے امکان کو مقابلتاً قوی سمجھے مگر مستقبل یہ بتائے کہ اس کا قیاس درست نہیں تھا اور نتیجہ وہ برآمد ہوا جسے اس نے غیر قوی اور بعید سمجھا تھا۔

اسی طرح کی تمام صورتوں میں آدمی کے حسنِ نیت اور اخلاص کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب اسے اس کے اقدام و عمل کے ناپسندیدہ اثرات و ثمرات پر توجہ دلائی جائے۔ اگر وہ ضد، نخوت اور بات کی پیچ پر اُتر آتا ہے تو سمجھئے اس کی نیت مشتبہ اور اخلاص مجروح ہے، لیکن اگر تاسف، ندامت اور تلافیِ مافات کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو سمجھئے کہ اس کی نیت درست اور اخلاص غیر مشکوک ہے۔

حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں تاریخ متعدد نظائر ایسے پیش کرتی ہے کہ ان کے حسنِ نیت، خلوص اور للّٰہیت میں اہلِ انصاف کیلئے شمہ برابر شک و شبہہ باقی نہیں رہ جاتا۔

قبول حق میں بے عذری

مثلاً جب بلوائی مدینے کی سرحد پر پہنچے ہوئے تھے تو حضرت علیؓ اور بعض دیگر صحابہؓ نے حضرت عثمانؓ کو مشورہ دیا کہ عبداللہ ابن ابی سرح کو معزول کر دیجئے۔ انھوں نے ایک سچے طالبِ اصلاح کی طرح پوچھا کہ اور کسے والی بناؤں؟ صحابہؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کا نام لیا۔ انھوں نے بلا تامل تقرری کا پروانہ لکھ کر دیدیا۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد بن ابی بکرؓ دل سے مخالفینِ عثمان میں سے ہوں، لیکن مشورہ دینے والے صحابہ کو اس کا علم نہیں تھا اور انسان اپنے علم ہی کی حد تک مکلف ہے۔

یا مثلاً جب مختلف صوبوں سے عمّال کی شکایات کے خطوط آنے لگے تو حضرت عثمانؓ نے فوراً عوام کے نام اس مضمون کا منشور جا بجا بھیجا کہ میں نے تمام عمّال کو حکم بھیجا ہے کہ اب کی حج میں سب آئیں جن لوگوں کو جس عامل سے جو شکایت ہو اسے برملا بیان کرے۔ ہر شخص کا جائز حق ادا کیا جائے گا اور جائز شکایات کی تلافی کی جائے گی۔

یا مثلاً ایک بار آپ نے مسجد میں تقریر کی جس میں فرمایا کہ اگر مسلمانوں کی خیر خواہی میں مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے یا میرا کوئی اقدام نقصان کا سبب بنا ہے تو میں خدا سے اس کی مغفرت چاہتا ہوں۔ آپ حضرات میں جو لوگ معاملات کا فہم اور سوجھ بوجھ رکھتے ہوں وہ مجھے نیک مشورہ دیں۔ خدا کی قسم اگر دیانت و حقانیت کیساتھ مجھ سے غلاموں جیسی فرماں برداری کا مطالبہ کیا جائے تب بھی میں انکار نہ کروں گا۔ میرا حتمی وعدہ ہے کہ آپ حضرات کی مرضی اور خوشنودی کے مطابق کام کروں گا اور مروان وغیرہ کی باتوں میں

نہ آؤں گا۔

یہ کہہ کر حضرت عثمانؓ رو پڑے اور حاضرین بھی رونے لگے۔

یا مثلاً مفسدین کے مدینے پہنچ جانے پر حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ انھیں سمجھائیں اور فتنہ و فساد سے روکیں اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے کتنی ہی بار آپ کو سمجھایا کہ بنو امیہ کی طرف داری میں حد سے آگے نہ بڑھیئے۔ مگر آپ نے نہیں مانا اور مروان اور معاویہ بن عامرؓ وغیرہ کے مشورہ پر چلتے رہے۔ اب میں مفسدین کو کیسے سمجھاؤں اور کیونکر فتنے سے باز رکھوں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ میں آئندہ آپ ہی کے مشورے پر عمل کیا کروں گا اور ان لوگوں کی نہیں سنوں گا۔

یا مثلاً جب عبداللہ بن عامر اور ولید بن عقبہ جیسے لوگوں کی گورنری پر لوگوں نے سخت اعتراض کیا تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں نے تو ان لوگوں کو اہل سمجھ کر والی بنایا ہے اور میرے علم کی حد تک یہ لوگ حسن انتظام اور قابلیت سے کار مملکت چلا رہے ہیں لیکن پھر بھی آپ لوگوں کی رائے انھیں معزول کرکے دوسروں کو ان کی جگہ متعین کرنے کی ہو تو میں اس پر بالکل تیار ہوں۔

اسی طرح کی بہت سی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ اصلاح حال کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ نہ انھیں اپنے اقتدار پر گھمنڈ تھا نہ نخوت، نہ وہ تعصباً کسی کو دکھ پہنچانا چاہتے تھے نہ انھوں نے دین و دیانت سے تجاوز کیا تھا۔ ہاں ان کے مزاج و طبیعت کے جو تقاضے دین و دیانت کے دائرے سے باہر نہ تھے، بلکہ اصولی حیثیت سے استحسان و محمودیت رکھتے تھے ان سے دست بردار ہونے کو وہ تیار نہ تھے۔ اسی لئے انھوں نے فرمایا:۔

"میں جانتا ہوں کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنے عزیزوں پر نوازشیں نہیں کیں، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رشتہ داروں کا بہت خیال رکھتے اور ان کو نمایاں طور پر نوازتے رہتے تھے۔ میرے رشتہ دار غریب ہیں، ضرورت مند ہیں، میں ان سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آتا ہوں۔ اگر کوئی اس حسن سلوک کو ناجائز ثابت کردے تو میں اسے ترک کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

بے نظیر عزم و ہمت

شجاعت اور عزم و ہمت کی ایک قسم تو وہ ہے جو آدمی کو ملک گیری و کشور کشائی پر ابھارتی ہے۔ جو مٹھی بھر فوجوں کو دس گنی طاقت سے ٹکرا دیتی ہے۔ جو تلوار کی کاٹ سے کشتوں کے پشتے لگاتی ہے۔ یہ قسم بےشک خراج تحسین کی مستحق ہے اور اس نے دنیا سے اپنا لوہا منوا لیا ہے، لیکن وہ دوسری قسم اس سے زیادہ قابل رشک بلکہ حیرت انگیز ہے جس میں آدمی فتنہ و شر کو دبانے کی خاطر اور خونریزی سے محترز رہنے کی نیت سے اس وقت اپنا سر بے چون و چرا پیش کر دیتا ہے جس وقت یہ بات عین ممکن ہوتی ہے کہ وہ تلوار اٹھائے اور سر بچالے۔ پہلی قسم کی مثالیں دنیا میں بہت ہیں لیکن دوسری قسم کی نظیریں شاذ و نادر ہی مل سکتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کو ہم اس دوسری ہی قسم کی تعجب خیز شجاعت، عزم و ہمت اور پامردی کا مجسمہ پاتے ہیں۔

فتنوں کا عروج ہے۔ حضرت معاویہؓ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ میرے ساتھ شام چلئے۔ یہاں آپ محفوظ نہیں ہیں۔ حضرت عثمان جواب دیتے ہیں کہ جان کے خوف سے میں جوار رسول کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اب حضرت معاویہ کہتے ہیں کہ تو پھر میں شام سے کچھ فوج بھیجدوں جو مدینہ رہ کر آپ کی حفاظت کرے۔ حضرت عثمان غور کرتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ مدینے جیسے معظم شہر کو فوجی چھاؤنی بنا دینا اور رسول اللہؐ کے صحابہؓ پر لشکر مسلط کر دینا کچھ اچھا طریقہ نہیں ہے۔ پس انکار فرما دیتے ہیں۔ حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ آپ دھوکا کھائیں گے! حضرت عثمانؓ جواب دیتے ہیں حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل۔

ذرا دیکھئے۔ اسی سال کا عمر رسیدہ خلیفہ خطرات کی کس فضا میں کیا جواب دے رہا ہے۔ کیسی استقامت اور شجاعت و توکل ہے اس کے جواب میں۔

فتنے جواں ہو چکے ہیں۔ مجلس شوریٰ منعقد ہے۔ سعید بن عاص کہتے ہیں:۔

"اس فتنے کے سرغنوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔"

عبداللہ ابن ابی سرح مشورہ دیتے ہیں:۔

"مفسدین مال و زر کے لالچی ہیں۔ کیوں نہ انھیں مال و دولت

سے رام کیا جائے۔"

عبداللہ بن عامر رائے پیش کرتے ہیں:۔

"کسی ملک پر چڑھائی کر دی جائے تو سب لوگ ادھر لگ جائیں گے اور داخلی فتنہ دب جائے گا۔"

حضرت معاویہؓ فرماتے ہیں:۔

"مناسب بات یہ ہے کہ ہر صوبہ کا گورنر اپنے صوبے کے امن و امان کی ذمہ داری لے۔ اپنے صوبے کا پورا ذمہ دار میں ہوں۔"

اور واقعی حضرت معاویہؓ کی رائے نہ صرف مناسب اور سنجیدہ فکر و تدبر کی حامل تھی بلکہ وہ واحد رائے تھی جسے کسی ذمہ دار عامل اور سیاست داں کے شایانِ شان کہا جا سکتا ہے۔ باقی آراء کا نسبتاً کمتر ہونا کسی بحث کا محتاج نہیں۔

لیکن بحث ان مشوروں کی صحت و عدم صحت سے نہیں، بلکہ مقصود وہ جواب ہے جو حضرت عثمانؓ نے دیا وہ فرماتے ہیں:۔

"آپ لوگوں کی باتیں میں نے سن لیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ فتنہ کہیں وہی فتنہ نہ ہو جس کی خبر رسول اللہؐ نے دی تھی۔ اگر وہی ہے تو یہ دبنے والا نہیں ہے۔ میں حتی المقدور سعی کروں گا کہ نرمی، خیر خواہی اور درگذر کے ذریعہ اس کی راہ روکوں میں اپنے عمل سے واضح کردوں گا کہ میں نے مخلوقِ خدا سے حسنِ سلوک میں کوتاہی نہیں کی اور کل بارگاہِ الٰہی میں اپنے اوپر الزام نہیں آنے دوں گا۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس فتنے کی چکی گھوم کر رہے گی، لیکن میں اپنے آپ کو لائقِ مبارک باد سمجھوں گا اگر جان دیدوں لیکن اس چکی کو حرکت دینے میں شریک نہ ہوں۔"

اندازہ کیجئے۔ جس وقت خلیفہ کے لئے اپنے بچاؤ اور خلافت کے تحفظ کی متعدد راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ جس وقت مخالفین کی سرکوبی کے لئے سب کچھ کیا جا سکتا تھا، جس وقت ایک جاہ پسند اور دنیادار بادشاہ حریفوں پر ٹوٹ پڑنے اور خون کی ندیاں بہا دینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتا اس وقت یہ عمر رسیدہ، نیک دل، رقیق القلب اور حق کوش خلیفہ کیسے بے مثال صبر و استقامت اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کر رہا ہے اور کس کی خاطر؟ صرف عوام کی فلاح اور ملت کی بہبودی کی خاطر۔ عاقبت کے نقطۂ نظر سے۔ اللہ اور رسول کی خوشنودی کا لحاظ کرکے۔

حالانکہ اگر وہ سرغنوں کو قتل کرتا تو یہ کوئی بے دینی کی بات نہ ہوتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اس ارادے سے کھڑا ہو کہ تمہاری جماعت میں تفرقہ ڈالے جبکہ تم کسی ایک شخص پر متفق اور مجتمع ہو چکے ہو تو اس کو قتل کر ڈالو۔ مفسدین و مخالفین اس حدیث کی زد میں تھے اور حضرت عثمانؓ صحابہؓ کے تعاون سے بہت کچھ کر سکتے تھے، لیکن وہاں تو فکرِ آخرت اور قوم و ملت کی بہی خواہی کے سوا کوئی جذبہ ہی نہ تھا۔ تلوار کیسے اٹھاتے۔

فتنے کی آگ پوری طرح بھڑک چکی ہے۔ مفسدین خلیفہ کے مکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہؓ خلیفہ سے عرض کرتے ہیں۔

"یا امیر المومنین! آپ خطرے کی آخری سرحد پر ہیں۔ تین صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار فرمائیے۔ یا تو باہر نکل کر محاصرین سے لڑیئے۔ جاں نثاروں کی معتدبہ تعداد آپ کے لئے جان کی بازی لگانے کو تیار ہے۔ یا پھر صدر دروازے کے علاوہ کسی اور طرف سے نکل کر مکے چلے چلئے۔ دیوار میں راستہ پھوڑا جا سکتا ہے۔ مکہ میں آپ پر مفسدین کا داؤ نہیں چل سکے گا۔ یا پھر شام چلے جائیے وہاں معاویہؓ اور دیگر معاونین موجود ہیں۔"

حضرت عثمانؓ جواب دیتے ہیں:۔

"پہلی شکل تو اس لئے منظور نہیں کہ میں وہ پہلا خلیفہ بننا پسند نہیں کرتا جو مسلمانوں کے لہو سے اپنی تلوار رنگین کرے۔ دوسری شکل اس لئے قبول نہیں کرتا کہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے ایک شخص مکے کی بے حرمتی کرے گا اور ساری دنیا کے عذاب کا نصف حصہ اس کے سر پڑے گا میں نہیں چاہتا کہ میری ذات سے مکے کی بے حرمتی کا خطرہ پیدا ہو۔ تیسری شکل اس لئے رد کرتا ہوں کہ رسول اللہؐ کے دار الہجرۃ اور جوارِ عزت کو کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

اس جواب میں اگر کوئی شخص ایک عجیب و غریب اولوالعزمی، ایک حیرتناک پامردی، ایک بے نظیر استقامت، ایک بلند ترین جذبۂ حبِ رسول اور ایک لاثانی عزم و حوصلہ نہیں دیکھ پاتا تو اسے کور چشم

سکے سوا کیا کہیں گے۔

آخر کار اللہ کے اس پاکباز بندے نے جان دے ہی دی اور اپنے مقدس دامن کو فساد و شر کے ہر داغ سے بچاتے ہوئے شہادت کی عظمتوں کو سمیٹے اپنے رب سے جا ملا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ عوام ان سے راضی نہیں ہیں تو انھیں خلافت سے دستبرداری دیدینی چاہیئے تھی۔ گذارش یہ ہے کہ وہ کس شرعی دلیل سے ایسا کرتے۔ رسول اللہؐ یا شیخین کے اسوے میں قولاً یا عملاً کہاں یہ حکم ملتا تھا کہ اگر رعایا مطالبہ کرے تو خلیفہ کو دست برداری دیدینی چاہیئے۔ آج ممکن ہے آپ جمع شدہ احادیث میں تفحص کر کے یہ قانون بنا لینے میں حق بجانب ہوں کہ عام بیزاری کی صورت میں خلیفہ یا تو مستعفی ہو یا معزول کر دیا جائے، لیکن یہ کہنا کیونکر درست ہوگا کہ حضرت عثمانؓ کو بھی اس قانون کا لحاظ رکھنا چاہیئے تھا جب کہ رسول اللہؐ کے بعض ارشادات انھیں یہ اشارہ دے گئے تھے کہ جان دیدینا مگر خلافت کی قمیص کو اپنے ہاتھ سے نہ اُتارنا۔ یہ بحث تو ہو سکتی ہے کہ انھوں نے جن ارشاداتِ رسول کا جو مطلب سمجھا کیا وہی انکا مطلب تھا یا کسی اور مفہوم کی بھی ان میں گنجائش تھی، لیکن یہ بحث کیسے ہو سکتی ہے کہ جو مطلب انھوں نے سمجھا تھا وہ نہیں سمجھنا چاہیئے تھا۔

گہری تہیں

فتنوں کی باب در باب داستان میں عبداللہ بن سبا کا بھی ایک قصہ ہے۔ محمد بن ابی حذیفہؓ اور محمد بن ابی بکرؓ کی بھی ایک داستان ہے۔ ابوذر غفاری اور عمار بن یاسر کی بھی ایک روداد ہے اور اُن لغویات کا بھی ایک افسانہ ہے جو حضرت علیؓ کو مخالفینِ عثمان کے پیراہن میں دکھاتی ہیں۔ پھر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی مسلکِ عثمانی سے اتفاق نہ رکھ سکے جنھوں نے انھیں خلیفہ چُنا تھا اور وہ طلحہؓ تو مخالفت میں کافی آگے نکل گئے جو حضرت عمرؓ کی نامزد کردہ چھ آدمیوں کی کمیٹی کے ایک فرد تھے اور شریکِ انتخاب نہ ہو سکے تھے۔ علاوہ ازیں کتنے ہی اور عالی مقام صحابہؓ عثمانی سیاست سے ناخوش نظر آتے ہیں اور یہی وہ نشیب تھا جس میں فتنہ و فساد کا پانی مر گیا۔ ورنہ ایک ہزار نہیں دس ہزار دشمن بھی مدینے پر چڑھ آتے تو بدر و اُحد اور حُنین و احزاب کے میدان دیکھی ہوئی تلواریں سامنا کئے بغیر نہ رہتیں۔ حضرت عثمانؓ تک پہنچنے کے لئے نہ جانے کتنے سروں کو گردنوں سے جُدا ہونا پڑتا اور پھر بھی لاشوں ہی پر چل کر دولت کدۂ عثمانی تک پہنچنا ممکن تھا۔ قیامت ہے۔ چالیس دن محاصرہ رہے اور عظیم مملکت کا معظم حکمراں اس بے سہارا قیدی کی طرح مجبور پڑا رہے جس کا کوئی دستگیر نہ ہو۔ گویا صوبوں کے گورنروں کا سارا کس بل، طنطنہ، سرگرمی، پیش رفتی اور جوش و خروش نئی زمینوں کو روندنے اور فتح کرنے ہی کے لئے تھا۔ خلیفہ کی جان بچانے کے لئے نہ انکی تلواروں میں دھار تھی۔ نہ پیروں میں تیز رفتاری کی طاقت، نہ حفظ و انتقام کا جذبہ، نہ ان کے کان بروقت یہ اطلاع سن سکے تھے کہ خلیفہ گھیر لیا گیا ہے، نہ وہ اُن برق رفتار گھوڑوں کو اصطبل سے کھول کر مدینے کی راہ پر ڈال سکتے تھے جو فتوحات کی راہ میں آندھی اور طوفان بنکر دوڑنا جانتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کوفہ و بصرہ وغیرہ سے جو فوجی گروپ خلیفہ کی مدد کے لئے مدینے کی طرف بھیجے گئے تھے انھوں نے جب راستے ہی میں یہ سُن لیا کہ خلیفہ شہید ہو چکے ہیں تو مجبوراً لوٹ گئے۔ ذرا اندازہ کیجئے اس قول کی سادہ لوحی کا۔ گویا شہادتِ امیر ایک ایسا معمولی واقعہ تھا کہ جب یہ ظہور پذیر ہو چکا تو اب فوجیوں کو گھر جا کے آرام کرنا چاہیئے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر خلافتِ عثمانی کے وقار کو عوامی بدگمانیوں اور نفسانیتوں نے بالکل کھا نہ لیا ہوتا تو اوّل تو شہادتِ عثمانؓ کا واقعہ ہی نہ پیش آتا اور پیش آتا تو باغیوں کے لہو سے زمین رنگین ہوئے بغیر نہ رہتی۔ ہمیں بادلِ ناخواستہ ماننا چاہیئے کہ حضرت عثمانؓ کی سیاست اور مسلک نے عوام کو مٹھی میں نہیں لیا اور جن لوگوں پر انھوں نے یہ سمجھ کے مہربانیاں کی تھیں کہ وہ شریف ہیں وہ واقعۃً اتنے شریف نہیں نکلے۔ دولت کی بہتات جن پیچ در پیچ اور بے حساب خرابیوں کو جنم دیتی ہے اُن سے جنگ کرنے کا واحد راستہ وہی ہے جو شیخین نے اختیار کیا تھا۔ عطاء، نرمی اور درگذر بے شک دلوں کو رام کرنے کے بہترین ہتھیار ہیں، لیکن ان کی کامیابی ان لوگوں کی شرافت پر منحصر ہے جن پر انھیں استعمال کیا جائے۔ دولت جب خودغرضی، مفاد پرستی اور حرص و ہوس کی آگ سلگا دے تو شریف بھی شریف نہیں رہ پاتے۔ حضرت عثمانؓ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمیاں، رافتیں، اور سیر چشمیاں دیکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مناسب سمجھا کہ متغیر شدہ حالات کی پرواہ کئے بغیر اپنے رسولؐ ہی کی سی کریمی و فراخدستی اختیار کریں۔ یہ بات اپنی روح کے اعتبار سے ٹھیک ویسی ہی تھی جیسی ابوبکر صدیقؓ کی یہ بات کہ ہم نوعمر اسامہؓ کو ضرور امیر لشکر رکھیں گے جبکہ رسول اللہؐ نے

انھیں امیر بنایا تھا اور مانعین زکوٰۃ سے ضرور لڑیں گے جبکہ ان کا طریقہ سرکشی کے تیور لئے ہوئے ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وصالِ حضورؐ کے بعد امارت کی سرداری پر صحابہؓ میں اختلاف پایا جاتا تھا اور سب جانتے ہیں کہ مانعین زکوٰۃ سے یکلخت لڑجانے کو عمر ابن الخطابؓ جیسا جگر اور سخت گیر بھی اولاً مناسب نہیں سمجھتا تھا، لیکن ابوبکرؓ نے دونوں ہی معاملوں میں اپنی بات منوا کے چھوڑی اور چونکہ نتائج قوم و ملت کے حق میں مفید نکلے اس لئے ان کے اقدامات بحث و اختلاف کا ہدف بننے سے رہ گئے۔ حضرت عثمانؓ کے لئے مشیت کا یہی فیصلہ تھا کہ وہ جو اقدامات نیک نیتی اور اتباعِ سنت کے تحت اٹھائیں وہ مادی اعتبار سے خوشگوار ثمرات کے حامل نہ ہوں اور دنیا کو بحث و اختلاف کا موقعہ مل جائے

چند روایات کا حلیہ

کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ ابن مسعودؓ کو مارا، اتنا مارا کہ ان کی پسلی ٹوٹ گئی۔ ان کا وظیفہ بند کر دیا اور مدینے میں نظر بند رکھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بوڑھے عمار بن یاسرؓ کو بھی دو دفعہ مارا۔ ایک دفعہ اتنا کہ وہ بیہوش ہو گئے اور ایک بار اتنا کہ انھیں مستقل ایک مرض لگ گیا۔

اس طرح کی روایات کس حد تک مبالغہ آمیز ہیں اور واقعات کے بیان میں کتنی تلبیس ہوئی ہے اس سے قطع نظر ہم صحابہؓ کے مشاجرات و تنازعات پر سنگدلانہ بے تکلفی سے گفتگو کرنے والوں کی خدمت میں قرآن کی وہ آیت پیش کریں گے جو امام مالکؒ نے صحابہؓ کے عیوب و اسقام کا ذکر کرنے والوں کے آگے تلاوت کی تھی:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ

محمد اللہ کے رسول ہیں اور انکے ساتھی کافروں کے حق میں سخت اور آپس میں نرم ہیں۔ تو ان کو رکوع و سجود میں مشغول دیکھتا ہے وہ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے رہتے ہیں سجدوں کے اثر سے ان کی نشانی انکے چہرہ پر نمایاں ہے۔

کیا اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ صریح ارشاد مومنین کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ جب وہ تاریخ میں صحابہؓ کے باہمی اختلافات و نزاعات کا حال پڑھیں تو آپے سے باہر نہ ہو جائیں۔ تاریخوں کا اول تو سند کے اعتبار سے وہ پایہ نہیں جو کتبِ احادیث کا ہے اور جس پر بڑی حد تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے تاریخ لکھنے والے بہرحال انسان تھے ان سے واقعات کے بیان میں ارادی اور غیر ارادی بھول چوک بھی ہو سکتی تھی۔ تیسرے اُموی اور ہاشمی خاندانوں کی معروف چشمک کا لحاظ کرتے ہوئے ایک سمجھدار آدمی کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جن مؤرخین کا مرتبہ و مقام اور کردار و عمل ان کی ثقاہت و صداقت کا یقین دلاتا ہے وہ بھی اس چشمک سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر واقعات کے بیان میں جانبداری برت سکتے تھے۔ چوتھے اللہ تعالیٰ جن کے رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ہونے کی خبر دے رہے ہوں ان کے باہمی نزاع اور جھگڑے کو ایسے ہی زاویہ نظر سے دیکھنا مناسب ہو سکتا ہے جس سے آیتِ قرآنیہ کی لاج رہ جائے۔ ورنہ حق کوشی یا حبِ اہلِ بیت کے جوش میں فرمودۂ ربانی ہی کی تخفیف کر دی گئی تو اس سے عذابِ آخرت کے سوا کیا نفع حاصل ہوگا۔ حق کوشی اور حُبِ اہلِ بیت کے عوض اُسے شرپسندی اور عداوتِ دین ہی کا نام دینا چاہئے جس میں رسول اللہؐ کے عالی مقام صحابہؓ پر طنز و طعن اور عناد و کدورت کا اظہار ہو۔ صحابیت کی عظمت ایک مقدس ترین نورانی حصار ہے جو رسول اللہؐ کے ایوانِ رفعت کے گرد اس لئے کھنچا ہوا ہے کہ اس ایوانِ رفعت میں قدم رکھنے والے پہلے آدابِ حضوری سے باخبر ہو جائیں۔ اس حصار کو جو توڑے گا وہ ہرگز ہرگز بارگاہِ رسول میں مقبول و محترم نہیں ہو سکتا۔

یہ تو اصولی بات تھی۔ اب مذکورہ دونوں قصوں کے متعلق بھی کچھ عرض کر دوں۔

روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ عبداللہ ابن مسعودؓ ہر جمعرات کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ دورانِ وعظ میں فرمایا کرتے ہے۔

"سب سے سچی بات کتاب اللہ ہے۔ بہترین سیرت سیرتِ محمدی ہے، بدترین کام نئی باتیں ہیں، ہر نئی بات بدعت ہے ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی آگ میں جائے گی۔"

کوفے کے گورنر ولید بن عقبہ نے حضرت عثمانؓ کو خط میں لکھا کہ یہ آپ پر چوٹ ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ انھیں مدینے بھیج دو۔ وہ بھیجے گئے۔ جس وقت پہنچے حضرت عثمانؓ مسجد میں خطبہ دے

رہے تھے۔ انھوں نے ابن مسعودؓ کے لئے ایک سخت لفظ استعمال کیا۔ ابن مسعودؓ نے جواب دیا میں ایسا نہیں ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے بھی باواز بلند کہا کہ عثمانؓ آپ رسول اللہؐ کے صحابی کو ایسی بات کہتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے نرمی نہیں برتی بلکہ ابن مسعودؓ کو نہ صرف مسجد سے نکلوا دیا' بلکہ زمین پر اتنی زور سے پٹکوایا کہ ان کی پسلی ٹوٹ گئی۔

اِس روایت کو مختلف مؤرخین نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ ہمیں یہ موقع تو نہیں مل سکا کہ ہر سند کے ہر راوی کی تحقیق کریں' لیکن یہ ضرور تحقیق کیا ہے کہ جن جن ابتدائی راویوں سے یہ روایت چلی ہے ان میں دو طرح کے افراد ہیں' ایک وہ جو حضرت عثمانؓ سے بدگمان تھے اور اس بدگمانی کے باعث ان کی روایت پوری طرح لائق اعتماد نہیں کہی جاسکتی۔ دوسرے وہ جن کی بدگمانی یا خوش گمانی ظاہر نہیں ہوتی۔ گویا خیالات کے اعتبار سے مجہول الحال ہیں۔ دونوں ہی طرح کے افراد کے بارے میں یہ بھی محتاج ثبوت ہے کہ وہ اس واقعہ کے وقت مسجد میں موجود تھے یا انھوں نے بعد میں لوگوں سے سن سُنا کر روایت کردی ہے اگر مؤخر الذکر صورت ہو تو ظاہر ہے کہ روایت کی تفصیلات میں کافی بحث و نظر کی گنجائش ہے اور اگر مقدم الذکر صورت ہو تو یہ بات تصدیق طلب رہ جاتی ہے کہ راوی نے واقعے کو پورا کا پورا بیان کردیا ہے یا کچھ حصہ نظر انداز ہوگیا ہے۔

بہر حال ہمارے لئے یہ تو موزوں نہیں کہ واقعہ کو بالکل ہی جھٹلا دیں لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ نہ تو حضرت عثمانؓ نے ابن مسعودؓ کو زمین پر پٹک دینے کا حکم دیا نہ ان کا زمین پر گرنا ایسا تھا جسے پٹک دیئے جانے کے الفاظ سے تعبیر کیا جائے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اتفاقاً گر گئے اور زیادہ چوٹ آگئی۔ یا ہو سکتا ہے کسی بدنیت اُموی نے انھیں گرادیا ہو حضرت عثمانؓ کی سیرت سے یہ بات بالکل جوڑ نہیں کھاتی کہ وہ ابن مسعودؓ جیسے صحابی کو اس بے رحمی سے مضروب کرنے کا ایما فرمائیں۔ رہا یہ کہ ابن مسعودؓ سے وہ خفا کیوں تھے تو اس کا پتا اُس گفتگو سے چلتا ہے جو ان کے اور حضرت علیؓ کے مابین ہوئی۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ ابن مسعودؓ پر آپ نے ولید کے کہنے سے سختی برتی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔ نہیں ولید کے کہنے سے نہیں۔ میں نے زبید بن کثیر کو خط لکھا تھا' اس کی اطلاع یہ ہے کہ ابن مسعودؓ میرا خون حلال قرار دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا! زبید ناقابل اعتبار آدمی ہے۔ اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے قلب میں ابن مسعودؓ کے خلاف سوءِ ظن جاگزیں ہوگیا تھا۔ اسی لئے ان سے درشتی سے پیش آئے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر طنز و طعن کے دفتر کھولے جائیں آدمی دھوکا بھی کھاتا ہے اور غلط فہمی کا شکار بھی ہوتا ہے۔ وہ لوگ آدمی ہی تھے' فرشتے نہ تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان سے ملکوتی صفات کی اُمید باندھیں۔

وظیفہ بند کرنے اور مدینے سے باہر نہ جانے دینے کی روایات اگر صحیح ہوں تب بھی شریعت کی خلاف ورزی کا الزام حضرت عثمانؓ پر نہیں آتا' کیونکہ اگر خلیفہ کو مختلف ذرائع سے یہ یقین دلا دیا گیا ہو کہ فلاں شخص تمھارے قتل کو جائز بتلاتا ہے اور تمھارے خلاف پروپگنڈہ کرتا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ شخص مذکور پر سختی کرے۔ اس کی وہ مالی امداد روک دے جو بیت المال سے دی جارہی ہو اور کسی ایک شہر میں محدود کردے تاکہ وہ اِدھر اُدھر جاکر بغاوت کی آگ نہ بھڑکا سکے ہمیں پورا یقین ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ مخالفت میں اس قدر آگے نہیں تھے اور کچھ لوگوں نے خاص اغراض کے تحت حضرت عثمانؓ کو ان کے موقف کا غلط نقشہ باور کرادیا تھا' لیکن اس فریب دہی کا بار فریب دینے والوں ہی کے سر ہے اور زیادہ سے زیادہ کچھ ذمہ داری حضرت عثمانؓ کی اُس سادگی اور زود اعتباری پر ڈالی جاسکتی ہے جو شیخینؓ کی طرح محتاط اور چوکنّی نہ تھی۔ وہ بہر حال اپنے خیال و یقین ہی کے مطابق فیصلہ اور اقدام کرنے کے مکلف تھے۔

پھر اس پر بھی توجہ کرنی چاہئے کہ جب ابن مسعودؓ مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو حضرت عثمانؓ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے اور ایک سلیم القلب مومن کی طرح فرمایا کہ اگر تمھیں مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو اس کو معاف کردو۔ ابن مسعودؓ نے معاف کردیا۔ رنجش ختم ہوگئی۔ پھر ابن مسعودؓ کی رحلت ہوئی تو نماز جنازہ حضرت عثمانؓ ہی نے پڑھائی۔

یہاں وہ لوگ جو ابن مسعودؓ پر حضرت عثمانؓ کی شدت کو گہرے سے گہرا رنگ دینا چاہتے ہیں ایک اور ہی قصہ بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کو قطعاً معاف نہیں کیا' بلکہ نہایت کھرے پن سے پیش آئے اور جب حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میرے لئے مغفرت کی دعا کردو۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میرے معاملے میں آپ سے باز پرس کرے۔ پھر حضرت عثمانؓ اُٹھ کر چلے گئے تو ابن مسعودؓ نے وصیت کی کہ عثمان میری نماز جنازہ

نہ پڑھائیں۔

یہ داستان بیان کرنے والے حضرت عثمانؓ پر تو واقعی چوٹ کر گئے، لیکن یہ نہیں سوچا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ بھی زد میں آگئے ہیں۔ ذرا فیصلہ دیجئے اُس شخص کی اخلاقی حالت کے بارے میں لوگوں کے کیا احساسات ہوں گے جو مرتے مرتے بخل اور تنگدلی کا دامن نہ چھوڑے اور رسول اللہ ﷺ کے داماد کے خلاف غم و غصہ اور عناد لئے دنیا سے رخصت ہو۔ ابن مسعودؓ کچھ معمولی آدمی نہ تھے۔ صحابہ میں سب سے بڑھ کر حافظ قرآن اور سب سے زیادہ راوی قرآن وہی تھے۔ دونوں ہجرتوں کا شرف حاصل کیا تھا۔ بدر و اُحد میں جان لڑائی تھی۔ حضور کی خدمت گذاری اس طرح کی تھی کہ اہل بیت ہی کا ایک فرد شمار ہوتے تھے۔ انھی کی پتلی پتلی پنڈلیوں کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن میزان میں یہ اُحد پہاڑ کے برابر وزنی ہوں گی۔ انھی کے متعلق صحابہ کی عموماً یہ رائے تھی کہ وہ سیرت اور اخلاق میں رسول اللہ ﷺ سے بیحد مشابہ ہیں۔ ایسے برگزیدہ صحابی کے بارے میں یہ کہنا کہ اس نے اپنے آخری وقت میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت و اخلاق سے بغاوت کی ٹھیٹ دنیاداری کا مظاہرہ کیا اور حضرت عثمانؓ کو معاف کرنے سے انکار کر دیا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور یہ اس شخص کی سمجھ سے بالاتر ہوگا جو جانتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر معاف کرنے والے، کیسے کریم و فیاض، کس درجہ بلند اخلاق اور جذبۂ انتقام سے کتنے دور تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص مسلّمہ طور پر رسول اللہ ﷺ کی سیرت و اخلاق سے مشابہت رکھتا ہو اور اتباعِ سنت میں حتی المقدور کسر نہ چھوڑتا ہو وہ آخری وقت میں تنگ دل اور منتقم مزاج نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم

دوسری روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ نے بیت المال کے جواہرات میں سے کچھ لے لیا اور اپنے گھر کے لئے زیور تیار کرایا۔ لوگ اس بات سے خفا ہوئے اور اعتراضات کی بوچھار کی۔ حضرت عثمانؓ نے حالتِ غیظ میں خطبہ دیا اور کہا کہ ہم خراج کے مال میں سے اپنی ضرورت کے مطابق ضرور لیں گے۔ کچھ لوگ ناراض ہوتے ہوں تو ہوں۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آپ کو اس سے روکا جائے گا۔ حضرت عمار بن یاسرؓ نے کہا میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ سب سے پہلا ناراض میں ہوں۔ حضرت عثمانؓ جھلا گئے اور غصہ سے بولے کہ لونڈی کے بچے تیری یہ جرأت، پکڑو اس کو! یہ پکڑے گئے اور عثمان نے انھیں اتنا مارا کہ بے ہوش ہو گئے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ سند کے اعتبار سے اس روایت کا کیا پایہ ہے لیکن حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ حضرت عثمانؓ اگر بیت المال سے بے دریغ اور بے حساب لینے میں ایسے ہی خود رائے تھے تو اس واقعہ سے بہت دنوں بعد انھیں معترضین اور مہاجرین و انصار کے مجمع میں پورے اطمینان اور تیقن سے یہ کہنے کا حوصلہ کیسے ہوا کہ :-

"میں بیت المال سے جائز حد تک ان کے (رشتہ داروں کے) حقوق ادا کرتا ہوں اور زائد عطیات اپنے ذاتی روپے سے دیتا ہوں۔ بیت المال کی دولت کو میں نے اپنے یا رشتہ داروں کے لئے ہرگز جائز نہیں سمجھا"

نیز "اللہ کے مال میں سے ایک پیسہ بھی غلط جگہ خرچ نہیں کیا جاتا خود میں اس میں سے کچھ نہیں لیتا یہاں تک کہ اپنی معاش کا بھی بوجھ اس پر نہیں ڈالا"

یہ باتیں کوئی ایسا شخص کیونکر کہہ سکتا تھا جسے اندیشہ ہو کہ سامنے بیٹھے ہوئے معترضین و مخالفین میری پچھلی بدعنوانیوں اور دست اندازیوں کو میرے منھ پر ماریں گے۔ بدیہی بات ہے کہ مذکورہ روایت میں حضرت عثمانؓ بیت المال کے بارے میں جس قدر جری اور مستبد نظر آتے ہیں اس کا قدرتی ثمرہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کی خویش پروری اور دست اندازی کے متعدد واقعات لوگوں میں مشہور ہوں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معترضین میں سے کسی نے بھی حضرت عثمانؓ کے بیان پر کوئی اور واقعہ تو کیا یہ زیور والا واقعہ بھی بطور تردید پیش نہیں کیا، حالانکہ اس واقعہ کی حقیقت اگر یہی ہوتی جو روایت میں ذکر ہوئی ہے تو وہ نہ صرف واقعہ پیش کرتے، بلکہ حضرت عثمانؓ کے یہ الفاظ بھی یاد دلاتے کہ :-

"ہم خراج کے مال میں سے اپنی ضرورت کے مطابق ضرور لینگے کچھ لوگ ناراض ہوتے ہوں تو ہوں"

اگر نہیں یاد دلائے تو ماننا چاہئے کہ حضرت عثمانؓ کا دامن بیت المال میں تغلب اور اسراف و اتلاف سے پاک تھا۔

دوسرا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمار بن یاسر ایک مرتبہ حضرت عثمان کے پاس ایک ایسا خط لیکر آئے جس میں انھیں نصیحتیں کی گئی تھیں۔ انھوں نے اس کا کچھ شروع کا حصہ اپنی زبان سے دہرایا تو حضرت

عثمانؓ نے انھیں جو تا پہنے ہوئے پاؤں سے اس طرح مارا کہ وہ فتق (فوطوں میں آنت اتر آنے کی بیماری) میں مبتلا ہو گئے۔

اس روایت کو اگر عالم تصور میں لایا جائے تو عجیب منظر سامنے آتا ہے کہ ایک خاصا کہن سال خلیفہ دوسرے سن رسیدہ شخص پر خفگی کے عالم میں ہاتھ چھوڑنے کی بجائے ٹانگ سے حملہ آور ہو رہا ہے۔ حملے کا یہ انداز کم سے کم تاریخ الخلفاء میں تو نرالا ہی سمجھنا چاہئے ہم بالکل نہیں سمجھ پائے کہ حضرت عثمانؓ کو ہاتھوں کے عوض پاؤں استعمال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا ایسا ہوا ہے کہ انھوں نے ابتداءً حملہ ہاتھوں ہی سے کیا ہو لیکن عمارؓ نے ہاتھ پکڑ لئے ہوں تو انھوں نے پاؤں استعمال کئے۔ خدا ہی بہتر جانے کیا ہوا ہوگا۔ ہمیں تو اس پر حیرت ہے کہ ایک طرف تو حضرت عثمانؓ اتنے متحمل، بردبار اور پُر وقار ہیں کہ جان کی قیمت پر بھی تلوار اٹھانا پسند نہیں کرتے۔ اور عدیم المثال استقامت کے ساتھ برداشت، نرمی اور امن پسندی کا دامن تھامے رہتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ ذرا ذرا سی بات پر اتنے زود رنج، جلد باز، مغلوب الغضب، بین بجبیں اور غیر سنجیدہ ہو جاتے ہیں کہ کہیں ابن مسعودؓ جیسے صحابی کو سخت سست کہہ کر زمین پر پٹکوا دیا۔ کہیں عمار بن یاسرؓ کو اتنا مارا کہ بے ہوش ہو گئے اور کبھی ایسی بے ضبطی اور عامیانہ پن پر اتر آئے کہ پیروں تک سے مار پیٹ شروع کر دی۔

جس کا قیاس اس پر مطمئن ہو وہ اسے مانے، ہمارا قیاس تو کسی طرح اسے قبول نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ زیر تذکرہ واقعہ کے بعد حضرت عمارؓ فتق میں مبتلا ہو گئے ہوں، لیکن فتق کی واحد وجہ ضربِ شدید ہی نہیں ہوتی۔ اس کے اور بھی اسباب اطباء بیان کرتے ہیں۔

اور معاملہ بس قیاس ہی کا نہیں۔ اس میں تو رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کی بھی کوئی ہلکی سے ہلکی جھلک نظر نہیں آتی۔ سخت حیرت ہے کہ اگر عمار بن یاسر، عبداللہ ابن مسعود اور عثمان رضی اللہ عنہم جیسے اکابرِ صحابہ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے دائرے سے باہر ہوں گے تو یہ دائرہ آخر کن افراد کو حاوی ہوگا۔ الفاظ قطعاً عام ہیں، مطلق ہیں، وسیع المصداق ہیں، اصحابِ رسولؐ کی ایک غالب اکثریت اگر رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کا عملی پیکر ہو تب تو بات بنتی ہے ورنہ کوئی بتلائے کہ مذکورہ اصحابؓ جیسے اکابر کے مابین اگر رحم و رافت کا وصف معدوم ہے تو آیت کا کیا بنے گا؟۔

ہو سکتا ہے بعض سطح بیں حضرات کہہ اٹھیں کہ یہ آیت تو حضرت عمرؓ کی سخت گیریوں پر بھی دعوتِ اشتباہ دیتی ہے۔ ہم ان سے عرض کریں گے کہ قانون کے نفاذ و اجرا، یا اصلاحِ معاشرہ کی حکمتِ عملی میں سخت گیر ہونا رحماء بینھم کے خلاف نہیں ہے۔ رحم و رافت اور درگذر کی تعلیم دینے والی شریعت یہ بھی تو کہتی ہے کہ قیامِ عدل اور اجرائے قانون رحم و کرم کے جذبات سے بالاتر شے ہے۔ قرآن خاص طور پر توجہ دلاتا ہے کہ مجرموں کو سزا دینے میں تساہل نہ برتو۔ حضرت عمرؓ یقیناً سخت تھے لیکن ان کی سختی قانونِ شریعت کے نفاذ اور معاشرے کی پاکیزگی کو قائم رکھنے اور ترقی دینے میں تھی نہ کہ ظلم و تشدد کو فروغ دینے میں۔ ان کا کوئی بھی واقعہ لیجئے یہی ملے گا کہ وہ اپنے نفس اور اپنے عزیز و اقربا کی پاسداری سے یکسر بے نیاز ہو کر صرف اور صرف دین و شریعت کے لئے تیغِ بے نیام بنے ہوتے ہیں۔ وہ زید پر سختی کر رہے تھے بکر کا حق دلوانے کے لئے۔ وہ جس وقت آپ کو کسی شخص کی پیٹھ پر دُرّہ برساتے ہوئے نظر آئیں گے تو ذرا فاصلے تک نظر دوڑانے سے معلوم ہوگا کہ دراصل وہ بعض مظلوموں کا بدلہ چکا رہے ہیں یا منضبط اور صالح معاشرے کو کسی ایسے نومولود فتنے سے بچانے میں مصروف ہیں جو ڈھیل ملنے پر بہت مہلک فتنہ بن سکتا ہے مشکل سے ایک ہی دو واقعے ایسے ملتے ہیں جن میں وہ دُور اندیشی کے بجائے محض فوری تأثر کے تحت مشتعل ہو گئے ہوں۔ یہ ان کے گرم مزاج کا ایک قدرتی داعیہ تھا لیکن ساتھ ہی اس اشتعال پر ان کا فوری تأسف اور عزمِ تلافی بھی تاریخ کے صفحات میں ثبت نظر آتا ہے۔

حق یہ ہے کہ جرائم کی تعزیر میں اور معاشرے کو افراد کی بے احتیاطیوں کے فساد سے بچانے میں رحم و کرم عموماً تباہ کن ہی ثابت ہوتا ہے اور وہی نہ چوکنے والی سخت گیری ہی مفید ہوتی ہے جسے حضرت عمرؓ نے اختیار کیا۔ وہ قانون کی حفاظت، کمزوروں کی حمایت اور فتنہ و شر کی مدافعت میں سینہ سپر نظر آتے ہیں۔ اپنے نفس کی تحریک پر انھوں نے کبھی کسی کے گریبان میں ہاتھ نہیں ڈالا، بلکہ ضعیفوں اور بوڑھی عورتوں تک کے آگے جھک گئے۔ وہ اس باپ کی طرح جس کا بچہ گم ہو گیا ہو گلی گلی دیکھتے پھرتے ہیں کہ مملکت کا کوئی فرد اپنے حق سے تو محروم نہیں رہ گیا، کسی نے کسی پر ظلم تو نہیں توڑا، کہیں کسی گوشے میں فتنے اور طوفان تو سرگوشیاں نہیں کر رہے۔ وہ رعایا کے لئے فی الحقیقت سراپا

بہی خواہی تھے مجسم رحم ورافت تھے۔ انھوں نے جو بھی سختیاں کی ہیں وہ اس دانشمند باپ کی حیثیت سے کی ہیں جو اولاد کی بے تمیزی اور کجروی پر تادیبًا مارتا ہے، ڈانٹتا ہے، بند کرتا ہے۔ رحم ورافت کیلئے باپ اور بیٹے کے تعلق سے بڑھ کر کونسا تعلق ہوگا، لیکن کیا آپ اُس باپ کو رحیم وکریم کہیں گے جو بیٹے کی ہر بے راہ روی اور گستاخی کا جواب لاڈ پیار سے دے؟

ہمیں یقین ہے کہ حضرت عمرؓ کی سخت گیریاں رحماء بینھم کے ہرگز منافی نہیں تھیں اور جن لوگوں نے لکھا ہے کہ ان کے تشدد سے رعایا تنگ آچکی تھی انھوں نے اگر مبالغہ نہیں کیا تب بھی اس تنگ آنے میں ہم رعایا کو وہی حیثیت دیں گے جو ماں باپ کی ادب آموز شدت اور سخت گیری پر کم عقل اور ناتجربہ کار اولاد کو دیجا سکتی ہے۔

لیکن حضرت عثمانؓ سے متعلق زیر بحث روایات کو اگر جوں کا توں درست مان لیا جائے تو توجیہ وتاویل کا کوئی راستہ نہیں ہے، ماننا پڑے گا کہ وہ ظالم بدہن نفسانیت اور خود پرستی کا شکار ہوگئے تھے ہم اپنے میں ہمت نہیں پاتے کہ اتنے بڑے مُبشّر بالجنۃ صحابی کے لئے اتنی بُری رائے قائم کریں۔ صحابۂ کرام سب کے سب عدول ہیں، معظم ہیں، ان کے کسی فعل وعمل کی اچھی توجیہ نہ ہو سکے تب بھی ہمیں انتہائی احتیاط برتنی چاہئے۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔

بات خاصی طویل ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ کی دردناک شہادت کے احوال وکوائف تو بالعموم لوگوں کو معلوم ہی ہیں۔ ہم ایک اصولی نکتے پر گفتگو کرکے بات ختم کردینا چاہتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ ہماری کسی توجیہ سے مطمئن نہیں ہوئے اور اُن الزامات کو درست ماننے پر مُصر ہیں جو بعض روایات حضرت عثمانؓ پر عائد کرتی ہیں تو اپنے ذہن کو ٹٹولئے کہ اس اصرار کے پیچھے کیا خیال کارفرما ہے اگر آپ تاریخ کے ایک ایسے طالب علم کی طرح جو کسی بھی تاریخی شخصیت کے لئے تعصب اور اندھی عقیدت نہیں رکھتا یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کی بجائے کسی اور ایسے صحابی کو خلیفہ بنانا چاہئے تھا جو تدبیر وتدبر دور اندیشی اور سیاست دانی میں ان سے بڑھ کر ہوتا، جو ملک وملت کو فتنوں سے بچالے جاتا اور جس کی سیرت، مسلک اور پالیسیاں شیخین کے طرز کی ہوتیں تو ہمارے خیال میں اس سمجھنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ابہام وتکلف کا پردہ ہٹا کر آپ حضرت علیؓ کا نام بھی لے دیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہم جانتے ہیں کہ اسلاف میں سے کتنے ہی قابل لحاظ حضرات اس خیال کے حامل رہے ہیں کہ اگر حضرت عثمانؓ کی بجائے حضرت علیؓ خلیفہ بنادیئے جاتے تو امت کا شیرازہ یوں نہ بکھرتا اور خلافت یوں داخلی انتشار کا شکار نہ ہوتی۔ اور آج بھی کتنے ہی اہل فکر یہی رائے رکھتے ہیں۔ ہم اگرچہ اس رائے کی تائید کے موقف میں نہیں لیکن یہ بھی ہمیں یقین ہے کہ یہ اگر تعصبات اور جانبداریوں سے پاک ہو تو نہ کفر ہے، نہ فسق نہ معصیت کیونکہ حضرت عمرؓ کے متصل بعد حضرت عثمان کا خلیفہ بنایا جانا وحی کے ذریعہ نہیں تھا جس سے اختلاف کو گمراہی قرار دیا جائے۔ وہ چند انسانوں ہی کی صواب دید کا نتیجہ تھا، بلکہ براہ راست تو اس کی ذمہ داری تنہا عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہی پر ہے۔ ابن عوفؓ ہوں یا دوسرے صحابہ کرامؓ۔ بہرحال انسان تھے، غیر معصوم تھے، فکر ونظر اور فیصلہ وانتخاب میں ان سے غلطی یا فروگذاشت کا صدور ممکن بھی تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ واقع بھی ہوا ہوگا

پھر حضرت علیؓ بھی ایسی معمولی شخصیت نہیں ہیں کہ ان کے فکر و تدبر اور فہم وفراست کو حضرت عثمانؓ کے فکر وفہم پر ترجیح دینا کوئی اچنبھے کی بات ہو، کوئی عجیب وغریب جراءت ہو۔ اس لئے ہم اُس شخص کو ہرگز ملامت اور زجر کا نشانہ نہیں بنائیں گے جو مذہبی تحکیم وتحکم سے بالاتر ہو کر صرف مادی اور منطقی حیثیت سے حضرت علیؓ کی صلاحیتوں کو حضرت عثمانؓ کے مقابلے میں زیادہ اور برتر خیال کرتا ہو۔

لیکن اگر ایک قدم آگے بڑھ کر آپ حضرت علیؓ کی تفضیل وترجیح کے لئے یہ بھی ضروری سمجھیں گے کہ جن بعض روایات کی لپیٹ میں حضرت عثمانؓ کی آخرت تک آجاتی ہے ان کی تصدیق وتائید کریں اور جہانتک ہوسکے ان کے دامن کردار کو داغدار دکھلائیں تو ہم یقینًا آپ کو ظالم اور غلو پسند ٹھیرائیں گے۔ آخر یہ کس نے کہا ہے کہ خلافت وحکمرانی کیلئے حضرت علیؓ کا اہل تر ہونا اُسی وقت ثابت ہو سکتا ہے جب حضرت عثمانؓ کی رفعتِ کردار اور عظمتِ صحابیت کو دل کھول کر ہدفِ طعن بنایا جائے کیا تدبیر وتدبر، سیاست، انتظامی قابلیت اور حکمرانی کی اہلیت ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کا تقابل اس بحث میں کافی سمجھا جائے اور گفتگو گناہ وثواب اور ایمان وکفر کی بجائے صحیح وغلط اور مفید ومضر کے دائرے تک محدود رہے۔ دراصل یہ بہت ہی غلط خیال لوگوں میں رواج پاگیا ہے کہ خلافت کا سب سے بڑھ کر مستحق اور اہل وہی شخص ہونا چاہئے جو دین اور دنیا دونوں لحاظ سے

اپنے تمام ہم عصروں پر فائق ہو اسی لئے حضرت علیؓ کو حضرتِ عثمانؓ سے زیادہ مستحقِ خلافت سمجھنے والے اس کوشش میں لگے رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی دینی و دنیاوی دونوں ہی پوزیشنوں کو داغدار کیا جائے۔ حالاں کہ یہ انتہائی غلط خیال ہے جس کی اصلاح کرلینی چاہئے۔ خلافت ایک ایسا مہتم بالشان منصب ہے، جو خاص معیار کی گوناگوں صلاحیتیں چاہتا ہے خلیفہ میں ضبط و انتظام، دور اندیشی، بروقت اقدام کی جرأت، اصابتِ فکر، ذہنی بیداری، معاملہ فہمی کی استعداد، مردم شناسی کا جوہر، عمل اور ردِ عمل کے فلسفے کا شعور، ہمت، عزم اور عوامی نفسیات کا معتد بہ علم بھی کچھ ہونا چاہئے۔ اس کے ہم عصروں میں اگر کچھ لوگ ایسے موجود ہوں جو بعض اوصافِ حمیدہ مثلاً عبادت، تقویٰ، زہد و ورع اور بے نفسی میں اس سے ممتاز ہوں اور عوام کو یقین ہو کہ اُخروی مراتب اور بارگاہِ ایزدی کی مقبولیت میں یہ خلیفہ سے بمراتب آگے ہیں تو اس سے خلیفہ کے استحقاقِ خلافت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اسے تختِ خلافت سے اُتار کر ان عباد و زہاد کو اس پر بٹھا دینا چاہئے۔

امت کی غالب اکثریت کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ پر تقدم اور فوقیت رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس کا مطلب اس غالب اکثریت ہی کے بے شمار افراد نے یہ قرار دے لیا کہ یہ تقدم اور فوقیت تمام اوصاف مناقب اور ملکات و خصوصیات میں ہے اور اس غلط فہمی میں انھوں نے بسا اوقات حضرت عثمانؓ کی ایسی غیر معقول اور تعصب آمیز حمایت کی کہ اس کا ردِ عمل بہت خراب ہوا۔ جو لوگ حضرت علیؓ کی تفضیل میں حد سے بڑھے ہوئے تھے ان پر تو خیر شدید اثر ہونا ہی چاہئے تھا، لیکن جنھیں غلو نہیں تھا وہ بھی اس ناروا حمایت سے بھڑک اٹھے اور جیسا کہ اشتعال کی حالت میں ہوا کرتا ہے انھوں نے اس کا بدلہ حضرت عثمانؓ کی مبالغہ آمیز مخالفت و تخفیف سے چکانے کی کوشش کی۔

اِس تاریخی صورتِ حال میں از روئے انصاف ہمیں کہنا چاہئے کہ تمام تر قصور مخالفینِ عثمانؓ ہی کا نہیں، بلکہ حامیانِ عثمان بھی شریکِ جرم ہیں اور انھوں نے بارہا نادانستہ طور پر وہی خرابیاں پیدا کی ہیں جو "نادان دوست" عموماً کیا کرتا ہے۔ لیکن ہمیں اور آپ کو دوسروں کی خطاؤں کا مقلد نہیں ہونا چاہئے اور فکر و نظر کے اختلافات کو لاحاصل اور فتنہ انگیز مخالفت و مخاصمت کا جامہ نہ پہنا دینا چاہئے۔ تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرتے ہوئے اگر آپ حضرت علیؓ کو فکر و تدبر، تقوے، دور اندیشی، تفقہ اور شیخین سے مشابہت و مماثلت میں حضرت عثمانؓ سے آگے محسوس کرتے ہیں تو جب تک یہ احساس دیانت، اعتدال اور احتیاط کی دیواریں نہیں پھلانگ جاتا ہم اسے گناہ، فسق، گستاخی یا گمراہی نہیں کہیں گے اور اگر آپ یہ حسرت رکھتے ہیں کہ کاش حضرت عثمانؓ کی جگہ حضرت علیؓ خلیفۂ ثالث بنا دیئے جاتے اور اسلامی ریاست فتنوں کا شکار ہونے سے بچ جاتی تو اگرچہ آپ کی ہاں میں ہاں ملانا ہمارے لئے مشکل ہے مگر آپ کی اِس حسرت کو ہم عیب و گناہ نہیں قرار دیں گے البتہ ایک دیانت دارانہ اندازِ فکر اور دردمندانہ حسرت سے گذر کر جب آپ کے علم و دانش غیر متوازن جذبات و خیالات کی راہوں میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جائیں گے تب بے شک ہمیں کہنا پڑے گا کہ آپ بھٹک رہے ہیں۔ مثلاً جب آپ یہ گمان کرنے لگیں کہ حضرت عثمانؓ نے اقربا نوازی میں گناہ کی حد تک بے احتیاطی کی اور بیت المال کے معاملہ میں شریعت کے عطا کردہ اختیارات سے بالارادہ آگے بڑھ گئے تو ہم ضرور آپ کو ٹوکیں گے۔ یا جب آپ استحقاقِ خلافت کی بحث میں معقولات کی بجائے حضرت علیؓ کے اہل بیت ہونے کا سہارا لیں گے تب ہم آپکی غلط فکری پر یقیناً معترض ہوں گے یا جب آپ حضرت علیؓ کی مظلومیت کا نقشہ کھینچکر حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابۂ کرام کو ظالم باور کرانا چاہینگے تب ہمارا دل ضرور مضطرب ہو جائے گا اور ہم فیصلہ دیں گے کہ آپ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔

توہم پرستی، کند ذہنی اور جہالت کی بات تو اور ہے ورنہ جو لوگ ذرا بھی عقلِ سلیم اور مذاقِ صحیح رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ کو جذبات کی عینک سے دیکھنا کھُلی نادانی ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہو چکا اس میں ہمارے لئے عبرت و موعظت تو ہے مگر ارمان و حسرت اور نوحہ و ماتم کا کھیل کھیلنے کے لئے کوئی میدان نہیں، نہ اس کی گنجائش ہے کہ گذری ہوئی شخصیتوں کی مخالفت و حمایت میں ٹولیاں بنا کر اکھاڑے میں کود پڑیں اور قوم و ملت کو حال و مستقبل کے مسائل سے ہٹا کر ماضی کے دھندلکوں میں گھسیٹ لے جائیں۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت و سیاست کا معاملہ ہو یا حضرت معاویہؓ کے اقدامات کا قضیہ، یزید کی نامزدگی کا قصہ ہو یا شہدائے کربلا کی روداد مظلومیت کا تذکرہ، اس طرح کے تمام تاریخی واقعات و حوادث کچھ پیغامات، کچھ مواعظ، کچھ اسباق اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان میں اولوالالباب کیلئے عبرتیں ہیں نصیحتیں

ہیں اور اُصول و ہدایات ہیں۔ بہت نادان ہیں وہ لوگ جو مغزِ تاریخ یعنی ہدایات و تنبیہات اور عبرت و موعظت سے تو کوئی سروکار نہیں رکھتے، لیکن شخصیتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ کسی کو آسمان پر چڑھاتے ہیں کسی کو زمین پر دے مارتے ہیں، کسی کو گالیاں دیتے ہیں کسی کے پاؤں چومتے ہیں، کسی پر ہنستے ہیں اور کسی کے غم میں آنسو بہاتے ہیں۔ حالانکہ یہ شخصیتیں اب لوٹ کر آنے والی نہیں ہیں اور جو کچھ گذر چکا اس میں ہماری جذباتی ہنگامہ آرائیاں کوئی تغیر نہیں کر سکتیں۔ اگر عمل سے بے بہرہ جذباتیت میں کوئی نفع ہوتا تو ہمارے خیال میں امتِ مسلمہ کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ غم انگیز اور ماتم آفریں حادثہ شہادتِ عمرؓ کا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ یہی وہ حادثہ تھا جو اسلام کی ترقی پذیر اور معیاری ریاست کو انحطاط، ہلاکت، انتشار اور بربادی کی اُس راہ پر ڈال گیا جو آج تک ہمارے زیرِ قدم ہے اور جس سے پیچھے لوٹ آنیکی کوشش اگرچہ کئی اولوالعزموں نے کی لیکن اجل نے اُن کے قدموں کو اُس مقام سے پہلے ہی بے حس و حرکت کر دیا جہاں سے منزل کی راہ ملتی تھی اور وہ گم گشتہ منزل دور ہی رہی جہاں سے انسانیت کا قافلہ بھٹکا تھا

اور سب سے بڑا الملعون و مردود وہ نصرانی غلام (فیروز) ہونا چاہئے تھا جس کے خنجر نے حضرت عمر ابن الخطابؓ کو نہیں اسلام کی پیش رفتی، ظفرمندی اور گیرائی کو ذبح کر ڈالا تھا لیکن امتِ مسلمہ نہ تو حضرت عمرؓ کے غم میں سینہ پیٹتی ہے نہ فیروز (ابو لولوٴ) پر تبرّا کرتی ہے۔ کیا حاصل؟ جو کچھ مشیت کو منظور تھا ہو چکا۔ قرآن و حدیث کی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ پیش آئے اس پر صبر کرو اور یقین رکھو کہ اس میں حضرت باری تعالیٰ کی مصلحت پوشیدہ ہے۔ وہ چند آنسو تو بے شک اعتراض سے بالا ہیں جو کسی غم انگیز واقعہ پر صبر کا حصار توڑ کر بے ساختہ نکل آئیں، لیکن حق تعالیٰ کی مرضیات پر صبر و شکر کے عوض ماتم و شیون کو شعار بنا لینا اور صدیوں پہلے گذرے ہوئے لوگوں کی حمایت و مخالفت میں رزم آرائیاں کرنا انتہائی بے سروپا اور لغو بات ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصالِ مبارک پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:۔

"جو شخص رسول اللہؐ کا پجاری تھا تو وہ سُن لے کہ رسول اللہؐ تو فوت ہو چکے، لیکن جو شخص اللہ کا پجاری ہے اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا"

اشخاص و افراد آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ ابوبکرؓ و عمرؓ بھی آئے اور عثمانؓ و علیؓ بھی آئے اور جو کچھ ان کے رب کو منظور تھا کر کے چلے گئے حسنؓ و حسینؓ نے بھی اپنا کام کیا اور رخصت ہوئے۔ ہم اور آپ بھی آج ہیں کل چلے جائیں گے۔ باقی رہنے والی شے صرف حق ہے۔ وہ حق جو خدائے لایزال کی ذات و صفات اور پیغامات و احکام سے عبارت ہے ــــ مبارک ہیں وہ لوگ جو اشخاص و افراد کی حمایت یا مخالفت میں حق کو فراموش نہیں کر بیٹھتے، جو حق کو قائم و نافذ کرنے کی جدوجہد میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں، اور منحوس ہیں وہ لوگ جو ماضی کے اندھیرے میں بھٹک کر زندہ جاوید حق سے غافل ہو جاتے ہیں۔ عثمانؓ و علیؓ کی حمایت و مخالفت حسینؓ کا ماتم اور یزید کا تبرا سب محض ڈھونگ اور لغویت ہے اگر ہم اُس "حق" ہی کو بالائے طاق رکھ دیں جس کے تعلق سے ان مرحوم شخصیتوں کے ساتھ ہمارے جذباتِ حمایت و مخالفت وابستہ ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الحقَّ حقًّا والباطِلَ باطلًا۔

خلفاءِ راشدینؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے لئے کیسی قیادت تیار کی

نعیم صدیقی

اس مقالہ کا نقشہ میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصہ میں یہ دکھانا تھا کہ ذاتی صلاحیتوں اور تحریک کی خدمات کی بنا پر خلفائے راشدین سے بڑھ کر کوئی اور خلافتِ رسالت کا مستحق نہ تھا۔ یہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسرے حصہ میں یہ بیان کرنا تھا کہ خلافتِ رسالت کی ذمہ داری اٹھا کر خلفائے راشدین نے عملاً بھی اس حق کو بے مثال معیار کے ساتھ ادا کر دیا۔ اور جو کام جن خطوط پر سرکارِ دوعالم نے جاری فرمائے تھے ان کو انہی خطوط پر نہایت سرعت رفتار سے آگے بڑھایا۔ اور ہدایت کے جو چراغ حضورؐ جلا گئے تھے ان کی لَو کو تیز سے تیز کر دیا۔ جو قدریں آپؐ نے قائم فرمائی تھیں ان کو فروغ دیا۔ یہاں تک کہ تحریکِ اسلامی چار دانگِ عالم میں اپنا پرچم اڑانے لگی اور مدینہ کی چھوٹی سی ریاست پورے بین الاقوامی دائرے میں ایک فیصلہ کن مرکزی طاقت بن گئی۔ یہ حصہ کسی دوسری ہی فرصت میں لکھا جا سکے گا۔

(نعیم صدیقی)

ہر صاحبِ دعوت جہاں اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پھیلانا چاہتا ہے اور اپنی پکار پر لبیک کہنے والوں کو جمع کر کے ان کے خیالات و کردار کو ایک خاص شکل دیتا ہے وہاں ساتھ کے ساتھ وہ بہت بڑا کام یہ بھی سرانجام دیتا ہے کہ اپنی نگاہِ مردم شناس کی مدد سے قیادت کی اہل شخصیتوں کو پہچان کر اپنے قریب تر کرتا ہے۔ ان کو معاشرہ کی سربراہ کاری کے کام میں اپنا معاون بناتا ہے، ان کے سامنے ہر ضروری امر کی توضیح کرتا ہے، ان سے مشورے لیتا ہے، ان کو رازدار بناتا ہے، ان سے شخصی روابط بڑھاتا ہے، ان کی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے، ان کے سر ذمہ داریاں ڈالتا ہے اور آہستہ آہستہ ان کو پوری طرح اپنی جانشینی کے قابل بنا دیتا ہے۔ دنیا کی ہر تحریک اور ہر نظامِ حیات کو ایک وسیع صفِ قیادت کی ضرورت ہوتی ہے اور قائدِ اعلیٰ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس صفِ قیادت کو تیار کرنے کا اول روز سے اہتمام کرے۔

دنیا کی اصلاح اور انسانیت کی فلاح کی تحریک لے کے جب بھی کوئی نبی و رسول اٹھا ہے تو اس نے بھی عام افراد کے تزکیہ کے ساتھ ساتھ خاص طور پر اصحاب اور حواریوں اور اعلیٰ صلاحیتوں کے رفقاء کی ایک جماعت منظم فرمائی ہے ان کو اپنی زندگی میں معاون و مشیر بنایا ہے اور اپنے بعد جانشینی کا حق ادا کرنے کے لئے تربیت دی ہے۔ سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کارِ دعوت کے اولین مراحل ہی میں اس ضرورت کو پیش نظر رکھا اور مکہ کی بھٹی میں آزمائش کی کٹھالیوں میں جو شخصیتیں تپ تپ کر کندن بنیں، ان میں سے رفقائے خاص کو پہچان کر اپنے قریب کیا۔ ان کی... صلاحیتوں کو نشوونما دی اور پھر مدینہ میں آکر اسلامی ریاست کے نظامِ رحمت کو انہی قائدانہ صلاحیتوں کی مدد اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے بہ صد حسن و خوبی چلایا۔ پھر ہجرت کے مرحلوں اور بدر و احد کے معرکوں اور مسجدِ نبویؐ کی مشاورتوں اور گشتی

میں جن لوگوں کے جوہر نکھرتے گئے ان کو اور بھی قریب ترکر کے اور غیر معمولی حد تک تربیت دے کر اپنی جانشینی اور اصلاح انسانیت کے ..... نصب العین کی اعلیٰ خدمات کے لئے تیار کر دیا ۔ ایسے منتخب افراد تحریک اسلامی کے برگ و بار سمجھے۔

تحریک اسلامی کی انسانی طاقت کے تین جز رہتے ۔ مرتبۂ اول پر خود داعیٔ اول اور قائد اعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی جو اپنے مقدس منصب کے لحاظ سے بھی اور اپنے لامثال کردار کے لحاظ سے بھی تحریک کی اصل روح رواں تھی ۔ مرتبۂ دوم پر اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے رفقائے نبوت تھے جن پر مشتمل صفِ قیادت گویا پورے معاشرہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی ۔ مرتبۂ ثالث پر ایمان لانے والے عوام اور بدوی لوگ تھے جو تحریک کے لئے مضبوط ہاتھ پاؤں بن گئے اور جنھوں نے اخلاص سے ہر پکار پر لبیک کہی چنانچہ سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے مرتبۂ اول کے انہی صحابیوں کا ذکر یوں فرمایا ہے ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ○ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۔لہ

اللہ کے رسول محمدؐ اور وہ لوگ جو آپؐ کے ساتھ ہیں کفار کے مقابلے میں مضبوط ہیں اور آپس میں نرم خو! ــــــــــ تو انہیں رکوع و سجود کرتے دیکھتا ہے ۔ یہ لوگ اللہ کی نوازش اور اس کی رضا کی جستجو میں لگے ہیں۔

انسانیت کے ہر قائد کے ساتھ والذین معہ کا ہونا ضروری ہے اور انہی کے ہونے سے ایک دعوت تحریک اور نظام کی شکل اختیار کرتی ہے والذین معہ کی صف اگر کسی داعی کے ساتھ موجود نہ ہو یا وہ کمزور ہو تو بالعموم دعوت اپنے مرتبہ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اسی مدعا کو حضورؐ نے بروایت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یوں بیان فرمایا کہ:۔

ما من نبیٍّ بعثہ اللہ فی اُمّۃ من قبلی الا کان لہ من امتہ حواریون واصحابٌ یاخذون بسنتہ و یقتدون بامرہٖ .... الخ

(مسلم)

مجھ سے پہلے خدا نے کسی قوم میں کوئی بھی نبی نہیں بھیجا ۔ مگر یہ صورت کہ اس کی امت میں اس کے ایسے رفقاء و ہم نشین ہوتے ہیں کہ جو اس کے مسلک کی پابندی کرتے ہیں اور احکام کی پیروی اختیار کرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا تو قرآن نے خاص طور پر ذکر فرمایا ہے ۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کارنامہ کو بیان کرتے ہوئے "وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ" کے الفاظ میں آپؐ کے اصحاب و رفقا کا تذکرہ کیا ۔ دوسرے پیغمبروں کے معاملہ میں بھی اسی طرح کے ارشادات موجود ہیں۔

سورۂ فتح میں مذکورہ بالا موقع پر اسلامی معاشرہ کے لئے اعلیٰ اور حسین ترین تشبیہ دی گئی ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ایک کھیتی ہے جس نے پہلے سوئیاں نکالیں ۔ پھر ان کی کمر کو مضبوط کیا ۔ پھر پودے ہوتے گئے اور آخر کار اپنے اپنے تنوں پر اچھی طرح کھڑے ہو گئے ۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی کھیتی میں بیج ڈالنے اور سینچنے والے تھے ۔ آپؐ نے اس کھیتی کو بڑی جانفشانیوں سے تیار کیا ۔ آنسوؤں خون اور پسینے کے قطروں سے اس کی آبیاری کی ۔ پھر اس میں اعلیٰ تمدنی اصولوں اور اخلاقی قدروں کے بیج ڈالے ۔ تلواروں اور نیزوں کی باڑ کھڑی کر کے دشمنوں سے اس کی حفاظت کی اور پھر کھیتی کو لہلہاتا چھوڑ کر اس مزرعۂ آخرت سے تشریف لے گئے ۔

گویا خلافت راشدہ دعوت نبوی کی کھیتی ہے ۔ صحابہ کرام اس کھیتی کے پودے ہیں اور ان کے کارنامے اور اخلاق اس کے برگ و بار ہیں ۔

لہ یہ کلام چونکہ صلح حدیبیہ کے موقع سے متعلق ہے ۔ اس لئے بعض لوگوں کے نزدیک "والذین معہ" میں بالاختصاص وہ اصحاب داخل ہیں جو حضورؐ کے ساتھ تھے اور جنھوں نے بیعت رضوان کی سعادت حاصل کی تھی ۔

اس کھیتی کی شادابی اور اس کے پودوں کی بہار ہی تو اصل کارنامۂ رسالت ہے۔ فصل اگر اچھی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آسمانی زراعت کار نے زمین کے اچھے زرخیز قطعات چھانٹے۔ مٹی کو خوب اچھی طرح تیار کیا، اس کے ذرے ذرے کو پوری طرح سیراب کیا، بیج ڈالا تو بہترین ڈالا پھر اس کی حفاظت کی تو پوری تندہی سے کی۔ کارنامۂ رسالت کی جانچ کا اصل وقت تو اسی لمحے سے شروع ہوتا ہے جب حضورؐ نے دارِفانی کو الوداع کہی اور ذمہ داریوں کا سارا بار آپ کے تربیت دادہ رفقا کے سر آپڑا۔ حضورؐ نے جو انسان تیار کیا تھا اور جس معاشرہ کو تشکیل دی تھی آپؐ کے اٹھ جانے سے وہ پوری طرح معرضِ امتحان میں آگیا۔ رسولِ پاکؐ کی تیس برس کی محنتوں سے تیار شدہ اشرفیاں تاریخ کے صرافہ میں پیش کر دی گئیں۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی شان میں قرآن کا جو پارۂ کلام درج کیا گیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کے محل و مقام کو بھی نگاہ میں رکھا جائے۔ اوپر کی متصل آیت میں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے رسولؐ کو اس لئے مبعوث فرماتا ہے کہ وہ دینِ حق کو ہر مخالف طاقت کا زور توڑ کر غالب کر دے۔ یوں بھی یہ بات از خود واضح ہے کہ آخری رسولؐ کے ہاتھوں دنیا کے سامنے ایک بار اسلامی نظامِ اور اسلامی معاشرہ کا کامل ترین نقشہ پیش ہونے والا تھا اور اس مقصد کے لئے انسانیت کا بہترین نمونہ بھی حضورؐ کے فیضانِ نظر سے تشکیل پانے والا تھا۔ اگر آخری رسولؐ کی تربیت بھی انسانیت کے سامنے وسیع پیمانے پر بلند ترین معیارِ کردار پیش نہ کر سکتی تو پھر قیامت تک نہ آپؐ سے بہتر کسی داعی و مزکّی کے آنے کی توقع تھی اور نہ عربوں اور خصوصاً قریش اور انصار سے بہتر انسانی سرمایہ آسانی سے کسی کو ہاتھ آسکتا تھا۔ اور نہ کسی اور دور میں زیادہ پاکیزہ معاشرہ تیار ہونے کا امکان تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی دعاؤں اور حضرت عیسیٰؑ کی بشارتوں کا ارتکاز آپؐ کی ہی ذاتِ اقدس پر تھا۔ پس انسانوں کے اندر بہترین، پاکیزہ اور مضبوط کردار پیدا کرنے کی آخری امیدیں آپؐ ہی سے تھیں۔

لیکن اگر آج یہ کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کردہ معاشرہ کی منتخب روزگار ہستیوں کی اکثریت ذمہ داری کا بار سر پر آپڑنے پر (نعوذ باللہ) کھوٹی ثابت ہوئی اور صرف گنتی کے چند افراد مقامِ اخلاص پر کھڑے رہ گئے اور وہ بھی بے یار و مددگار ہو کر...... تو پھر تاریخ کا یہ انتہائی بے مثال تجربہ انسانیت کے لئے سخت مایوس کن ہوگا۔ اگر سچائی کی طاقت کو حضورؐ کی جانفشانیاں اتنا مستحکم نہ کر سکیں کہ وہ ایک نظام کی شکل میں آپؐ کے بعد کچھ بھی عرصہ تک قائم رہ سکے اور اگر آپ کے برسوں میں تیار کردہ بہترین قریبی رفقا کے کردار بھی اتنے بودے تھے کہ حضورؐ کی رخصت ہوتے ہی ان کا شیرازۂ ایمان و سیرت بکھر گیا تو پھر آئندہ کے لئے اور کس ہستی سے یہ توقع باندھی جا سکتی ہے کہ وہ آپؐ سے بڑھ کر موثر انداز میں دعوت دے گی، آپؐ سے بڑھ کر مردم شناس ہوگی۔ آپؐ سے بڑھ کر تربیتِ کردار کا حق ادا کر سکے گی، آپؐ سے بڑھ کر نظامِ حق کا سر و سامان کر سکے گی۔ حضورؐ کے کارنامہ کو جو لوگ اتنا پادر ہوا قرار دیتے ہیں وہ گویا ساری نوعِ انسانی کو ہمیشہ کے لئے مایوسی کے گڑھے میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔

اسلام کی اولیں صفِ قیادت

"والذین معہ" میں جس صفِ قیادت کی طرف اشارہ ہے اس کا دوسری جگہ زیادہ تفصیلی تعارف کرا دیا گیا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے:-

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○

اور مہاجرین و انصار میں سے پہل کر کے آگے بڑھنے والے، نیز وہ لوگ کہ جو حسنِ عمل کے ساتھ ان کے پیچھے آئے۔ —— اللہ ان سے راضی ہوا وہ اللہ سے راضی ہوئے —— اور اللہ نے ان کے لئے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

آیت بتاتی ہے کہ دعوتِ حق پر آگے بڑھ کے پہلے پہل لبیک کہنے والے، ہجرت کی وادیاں طے کرنے والے اور فروغِ حق کے لئے

پہلے خانماں کپاہیوں کو سچے جذبۂ اخوت کے ساتھ سینے سے لگانے والے اور پھر وہ سارے عوام جو ان سربراہ کار عناصر کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں، خواہ وہ ہم عصر ہوں یا بعد کے زمانوں کی نسلیں .... انہی پر تحریک اسلامی کی ساری قوت مشتمل ہے۔ ان کے متعلق باری تعالیٰ کا اعلان یہ ہے کہ انھوں نے میرے سامنے سر تسلیم و رضا خم کر دیا ہے اور میں نے اپنی رضا سے ان کو سرفراز فرما دیا ہے۔ یہی وہ ہیں جن کے لئے جنت دوام آراستہ کر کے رکھی گئی ہے۔

اس آیت میں اسلامی معاشرہ کے مدارج کی وہی ترتیب واضح کر دی جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے: نبی اکرم تو اپنے مقدس منصب کی بنا پر ساری امت کے مقابلے میں افضل و برتر ہیں۔ لیکن خود امت کے اندر تحریک کے لئے جانفشانیاں کرنے والے لوگوں کا درجہ نمایاں ہے اور پھر ان میں سے بھی سب سے پہلے اور آگے بڑھ کر دعوت کا علم بلند کرنے والوں کا قائدانہ مقام ممتاز ہے۔" والذین معہ " میں یوں تو سارے اہل ایمان بدرجہ عموم شامل ہیں۔ لیکن خصوصی مراد السابقون الاولون من المهاجرين والانصار کی تعریف میں آنے والی ہستیاں ہیں۔ ایک بدوی بھی مومن تھا اور حضرت ابو بکر صدیق بھی مومن تھے اور ابو سفیان بھی اسلامی معاشرہ کے رکن تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی۔ مگر ایک عامی بدو کا مرتبہ اور ہے اور حضرت ابو بکر صدیق کا مرتبہ اور، اسی طرح ابو سفیان کا درجہ مختلف ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا درجہ مختلف ہے۔ باعتبار مراتب سارے اہل ایمان ایک سطح پر نہیں ہیں۔

والذین مَعَہٗ کی تعریف ایک اور آیت سے بھی بخوبی ہوتی ہے" رسول النبی الامی کے رفقاء وہ ہیں جن کی شان یہ ہے کہ

فالذین آمنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا — پس وہ لوگ جو آپ کی رسالت پر ایمان لائے، آپ کی رفاقت کی، اور
النور الذی انزل معه اولئك هم المفلحون — اقامت دین کی مہم میں آپ سے تعاون کیا اور اس نور ہدایت کے
الاعراف - ۱۵۷ — پیچھے چلے جو آپ کے ساتھ اترا ہے، تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

یعنی صحابیت و رفاقت کا مرتبہ ان ہستیوں کو حاصل ہے جو حضور پر ایمان لا کر پوری طرح تحریک اسلامی کے خادم بن گئے اور آپ کے مشن کی علمبرداری میں محو ہو گئے۔

انہی نکات کی بنا پر اہل علم میں صحابی کی تعریف میں خاصا اختلاف واقع ہوا ہے۔ بعض کی رائے میں ہر وہ شخص جس نے بحالت ایمان حضور کو دیکھا ہے۔ یا حضور کو دیکھا تو بحالت کفر تھا لیکن بعد میں سعادت ایمان حاصل کر لی، وہ صحابی ہے۔ لیکن دوسرے مفکرین نے اس حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے کہ " ان اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم " (میرے رفقاء ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی بھی رہنمائی حاصل کرو گے، ہدایت پاؤ گے) یہ رائے قائم کی ہے کہ صحابی (بمعنی حواری) ہونے کے لئے ذہنی و اخلاقی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ و معیار کا حصول ضروری ہے۔ صحبت و رفاقت یہاں ایسے مفہوم میں پیش نظر ہے جو منصب قیادت پر فائز کرنے والی ہے نہ کہ محض ملاقات یا زیارت یا ہم عصری! راقم الحروف کے نزدیک بھی یہی موخر الذکر رائے درست ہے۔ قرآن میں حواری اور حدیث میں صحابی کے جو اصطلاحی الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے اصل مفہوم صف قیادت کی وہ ہستیاں ہیں جنہیں ہر نبی نے اپنے قریب رکھ کر اسلامی معاشرہ کی سربراہ کاری کے لئے خاص تربیت دی ہے۔ عام اہل ایمان اگر حواری یا صحابی (یا والذین معہ) کی تعریف میں داخل ہیں بھی تو مرتبہ ثانی پر۔ اس رائے کے حق میں ہمارے سامنے دلائل ہیں۔ ان میں سے ایک ماخذ استدلال تو مذکورہ بالا حدیث ہے جس میں اصحاب نجوم سے مراد وہ ہستیاں ہیں جن کی اقتداء کی جانی چاہیے۔ اور ماہ رسالت کے گرد نجوم کی طرح جمع رہے ہیں۔ رسول پاک کا ایک دوسرا ارشاد اس معنی کو اور واضح کر دیتا ہے۔ جسے ابی بردہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ حضور کی اقتدا میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد اور عشاء سے قبل مسجد میں مجلس رہی جس میں حضور بھی آ شامل ہوئے۔ اس مجلس میں آپ نے فرمایا:۔

النجوم آمنة للسماء فاذا ذھبت النجوم اتی السماء ماتوعد وانا آمنة لاصحابی فاذا ذھبت انا اتی اصحابی مایوعدون واصحابی آمنة لامتی فاذا ذھب اصحابی اتی امتی مایوعدون

ستارے آسمان کے حق میں وجہ امن وامان ہیں۔ پس جب ستارے نہ رہیں گے تو آسمان کو وہ کچھ پیش آئے گا جو کچھ اس کے لئے طے پا چکا ہے اور میں اپنے اصحاب کے لئے ذریعہ سلامتی ہوں۔ پس جب میں چلا جاؤں گا تو میرے اصحاب ان معاملات سے دوچار ہونگے جو ان کے لئے مقدر ہیں اور میرے اصحاب ساری امت کے لئے سامانِ سلامتی ہیں۔ پس جب میرے اصحاب دنیا سے اٹھ جائیں گے تو میری امت کو اس صورتِ حال سے سابقہ پڑیگا جو اس کے لئے طے شدہ ہے۔

یعنی صحابیوں کی صف امت کے مقابلہ میں بالکل ممتاز کردی گئی ہے۔ رسولِ اکرم ان صحابیوں کے نگراں اور مربی ہیں اور صحابی بقیہ امت کے نگراں اور مربی ہیں۔ ظاہر ہے کہ امت کے لئے نگراں و مربی اور ضامن سلامتی ہونے کا مرتبہ ان خواص ہی کو حاصل ہو سکتا ہے جن پر نبی اکرم کی نگاہِ فیض خاص طور پر منعطف رہی ہو۔ برخلاف اس کے بدوؤں کے وفود یا نمائندے جو کبھی ایک آدھ بار حضورؐ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے اور کچھ مسائل پوچھ کر چلے گئے اور پھر کبھی حاضری کا شرف نہ پا سکے مشہور تابعی سعید ابن المسیب کے بقول صحابی کے خاص اصطلاحی مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ محدثین نے سلسلہ اسناد روایات کی جانچ پرکھ کے لئے اس بحث کو دور تک پھیلایا ہے اور محض ایک آدھ ملاقات کرنے والے صحابیوں سے مستقل رفاقت رکھنے والے صحابہ کو بالکل الگ ممتاز مقام دیا ہے۔ مستقل رفاقت رکھنے والے صحابی معیار کی حد تک قابلِ اعتماد شمار کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ ابن عبدالبر نے خاص طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ علامہ موصوف کا کہنا یہ ہے کہ کتاب اللہ کے بعد ہمارے ایک طالب علم کو جس اولیں چیز پر توجہ دینی ہے وہ سنت ہے کیونکہ یہی ذریعہ ان اشارات و مضمرات کو سمجھنے کا ہے جو کتاب اللہ میں منتشر ہیں۔ لیکن خود اس سنت کو سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ان شخصیتوں کو سمجھا جائے جنھوں نے سنت کے جواہر کو ہم تک منتقل کیا۔ یہ شخصیتیں حضورؐ کے رفقائے خاص کی ہیں۔ آپؐ کے معاونین تحریک کی یہ حضرات خیر القرون کے زیرِ عنوان آتے ہیں۔ یہ بہترین جماعت اور صالح ترین معاشرہ ہیں جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے تشکیل دیا گیا ہے۔ ان کے اخلاص اور راستبازی کی شہادت خود اللہ اور اس کے رسول ؐ نے دی ہے۔ اس شخص سے بڑھ کر صالح و امین کوئی نہیں ہو سکتا جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی صحبت و رفاقت کی توفیق دی ہو۔ علامہ ابن عبدالبر کے نزدیک یہ صحابی کی اصطلاح اس تعریف کے لئے[1] ان خواص پر راست آتی ہے جنھوں نے حضورؐ کی دعوت کو سب سے آگے بڑھ کر قبول کیا۔ حضورؐ پر پورا اعتماد قائم رکھا۔ آپؐ کے ہاتھ مضبوط کئے اور آپ کو جدوجہد کے دوران میں پورا تعاون پیش کیا۔ یہ اصطلاح اپنی اس تعریف کے ساتھ ہر اس مسلمان پر راست نہیں آتی جو آپؐ پر ایمان لایا ہو یا جس نے آپ کی محض زیارت کرلی ہو۔

اس موقع پر مشہور محدث مازری کے ایک اہم قول کا حوالہ دینا بھی مفید ہوگا جسے مولنا عبدالسلام ندوی نے "اسوۂ صحابہ" میں نقل کیا ہے:۔

لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول كل من سرا ه — ہم جو یہ کہتے ہیں کہ تمام صحابہ عدول[2] ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں

[1] الاستیعاب ج ۱۔ ص ۲ [2] محدثین کے ہاں صحابہ کے عدول ہونے پر بھی بڑی تفصیلی بحثیں ہیں۔ مگر ان ساری بحثوں میں عدالت سے اصطلاحی مفہوم بیان سنت میں اجتناب عن الکذب ہے۔ عدول کے معنی معصوم کے کسی نے نہیں لئے۔

صلی اللہ علیہ وسلم یوما او رآہ لماما او جتمع بہ لغرض وانصرف من کتب وانما الغنی بہ الذین لازموہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون (مقدمۂ اصابہ)

کہ ہر وہ شخص جس نے آپ کو کسی دن دیکھ لیا۔ یا چلتے پھرتے آپ کی زیارت کرلی یا کسی غرض سے آپ کی ملاقات کرکے تھوڑی دیر کے بعد واپس ہوگیا۔ عادل ہے، بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے، آپ کی تائید و اعانت کی اور اس نور کا اتباع کیا۔ جو آپ کے ساتھ اتارا گیا۔ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

ایسے اصحاب خاص کی تعریف میں قرآن بے شمار آیات و بینات اپنے اندر رکھتا ہے ان میں اصحاب الشجرہ شامل ہیں۔ ان میں شرکائے بدر ہیں، ان میں عشرۂ مبشرہ ہیں، اور ان میں خلفائے راشدین جیسی ہستیاں شریک ہیں۔

اس حقیقت کو ایک اہم روایت پوری صراحت سے سامنے لاتی ہے جسے ابن صلاح نے "مقدمہ" میں درج کیا ہے۔ حضرت انس ابن مالکؓ سے کسی نے ایک موقع پر دریافت کیا کہ "کیا آپ کے علاوہ رسول اللہؐ کے کوئی اور صحابی زندہ موجود ہیں؟" حضرت انس نے جواب دیا: "بعض ایسے بدوی ضرور زندہ ہیں جنھوں نے حضورؐ کی زیارت کی تھی۔ مگر حضورؐ کے صحابیوں میں سے اور کوئی نہیں رہا" گویا حضرت انس رضؓ ابن مالک کا نقطۂ نظر اس بارے میں بہت ہی واضح ہے۔ ایک ممتاز صحابی ہوتے ہوئے آپ نے صحابہ کو زائرین رسول کے مرتبہ کا حامل قرار دیا ہے۔

بہرحال تربیت یافتگان نبوت کی صف اول جو ایک طرف دعوت حق اور کتاب و سنت کا واحد ذریعہ حفاظت اور ذریعۂ انتقال تھی، جو شہداء علی الناس کے مرتبے میں سب سے پیش پیش رکھی گئی ہے جو ختم نبوت کے بعد حضورؐ کے مشن کو سنبھالنے اور اس کام کو آگے بڑھانے کی ضامن ٹھیری اور جس کے کاندھوں پر حضورؐ کے بعد معاشرہ کی قیادت کا بار پڑا اگر ایک بار اس کے ممتاز افراد پر سے اعتماد اٹھ جائے تو پھر ان کے ہاتھوں کتاب، سنت، تاریخ، آثار، اقدار، شعائر اور مناسک کے جتنے خزانے ہم تک پہنچے ہیں ان کا ہر سکہ مشکوک ہو کے رہ جاتا ہے۔ بعد کی تمام صفوں کا نبیؐ سے راستہ جوڑنے والے یہی رجال اعاظم ہیں۔ یہ درمیانی کڑی ٹوٹ جائے تو پھر ہم کہیں کے نہیں رہتے۔

صحابہ کرام کی صف اول میں بھی خلفائے راشدین کی ہستیاں منتخب ترین ہستیاں ہیں اسلامی معاشرہ کی دینی و سیاسی قیادت حضور پاکؐ کے بعد انہی کو تفویض ہوئی اور انھوں نے اپنے منصب کا حق ادا کردیا اور اپنی ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہوتے! یہ حضرات خیر القرون کا جوہر تراق تھے اور انھوں نے بڑی خوبی سے سرکار دوعالم کے مشن کو نہ صرف یہ کہ سنبھالا بلکہ فروغ دیا۔

اس مقالے میں ہم آسمان حق کے انہی روشن ترین ستاروں کے زریں کارنامے پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

جوہر قابل

عرب کی اسلامی تحریک کی گود میں انسانیت کے جن قائدین نے پرورش پائی، وہ حسب نسب کے اعتبار سے جوہر قابل رکھتے تھے۔ "خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام" کی معنویت سامنے ہو تو یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام کی ٹکسال میں انسانی کردار کے جو بہترین سکے ڈھلے ان میں استعمال ہونے والی دھات فی نفسہ قیمتی دھات تھی۔ بس اس کا کھوٹ میل دور ہونے اور تربیت کی کٹھالی میں پڑ کر دمکنے کی دیر تھی۔ پھر اس دھات سے جو سکے تیار ہوتے بازار تاریخ میں ان کو قبول دوام حاصل ہو کے رہا۔ آیئے باعتبار حسب نسب خلفائے راشدین پر ایک نگاہ ڈالئے۔

۱۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نسب والد کی طرف سے سات پشت اور والدہ کی طرف سے چھ پشت اوپر جاکر

مرّہ پر رسول اکرمؐ سے مل جاتا ہے ۔ آپ کے والد ابو قحافہ عثمان بن عامر شرکائے مکہ میں شامل تھے ۔ جناب صدیق ایک معزز باپ کے سائے میں پل کر متمول تاجر بنے ۔ کاروبار میں آپ کی دیانت وراست بازی کا شہرہ تھا ۔ اہل مکہ کی نگاہوں میں علم یا تجربہ اور حُسن خلق کی بنا پر آپ کو خاص اعتماد و وثوق حاصل تھا ایام جاہلیت میں خوں بہا کا مال آپ ہی کے پاس جمع ہوتا تھا کسی دوسری جگہ مال جمع ہونے پر قریش تسلیم نہیں کرتے تھے ۔ مہمان نوازی ، سخاوت ، غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے ، اور ان خوبیوں سے پورا مکہ متاثر تھا ۔

ایام جاہلیت میں بھی آپ کو شراب سے نفرت تھی ۔ حالانکہ شراب نوشی قریشی کلچر کا ایک اہم عنصر تھا ہم ذوقی و ہم مزاجی کے باعث عالم طفلی ہی سے سرورِ عالمؐ سے دوستی و ہم جلیسی کا رشتہ تھا ۔ تجارتی سفروں میں ساتھ رہے ۔

۲ :- حضرت عمر ابن الخطاب کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت اوپر جاکر مرّہ کے بھائی عدی کے واسطے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے ۔ آپ کا خاندان عرب میں ممتاز تھا ۔ آپ کے جداعلیٰ عدی کے دور سے اسی خاندان کے لوگ عرب کے تنازعات میں ثالث مقرر ہوتے تھے ۔ نیز سیاسی معاملات میں سفیر بناکر بھیجے جاتے تھے ۔ آپ کی والدہ حنتمہ ہاشم بن مغیرہ کی دختر تھیں ۔ مغیرہ قریش کی جنگوں میں فوج کا اہتمام کرنے پر مامور تھے ۔ حضرت عمرؓ نوجوان ہوتے شرفائے عرب کی مخصوص صلاحیتوں سے آراستہ ہوئے ۔ یعنی نسب دانی ، سپہ گیری ، شہسواری ، پہلوانی اور خطابت میں ناموری حاصل کی ۔ آپ نے لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھا ۔ تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا اور اس سلسلہ میں دور دراز کے سفر کرکے معلومات عامہ اور تجربہ و مشاہدہ کے لحاظ سے خاص درجہ حاصل کیا ۔ آپ کی غیرت و خودداری کی صفت معلوم عام تھی ۔ غیر معمولی قسم کی گتھیوں کو سلجھانے میں ملکۂ خاص رکھتے تھے ۔ آپ کی صلاحیتوں اور اثر و رسوخ کے پیش نظر حضورؐ نے دعا کی تھی کہ آپ اسلام لائیں[1] چنانچہ اس مردِ حنیف نے دورِ جاہلیت میں جہاں اسلام کی مخالفت میں پورا زور صرف کیا تھا ، وہاں آنکھوں سے پردہ اٹھتے ہی یکایک ایمان لایا اور پھر اسلام کا پرجوش علمبردار بن کر شرک و کفر کے مقابلہ میں کھڑا ہوگیا ۔ دل نے جب ایک بار حق کی حقانیت کی گواہی دے دی تو پھر کوئی تذبذب و تساہل باقی نہ رہا ۔

۳ :- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شجرۂ نسب پانچویں پشت تک اوپر جاکر عبدمناف پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے حضرت عثمان کی نانی نبی اکرمؐ کی سگی پھوپی تھیں ۔ آپ کے جدِاعلیٰ امیہ بن عبد شمس رؤسائے قریش میں سے تھے ۔ قریش کا قومی علم اسی معزز خاندان کے ہاتھوں میں رہتا تھا جنگ فجار میں اسی خاندان کی ایک ممتاز شخصیت حرب بن امیہ سپہ سالار قرار پائی تھی ۔ حضرت عثمانؓ نے بھی نوشت و خواند میں استعداد پیدا کی ۔ معاش کا ذریعہ تجارت کو بنایا اور کاروبار میں آپ کی ریاست و صداقت کی وجہ سے بہت ترقی ہوئی حضرت ابوبکرؓ کی تلقین سے دورِ ابتدا ہی میں اسلام لائے ۔

۴ :- حضرت علی کرم اللہ وجہہ ، ابوطالب کے فرزند تھے ۔ والد اور والدہ دونوں سلسلوں سے ہاشمی تھے اور اس لحاظ سے باعتبار نسب رسول اللہؐ کے خاص قرابت دار ۔ اور چچا زاد بھائی تھے ۔ خاندانِ ہاشم کو قریش میں غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل تھا ۔ خانۂ کعبہ کی خدمت و نگہداشت اسی خاندان کے سپرد تھی ۔ اس خدمت کی وجہ سے پورے عرب میں ہاشمیوں کو سیادت حاصل تھی ۔ حضرت علیؓ کے والد اور حضورؐ کے چچا ابوطالب نے رسولِ پاک کی پرورش بھی کی اور آپؐ کی حمایت میں سینہ سپر بھی رہے ۔ حضرت علیؓ نے رسولِ اکرمؐ کی سرپرستی میں پرورش پائی اور بچپن ہی سے آپؐ کے زیرِ سایہ رہے ۔ آپ نے رسول اکرمؐ کی دعوت پر ہاشمی خاندان کی ایک مجلس میں بڑی جرأت سے لبیک کہی اور نوعمری میں وہ اقدام کیا کہ پختہ سال بزرگوں کو پیچھے چھوڑ دیا ۔

---

[1] الفاظ دعا یہ ہیں :- اَللّٰھُمَّ اَعِزِّ الاسلام باحد الرجلین اما ابن ھشام وا ما عمر ابن الخطاب (جامع ترمذی)

چاروں حضرات کے کردار کی خام دھات کو دیکھئے کہ آگے چل کر جسے سرورِ عالمؐ نے اسلام کے سانچے میں ڈھالا۔ یہ لوگ خاندانی لحاظ سے معزز، عادت واطوار کے لحاظ سے محترم اور صلاحیتوں کے لحاظ سے پیش پیش تھے۔ بنیادی فطرت کے لحاظ سے یہ مال کھرا مال تھا۔ اسلام کی کٹھالی میں پڑ کر یہ سونا کندن بن گیا!

تحریک اسلامی میں عملی حصہ

تحریکوں کی قیادت انہی لوگوں کے ہاتھوں میں جاتی ہے جنھوں نے جان جوکھوں میں ڈال کر اس کا علم بلند کرنے کی مساعی سرانجام دی ہوں جنھوں نے دنیوی ترقیوں کے ارمانوں اور معاشی امنگوں کو بالائے طاق رکھ کر بے لوث طریقہ سے عمریں کھپائی ہوں۔ جنھوں نے اپنے مفاد سے منہ موڑ کر تکلیفوں اور مصیبتوں کو لبیک کہا ہو۔ اور جنھوں نے بہت سے بیگانوں کو بے گانا بنا کر اپنے آپ کو مردانگی آزمائشوں سے گذرا ہو، ایسے ہی لوگ سزاوار ہو سکتے ہیں کہ کسی بھی تحریک یا نظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں رہے۔ ایسے لوگ ہی اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر اخلاص کے ساتھ اپنا فرض انجام دے سکتے ہیں لیکن اگر کسی دعوت کے لئے برسوں تک جانفشانیاں کرنے اور عمر بھر مصیبتیں سہنے والے افراد بھی من حیث المجموع کھوٹا مال قرار پا جائیں تو پھر اور کون ہوگا جس سے دیانت واخلاص کی امید باندھی جائے۔ کسی دعوت اور تحریک کے ابتدائی علمبردار اس کے لئے مال کھپانے والے، اس کے لئے ہجرت کرنے والے۔ اور اس کے لئے جہاد کرنے والے۔ اس تحریک کے مزاج کا ایک مستقل کردار اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں، وہ ان کی خاص روایات بن جاتی ہیں، ان کے سوچنے کا۔ ہیج معین ہو جاتا ہے اور ان کے علم وعمل کی روشنی میں ہی یہ قافلہ آگے بڑھتا ہے۔

ایسے لوگ جماعت یا معاشرہ کے اندر بالکل ممیز ہوتے ہیں۔ ان کو ہر کوئی جانتا اور پہچانتا ہے اور انہیں ان کی کوشش کے بغیر اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ہر صاحب دعوت ایسے خاص افراد کو اپنے پہلو میں رکھتا ہے۔ ان کو سینے سے لگاتا ہے اور ان کی قدر ومنزلت کرتا ہے۔ اور یہی افراد بعد میں ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے چنے جاتے ہیں۔

آیئے اس معیار کو سامنے رکھ کر دیکھیں کہ خلفائے راشدین کا مقام تحریک اسلامی میں کیا تھا!

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ آزاد بالغ انسانوں کی صف میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ آپ حضورؐ کو ایک ۔۔ دوست کی حیثیت سے قریب سے جانتے تھے۔ ان کی فطرت سلیم تھی اس لئے انفرادی دعوت کے ابتدائی دور میں کسی تأمل کے بغیر ایمان لے آئے۔

دعوتِ اسلامی کو قبول کرتے ہی ایک جذبہ خاص کے ساتھ اس دعوت کو پھیلانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں حضرت عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن العوام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت طلحہ بن عبداللہؓ حضرت عثمان ابن مظعون، حضرت ابوسلمہ اور حضرت ابوعبیدہ، حضرت خالد بن سعید جیسے درخشاں ستارے اسلام کے افق پر جلوہ بار ہو گئے

تحریک کا سارا کام رسولِ اکرمؐ آپ کے مشورے سے سرانجام دیتے۔ تقریباً روزانہ حضرت صدیقؓ کے گھر پر دیر تک غور وفکر کی مجلس قائم رہتی۔ ابتدائی کٹھن دور میں حضرت صدیق رضؓ نے جان، مال اور دماغ کا پورا پورا تعاون حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ سرکار دو عالم جب کبھی قبائل عرب یا مجمع ہائے عام میں دعوت پیش کرنے جاتے تو جناب صدیق رفاقت کرتے۔ اور حضورؐ کا تعارف کراتے۔

جن غلاموں اور لونڈیوں کو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے قریش عذاب دیتے تھے ان کو جناب صدیق رضؓ اپنا مال صرف کر کے آزاد کراتے چنانچہ بلال، عامر بن فہیرہ، نذیرہ، نہدیہ، جاریہ، بنی مومل اور بنت نہدیہ کو آپ ہی نے نجات دلائی۔ قبول اسلام کے ساتھ تقریباً چالیس ہزار درہم کا اندوختہ تحریک پر صرف کر دیا۔

جب کبھی نبی اکرمؐ پر کفار دستِ تعدی دراز کرتے تو حضرت ابوبکر صدیق خطرناک ترین مواقع پر سینہ سپر ہو جاتے۔ خود بھی ایذائیں برداشت کیں۔ جب طلحہ بن عبداللہ نے اسلام کی دعوت پر لبیک کی تو ان کے چچا نوفل بن خویلد نے حضرت طلحہ کے ساتھ

جناب صدیق کو بھی باندھ مارا۔ حالات بہت ہی سخت ہوگئے اور ہجرت حبشہ کا دروازہ کھلا تو رسول اکرمؐ کی اجازت سے جناب صدیق بھی ہجرت کرنے کے لئے نکلے۔ راستہ میں رئیس قارہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا کہ تم جیسے مہمان نواز اور بیکسوں کے خدمت گزار کو مکہ سے نکلنا نہیں چاہیئے۔ ابن الدغنہ بڑے اصرار کے بعد آپ کو واپس لایا اور اپنی طرف سے امان کا اعلان کیا۔ بعد میں یہ امان آپ نے واپس کردی

ہجرت مدینہ کی ساری اسکیم بھی آپ ہی کے گھر میں طے ہوئی۔ حضرت عائشہ اور حضرت اسماء نے زادراہ تیار کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رفیق سفر بنے۔ غار ثور میں پہلی منزل ہوئی۔ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ مکہ کی سرگرمیوں کی روداد شب کو آکر پہنچاتے۔ آپ کا غلام عامر بن فہیرہ بکریوں کے ریوڑ کو غار تک لاکر دودھ کی رسد پہنچاتا۔ کفار جب ان مہاجرین راہ حق کی تلاش میں غار کے دہانے پر پہنچے تو جناب صدیق کو تشویش ہوئی اور اس موقع پر الفاظ وحی میں آپ کو مخاطب بناکر کہا گیا کہ "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا"

مدینہ میں جاکر اسلام کے روحانی و تمدنی مرکز یعنی مسجد نبوی کی تعمیر کے لئے جو زمین خریدی گئی اس کی قیمت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی نے ادا کی۔ پھر آپ اس کی تعمیر کے عملی کام میں بھی مزدوروں کے مصروف ہوگئے۔

دلائل و براہین کی بازی ہر جانے کے بعد جب دشمنان حق تیغ بکف ہوکر اٹھے اور جہاد کا سلسلہ شروع ہوا تو معرکۂ بدر سے لے کر فتح مکہ تک کے سارے موقعوں پر جناب صدیق جانثار سپاہی بن کر حضورؐ کے پہلو میں موجود رہے۔ جنگ بدر میں آپ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کا مقابلہ کرکے ایک شاندار روایت قائم کردی۔

میدان احد میں ایک نازک موقع پر مسلمانوں کی صفوں میں وقتی انتشار پھیلا تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔ غزوہ حنین میں بھی آپ نے غیر معمولی ثبات کا مظاہرہ کیا۔ طائف کے محاصرے کے دوران میں زخمی ہوئے یہی زخم اندر اندر اپنا کام کرتا رہا اور آپ کی وفات کا باعث ہوا۔

حدیبیہ کے مقام پر جو معاہدہ طے پایا اس کی گہرائیوں کی طرف توجہ نہ جانے کی وجہ سے صحابہ کرام میں سخت اضطراب پیدا ہوا اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق سے حضرت عمرؓ نے بات کی اور کہا کہ کفار سے اس قدر دب کر صلح کیوں کی جارہی ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ "آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں اس لئے آپ اس کی نافرمانی نہیں کرسکتے اور وہ ہر وقت آپ کا معین و ناصر ہے" اس جواب سے آپ کے ایمان بالرسالت کی گہرائی اور مضبوطی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۹ھ میں عام خبر چلی کہ قیصر روم حملہ آور ہونے والا ہے۔ مالی اعتبار سے اسلامی حکومت کے حالات کمزور تھے۔ رسول اکرمؐ نے انفاق فی سبیل اللہ کی اپیل کی۔ صحابہ کرام نے دل کھول کر مال پیش کیا۔ حضرت عثمانؓ نے خصوصاً بڑے پیمانے پر مالی تعاون پیش کیا۔ یہی وقت تھا کہ جناب صدیقؓ نے جملہ اثاث البیت بارگاہ رسالت میں پیش کردیا اور کہا کہ اہل و عیال کے لئے خدا اور رسولؐ کافی ہیں۔ اس طرح بازی لے گئے۔

۲:- حضرت عمرؓ جیسا باشعور اور فعال انسان آخر اس تحریک سے بے تعلق کیسے رہ سکتا تھا جو مکہ میں ابھر رہی تھی۔ تعلق مخالفت کی راہ سے سہی، لیکن روز اول سے تھا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نبی اکرمؐ کو پریشان کرنے کے ارادے سے نکلے۔ حضورؐ مسجد حرام میں تشریف لے گئے۔ پیچھے پیچھے حضرت عمرؓ تھے۔ حضورؐ نے نماز شروع کردی اور سورۃ الحاقہ تلاوت کی۔ عمرؓ سنتے رہے۔ دل میں غیر شعوری طور پر خدائی کلام نے گھر کرلیا۔ چنانچہ اس موقع سے متعلق اپنا حال خود بیان کرتے ہیں کہ "اسلام پوری طرح میرے دل میں اتر گیا۔"

انسانی نفسیات کا ایک انداز خاص یہ بھی ہوتا ہے کہ دل میں جو چیز اتر جاتی ہے، آدمی کے سابق رجحانات ایک بار اس کے خلاف بڑا طوفانی حملہ کرتے ہیں اس کی وجہ دراصل یہ ہوتی ہے کہ اس کشمکش اضداد کے جان لیوا عالم سے نکلنے کے لئے طبیعت زور کرتی ہے۔

یہی محرک تھا جس نے حضرت عمرؓ کو معاً انتہائی اقدام پر آمادہ کر دیا۔ تلوار لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلے۔ راستہ میں نعیم بن عبد اللہ کا طنز سن کر بہن اور بہنوئی کو قبول اسلام کی سزا دینے چلے۔ ایک طرف نفسیاتی ردِ عمل کا پیدا کردہ غضب تھا، دوسری طرف دل کے مخفی گوشوں میں اعترافِ حق اور تیسری طرف بہن اور بہنوئی کی محبت۔ بہن اور بہنوئی کو مارا پیٹا۔ لیکن زخمی بہن نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ جب یوں اظہار عزیمت کیا کہ "عمر! جو چاہے کرو، اسلام تو اب دل سے نہیں نکل سکتا" تو دل پسیج کر یکسو ہو گیا۔ بہن سے قرآن سنا کلمۂ شہادت ادا کیا اور حضورؐ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔ آپ کے اسلام میں آنے سے حق کی قوت میں نمایاں اضافہ ہوا چنانچہ صحابہ نے اللہ اکبر کا اس قدر پرجوش نعرہ بلند کیا کہ پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ اس سے قبل تقریباً چالیس افراد پر مشتمل جماعت اسلام دعوتِ حق، عبادتِ رب، تعلیم و تزکیہ اور باہمی مشاورت کے سارے وظائف خفیہ طریقے سے سرانجام دیتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے آتے ہی نقشہ بدل گیا، اب حق کا برملا اظہار ہونے لگا اور اسلامی تحریک دوسرے دور میں داخل ہو گئی۔

وہی عمرؓ جنھوں نے مسلمانوں پر ابتدا میں ظلم توڑے تھے۔ اب خود مسلمانوں کے ساتھ مشرکین کے ظلم سہنے میں شریک تھے۔ چھ سات برس جور و تشدد کی بھٹی میں تپے اور اس دور میں جبر کی جگہ صبر سیکھا۔ سرکار دو عالمؐ کی اجازت سے مدینہ کو ہجرت کی تو اپنی طبیعت و مزاج کے مطابق کئی رفیقوں کو ساتھ لے کر، علانیہ کہا اور چیلنج کیا کہ جسے مزاحمت کرنی ہو وہ مکہ سے باہر نکل آئے۔ کوئی سامنے نہ آ سکا۔

معرکۂ بدر میں اس شان سے شریک ہوئے کہ اپنے ماموں عاص ابن ہشام بن مغیرہ کو واصل جہنم کر دیا۔ مدینہ کے یہودیوں کے خلاف جتنے غزوات پیش آئے اور غزوۂ سویق جیسے چھوٹے چھوٹے معرکوں میں حضرت عمرؓ نے پوری طرح حصہ لیا۔ احد میں جب مسلمانوں میں بطور تنبیہ عارضی انتشار کی کیفیت مشیت نے پیدا کی، اور ایک نازک موقع پر خالد کی کمان میں دشمنوں کی فوج کا ایک دستہ حضورؐ کی طرف بڑھنے لگا۔ تو اس وقت حضرت عمرؓ نے چند مہاجرین و انصار کی مدد سے اس دستہ کا منہ پھیر دیا انہی سنگین حالات میں ابو سفیان نے ابوبکرؓ و عمرؓ کا نام لے کر پکارا کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا "او دشمنِ خدا ہم سب زندہ ہیں"۔ ابو سفیان نے "ہبل، سربلند رہ" کا نعرہ لگایا تو حضورؐ نے حضرت عمرؓ ہی کو حکم دیا کہ جواباً کہو کہ "اللہ بلند و برتر ہے"۔

جنگِ احزاب کے سلسلے میں خندق کھودی گئی تو حملہ کے وقت اس کے ایک حصہ کی پاسبانی پر حضرت عمرؓ ہی مامور کئے گئے۔

واقعۂ حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کی غلط افواہ اڑی تو حضرت عمرؓ ہتھیار لگا کر جہاد کے لئے تیار ہو گئے راستے میں بیعت رضوان کی اطلاع ملی۔ فوراً حاضر ہو کر بیعت کی۔ معاہدہ کی اس شرط نے کہ قریش کا آدمی تو واپس کر دیا جائے گا اور جو کوئی قریش کے قبضے میں آ جائے واپس نہ کیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ کی غیور طبیعت کو سخت مضطرب کر دیا۔ بعد میں اس جذبۂ غیرت کو بھی رسول خدا کے سامنے جھکا دیا۔ مگر اپنے وقتی اضطراب پر نادم بھی رہے!

خیبر کے معرکہ میں کامیاب ہونے پر زمین مجاہدین میں تقسیم ہوئی تو ایک قطعہ حضرت عمرؓ کے حصہ میں بھی آیا۔ یہ قطعہ آپ نے راہ خدا میں وقف کر دیا۔ غالباً اسلام کی تاریخ میں وقف کی یہ پہلی مثال تھی۔

فتح مکہ کی مہم پر بھی حضرت عمرؓ رسول اکرمؐ کے پہلو میں موجود تھے اس کے بعد غزوۂ حنین میں بھی بڑی پامردی دکھائی ۹ھ میں جب قیصر روم کے حملہ کی خبر اڑی تو حضورؐ کی طرف سے مالی ایثار کی اپیل پر حضرت عمرؓ نے اپنے اموال و املاک کا نصف حصہ پیش کر دیا۔

۳؎ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دوستانہ رابطہ حضرت ابوبکرؓ سے تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے دعوت دی اور تفصیلی گفتگو کی۔

فوراً متاثر ہوئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں جاکر حلقہ بگوش اسلام ہونے کا ارادہ کرلیا۔ اتفاقاً سرکار دو عالم ﷺ بھی تبھی خود تشریف لے آئے حضور ﷺ کے سامنے کلمہ شہادت ادا کیا۔ حضرت عثمان رضؓ کا قبول اسلام اس لحاظ سے بڑے ایثار کا حامل ہے کہ آپ کا تعلق خاندان بنو امیہ سے تھا جو ہاشمی خاندان کا دیرینہ حریف تھا مگر جناب عثمان نے خاندانی عصبیت کو درکنار رکھ کر قدم آگے بڑھایا۔۔۔۔

حضرت عثمان نے مکہ کے دورِ ابتدا میں کفار و مشرکین کے ہاتھوں زیادتیاں برداشت کیں خود چچا نے آپ کو مارا۔ اعزہ و اقارب نے سخت گیری اختیار کی۔ آخرکار حضور رسالتمآب کے اذن سے اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے کر حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ قریش کے اسلام لانے کی جھوٹی خبر ملنے پر بعض دیگر صحابہ کے ساتھ آپ واپس آگئے۔ بقیہ رفقا تو خبر کے غلط نکلنے پر پھر حبشہ چلے گئے مگر حضرت عثمان مکہ ہی میں رہ گئے۔ یہاں تک کہ ہجرت مدینہ کی سعادت حاصل کی۔

مدینہ میں آکر پانی کی تکلیف محسوس کی گئی۔ بیئر رومہ ایک یہودی کا کنواں تھا جس کا پانی وہ بیچا کرتا تھا۔ حضرت عثمان ؓ نے پہلے اس کنویں کا نصف حق ملکیت بارہ ہزار درہم میں اور پھر دوسرا نصف آٹھ ہزار درہم میں خرید کر وقف کردیا۔

اگرچہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اندر سپاہیانہ صلاحیتوں کو پہلے سے نشوونما نہیں دی تھی، لیکن جہاد فی سبیل اللہ کی سرگرمیوں میں حضور ﷺ کا پوری طرح ساتھ دیا۔ غزدۂ بدر میں آپ کو   جناب رقیہ کی شدید علالت نے شرکت کا موقع نہ دیا۔ اس کا آپ کو بہت افسوس رہا لیکن چونکہ بارشادِ رسالت آپ مجبوراً ٹھہرے تھے۔ اس لئے آپ کو اس میں شریک قرار دیا گیا اور مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا گیا۔ نیز اجر و ثواب کی بشارت بھی دی گئی۔ بقیہ معرکوں میں آپ عملاً بھی شریک رہے اور رائے اور مشورہ سے بھی حقِ نصرت ادا کیا۔

میدان احد میں چند مسلمان تیراندازوں کی ایک کوتاہی سے مسلمانوں کو جس عالمِ انتشار کا سامنا کرنا پڑا اس کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سخت نادم اور پشیمان رہے۔

غزوہ ذات الرقاع میں جاتے ہوئے سرورِ عالم ﷺ نے آپ کو مدینہ میں قائم مقام مقرر کیا۔ بنو نضیر کی جلاوطنی اور غزوۂ خندق اور واقعہ حدیبیہ میں شریک رہے۔

غزوۂ تبوک کے لئے صحابہ نے دل کھول کر مالی مدد دی تھی۔ حضرت عثمان ؓ نے ایک تہائی فوج کے جملہ اخراجات تنہا اپنے ذمے لے لئے درآنحالیکہ تیس ہزار پیادے اور دس ہزار سوار اس فوج میں شامل تھے۔ حضور ﷺ اس ایثار پر حد درجہ خوش تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "آج کے بعد عثمان کا کوئی کام اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

۴:۔ حضرت علی رضؓ چونکہ عالمِ طفلی میں حضور ﷺ کے سایۂ عاطفت میں رہے۔ اس لئے اسلام کی پہلی شعاع ہی کا ان کی بصیرت نے خیر مقدم کیا۔ ایک روز سرورِ دو عالم ﷺ اور حضرت خدیجہ کو مصروفِ عبادت دیکھا۔ تعجب سے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے اپنی رسالت کا ذکر کیا، توحید کی دعوت دی۔ کفر و شرک کی مذمت میں چند کلمات ارشاد فرمائے۔ حضرت علی ؓ یہ نئی باتیں سن کر سوچ میں پڑے۔ ارادہ کیا کہ والد سے پوچھیں گے۔ لیکن اگلے ہی روز ایمان لے آئے۔ بعد میں ہاشمی خاندان کی طلب کردہ مجلس میں حضور ﷺ کی دعوت پر علی الاعلان پورے تعاون کی پیش کش کی اور پھر اپنے قول کو عملاً سچا کر دکھایا۔ مکہ کے ابتدائی دور ہی سے مشورہ اور تربیت کی مجالس میں شرکت کرتے رہے۔

حضرت علی رضی اللہ کو ہجرت نبوی کے موقع پر یہ سعادت حاصل ہوئی کہ آپ حضور ﷺ کے بستر پر سوئے جو تلواروں کی زد پر تھا مدعا یہ تھا کہ سرکار دو عالم ﷺ کی ہجرت کا راز رات میں فاش نہ ہو۔ پھر آپ ہی کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ اہل مکہ کی امانتیں اور حسابات ادا کر کے آئیں جو رسولِ پاک ﷺ کے پاس رکھوائے گئے تھے۔

مدینہ میں مسجد کی تعمیر کے دوران میں حضرت علی رضہ بنفس نفیس مزدوروں کا ہاتھ بٹا کر گارا ڈھوتے رہے۔

حضرت علی رضہ جنگی صلاحیتوں کے لحاظ سے درجۂ اختصاص رکھتے تھے۔ اس لئے جہاد کے معرکوں میں مقام امتیاز حاصل کیا۔ معرکۂ بدر کے موقع پر جو دو علم آگے آگے مجاہدین لہرا رہے تھے ان میں سے ایک حضرت علی کے ہاتھ میں تھا۔ مبارزت کے لئے پہلے پہل تین انصار نکلے۔ قریش نے مطالبہ کیا کہ ہمارے جوڑ کے بہادروں کو بھیجو۔ پس حضرت حمزہ، حضرت علی، اور حضرت عبیدہ سامنے آگئے، حضرت علی کے ایک وار نے ان کے حریف ولید کا خاتمہ کر دیا اور پھر پھرتی سے حضرت عبیدہ کی مدد کو پہنچ گئے۔ پھر عام جنگ میں آپ نے مشرکین کی صفیں الٹ دیں۔ احد کے میدان میں نہایت نازک گھڑی میں ثابت قدمی دکھائی۔ مصعب بن عمیر شہید ہوتے تو فوراً آپ نے علم سنبھالا۔ مشرکوں کے علمبردار ابو سعد بن ابی طلحہ کی للکار پر ایک ہاتھ مار کر گرا دیا۔ بنی نضیر کی سرکوبی کے لئے اقدام ہوا تو حضرت علی ہی صاحب علم تھے۔ غزوۂ خندق میں سواروں کے ایک بپھرے ہوئے دستے کا بے جگری سے مقابلہ کیا اور ان کے سردار عمرو بن عبدود کو جہنم رسید کر دیا۔ بنو قریظہ کی سرکوبی کی مہم میں بھی حضرت علی کو علم تفویض کیا گیا۔ بنو سعد پر بھی حضرت علی رضہ نے ہی ایک سو مجاہدین کے ساتھ چڑھائی کی۔ اور ان کو منتشر کر دیا۔ واقعۂ حدیبیہ میں بھی حضرت علی رضہ حضور کے ہم رکاب تھے اور معاہدہ کے کاتب تھے۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر فوج کی کمان پہلے حضرت ابو بکر رضہ کو اور پھر حضرت عمر رضہ کو دی گئی، مگر معرکہ سر نہ ہوا۔ آخر میں بڑے اعزاز کے ساتھ یہ ذمہ داری حضرت علی رضہ پر ڈالی گئی۔ چنانچہ خیبر مفتوح ہو گیا۔

مرحب شکنی کا اعزاز بھی حضرت علی رضہ نے حاصل کیا۔ یہودیوں کا سردار مرحب بڑے بڑے جوش سے رجز پڑھتا ہوا نکلا، مگر حضرت علی رضہ کی تیغ جوہر دار کا ایک وار اس کے لئے کافی رہا۔ فتح مکہ کے موقع پر بھی حضرت علی رضہ اعلیٰ فوجی افسر کی حیثیت سے شریک تھے۔ شہر میں فاتحانہ داخلہ کے وقت حضرت علی رضہ کے ہاتھ میں علم تھا۔ غزوۂ حنین کے موقع پر غفلت کے عالم میں غنیم نے ایسا ناگہانی حملہ کیا کہ بارہ ہزار سپاہ میں سے چند ہی افراد ثابت قدم رہ سکے۔ ان میں سے ایک حضرت علی رضہ بھی تھے۔ آپ نے دشمن کے سپہ سالار کو ختم کر دیا۔ اسی دوران میں اسلامی سپاہ سنبھل گئی۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ کو حضور نے اہل بیت کی حفاظت پر مدینہ میں مامور کیا تھا۔

نہایت ہی مختصر الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کرنے والے چاروں خلفائے راشدین کا یہ پارٹ تھا تحریک اسلامی کے فروغ دینے میں۔ انہوں نے تاریک ماحول میں آگے بڑھ کر دعوتِ نبوی پر لبیک کہی، انہوں نے بہت سے تعلقات کو پس پشت ڈالا۔ تشدد کی بھٹی میں تپے گھربار کو چھوڑا۔ مال صرف کیا۔ اپنے آپ کو خاک و خون میں لوٹنے جانے کے لئے پیش کیا اور نہایت ہی نازک لمحوں اور سخت گھڑیوں میں اسلام کی حمایت کا حق ادا کیا۔ پندرہ پندرہ بیس بیس برس جن ہستیوں نے یہ کردار پیش کیا ہے ان کے بارے میں یہ تصور دلانا کہ وہ رحلت نبوی کے بعد آناً فاناً رنگ بدل گئے ہوں گے۔ کسی معقول آدمی کے لئے قابل فہم نہیں ہے۔

ان حضرات کا کارنامۂ حیات گواہی دیتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی قیادت کے لئے صلاحیت و استحقاق اگر تھا تو انہی حضرات میں تھا، جنہوں نے تحریک کی آبیاری خون کے قطروں سے کی تھی۔ ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا اس کا خادم، خیرخواہ اور محافظ نہیں ہو سکتا تھا۔ ذاتِ رسالت مآب اور حضور کے ساتھ سارا اسلامی معاشرہ اور مدینہ کی "الجماعت" خلفائے راشدین کی اس قدر و قیمت، خدمتِ دین اخلاص و ایثار اور سرفروشی و جانبازی کو نہ صرف یہ کہ سمجھتی تھی بلکہ اس کا اعتراف کرتی تھی!

صلاحیتیں جو تدریجاً اجاگر ہوئیں

(۱) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے جو رسالت کے قرب میں جلا پاتا گیا۔ ابتدا میں شعر گوئی کی طرف میلان تھا۔ لیکن اسلامی انقلاب کا علمبردار بننے کے بعد عملی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئیں کہ یہ مشغلہ برقرار نہ رہا۔ کبھی کبھی اتفاق سے خیالات موزوں ہو جاتے تھے۔ مثلاً امام حسین کو طفلی میں

دیکھ کر ایک بار فرمایا:۔

وباب شبه النبی — لیس شبیها بعلی

میرا باپ فدا ہو آپ نبی ؐ سے مشابہ ہیں — علی رضؓ سے مشابہ نہیں ہیں۔

تقریر اور خطابت کی خاص صلاحیت سے آراستہ تھے۔ اہم مواقع پر آپ نے معرکۃ الآرا تقریریں کیں اور حالات کا رُخ بدل دیا۔ مثال میں وہ تقریر پیش کی جاسکتی ہے جو آپ نے سقیفہ بنو ساعدہ میں فرمائی۔ اسی طرح خطبۂ خلافت کے جو فقرے ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی زورِ خطابت میں لاجواب ہیں۔ ایک مشہور تقریر کے فقرے دیکھئے:۔

"آج وہ حسین اور روشن اور جوشِ شباب سے حیرت میں ڈالنے والے چہرے کہاں ہیں؟ آج بڑے بڑے شہروں کے بسانے والے اور ان کو قلعہ بند کرنے والے سلاطین کدھر گئے؟ آج بڑے بڑے غالب آنے والے سُورما کیا ہوئے؟ زمانہ کی گردشوں نے ان کی ہمتیں پست کر دیں۔ ان کے بازو توڑ دیئے اور وہ قبر کی تاریکیوں میں ہمیشہ کی نیند سو گئے!"

نسب دانی میں جو کمال حاصل تھا اس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں جیسا کہ حضرت جبیر بن مطعم جیسے نساب کا اعتراف ہے کہ میں نے اس فن کو حضرت ابوبکرؓ سے سیکھا تھا۔

تعبیر رؤیا کا ملکہ بھی آپؓ کو حاصل تھا۔ روایات میں صحابہ و صحابیات کے متعدد خوابوں پر آپ کی بیان کردہ تعبیریں محفوظ ہیں اور وہ بالکل درست ثابت ہوئیں۔ خود رسولِ اکرم ؐ نے آپ کو تعبیر رؤیا کے لئے فرمایا ہے اور آپ کی تعبیر کی تصدیق کی ہے۔

چونکہ صدیق اکبرؓ مہبط وحی کی معیت اور حضور ؐ کے قرب میں رہے ہیں اور تمام واقعات و احوال میں بہ نفس نفیس شریک تھے جن سے کسی سورت یا آیت کا شانِ نزول عبارت تھا۔ اس لئے آپ مرتبہ اول کے مفسر تھے۔ دو مواقع پر آپ کے علم تفسیر نے مسلمانوں کو راہ راست دکھائی۔ ایک تو "علیکم انفسکم" کی غلط تفسیر کی آپ نے بروقت اصلاح کی، دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت پر جب حضرت عمرؓ تلوار لے کر کھڑے ہو گئے تھے کہ جو کوئی کہے گا۔ رسول اللہ ؐ وفات پاگئے۔ میں اس کی گردن اڑا دوں گا تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے آیت "وما محمد الا رسول" پڑھ کر ایسی تقریر کی کہ حضرت عمرؓ فوراً اپنے آپ میں آگئے۔

آپ حدیث کے خزانے کے بھی بہت بڑے امانت دار تھے۔ معیت رسول ؐ نے آپ کو اس سعادت سے آراستہ کیا۔ اس علم کی بنا پر آپ نے اپنے دور خلافت میں نصاب زکوٰۃ کا مفصل ہدایت نامہ تیار کر کے تمام علاقوں میں بھجوا دیا۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کے سلسلہ میں جب بحث چھڑی ہے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ حدیث پیش کر کے معاملہ کو فوراً سلجھا دیا کہ "الائمۃ من قریش"

حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ نے نبی اکرم کی میراث کا مسئلہ اٹھایا تو آپ نے یہ قول رسالت پیش کیا کہ "لا نورث، ما ترکنا صدقۃ" یعنی (ہم نبیوں کے) مال میں وراثت جاری نہ ہوگی، ہمارا سارا ترکہ امت پر صدقہ ہے۔

قائدین اجتہاد کی صلاحیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کسی نظام کو چلایا ہی نہیں جا سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیق اس صلاحیت سے امتیازی نشان کے ساتھ آراستہ تھے۔ یہی اجتہادی شعور تھا جس کے تحت آپ نے خطبۂ خلافت میں رسول ؐ کے مقام سے جانشین رسول ؐ کے سیاسی مقام کو یہ کہہ کر الگ کر دیا کہ "اگر تم مجھے راہ راست پر دیکھو تو اتباع کرو۔ اگر راستہ سے ہٹوں تو مجھے سیدھا کر دو" گویا ہمیشہ کے لئے خلافت یا اسلامی حکومت کے کارپردازوں اور عوام امت کے سیاسی رابطے کو آپ نے متعین کر دیا۔ آپ کا اجتہادی نقطۂ نظر

اس اصول پر مبنی تھا کہ معاملات میں پہلے قرآن کریم سے حکم معلوم کرتے۔ اگر نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے، پھر بھی نہ ملتا تو عام مسلمانوں سے رائے لیتے، پھر کوئی فیصلہ کرتے۔ قیاسی مسائل سے عملاً اجتناب کرتے۔ مجبوراً قیاس سے کام لینا پڑتا تو بے حد محتاط ہو کر حکم لگاتے، کلالہ کی میراث کے ایک بہت بڑے اختلافی مسئلے میں آپ نے اپنی قوت اجتہاد سے کام لیا۔

آپ کے اندر اخلاقی لحاظ سے زہد و اتقا کی پُرزور روح کارفرما تھی۔ ایک مرتبہ کسی کے ساتھ ایک راستے پر جا رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس طرف بعض بدمعاش رہتے ہیں۔ فوراً اس راستے سے ہٹ آئے۔ اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ میں آپؓ نے بے نظیر کردار پیش کیا، حتیٰ کہ اپنی ساری کمائی راہِ حق میں کھپا دی۔ خلافت کا جو وظیفہ ملتا رہا وہ بھی آخری وصیت کے ذریعے بیت المال میں واپس داخل کرا دیا۔ آپ بڑے مہمان نواز بھی تھے۔ خدمتِ خلق کا یہ حال تھا کہ ایک دن روزہ سے ہوتے ہوئے جنازہ کے ساتھ بھی گئے، مسکین کو کھانا بھی کھلایا اور مریض کی عیادت بھی کی۔ اس پر سرکارِ دو عالم ﷺ نے جنت کی بشارت دی۔ بالعموم اہلِ محلہ کی خدمات انجام دیتے، ضعیف و لاچار لوگوں کے بھی کام کرتے۔ مدینہ کے قریب رہنے والی ایک بڑھیا کا مشہور واقعہ ہے کہ آج تک زبان زد چلا آ رہا ہے۔ اس کی خدمت کرنے کے لئے حضرت عمرؓ ہر روز علی الصبح پہنچتے تھے، جھاڑو دیتے، پانی بھر لاتے، دودھ دوہتے۔ بعد میں کئی دنوں تک مسلسل انھوں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی دوسرا ان سے پہلے آکر اس خدمت میں سبقت کر جاتا ہے۔ کھوج لگانے کے لئے ایک دن بہت ہی سویرے آگئے تو دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ جھونپڑے سے نکل رہے ہیں۔ یہ عین دورِ خلافت کا واقعہ ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے فرماں روا کا یہ کردار تھا! رضی اللہ عنہ!

(۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ گنتی کے ان چند افراد میں سے تھے جنھوں نے مکہ میں لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ (ان کی تعداد قریباً ۱۷ تھی) ان کے فرامین و خطوط کتابوں میں موجود ہیں۔ زمانہ جنگ میں وہ مجاہدین کے خطوط ان کے گھروں پر پہنچا کر سُناتے تھے اور ان کے اہل و عیال کے خطوط لکھ بھی دیتے تھے۔ تحریر میں زورِ انشا ہوتا تھا اور اظہارِ مفہوم بڑے سادہ و پُرکار انداز میں فرماتے تھے۔

اسی کے ساتھ ساتھ خطابت کا ملکہ رکھتے تھے۔ خلافت کے خطبہ کے علاوہ آپ نے مختلف عہدہ داروں کی تقرری پر جو تقریریں ان کو نصیحت کرنے کے لئے ارشاد فرمائیں ہیں وہ ادب و خطابت کی نہایت اچھی مثالیں پیش کرتی ہیں۔

شاعری کا خاص ذوق تھا۔ شعرائے عرب کا کلام خوب پڑھا اور اس پر ناقدانہ نگاہ تھی۔ زہیر کے کلام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ زبان اور فصاحت و بلاغت میں اس قدر بلند مرتبہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے بعض جملے ضرب المثل بن گئے۔ علم الانساب میں اپنے والد سے استفادہ لیا تھا۔ عبرانی زبان بھی مدینہ میں آکر سیکھ لی تھی اور توراۃ کا اصل نسخہ خاصی روانی سے پڑھتے تھے۔

دین کے مزاج کو اتنی اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اکثر مواقع پر جو مشورے دیئے بعد میں وحی نے ان کی صحت کی شہادت دی۔ منشائے الٰہی کے مطابق اذان کا طریقہ سب سے پہلے انہی کے ذہن میں آیا۔ اسیرانِ بدر کے متعلق آپ ہی کی رائے منشائے الٰہی کے قرین و مطابق ثابت ہوئی۔ شراب کی حُرمت، ازواجِ مطہراتؓ کے پردہ کے بارے میں آپ کا دماغ وہاں تک جا پہنچا جو کچھ ملاءِ اعلیٰ میں طے پا چکا تھا۔ قرآن کے سمجھنے میں بڑے تفکر و تدبر سے کام لیتے اور ضروری مقامات کے بارے میں حضورؐ سے استفسار بھی کرتے اور اس باب میں گفتگو کر کے تشفی حاصل کر لیتے۔ آپ کا مرتبہ علم تفسیر میں بہت بلند ہے۔ اس کا ثبوت عراق و شام کی مفتوحہ اراضی کی بحث میں حضرت عمرؓ کا قرآن کی مدد سے فیصلہ کن استدلال ہے۔

فقہ میں خالص متوازن ذہن سے آپ نے کام لے کر جو قانونی نکات اٹھائے ہیں اور بوقت ضرورت جو اجتہادی فیصلے کئے ہیں وہ بعد والوں کے لئے راستہ دکھانے والے چراغ بن گئے۔ آپ نے استنباطِ احکام اور تصریحِ مسائل کا ایک مستقل اصولی مسلک پیدا کر دیا۔

بہ حیثیت محدث حضرت عمرؓ نے خزانۂ حدیث کو غیر محتاط روایت کے خطرے سے بچانے کا پورا اہتمام کیا۔ بات بات میں بغیر سوچے سمجھے اقوال رسولؐ بیان کرنے سے روکا۔ صرف ان روایات کو قبول کرتے جن میں کم سے کم دو راوی بیان کرنے والے ہوں۔ کیونکہ کسی روایت کے قبول کرنے کے لیے اسلامی معیارِ شہادت یہ ہے کہ دو قابل اعتماد اشخاص اسے بیان کریں ایمان اور اخلاقی لحاظ سے خشیت الٰہی اور محاسبہ آخرت کا احساس حضرت عمر فاروقؓ میں غیر معمولی حد تک موجود رہا۔ خواہشات کو پس پشت ڈال کر سادہ ترین زندگی اختیار کی، پیوند لگے کپڑے پہنے، روکھی سوکھی روٹی کھائی، غلام کو اونٹ پر بٹھاکر مہار تھامنے کی مثال قائم کی۔ بیت المال کے اموال کے صرف میں انتہائی احتیاط دکھائی ایک عورت کے بھوکے بچوں کے لئے کھانے کا سامان قلی کی طرح پیٹھ پر لاد کر پہونچایا اور بیت المال کے اونٹوں کو خود ہانک کر دکھا دیا کہ ایک حکمراں اور فرمانروا میں کس قدر احساس ذمہ داری ہونا چاہئیے!

(۳) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ان چند افراد میں شامل تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد اس صلاحیت کو اور بھی نشوونما ملی۔ حضورؐ نے آپ سے کتابتِ وحی کی خدمت لی۔ آپ کی تحریر میں بھی زور انشا ہوتا تھا جو فرامین اور خطوط کتابوں میں محفوظ ہیں آج بھی اپنی ادبی قدر و قیمت کے خود گواہ ہیں۔

قرآن سے حضرت عثمانؓ کا شغف خاص تھا۔ اس کے کاتب بھی تھے، حافظ بھی اور سمجھنے والے بھی۔ انھوں نے دورِ نبوت ہی میں اپنے لئے ایک مصحف جمع کیا تھا۔ عین شہادت کے وقت قرآن سامنے رکھا تھا اور تلاوت میں مصروف تھے۔

حدیث کی روایت میں بہت محتاط تھے۔ آپ سے کل ۴۶ روایتیں ملی ہیں جن میں سے سولہ صحیحین میں شامل ہیں۔ فقہ و اجتہاد کے باب میں بھی آپ کا حصہ شامل ہے۔ خصوصاً مسائل حج میں آپ کا علم امتیازی ہے۔ شیخین کے دور میں ان سے استفتا کیا جاتا تھا۔ ہرمزان کے قتل کے مقدمے سے متعلق آپؓ کا مشہور اجتہادی نکتہ یہ ہے کہ جس مقتول کا کوئی وارث نہ ہو۔ حاکم وقت اس کا ولی ہوتا ہے۔ اسی طرح دیت میں اونٹ دینے کا جو حکم تھا اس میں آپ نے یہ گنجائش بھی پیدا کی کہ قیمت بھی دی جا سکتی ہے۔ آپؓ متعدد مسائل میں دوسرے ممتاز صحابہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور اپنے ہی اجتہاد و بصیرت کے مطابق عمل کرتے تھے، آپ کا قول ہے کہ "ہر شخص کو جو حق نظر آئے اس پر عمل کرے۔ میں کسی کو اپنی رائے ماننے پر مجبور نہیں کرتا۔"

علم الفرائض میں آپ کو خاص دستگاہ تھی۔ زید بن ثابت اور حضرت عثمانؓ نے مل کر قرآن کے بیان کردہ چند ذوالفروض اور عصبات کو سامنے رکھکر تمام حقداروں کے حقوق متعین کئے اور قانونِ میراث کے اصول و فروع نکالے۔ تجارتی کاروبار کے سبب آپ کو حساب کتاب سے جو دلچسپی ہوگی اس نے یقیناً اس میدان میں مدد دی ہوگی۔

اخلاقی پہلو سے آپ میں حیا کا رنگ اتنا غالب تھا کہ بند کمرے میں بھی برہنہ نہیں ہوتے تھے۔ اس کا احترام حضور پر نور کو بھی تھا حلیم تھے، یہاں تک کہ ان کے خلاف جن فتنہ پردازوں نے بہتان طرازی کرکے ایک خوفناک طوفان بغاوت اٹھا دیا ان سے بھی انتہائی نرمی سے معاملہ کیا اور بالآخر اسی شان حلم و تحمل کے ساتھ شہید ہوگئے۔ فیاضی اور مالی ایثار کا وصف نمایاں تھا اور اس وصف کی وجہ سے آپ نے تحریک اسلامی کی بہت خدمت کی۔ اعزہ و احباب کے ساتھ حُسن سلوک کرتے تھے ان پر مال صرف کرتے تھے، ان سے عفو و درگزر اور احسان و مروت کا سلوک اور برتاؤ فرماتے تھے۔

(۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رفاقتِ نبوت سے غیر معمولی حصہ ملا اور آپؓ نے ایمانی اور عملی لحاظ سے بہت کچھ استفادہ کیا قرابت کی بنا پر حضور پر نورؐ نے آپ کو خود قرآن کی تعلیم دی۔ بعض آیات کی تفسیر سکھائی۔ آپ قرآن کے حافظ بھی تھے، آیات کے شانِ نزول سے آگاہ تھے۔ آپ نے حدیثیں بھی قلمبند کیں۔ نوشت و خواند کی تعلیم بھی بچپن ہی میں حاصل کی تھی۔ اس لئے آپ حضورؐ کے سیکریٹری اور ایڈیٹر

شامل تھے اور بہت سے تحریری کام آپ سے لئے گئے۔ معاہدہ حدیبیہ کے کاتب آپ ہی تھے۔ آپ ہی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چھ مہینہ کا زمانہ اس خدمت میں وقف کیا کہ تمام سورتوں کو نزول کی ترتیب سے مرتب کیا۔

آپ کی مہارت تفسیر اور تدبر فی القرآن کا مظاہرہ جن مواقع پر ہوا ان میں سے ایک وہ ہے جب کہ خوارج نے تحکیم پر اعتراض کیا آپ نے علماء قرآن کو جمع کرکے اور ان کے روبرو "حَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا" پیش کرکے اس اعتراض کا قلع قمع کر دیا۔ علم ناسخ و منسوخ میں بھی آپ خاص درک رکھتے تھے۔

آپ کو رفاقت نبوی کی جو سعادت خاص حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے خزانہ حدیث بھی آپ نے جمع کر لیا۔ لیکن روایت میں حد درجہ محتاط تھے۔ اس لئے کل ۵۸۶ حدیثیں آپ سے روایت ہوئی ہیں جن میں ۲۹ حدیثیں صحیحین میں شامل ہیں۔

فقہ و اجتہاد میں بھی آپ منصب عالی اور مقام بلند پر فائز ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ایک مجنون زانیہ پر حد جاری کرنے لگے تھے کہ حضرت علی رضؓ نے توجہ دلائی کہ مجانین حدود سے مستثنیٰ ہیں چنانچہ حضرت عمرؓ رک گئے۔

حضرت علی رضؓ عہدہ قضا پر بھی سب سے اور بہترین قاضی تھے۔ خود حضورؐ نے صحابہ کے متعلق فرمایا تھا کہ "اَقْضَاھُمْ عَلِیٌّ[1]" حضورؐ نے اسی صلاحیت خاص کی بنا پر آپ کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تھا یمن میں نہایت مشکل مقدمات سامنے آئے مگر آپ نے بڑی دانائی سے ان کا منصفانہ فیصلہ کیا ——————— اور صحیح حل ڈھونڈ نکالا۔

شرعی احکام کی حکمتوں کو سمجھنے میں بھی آپ کی نگاہ دوررس بلکہ معاملہ رس تھی۔

تقریر و خطابت میں وہ یکتائے عصر تھے۔ اہم مواقع پر بڑی موثر اور مدلل تقریریں فرمائی ہیں۔ وہ خطبہ بڑا پرزور خطبہ ہے جو آپ نے امیر معاویہ کے مقابلے میں اپنی جماعت کو ابھارنے کے لئے جمعہ کے روز دیا تھا۔ غالباً اسی صلاحیت کے پیش نظر حضرت عثمان کو امیر حج بنا کر بھیجتے ہوئے حضورؐ نے حضرت علی کو مکہ میں سورۂ برأت سنانے کے لئے ترجمان و قاری بنا کر بھیجا تھا۔ آپ کی طرف بعض اشعار بھی منسوب ہیں۔

علم نحو کے ابتدائی اصول بھی آپ ہی نے وضع کئے اور اس طرح اس علم کی بنیاد رکھدی۔ کردار کے لحاظ سے دیکھئے تو سب سے پہلے فقیرانہ زندگی سامنے آتی ہے۔ حضرت سیدہ فاطمہ خاتونِ جنت حرم میں ہیں اور میاں بیوی دونوں گھر کے چھوٹے بڑے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ روکھی، سوکھی کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر زندگی گزار دی۔ دورِ خلافت میں بھی یہی رنگ قائم رہا۔ انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت میں بھی مثالی روایات قائم کیں۔ فنِ سپہ گری اور شجاعت میں آپ اپنی نظیر تھے، غزوہ بدر، غزوۂ خندق اور غزوۂ خیبر اور غزوۂ ہوازن میں حضرت علی نے شجاعت کے ایسے جوہر دکھلائے ہیں کہ تاریخ کے صفحات اس سے جگمگا رہے ہیں بلکہ فخر کر رہے ہیں۔ اسی شانِ شجاعت کا اثر تھا کہ بالعموم دشمنوں اور مخالفین کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔ اور غالب آجانے کے بعد ان کو بے بس پا کر چھوڑ دیتے تھے۔ اس خُلق کا مظاہرہ جنگ جمل میں بہت بڑے پیمانہ پر ہوا۔ خود اپنے قاتل ابن ملجم کے متعلق وصیت فرمائی کہ شرعی قصاص سے زائد کوئی زیادتی اس پر نہ کی جائے۔ (کرم اللہ وجہہ ورضی اللہ عنہ)

خلفائے راشدین کے اس بے داغ کردار، ایثار، اخلاص، بےنفسی، ایمانی جرأت، کتاب و سنت کے اتباع اور انتہائی خدا ترسی کے ساتھ طریق جہاں بانی کو دیکھ کر اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ یہی نفوس قدسیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی —— صحیح جانشینی کے اہل اور مستحق تھے، اور خلافت کی ترتیب اور اس کے جز متعلقات ظہور میں آئے وہ مشیت خداوندی کے مطابق تھے:

---

[1] ان میں سب سے بہتر قاضی علیؓ ہیں۔

نگاہِ رسالت میں مقام و اعتبار

ہر دعوت و تحریک کا قائدِ اعلیٰ اپنی امداد اور اپنے بعد جانشینی کے لئے جن رفقا کو تربیتِ خاص دیتا ہے ان کو اپنی جماعت کی نگاہوں میں معزز و محترم بناتا ہے اور ان کے مرتبۂ خاص سے معاشرہ کو آگاہ کرتا ہے۔ انبیاء بھی اپنے خاص صحابیوں اور حواریوں کے امتیازی کردار کی قدر افزائی کرتے ہیں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جن ہستیوں کو اُمت کی قیادت کے لئے تیار فرمایا تھا۔ ان کی امتیازی شان رفاقت کو مختلف اسالیب سے نمایاں کیا۔ ان کے بارے میں رضا اور خوشنودی کی بشارت دی۔ ان سے اپنی محبت کا اظہار کیا ان کی قدر بڑھائی اور ساری امت کو انکے احترام کا درس دیا۔ احادیث میں خلفائے راشدین اور دوسرے ممتاز صحابہ کے جو مناقب بیان ہوئے ہیں ان کا ایک اہم منشا یہی ہے کہ معاشرہ ان ممتاز و محترم اور جوہر دار شخصیتوں سے واقف ہو اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق قائدانہ ذمہ داریوں کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال کر ان کا ساتھ دے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ سرکارِ دوعالمؐ نے اپنے چاروں خاص الخاص رفقا کو کیا مقام دیا۔ خلفائے راشدین کے مناقب پر مشتمل صحیح روایات بہت سی ہیں۔ مگر ہم صرف بخاری میں سے چند اہم روایات لیں گے

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ :۔

● ——— حضورؐ نے فرمایا : ” لوگوں میں سے جس کی رفاقت اور جس کے مال سے (اسلام کے سلسلہ میں) مجھے سب سے زیادہ ملی وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں “

● ——— حضورؐ نے فرمایا : ” اگر اپنی امت میں سے کسی کو (اپنے رب کے علاوہ) دمساز بناتا تو ابو بکرؓ کو بناتا، لیکن (چونکہ یہ ممکن نہیں اس لئے) وہ میرے لئے بھائی اور ہمدم ہیں۔ دوسری روایت کے مطابق فرمایا... لیکن اسلامی اخوت زیادہ بہتر ہے “

● ——— ایک عورت (کسی مقصد سے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اسے حضورؐ نے حکم دیا کہ وہ (کسی دوسرے وقت) پھر آئے۔ اس عورت نے عرض کیا : ” آپؐ غور فرمائیں کہ اگر میں حاضر ہوں اور آپ نہ ملیں تو پھر کیا کروں ؟ “ (راوی کے اندازِ بیان کا تاثر یہ ہے :۔ کہ اس عورت کے پیشِ نظر امکانِ موت تھا) حضورؐ نے فرمایا : ” اگر تم مجھے نہ پاؤ تو پھر ابو بکرؓ کے پاس جانا “۔

● ——— حضورؐ نے ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا : ” خدا نے مجھے تمہاری جانب مبعوث فرمایا تو تم لوگوں نے مجھے کہا کہ تم غلط کہتے ہو اور ابو بکرؓ نے کہا کہ پیغمبر نے سچ کہا۔ پھر اس نے اپنی جان اور مال سے میرے ساتھ پورا پورا تعاون کیا “۔

● ——— حضورؐ نے فرمایا : ” ابو بکرؓ کے مال سے زیادہ کوئی مال میرے لئے مفید نہ ہوا “ (کنز العمال)

● ——— حضورؐ ذکر فرما رہے تھے کہ جنت کے کئی دروازے ہیں، ایک دروازہ اہلِ صلوٰۃ کے لئے ہے، ایک اہلِ جہاد کے لئے ہے ایک اہلِ صدقہ کے لئے، ایک اہلِ صیام کے لئے جس کا نام ”باب الریان“ ہے (یعنی جس میں جو نیکی یا خوبی غیر معمولی حد تک موجود ہوگی اسی کے مطابق اسے کسی خاص دروازے سے داخلہ ملے گا) حضرت ابو بکرؓ نے سوال کیا : ” اے اللہ کے رسول! کیا کسی شخص کو ان سارے دروازوں میں سے بیک وقت بھی پکارا جائے گا ؟ “

حضورؐ نے فرمایا : ” ہاں ! اور اے ابو بکر ! مجھے امید ہے کہ تم ایسے ہی لوگوں میں سے ہو گے “ (دوسرے لفظوں میں حضرت ابو بکرؓ ان ساری نیکیوں اور خوبیوں کے لحاظ سے فضیلتِ خاص رکھتے تھے)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ :۔

——— حضورؐ نے اپنا ایک خواب بیان فرمایا جو مشاہدۂ جنت پر مشتمل تھا۔ اس میں

تذکرہ کیا کہ :"میں نے ایک محل دیکھا اور اس میں ایک لڑکی دکھائی دی ۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس کا محل ہے ، کسی نے کہا کہ عمرؓ کا !"

● ـــــــ حضورؐ نے ایک اور خواب بیان فرمایا کہ :" میں نے دودھ پیا ، یہاں تک کہ وہ سیال میری انگلیوں کے پوروں تک سرایت کرتا محسوس ہوا ۔ پھر میں نے وہ عمرؓ کی طرف پھیر دیا :" لوگوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ! اس کی تاویل کیا ہے ؟ فرمایا :- (دودھ سے مراد ہے) العلم !"

● ـــــــ حضورؐ نے ایک اور خواب بیان فرمایا :" سوتے ہوئے میں نے دیکھا کہ میں چمڑے کا ایک ڈول لکڑی کی گرنی پر سے کھینچ رہا ہوں ۔ پھر ابو بکرؓ آئے اور ایک یا دو ڈول آہستہ آہستہ نکالے ۔ پھر عمرؓ بن خطاب آئے تو وہ چھوٹا سا ڈول بہت بڑا ہو گیا اور میں نے کسی مضبوط ترین آدمی کو بھی ان کی طرح سے کام کرتے نہیں دیکھا ۔ یہاں تک کہ لوگوں کے اونٹ خوب سیراب ہو گئے اور وہ پھر آرام کرنے لگے :

(اشارہ تھا کہ حضورؐ کے بعد دعوت حق کا کام ایک حد تک حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھوں انجام پائے گا اور پھر حضرت عمرؓ کے دور میں اچانک فتوحات کا سلسلہ بھی بے حد ترقی کرے گا اور دعوت بھی زور شور سے پھیلے گی)

● ـــــــ ایک خاص موقع پر جب کہ خواتین قریش حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر بے تکلفی سے باآواز بلند بات کر رہی تھیں اتنے میں حضرت عمرؓ وارد ہوئے ۔ فوراً لپک کر پردے کے پیچھے چلی گئیں ۔

رسول اللہ مسکرا دیئے اور فرمایا :" اے ابن الخطاب ! قسم اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے ، جس راستے پر تم چلتے ہو ۔شیطان اس پر تمہارے سامنے نہیں آتا ، بلکہ تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر پڑ جاتا ہے "

● ـــــــ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کے جنازے کے قریب کھڑے ہو کر فرمایا :" تم نے اپنے پیچھے کوئی ایسا ساتھی نہیں چھوڑا ہے جو مجھے اس لحاظ سے تم سے زیادہ محبوب ہو کہ میں اس کے اعمال کے ساتھ خدا کے سامنے پیش ہونے کی تمنا کروں ..... میں نے اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا کہ " میں اور ابو بکرؓ و عمرؓ (فلاں جگہ) گئے ۔ " میں اور ابو بکرؓ اور عمرؓ فلاں (جگہ میں) داخل ہوئے ۔" اور " میں اور ابو بکرؓ اور عمرؓ (فلاں جگہ سے) نکلے ۔"

● ـــــــ حضورؐ نے فرمایا :" تم سے پہلے جو امتیں گزر چکی ہیں ان میں ایسے لوگ تھے کہ جو وحی کے مخاطب رہے ۔ درآنحالیکہ وہ نبی نہ تھے ، اگر ایسا کوئی آدمی میری امت میں ہوتا تو وہ عمرؓ ہی ہوتے ۔"

● حضورؐ نے خواب بیان فرمایا :" سوتے ہوئے میں نے دیکھا کہ لوگ میرے سامنے لائے جا رہے ہیں اور وہ قمیصیں پہنے ہوئے ہیں ، ان میں سے کچھ ایسی ہیں کہ سینہ تک ہیں ۔ کچھ زیادہ لمبی ہیں ۔ عمرؓ بھی میرے سامنے آئے اور ان کی قمیص (اتنی لمبی تھی کہ) پیچھے گھسٹ رہی تھی ، حاضرین نے پوچھا :" اے اللہ کے رسول ! اس کی آپ کیا تعبیر فرماتے ہیں ؟" فرمایا :" دین " !!

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ :-

● ـــــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :" جو کوئی بیر رومہ (ایک کنواں) کو تعمیر کرائے اس کے لئے جنت ہے " سو حضرت عثمانؓ نے اسے تعمیر کرا دیا ۔ اور نبی اکرمؐ نے فرمایا :" جو کوئی جیش العسرۃ (مالی مشکلات کی وجہ سے غزوۂ تبوک کا نام .... غزوۃ العسرۃ پڑ گیا اور اس کے لئے جو فوج تیار ہوئی وہ جیش العسرۃ کے نام سے موسوم ہوئی) کو ضروری سامان پہنچائے اس کے لئے

جنت ہے۔ سو حضرت عثمان رضؓ نے اس لشکر کو آراستہ کرنے میں (بہت بڑے پیمانہ پر) مدد دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ:۔

● ـــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

"تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں"۔ (اس ارشاد کا ایک پہلو یہ ہے کہ بلحاظ قرابت ہم دونوں ایک ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک ہی مقصدِ حق کی علمبرداری کا اشتراک یگانگت کا باعث ہے)

معرکۂ خیبر کے دوران میں آخری رات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کل میں ایک ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جس کو اللہ اور رسولؐ پسند کرتے ہیں (یا یہ فرمایا کہ جسے اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے) اللہ اس کے ہاتھوں سے خیبر کو فتح کرائے گا"۔ اگلی صبح کو جھنڈا حضرت علی رضؓ کو تفویض کیا گیا۔

● ـــــ غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضؓ مجاہدین کے ساتھ جاکر داد شجاعت دینا چاہتے تھے مگر حضورؐ نے ان کو شہر اور خاندانِ نبوت کی حفاظت کے لئے قائم مقامی کا فریضہ تفویض کیا۔ حضرت علی رضؓ پیچھے رہنے کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے[۱]۔ اس احساس کا ازالہ کرنے کے لئے حضورؐ نے فرمایا: "کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ تمہارا تعلق میرے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہارون علیہ السلام کا موسیٰؑ کے ساتھ تھا"۔ (یعنی موسیٰ علیہ السلام جب طور پر ضابطۂ شریعت لینے گئے تھے تو قائم مقامی حضرت ہارون علیہ السلام کو پہنچی تھی) اس ارشاد رسالت صلعم نے حضرت علی رضؓ کو مطمئن کر دیا۔

مشترک جامع روایات

● ـــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم احد پر تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ساتھ تھے کہ پہاڑ ہلنے لگا۔ فرمایا: "ٹھہر اے اُحد! کیونکہ تجھ پر ایک نبی کھڑا ہے، ایک صدیق ہے اور دو شہید ہیں"۔ چنانچہ پہاڑ ہلنے سے رک گیا)

● ـــــ حضرت انس رضؓ نے ایک بار حضورؐ سے پوچھا: "قیامت کب آئے گی؟ حضورؐ نے فرمایا: "تم نے اس کے لئے کیا کچھ تیار کر رکھا ہے"۔ حضرت انس رضؓ بولے: "کچھ نہیں، مگر یہ کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں"۔ حضورؐ نے فرمایا: "تم (اخروی انجام کے لحاظ سے) اس کے ساتھ ہو گے جس سے محبت کرتے ہو"۔ حضرت انس رضؓ نے عرض کیا: "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ سے اور حضرت عمرؓ سے محبت کرتا ہوں۔ اور ان کی اس محبت کے زیر اثر میرا حشر ان کے ساتھ ہو ـــــ اگرچہ میں اُن جیسے عمل نہیں کر سکتا"۔

● ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ بیان کرتے ہیں کہ میں مدینے کی حویلیوں میں سے ایک حویلی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ اتنے میں کوئی شخص آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا: "اس کے لئے دروازہ کھولو اور اسے جنت کی بشارت دو۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ حضرت ابوبکرؓ تھے۔ چنانچہ میں نے ان کو نبی اکرم کے حسب ارشاد بشارت دی۔ پس انہوں نے خدا کی حمد کی۔ پھر کوئی آدمی آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا آنے والے کے لئے دروازہ کھولو اسے جنت کی بشارت دو

---

[۱] چنانچہ ایک روایت ہے کہ جب آپ نے حضورؐ سے عرض کیا "تخلفنی فی النساء والصبیان" یعنی آپ مجھے عورتوں اور بچوں کی نگرانی کے لئے چھوڑے جاتے ہیں۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ حضرت عمرؓ تھے۔ میں نے ان کو نبی اکرمؐ کے ارشاد سے مطلع کیا۔ پس انھوں نے خدا کی حمد کی، پھر ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضورؐ نے مجھے فرمایا کہ آنے والے کے لئے دروازہ کھولو اور اسے اس بلوے کے لئے بدلے میں جنت کی بشارت دو جو اس کے خلاف اٹھے گا۔ سو وہ حضرت عثمان غنی تھے۔ میں نے ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے مطلع کیا۔ پس انھوں نے خدا کی حمد کی۔ پھر کہا: اللہ المستعان "

ان اعاظم صحابہ کو دربارِ رسالت میں جو مرتبۂ خاص حاصل تھا اور دین اسلام کی خدمت میں ان کا جو مقام تھا۔ اس سے پوری سوسائٹی آگاہ تھی۔ عام لوگ جانتے تھے کہ کون کیا مقام رکھتا ہے۔ چنانچہ بعض روایات اس کی واضح شہادت دیتی ہیں

یہ تاریخ و سیر کے مستند و قوی شواہد ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کون شخص ان مقدس بزرگوں کے اخلاص اور اسلام دوستی کے بارے میں ذرہ برابر بھی شک کر سکتا ہے! ایک مسلمان کے تو ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ وہ خلفائے راشدین کی محبت و عقیدت سے اپنے دل کو معمور و لبریز رکھے، ان سب سے محبت کرے، ان کے نقوشِ پا کو دلیلِ راہ بنائے اور ان کی دینی خدمات کے اعتراف میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔ اور ان نفوسِ قدسیہ کو اپنا محسن سمجھے!

خلافتِ راشدہ کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان

تحفظِ کلامِ ربانی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس

ان لوگوں کی رائے سے بحث نہیں جن کو قرآن مجید نے "اولٰئک کالانعام بل ھم اضل" کا نام دیا ہے۔ باقی کونسا انسان ہے جو اس میں کلام کرے کہ کلام ربانی کے (جو انسان کی سعادتِ دارین کے لئے نازل ہوا ہو) تحفظ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی؟

کتبِ سلف روایت ہے (مرقاۃ شرحِ مشکوٰۃ لعلی القاری ۱/۵۰) انبیا سلف پر نازل شدہ کتابوں کی تعداد ایک سو چار تھی۔ ان میں حضرت آدم و شیث کے صحیفوں کا نام و نشان باقی نہیں۔ حضرت اخنوخ (ادریس) کے صحیفوں کے دو ایک سطری اقتباس نبی آخر الزماں کی پیشین گوئی کے متعلق حواری یہوداکے مکتوب (انجیل) میں ملتے ہیں۔ حالانکہ ان کی طرف تین صحیفے منسوب ہیں۔ حضرت نوح کی کتاب کا کیا ذکر، حضرت ابراہیم کے دس صحیفوں کا بھی (جن کا قرآن مجید میں "صحفِ ابراھیم وموسٰی" کے الفاظ میں صراحت سے ذکر ہے، اور نسبتہً جدید چیز ہیں) کوئی پتہ نہیں۔

تورات کتب عتیقہ میں "صحفِ موسٰی" البتہ موجود ہیں۔ یہ پانچ صحیفے ہیں جن کو اطلاق الجزء علی الکل کے طور پر عام بول چال میں تورات (توریت) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ صحیفۂ اول پیدائش، صحیفۂ دوم خروج، صحیفۂ سوم تورات (یعنی قانون)، صحیفۂ چہارم اعداد۔ اور صحیفۂ پنجم تثنیہ کے نام سے معروف ہے۔ ان کی مختصر سرگزشت یہ ہے کہ جب حضرت موسٰی نے کوہ طور پر چلہ کیا، اور خدا نے ان کو الواح عطا فرمائیں جو شاید کسی قسم کے پتھر کی تھیں، کیونکہ یہودی روایت میں چلے سے واپسی پر قوم کو انہوں نے گوسالہ پرستی میں مبتلا پایا تو مارے غصے کے یہ تختیاں پٹک دیں جو ٹوٹ پھوٹ گئیں، اور انہیں کو بعد میں تابوت میں محفوظ کیا گیا)۔

حضرت موسٰی کے بعد یہودیوں نے جلدی ہی فلسطین میں (کافی بے رحمانہ قتل و غارت گری کے ذریعے سے جس کا ذکر تورات میں صحیفۂ اشموئیل وغیرہ میں ہے) ایک بڑی سلطنت حاصل کرلی لیکن مادی وسائل کی فراوانی کے باوجود صحف موسٰی کے نسخوں کی تکثیر و تحفظ پر زیادہ توجہ نہ ہوئی (اور مذہبی معلومات پر مٹھی بھر ائمہ کنائس کی اجارہ داری رہی) نتیجہ یہ ہوا کہ طالوت (ساول) پھر حضرت داؤد و حضرت سلیمان کے بعد ملک میں تاراج پھیلا، اور بابل (عراق) کے بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کیا تو عام لوٹ مار اور حرق و نہب میں تورات کے سارے نسخے تلف ہو گئے۔ فاتح نے بہت سے یہودیوں کو قید کرکے بابل بھیجدیا۔ تقریباً سو سال بعد ایک عالم نے اپنی یاد کی اساس پر تورات کو دوبارہ قلمبند کیا۔ پھر جلا وطنی سے نجات ملی اور یہودی فلسطین سے واپس لائے۔ تو کچھ عرصہ بعد کچھ اور بت پرست حملہ آور ہوئے۔ یہ رومی تھے۔ انہوں نے بابلیوں سے کچھ بہتر تہذیب و تمدن کا ثبوت نہ دیا اور مکرر تورات کے سارے نسخے چن چن کر تلف کئے گئے۔ اب ہمارے پاس تورات کا جو نسخہ ہے وہ تیسری مرتبہ حافظے کی مدد سے [illegible] کیا ہوا اڈیشن ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ اس میں بہت سے بیاضات بھی ہیں (مثلاً ایک باب میں ایک دوسرے باب کا حوالہ دیا گیا ہے جو اب موجود نہیں)، بعد کے الحاقات بھی (مثلاً صحف موسٰی کے آخر میں خود حضرت موسٰی کی وفات کا ذکر)، عمداً حذف بھی (عہدِ نبوی کے یہودیانِ مدینہ کے نسخہ ہائے تورات میں رجم کا ذکر تھا اور انجیل یوحنا باب ۸ میں بھی اس کا [illegible] ذکر ہے۔ "موسٰی نے تورات میں ہم کو حکم دیا تھا کہ ایسی (زانیہ) عورتوں کو رجم کریں۔ اب تو کیا حکم دیتا ہے" مگر جدید تورات میں

ایسا کوئی ذکر نہیں) قلمی نسخوں میں باہم اختلاف بھی (بعض مغربی ماہروں نے ایسے اختلاف والے روایت کی تعداد چھبیس ہزار شمار کی ہے) نیز چھ سات مقامات پر اصل عبارت ٹھیک نہ معلوم ہونے سے اہلِ دین نے کاربراری کے لئے ان کی ترمیم بھی کی ہے۔

زبورِ داؤد اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل کے صحف کا بھی یہی حال ہے۔ صحیفہ حزقیل کا تو یہ حال ہے کہ مغرب میں عورتوں کے پڑھنے کے لئے جو علیحدہ تورات چھاپی جاتی ہے، اس میں علاوہ اور اجزا کے خاص کر صحیفہ حزقیل کو حذف کر دیا جاتا ہے کہ فحش نگاری پر مشتمل ہے۔

انجیل

رہی انجیل، سو اس کا قصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بعثت کے بعد مشکل سے دو چار سال دنیا میں رہے، اور زیادہ تر روپوشیدہ (کہ رومی پولیس ان کی تلاش میں رہتی تھی) ان کو اس کا موقع تو ملا کہ وقتاً فوقتاً کسی گاؤں کے مٹھی بھر بے دینوں کو مخاطب کر کے وعظ کریں اور ان تک کلامِ ربانی کی تبلیغ کریں لیکن آپ پر ایمان لانے والوں کی تعداد دس بارہ سے بڑھ نہ سکی، ساتھ دینے والے تو کوئی بھی نہ تھے کہ "روپوشی" کی ضرورتیں دائمی تھیں۔ اسی لئے انجیل کے لکھنے لکھانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ آپ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد تقریباً ایک صدی گزر گئی، اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اپنی کان سنی اور آنکھ دیکھی چیزوں کو قلمبند کریں۔ پھر جب توجہ ہوئی تو ایک کی جگہ پچاس انجیلیں لکھی گئیں اور یہ کام کئی نسلوں تک جاری رہا (یہ امر شاید قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ کی کتاب انجیل کہلاتی ہے جس کے معنی خوش خبری کے ہیں۔ غالباً مقصد یہ جتانا تھا کہ ختم المرسلین کے آنے کی خوش خبری سنائیں، جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے آخری مواعظ میں کئی بار فرمایا ہے)

یہ انجیلیں نہ قرآن سے مشابہت رکھتی ہیں (کہ صرف کلام اللہ پر مشتمل ہوں) نہ حدیث سے (کہ قول و فعلِ نبی سے مختص ہوں) بلکہ کتبِ سیرت سے مشابہ ہیں یعنی حضرت عیسیٰ کی سوانح عمریاں ہیں جن میں پیدائش سے رفع الی السماء تک کے حالات ہیں۔ ضمناً کہیں کہیں حضرت عیسیٰ کے خطبے یا مکالمے بھی آ گئے ہیں جن کا کچھ حصہ قرآن سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے اور کچھ حدیث سے۔ مگر ایسے اجزا کم ہی ہیں۔ مزید برآں حضرت عیسیٰ کی اصل زبان آرامی کا کوئی نسخہ اب موجود نہیں۔ یونانی ترجمہ اب اساس ہے۔

جب انجیلوں کی تعداد کثیر ہو گئی اور ان میں باہم بڑا اختلاف بلکہ تضاد بھی نظر آیا تو بعض ایسے وسائل سے جن کو علمی و تنقیدی نقطۂ نظر سے کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی، چار انجیلوں کا انتخاب کیا گیا جو اب عیسائی دنیا میں مروج ہیں۔ اور ان چاروں میں بھی باہم کافی تضادات پائے جاتے ہیں۔

دیگر کتب

دیگر مذاہب کی مقدس کتابوں (چین میں کنفوشس کی شوکنگ، ایران میں آوِستا، ہند میں وید، پُران وغیرہ) کی سرگزشت بھی مماثل رہی ہے اور ان پر وثوق و اعتماد شک و شبہ کے ایسے عیب سے پاک نہیں۔

قرآن

نبیٔ اُمّی، فداہ ابی و امی نے قرآن کریم کے حفظ و کتابت میں جو اہتمام فرمایا وہ اپنی جگہ بے نظیر تھا۔ جیسے ہی آپ پر کوئی وحی نازل ہوتی، آپؐ کسی لکھنا پڑھنا جاننے والے صحابی کو بلا کر املا کراتے اور حکم دیتے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ نقلیں جماعتِ اسلامی میں پھیلائی جائیں اور ساتھ ہی اس پر اصرار فرماتے کہ ہر مسلمان اسے حفظ بھی کرے (تلاوت و قرآت ناظرہ کتاب سے بھی ہو، حافظے سے بھی۔ اسی لئے یہ وحیٔ ربانی کتاب بھی کہلاتی ہے، قرآن یعنی پڑھنے کی چیز بھی) وحی ہر روز نہ آتی تھی۔ اس لئے نازل شدہ اجزا کا حفظ کر لینا زیادہ دشوار نہ تھا، مرد ہی نہیں، عہدِ نبویؐ میں عورت حافظوں کا بھی پتہ چلتا ہے جیسے ام ورقہؓ (دیکھو مسند ابن حنبل ۶/۴۰۵)

یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ آدمی لکھنے میں سہو کر سکتا ہے (لکھنا کچھ چاہتا ہے اور بعض وقت قلم لکھ کچھ اور جاتا ہے) اسی طرح حافظہ سے بھی سہو ہو جاتا ہے اور یاد کی ہوئی چیز کے دہراتے وقت قسم قسم کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں لیکن کسی چیز کو بیک وقت حفظ بھی کیا جائے اور لکھ بھی لیا جائے تو ان طریقوں سے ہر ایک دوسرے کی کوتاہیوں کی تلافی کرتا ہے۔ حافظ کسی جگہ اٹکے تو متعلقہ آیت پر ایک نظر ڈالتے ہی یاد مکرر رواں دواں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حفظ جیز کو لکھا ہوا دیکھیں اور اس میں کوئی غلطی ہو تو فوراً محسوس ہو جاتی ہے۔ اطمینان کے ساتھ

تصیح کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ دُہرا وسیلہ تھا جسے رسولِ اکرمؐ نے وحیٔ متلو یعنی قرآن مجید کے تحفظ کے متعلق استعمال فرمایا۔ نہ صرف یہ کہ وسیلہ انتہائی ممکنہ حد تک مکمل ہے، بلکہ یہ بھی کہ تاریخ عالم میں کسی کتاب کے تحفظ کے اس استعمال میں یگانہ بھی ہے (نہ قرآن سے پہلے، اور نہ قرآن کے بعد آج تک کسی تالیف کو اس اہتمام توجہ سے محفوظ کیا گیا)

وادِ غیرِ ذی زرع یعنی مکہ معظمہ میں کاغذ نا پید تھا۔ مدینہ آنے پر حالت کچھ زیادہ بہتر ہوئی اور کھجور کے پتوں، ہاڑ کی چوڑی ہڈیوں، پتھر کی تختیوں، چمڑے کے ٹکڑوں اور اونٹ وغیرہ کی جھلیوں پر ایسی کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اسلام کی خوش قسمتی ہے کہ نبی اکرمؐ نے کامیاب زندگی گزاری اور جب آپؐ کی وفات ہوئی تو کسی بیرونی حملے کا زمانہ نہ تھا کہ قرآن کے نسخوں کو خطرہ لاحق ہو۔ بعد ازاں نسل ہا نسل تک ملک کو بیرونی حملوں اور اندرونی خانہ جنگیوں ہر دو سے امن حاصل رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید کے تحفظ میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

قرآن مجید کی آیتوں کا نزول، واقعات و حوادث کے سلسلے میں احکام صادر کرنے یا وعظ و نصیحت کرنے کے لئے ہوتا تھا، اور سماجی و نفسیاتی ضرورتوں سے احکام کی تکمیل تدریجی طور پر ہی ہونی چاہیئے تھی، اسی لئے اگر محض تاریخ نزول کے لحاظ سے وحی کی تدوین کی جاتی تو انتہائی بے ربطی پیدا ہو جاتی۔ اسی لئے رسول اکرم صلعم نے اسے ایک ایسی ترتیب دی ہے جس میں ربط بیان اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ اور ہمارے مصادر تصریح کرتے ہیں کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تو آنحضرت صلعم کاتبوں کو ہدایت فرماتے کہ اس کو فلاں صورت کے فلاں مقام پر رکھا جائے۔ اس کا سلسلہ تاحیات جاری رکھا۔ اسی طرح صحیح بخاری وغیرہ کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلعم ہر رمضان میں تا آں دم نازل شدہ سارے قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے۔ وفات کے سال تو دو مرتبہ سارا قرآن اس مبارک مہینے میں تلاوت فرمایا (اور یقیناً اسی ترتیب سے جو اب تک محفوظ ہے)

نتیجہ یہ نکلا کہ آپؐ کے دنیا سے رحلت فرمانے کے وقت:-

(۱) سینکڑوں صحابہ کو قرآن مجید کا کافی حصہ، اور متعدد صحابہؓ کو سارا قرآن حفظ تھا۔

(۲) سارا قرآن مجید لکھا ہوا بھی تھا، لیکن کتاب کی صورت میں نہیں بلکہ منتشر اوراق اور متفرق اشیاء پر۔ کامل قرآن بظاہر کسی ایک شخص کے پاس نہ تھا کسی کے پاس کچھ حصہ کسی کے پاس کچھ حصہ۔ لازماً مکررات بھی کثرت سے تھے۔

خلافت راشدہ کا کارنامہ

رسول اکرم صلعم کی وفات کے بعد ابتدائی چند مہینے جمع قرآن پر کوئی خاص توجہ نہ ہوئی۔ صرف ایک واقعہ.... قابلِ ذکر ہے کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ تین دن گھر سے نہ نکلے تاکہ پورا قرآن مجید لکھ ڈالیں..... اور شانِ نزول ملحوظ رکھیں...... ا

لیکن مسیلمہ کذاب کی جنگ یمامہ میں کئی سو صحابہ شہید ہوئے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کو قرآن کا بڑا حصہ یاد تھا۔ اس پر اربابِ حکومت کو تشویش ہونی ناگزیر تھی۔

امام بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق اولاً حضرت عمرؓ کو خیال آیا۔ انھوں نے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے تجویز پیش کی کہ پورا قرآن بین الدفتین جمع کرالیں۔ وہ ہچکچائے۔ آخر آنحضرت صلعم کے کاتب خاص حضرت زید بن ثابتؓ کو بلایا۔ وہ بھی ہچکچائے کہ جو کام رسول خدا نے خود نہ فرمایا ہو اسے کیسے کریں۔ آخر وہ بھی قائل ہو گئے کہ یہ کرنے اور فوراً کرنے کا کام ہے۔

حضرت زید بن ثابت کا یہ اہم بیان قابلِ ذکر ہے کہ "میں نے اسے سینوں اور سفینوں دونوں کی مدد سے جمع کیا" حضرت ابوبکر پر اللہ کی ہزاروں رحمتیں نازل ہوں، انھوں نے قانون شہادت کے اصول کا اطلاق علم پر بھی کرنے کا آغاز کیا اور حکم دیا کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جس کی دو تحریری شہادتیں موجود نہ ہوں، اور یہ کہ یہ حافظے پر مستزاد ہو۔ بارگاہ خلافت سے شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا گیا کہ جس کسی کے پاس قرآن مجید کا کوئی حصہ لکھا ہوا ہو وہ حضرت زید بن ثابت کو دکھایا جائے۔ زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ میں نے اس طرح سارا مواد جمع کیا پھر (حافظے کی مدد سے) اسی

کی جانچ کی تو صرف ایک آیت جو یاد تھی اس تحریری ذخیرے میں غیر موجود نظر آئی۔ شہر میں تلاش کرائی گئی تو پھر وہ بھی برآمد ہوئی یں نے اس کے بعد مکرر سارے مواد کی جانچ کی تو ایک اور جگہ کچھ آیتیں کم نظر آئیں۔ تلاش پر تحریری حالت میں وہ بھی مدینہ ہی میں مل گئیں۔

یہ کام قلیل مدت میں مکمل ہوگیا۔ پھر عوام میں بھی قرآن کے حفظ کرنے نیز نقل کرنے کا شوق بڑھا۔

تفسیر طبری کے دیباچے میں زید بن ثابت کا یہ بیان بھی ہے کہ ابتدائی "تالیف" ہڈیوں، جھلیوں وغیرہ ہی پر تھی۔ پھر جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو ان کے زمانے میں اس سب کو کتابی صورت میں (غالباً جھلیوں پر) نقل کرایا گیا۔ اسی لئے اسے مصحف کا نام دیا گیا۔

لیکن اس وقت اس پر توجہ نہ کی گئی کہ قرآن کریم کے اس سرکاری نسخے کو شائع کیا جائے اور نقل کرنے والوں کے لئے اسے اساس قرار دیا جائے۔ وجہ بظاہر یہ تھی کہ صحابہ قابل اعتماد تھے، اور وہی اسلامی مملکت میں ہر طرف تعلیم و تدریس کا مدار بنے ہوئے تھے۔ لیکن پندرہ بیس سال کے عرصے میں ایک طرف اسلامی حکومت بحر ظلمات سے قریب قریب بحر الکاہل تک تین براعظموں پر پھیل گئی اور بلیسیوں ممالک اور لاکھوں انسانوں نے (جن کی مادری زبان عربی نہ تھی) اسلام قبول کیا، تو دوسری طرف سابقین صحابہ کی تعداد کا وفات کے باعث روز افزوں گھٹنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ حضرت حذیفہ بن الیمان کو جب آرمینیا کی مہم پر بھیجا گیا تو ان کی فوج میں عراقی بھی تھے اور شامی بھی (اور ہر علاقے کا استاذ قرآن الگ ہونے سے ان میں کچھ قراآتی اختلاف نظر آئے) بعض موقعوں پر ان لوگوں میں قرآنی آیتوں کی صحت تلفظ وغیرہ پر جھگڑا بھی ہوا۔ اور سپہ سالار اعظم کو بڑی حکمت سے اس میں کامیابی ہوئی کہ فتنے کو بڑھنے نہ دیں۔ معرکے کے بعد جب یہ سنہ ۳۰ھ میں مدینہ واپس آئے تو گھر جانے سے پہلے خلیفہ حضرت عثمان کے پاس پہنچے اور کہا کہ امت کی جلد خبر لو، ورنہ خیر نہیں نظر آتی۔

حالات سن کر حضرت عثمان نے وہ نسخہ منگایا جو حضرت ابو بکر اور ان کے بعد حضرت عمر کے پاس رہا تھا اور اس وقت ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس (جو لکھنے پڑھنے میں طاق تھیں) تھا۔ پھر کاتب نبوی حضرت زید بن ثابت ہی کی صدارت میں چند قابل افراد کو مامور کیا کہ وہ قرآن کی نقلیں تیار کریں اور اجازت دی کہ جہاں ضرورت محسوس ہو وہاں سابقہ املا کی کتابت میں تلفظ کا خیال رکھیں۔ چار (اور ایک روایت میں سات) نقلیں تیار ہوئیں تو حضرت عثمان نے ان کو مسجد میں پبلک کے سامنے پڑھوایا اور جب اطمینان ہوگیا کہ —— سارے نسخے صحیح بھی ہیں اور مکمل بھی تو ان کو مختلف صوبائی مرکزوں میں بھیج دیا گیا۔ تاکہ آئندہ نقل اور تدریس انھیں کے مطابق ہو اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ اگر کوئی نسخہ اس کے خلاف پایا جائے تو اسے جلا (حرق) —— اور ایک روایت میں ہے کہ پھاڑ (خرق) —— دیا جائے۔

دوسرے "مصاحف" کے تلف کرنے کا حکم اسپین سے چین تک پھیلے ہوئے اسلامی علاقے میں جزءً ہی تعمیل پا سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود وغیرہ کی طرف منسوب مصحف بہت دن تک محفوظ رہے، اور ان کے اختلافات تفسیر طبری وغیرہ میں آج تک محفوظ ہیں۔ نیز تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں خاص اختلاف روایات قرآنی پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکیں۔ ان میں سے بعض اب طبع بھی ہو چکی ہیں۔ یہ اختلافات زیادہ اعراب کے متعلق ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے سند یافتہ استاد کے پاس قرآن نہ پڑھا ہو، بلکہ بے اعراب و بے نقط نسخوں کو اپنی عربی دانی کے بھروسے پر خود ہی پڑھا ہو تو اختلاف کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اختلافات کا ایک مزید باعث یہ ہوا بعض صحابہ نے رسول اکرم سے پوچھ کر کچھ تفسیری و تشریحی جملے بھی اپنے نسخوں کے حاشیوں پر بڑھا دیئے۔ بعد میں ان نسخوں کی نقلیں لی گئیں تو "نقل نویس را عقل نباشد" کے مصداق حرص و حاشیہ ایک کر دیا گیا اور متن قرآن و تفسیر گڈمڈ ہو گئے۔ چند صدیوں بعد علماء نے ایسے نسخے دیکھے تو انھیں "اختلاف روایات قرآنی" پر اپنے اظہار علم کا گویا موقع ہاتھ آیا۔ حالیہ زمانے میں نولدکے، شوالی، برگشتراسیر، پرتیسل، جیفری وغیرہ نے کئی نسل کی منظم کوشش سے ایسے تمام اختلافات روایت کو یکجا کر کے شائع بھی کیا اور پھر خود ہی تسلیم بھی کیا کہ یہ اختلافات "مایوس کن" ہیں یعنی قرآن میں کثیر اختلافات نکلنے کی جو توقعات یا آرزوئیں تھیں وہ بے بنیاد ثابت ہوئیں۔

حضرت معاویہ کے زمانے کے کتبوں میں حروف پر نقطے ملتے ہیں، تاکہ ب ت ث ، ج ح خ وغیرہ میں فرق کرسکیں کچھ عرصہ بعد اعراب بھی ایجاد کرلیا اور اس سے قرآن مجید میں استفادہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے الفاظ انتہائی صحت کے ساتھ متعین کردیئے جاسکے۔ آج کل قرآن کے لاکھوں قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ استانبول میں حضرت عمرؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک ورق ہے، تاشقند میں حضرت عثمانؓ کے روانہ کردہ سرکاری نسخوں میں سے ایک نسخہ محفوظ ہے۔ صنعا وغیرہ میں حضرت علیؓ کی طرف منسوب قرآن پائے جاتے ہیں، دوسری صدی ہجری کی طرف منسوب نسخے مستشرقین نے فراہم کئے ہیں، ان میں آپس میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ چار دانگ عالم میں پائے جانے والے لاکھوں حافظوں کی یاد میں۔ کمال یہ ہے کہ اصل عربی ہی محفوظ ہے، یہ نہیں کہ انجیل کی طرح ترجمے تو ہوں اور اصل ناپید!

جب اصل موجود ہو اور پوری صحت کے ساتھ نسل بنسل محفوظ کیا گیا ہو اور آج بھی سلسلۂ استاد سے پڑھنے والے ایسی سندیں حاصل کرتے ہیں جن میں سلسلۂ اساتذہ صحابہ اور جناب رسالت تک پہنچتا ہے، اور خود اس گنہگار کے پاس مدینہ منورہ کے شیخ القراء مولانا حسن الشاعر کی ایسی سند ہے، تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے؟ ذلک من فضل اللہ علینا۔ خلفائے راشدین نے انسانیت پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

صحابۂ کرامؓ اور خشیتِ الٰہی

ابو محمد امام الدین رام نگری

گوناگوں انسانی عقائد و تصورات اور اعمال و اخلاق کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی صرف دو قسمیں قرار پائیں گی۔ حق اور صحیح، باطل اور غلط۔ ماضی میں بھی انسانی زندگی کے بہت سے اصول و نظام رہے ہیں اور آج بھی بہت سے اصول و نظام ہیں مگر ان کے تجزیہ سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ انسانی زندگی کے صرف دو اصول و نظام ہیں، ایک خدا پرستانہ اور دوسرا غیر خدا پرستانہ۔ خدا کا ہزار انکار کیا جائے مگر اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے۔ اس کا ایک خدا ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے، اور تمام کائنات میں اسی کا امر اور حکم چل رہا ہے۔ انسان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور اس پر بھی خدا کا حکم جاری اور نافذ ہے۔ اس کو جو تھوڑی سی آزادی حاصل ہے وہ بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے، وہ جس وقت اس آزادی کی رسی کھینچ لیتا ہے بڑے بڑے مدعیانِ اقتدار و حکومت بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں، ماضی ہی نہیں، ہماری آنکھوں کے سامنے ایسی کتنی ہی عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں، ہمارے سامنے نمارده اور فراعنہ گذرے ہیں اور ہم ان کا انجام دیکھ چکے ہیں۔

انسان کے لئے حق اور صحیح طریقۂ زندگی یہ ہے کہ وہ خدا کا بندہ اور فرمانبردار بن کر رہے، خدا نے حضرت آدم علیہ السّلام کو اسی طریقۂ زندگی کی ہدایت فرمائی تھی۔ اور ان کی اولاد کو بھی اسی طریقے کے مطابق زندگی گزارنے کا حکم دیا تھا۔ اور یہی صحیح فطری طریقہ ہو سکتا ہے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد قوموں اور ملکوں میں اللہ تعالیٰ برابر اپنے رسول مبعوث فرماتا رہا اور ان کے ذریعہ اپنی طرف سے انسانوں کے لئے زندگی گزارنے کے احکام و قوانین بھیجتا رہا۔ آخر میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جو خدا کے آخری رسول اور نبی ہیں۔ ان کے ذریعہ جو خدائی اصول و نظام نازل ہوا وہ تمام بنی نوعِ انسان کے لئے ہے اور قیامت تک کے لئے ہے۔

اس خدا پرستانہ طریقۂ زندگی کا نام اسلام ہے۔ جتنے انبیائے کرام علیہ السلام مبعوث ہوئے، وہ تعلیمات ربانی کے صرف معلم ہی نہ تھے عملی نمونہ بھی تھے۔ انہوں نے خدا کے نازل کردہ اوامر و احکام کی تعلیم بھی دی، ان کی شرح و تفسیر بھی فرمائی اور خود عمل کر کے دکھایا کہ اپنی پوری زندگی خدا کے عطا کردہ اصول و نظام کے مطابق کیسے گزاری جائے۔ اسی لئے انسانوں کو صرف یہی حکم نہیں ملا کہ وہ خدا کی اطاعت کریں بلکہ خدا کی اطاعت کے ساتھ اس کے رسولوں کی اطاعت بھی لازم قرار دی گئی۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لئے بھیجا کہ ——— اللہ کے اذن کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

(پ ۵۔ نساء)

مومنو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولی الامر کی بھی۔ پھر اگر تم میں کوئی نزاع واقع ہو جائے تو اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو، اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

اولو الامر کی اطاعت میں بحث و نزاع ہو سکتی ہے لیکن رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت کی طرح ہر بحث و نزاع سے بالاتر ہے۔ رسول کا ہر حکم اور ہر اسوہ واجب الاطاعت ہے، اِلّا یہ کہ وہ خود اپنے کسی حکم یا عمل کا استثنیٰ واضح کر دے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس عقیدہ

داصول کے مطابق اپنی پوری زندگی سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی کی، اگر صحابہ کرام کو حضورؐ کا کوئی ارشاد و عمل وضاحت طلب محسوس ہوا تو باادب تمام اس کی وضاحت چاہی اور حضورؐ نے وضاحت فرمادی، اگر خود حضورؐ کے نزدیک کسی چیز کی وضاحت ضروری تھی تو وہ خود کردی، صحابہ کرام نے حضورؐ کی سنت کی پیروی خشک قانونی حیثیت سے نہیں کی۔ بلکہ ان کو حضورؐ کی سنت سے عشق تھا، انہوں نے والہانہ حضورؐ کی سنت کی پیروی کی۔ اس حیثیت سے امت صحابہ کرام کی پیروی سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتی، اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کیسے کی جائے؟ اس کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بتایا، اللہ و رسول کی اطاعت و پیروی کیسے کی جاتی ہے اس کی تعلیم و ہدایت ہمیں صحابہ کرام کی زندگی سے ملتی ہے، اور صرف انہیں کی زندگی سے مل سکتی ہے، جو صحابہ کرام کی پیروی سے انحراف کرکے اللہ و رسول کی اطاعت و پیروی کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنے دعوے میں باطل ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس اور پاکیزہ اسوۂ حسنہ کی پیروی کرکے خدا کے حضور سے کن کن مراتب و درجات سے سرفراز ہوئے اور کیسے کیسے امتیازی طغروں سے نوازے گئے ذرا ان پر ایک نظر ڈالئے۔

"جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا — ہم نے تم کو ایک مثالی جماعت بنایا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ — تم بہترین امت ہو۔

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِى الْاِنْجِيْلِ" الخ
(پ ۲۶، س، الفتح)

تو ان کو دیکھتا ہے کہ وہ (خدا کے حضور) جھکے ہوئے سر بسجود ہیں خدا سے اس کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں، ان کی یہی حالت توراۃ میں بھی (مرقوم) ہے اور انجیل میں بھی ان کا یہی وصف (مذکور) ہے۔

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ذٰلک لمن خشی ربہ — اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، یہ (مقام رضا) اس کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا رہا۔

تتجافی جنوبہم عن المضاجع یدعون ربہم خوفا وّ طمعا ومما رزقنہم ینفقون
(پ، س، السجدہ)

ان کے پہلو (شب کے وقت) بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ خوف اور امید سے اپنے رب کو پکارتے ہیں اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے یہ تمام خصائص و محامد حضرت رسول اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ تعلیم و تربیت کے فیضان تھے اسلامی زندگی کی روح خشیت الٰہی ہے، اسی سرچشمہ سے خشوع خضوع، تقویٰ اور پرہیزگاری کی نہریں پھوٹتی ہیں اور ایک مومن کی زندگی کے تمام شعبوں کو سیراب کرکے اسکی زندگی کو سدابہار اور جنت نظیر بنادیتی ہیں، صحابہ کرام کی زندگیاں کتنی معطر و معنبر تھیں کہ ان کی خوشبو کی لپٹیں اب بھی مشامِ روح کو نشاط آگیں بنا رہی ہیں اور یہ اس لئے کہ ان کی زندگیاں خشیتِ الٰہی سے معمور تھیں۔

ہم خشیتِ الٰہی سے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کچھ واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں، ضرورت تو تھی کہ ہم جن بزرگوں کے واقعات پیش کرتے ان کے متعلق یہ بھی بتلاتے کہ وہ اعمال و اخلاق اور سیرت و کردار کے کن بلند ترین مقامات پر فائز تھے اور بارگاہ نبوی میں ان کو کیا قدر و منزلت حاصل تھی، اس پس منظر کے ساتھ ہی ان کے خوف و خشیت کا جوہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو سکتا تھا مگر ان چیزوں کے لئے یہاں گنجائش نہیں ہے، اس لئے صرف موضوع سے متعلق حالات و واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے مرتبہ سے کون واقف نہیں، آپ افضل الامت ہی نہیں، افضل الامم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ شرف پناہ میں آپ کو جو اعزاز و تقرب حاصل تھا وہ کسی دوسرے کو حاصل نہ تھا، آپ ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو بارگاہ رسالت سے جنت کی بشارت دی جا چکی تھی، پھر بھی آپ کی ذات گرامی سرتاپا خشیت الٰہی تھی۔

قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو قلب مبارک کا یہ حال ہوتا کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے، اور اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روتے کہ پاس کے لوگ آپ کے گرد جمع ہو جاتے، رقت قلبی کے باعث بات بات پر سرد آہ کھینچنا آپ کی عادت ہو گئی تھی، اسی لئے لوگ آپ کو "اواہ منیب" کہتے۔ (خلفائے راشدین)

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے "اواہ منیب" کی صفت بیان ہوئی ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی عبادت گذاری کا یہ حال تھا کہ رات رات بھر نماز پڑھتے، دن اکثر روزے کی حالت میں گذارتے، موسم گرما میں خاص طور پر روزے رکھتے۔ خشیت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ نماز میں لکڑی کی طرح بے حس و حرکت نظر آتے، اور ایسی رقت طاری ہوتی کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی، آپ پر قیامت کے خوف کا اس قدر غلبہ تھا کہ کسی درخت کو دیکھتے تو فرماتے۔ کاش میں درخت ہوتا کہ جھگڑوں سے چھوٹ جاتا، کسی باغ کی طرف سے گذرتے اور چڑیوں کو چہچہاتے دیکھتے تو سرد آہ کھینچ کر فرماتے، اے پرندو! تمہیں مبارک ہو کہ دنیا میں چرتے چگتے ہو، درخت کے سائے میں بیٹھتے ہو، اور قیامت میں تمہارا کوئی حساب و کتاب نہیں، کاش ابوبکر بھی تمہاری طرح ہوتا۔ (ایضاً)

ایک بار آپ نے پینے کے لئے پانی طلب فرمایا، لوگوں نے پانی میں شہد ملا کر پیش کیا، آپ جیسے ہی اسے منہ کے پاس لے گئے آنکھوں میں آنسو امنڈ پڑے اور اس قدر روئے کہ ریش مبارک تر ہو گئی، سکون ہوا تو لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا، فرمایا۔ میں ایک روز خدمت نبوی میں حاضر تھا حضورؐ کسی چیز کو دور دور فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا چیز ہے جس کو دور فرما رہے ہیں؟ مجھے تو کوئی چیز نظر نہیں آتی، حضورؐ نے فرمایا۔ "دنیا مجسم ہو کر میرے سامنے آئی تھی، میں نے اس کو دور کر دیا" اس وقت مجھے وہی بات یاد آگئی اور میں ڈرا کہ شاید دنیا کے فریب میں پھنس نہ جاؤں۔

کون اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خشیت الٰہی کے کس بلند مقام پر فائز تھے؟

دنیا عزت و توقیر کے لئے جان دیتی ہے، لوگ جو کچھ ہوتے ہیں چاہتے ہیں کہ اس سے کہیں زیادہ ان کی تعریف و تحسین کی جائے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ خلیفۂ رسول ہونے کی بنا پر لوگ آپ کی مدح و ستائش کرتے تو آپ اس سے بھی گھبراتے کہتے۔ الٰہی! تو میرا حال مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور میں اپنی حالت ان لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں۔ خدایا! تو ان کے حسن ظن سے مجھ کو بہتر ثابت کر، میرے گناہوں کو بخش دے، اور ان لوگوں کی بے جا تعریف کا مجھ سے مواخذہ نہ کر۔" (ایضاً)

مدینہ منورہ سے مجاہدین اسلام کا لشکر روانہ ہوتا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ پیادہ پا دور تک اسے وداع کہتے جاتے۔ اگر کوئی افسر آپ کی تعظیم کے خیال سے گھوڑے سے اترنا چاہتا تو اسے روک دیتے، فرماتے۔ کیا مضائقہ ہے اگر میں تھوڑی دور تک راہ خدا میں اپنے پاؤں غبار آلود کر لوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ۔ جو پاؤں راہ خدا میں غبار آلود ہوتے ہیں خدا ان پر جہنم کی آگ حرام کر دیتا ہے۔ (ایضاً)

ایک بار حضرت ابوبکرؓ نے مسجد نبوی میں اعلان فرمایا کہ میں آج صدقے کے اونٹ تقسیم کروں گا، لوگ آئیں، لیکن جو آئے اجازت لے کر آئے، بے اجازت نہ چلا آئے۔

یہ اعلان سن کر ایک خاتون نے اپنے شوہر سے کہا یہ مہار لو اور خلیفۂ رسول کی خدمت میں جاؤ، ممکن ہے تمہیں بھی کوئی اونٹ مل جائے، وہ بغیر اجازت لئے بارگاہ خلافت میں چلے گئے، حضرت ابوبکرؓ نے ازراہ تادیب انہیں کی مہار سے ان کو مار دیا، اونٹوں کی تقسیم سے فارغ ہوئے تو ان کو بلا کر فرمایا میں نے اس مہار سے تم کو مارا تھا، تم بھی مجھ کو اسی سے مار کر اپنا بدلہ لے لو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی تشریف رکھتے تھے، بولے "خلیفۂ رسول! یہ رسم قائم نہ کیجئے"۔ آپ نے کہا بے وجہ نہیں مارا تھا، حکم کی خلاف ورزی پہ تادیب فرمائی تھی، فرمایا یہ صحیح ہے، لیکن قیامت کے روز خدا نے محاسبہ کیا تو کیا جواب دوں گا؟

ایک بار حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت ربیعہ بن جعفرؓ کے درمیان ایک درخت کے بارے میں کچھ کہا سنی ہوگئی، اسی سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل گئی جس سے حضرت ربیعہؓ کو تکلیف پہونچ گئی، حضرت ابوبکر کا غصہ دور ہوا تو فرمایا۔ ربیعہ! تم بھی مجھ کو کوئی ایسی ہی سخت بات کہہ لو، انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔

دونوں حضرات بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ سن کر ارشاد فرمایا۔ ربیعہ! تم کوئی سخت بات نہ کہو، اتنا کہہ دو کہ "ابوبکر! اللہ تمہیں معاف فرمائے" حضور کا ارشاد سن کر حضرت ابوبکر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور زار زار رونے لگے۔ (ایضاً)

آپ نے کچھ غور کیا؟ خشیت الٰہی سے متعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جو واقعات پیش کئے گئے ہیں، وہ زندگی کے کسی ایک ہی شعبے سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ان کا تعلق مختلف شعبہائے زندگی سے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی پوری زندگی ہی خشیت الٰہی سے معمور تھی، آپ کی تقریریں بھی اکثر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی، آپ نے ایک بار اپنی تقریر میں فرمایا۔

"کہاں وہ حسین و روشن اور دلفریب شباب سے حیرت میں ڈالنے والے چہرے کہاں ہیں؟ آج بڑے شہروں کے بسانے والے اور ان کو قلعہ بند کرنے والے سلاطین کدھر گئے؟ آج بڑے بڑے غالب آنے والے مرد میدان سور ماکیا ہوئے؟ زمانے کی گردشوں نے ان کی قوتیں پست کر دیں۔ اور ان کے بازو توڑ دیئے، اور وہ ہمیشہ کے لئے قبر کی تاریکی میں سو گئے"۔ (ایضاً)

جس ہر وقت خدا کا خوف دامن گیر رہتا ہو وہ دنیا کے جاہ و جلال، اور قوت و شوکت کو نگاہ عبرت کے سوا اور کس نظر سے دیکھ سکتا ہے؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی بھی غیر معمولی فضائل و درجات اور خصوصیات و امتیازات کی حامل، بارگاہ نبوی میں آپ کو بھی کمال قدر و منزلت حاصل تھی، آپ کی شان و عظمت کے غیر بھی معترف ہیں، آپ کی فتوحات، آپ کی سیاست، آپ کی جہانبانی اور آپ کا حسن انتظام بے مثال ہے، آپ کی خلافت، خلافتِ الٰہیہ کا مکمل نمونہ تھی، آپ کے عہد خلافت میں اسلام کی عظمت درجۂ کمال کو پہونچ گئی تھی، باایں ہمہ آپ کی زندگی خشیت الٰہی کا ایمان افروز مرقع تھی آپ پوری پوری رات جاگ کر نماز پڑھتے اور صبح قریب آتی تو گھر والوں کو جگاتے اور یہ آیت پڑھتے۔

وامر اھلک بالصلوٰۃ واصطبر علیہا — اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس پر جمے رہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عموماً نماز میں ایسی آیتیں پڑھتے جن میں خدا کی عظمت و جلال، اور آخرت کا بیان ہوتا اور ان سے اس قدر متاثر ہوتے کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر نماز پڑھ رہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے،

ان عذاب ربك لواقع ماله من دافع (سورہ والطور) — بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہو کر رہنے والا ہے اور کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں،

تو اتنا روئے کہ آنکھیں ورم کر آئیں۔

ایک بار کہیں تشریف لے جا رہے تھے، ایک مکان کے پاس سے گذر ہوا، مکان کے اندر کوئی نماز میں سورۃ "والطور" قرأۃ کر رہا تھا، آپ کے کان میں آواز پہنچی "ان عذاب ربك لواقع" تو آپ سواری سے اتر پڑے اور دیوار سے ٹیک لگائے دیر تک بیٹھے رہے، اس کے بعد گھر آئے تو ایک مہینہ تک بیمار رہے، لوگ بیمار پرسی کو آتے لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ کونسی بیماری ہے،

مریضِ عشق پہ رحمت خدا کی۔

ایک بار سورۂ "تکویر" کی تلاوت فرما رہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے۔

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ — اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔

تو بے ہوش ہو کر گر پڑے، اور ایسی حالت ہو گئی کہ کئی روز تک لوگ بیمار پرسی کو آتے رہے۔

ایک دفعہ آپ نے اثنائے تلاوت میں یہ آیت پڑھی۔

وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا — اور جب ڈالے جائیں گے اسکے (دوزخ کے) اندر ایک تنگ جگہ میں ایک زنجیر میں کئی کئی بندھے ہوتے، پکاریں گے اس جگہ موت کو۔ (سورۂ فرقان)

اس آیت کا آپ پر اتنا اثر ہوا، آپ کی حالت سے ناواقف شخص آپ کو دیکھتا تو اسے معلوم ہوتا آپ کی روح پرواز کر جائے گی۔ (خلفائے راشدین)
ہمارا کیا حال ہے؟ ہم پہلے عمل ہی نہیں معصیت کی حالت میں بھی خوفِ خدا سے غافل ہیں، ہمارے سینے میں دل نہیں پتھر ہے، ہم کیا جانیں کہ خشیت الٰہی کی حقیقت کیا ہے، اور اندیشۂ آخرت کسے کہتے ہیں، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دیکھئے! آپ نے اپنے آغازِ اسلام سے آخری دم تک اسلام کی کتنی گراں بہا خدمتیں انجام دیں، ان کی پوری زندگی کس طرح نیکیوں سے معمور تھی، ان کو حضور نبی سے جنت کی بشارت حاصل تھی، پھر بھی ان کو مواخذۂ آخرت کی کتنی فکر تھی؟ ایک روز ایک صحابی سے پوچھتے ہیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے ساتھ اسلام لائے، ہجرت کی جہاد کیا اور بہت سے نیک کام کئے ان سب کا تو ہم کو ثواب مل جائے لیکن آپ کے بعد ہم نے جو نیک کام کئے۔ ان کے بدلے میں ہم صرف دوزخ سے بچ جائیں، اور عذاب و ثواب برابر سرابر ہو جائے؟

صحابی نے جواب دیا۔ خدا کی قسم ایسا نہیں، ہم نے حضور کے بعد بھی جہاد کیا، روزہ رکھا، نماز پڑھی، بہت سے دوسرے نیک کام کئے۔ بہت سے لوگ ہمارے ہاتھ پر اسلام لائے، ہم کو اپنے ان اعمال سے بہت امید بھی ہے،

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے مجھے تو یہی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے عذاب سے بچ جائیں اور نیکی بدی برابر سرابر ہو جائے۔ (اسوۂ صحابہ)

یہ تھے مقامِ رسالت کے عظمت شناس، ایمان و یقین کے بلند ترین مقام پر فائز کہ جو سرتا بقدم تقویٰ و نیکوکاری تھے اور ان کی ذات سے دنیا میں نیکی و پرہیزگاری قائم تھی مگر اس پر بھی خشیت الٰہی سے ان کے دل معمور تھے، یہی وہ نفوسِ قدسیہ ہیں۔

کہ گنہ بھی نہ کیا اور پشیمان رہے

یاد ہوگا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو اس کی مہار سے مار دیا تھا پھر مواخذۂ آخرت کے خوف سے اس شخص کو بلا کر فرمایا کہ وہ اپنا بدلہ لے لے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا کہا تھا، مگر جب اسی خلافت کا بار آپ پر پڑا تو دیکھئے آپ کس طرح پگھل کر موم ہو گئے۔ ایک بار آپ خلافت کے کام میں مشغول تھے۔ ایک شخص آیا۔ کہا، فلاں شخص نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ آپ چل کر اس سے بدلہ دلائیے۔
اس کے بے موقع آنے سے آپ کے کام میں خلل پڑ گیا۔ آپ نے اس کو ایک درہ مارا اور فرمایا۔ جب میں اسی غرض سے بیٹھتا ہوں کہ جن لوگوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی ہو وہ آئیں اور میں ان کی فریاد سنوں تو لوگ آتے نہیں اور جب میں دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتا ہوں تو فریاد لے کر پہنچتے ہیں۔

وہ شخص چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر کام کا کچھ بار ہلکا ہوا اور مزاج اعتدال پر آیا تو مواخذۂ آخرت کا اندیشہ دامنگیر ہوا، آپ نے اسے بلوا کر اپنا درہ اس کے سامنے ڈال دیا، اور فرمایا۔ یہ درہ لو اور جس طرح میں نے مارا تھا اسی طرح تم بھی مجھے مارو۔
اس شخص نے عرض کی۔ امیر المومنین! مجھے ایسی گستاخی کی جرأت کیونکر ہو سکتی ہے؟ میں نے خدا کے لئے آپ کو معاف کر دیا۔

اس کے باوجود حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا، خوفِ خدا اسی طرح دامنگیر رہا، اسی حالت میں گھر گئے، دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے کو ملامت کرنا شروع کی۔

"اے عمر! تو نیچ تھا، خدا نے تجھے سربلند کیا، تو گمراہ تھا، خدا نے تجھے ہدایت بخشی، تو ذلیل تھا، خدا نے تجھے عزت و اختیار سے نوازا، تیرا یہ حال ہے کہ ایک شخص تیرے پاس فریاد لے کر آیا، تو نے اسے مار کر بھگا دیا۔ کل خدا کے سامنے اس زیادتی کی باز پرس ہوتی تو کیا جواب دے گا۔ (اسوۂ صحابہ)

اللہ اکبر! خلیفۂ رسول، مسلمانوں کا امیر، دنیا کی عظیم الشان سلطنت کا فرمانروا، اور یہ خشیتِ الٰہی! کچھ لوگوں کا مدارِ نجات یہ عقیدہ ہے کہ عہد رسالت کے بعد عمرؓ اسلام سے پھر گئے تھے، نعوذ باللہ، انہوں نے خلافت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا، استغفر اللہ! کیا خلافت غصب کرنے والے ایسے ہی خدا ترس ہوا کرتے ہیں؟ اگر خلافت کے غصب کرنے کا ثمرہ یہ ایمان ہے تو ہر مومن کو اس نیکی کی تمنا کرنی چاہیے۔

اس سلسلۃ الذہب کی چند اور کڑیاں!

ایک بار کچھ سرکاری اونٹ گم ہوگئے، گرمیوں کا زمانہ، دوپہر کا وقت، عرب کی آگ برسانے والی دھوپ، حضرت عمر فاروقؓ اسی حالت میں اونٹوں کی تلاش میں نکل پڑے، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اونٹ ملے، ان کو لئے ہوئے واپس آ رہے تھے، چہرہ دھوپ سے سرخ، جسم پسینے سے شرابور، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی، یہ حال دیکھ کر تڑپ گئے، بولے۔ امیر المومنین! اونٹوں کی تلاش کے لئے ملازموں کو بھیجدیا ہوتا، آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟

جواب دیا۔ علی! قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ملازموں سے نہیں مجھ سے مواخذہ فرمائے گا کہ عمر! تو نے ایسی غفلت کیوں کی کہ سرکاری اونٹ گم ہوگئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس جواب سے بہت متاثر ہوئے، بولے۔ امیر المومنین! آپ کامیاب ہوگئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ علی! میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ قیامت کے روز مجھے نہ میری نیکیوں کا ثواب ملے اور نہ میرے گناہوں کے بدلے میری پکڑ ہو، میرے لئے بڑی کامیابی یہی ہے۔

ایک بار حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیت المال کا جائزہ لیا تو صرف ایک درہم موجود تھا، انہوں نے یہ سوچکر کہ ایک درہم کے بیت المال میں پڑے رہنے سے کیا فائدہ؟ اسے اٹھا کر حضرت عمرؓ کے ایک صاحبزادے کو دیدیا، حضرت عمرؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو۔ انہوں نے اس درہم کو پھر بیت المال میں داخل کر دیا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بلا کر فرمایا۔ کیوں ابوموسیٰ! تم کو مدینہ بھر میں آلِ عمرؓ سے زیادہ کوئی گھر نظر نہ آیا، کیا تم چاہتے ہو کہ قیامت کے روز تمام امتِ محمدیہ کا مطالبہ میری گردن پر ہو؟ (خلفائے راشدین)

ایک بار حضرت عمرؓ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمرؓ سے کہا۔ اب خدا نے خوش حالی عطا فرمائی ہے، آپ کو نرم کپڑے اور نفیس کھانے سے پرہیز نہ کرنا چاہئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ بیٹی! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسرت اور تنگ حالی کو بھول گئیں، خدا کی قسم! میں اپنے آقا کے نقشِ قدم پر ہی چلوں گا کہ مجھے آخرت کی فراغت اور خوش حالی نصیب ہو۔ (ایضاً)

آپ ان واقعات پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کچھ نماز اور تلاوت ہی کی حالت میں خشیتِ الٰہی طاری نہیں ہوتی تھی بلکہ آپ کی پوری زندگی ہی خوفِ خدا کے تحت گذری، آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر آسمان سے ندا آئے کہ ایک آدمی کے سوا دنیا کے تمام لوگ جنتی ہیں تب بھی مجھے مواخذۂ آخرت کی طرف سے اطمینان نہ ہوگا کہ شاید وہ بدقسمت انسان میں ہی ہوں!

ایک بار کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے سے ایک تنکا اٹھالیا۔ اور بڑے ہی تاثر کے ساتھ کہنے لگے۔ کاش میں بھی خس و خاشاک ہوتا، کاش میں پیدا ہی نہ کیا جاتا، کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔ (ایضاً)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری لمحات میں ایک صاحب آپ کی عیادت کو گئے اور آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ

عنہ کے علم و تقویٰ کی تعریف کر کے ان کی جانشینی کی تحریک کی حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تمہارا برا ہو، اس تجویز کے پیش کرنے میں تمہاری نیت بخیر نہیں ہے، اب مجھے مسلمانوں کے معاملات میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اگر خلافت اچھی چیز تھی تو میں نے اس میں سے اپنا حصّہ پالیا اور اگر بری چیز تھی تو اللہ نے مجھ کو اس سے الگ کرلیا۔ آل عمر کے لئے یہی بہت ہے کہ ان میں سے ایک شخص سے اس کے متعلق باز پرس کی جائے اور امت محمدیہ کے بارے میں سوال ہو، میں نے اپنے کو اس میں تھکا ڈالا، اور اہل و عیال کو ان کے بہت سے حقوق سے محروم رکھا، پھر بھی اگر برابر سرابر چھوٹ جاؤں کہ میرے لئے اس میں کوئی نفع ہو اور نہ نقصان تو میں اپنے کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ (ایضاً)

جن باطن لوگوں کے نزدیک ایسے نفوس قدسیہ بھی سچے مسلمان نہ تھے خود ان کے ایمان و اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے اور کیا کہا جائے کہ وہ خدا سے کس قدر بے خوف اور مواخذۂ آخرت کی طرف سے کتنے بے پروا ہوگئے ہیں؟

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ سابق الاسلام تھے۔ مکہ میں کسی کا اسلام قبول کرنا سب سے بڑا قومی اور مذہبی جرم تھا، اسی جرم کی پاداش حضرت عثمان کو بھی بھگتنی پڑی، آپ نے مکہ سے حبشہ ہجرت کی، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا آپ کے عقد میں تھیں، وہ بھی ساتھ گئیں، برسوں مہاجرت اور غریب الوطنی کی زندگی گذار کر مکہ واپس آئے پھر مدینہ کی ہجرت سے مشرف ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ اسی قدر عزیز تھے کہ حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوگیا تو حضورؐ نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت عثمانؓ کے عقد میں دیدیا۔ تقرب کا یہ حال تھا کہ صلح حدیبیہ میں جب قریش نے آپ کو محبوس کر لیا تھا حضور اقدسؐ نے ان کی طرف سے خود اپنے دست مبارک پر بیعت فرمائی، آپ کو بار بار حضور نبوی سے جنت کی بشارت ملی تھی، ان تمام فضائل و مدارج کے باوجود آپ خوفِ خدا سے لرزاں و ترساں رہتے تھے، کسی کا جنازہ دیکھتے تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے، گورستان کے پاس سے گزرتے تو اتنا روتے کہ ریشِ مبارک تر ہو جاتی، کسی نے آپ سے پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ جنت و دوزخ کے بیان کا آپ پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا گورستان کے منظر کا؟ آپ نے جواب دیا، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قبر آخرت کی سب سے پہلی منزل ہے، اگر یہ منزل آسان ہوگئی تو ساری منزلیں آسان ہیں اور اگر اس میں دشواری ہوئی تو ساری منزلیں دشوار ہوں گی۔ (خلفائے راشدین)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر خشیتِ الٰہی اور مواخذۂ آخرت کے خوف کا اتنا غلبہ تھا کہ ایک بار کسی بات پر اپنے غلام کا کان اینٹھ دیا۔ بعد میں غلاموں سے متعلق حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ اور آخرت کی پرسش کا خیال آیا تو غلام سے کہا۔ میں نے تیرا کان اینٹھا تھا تو بھی میرا کان اینٹھ، غلام نے تعمیلِ حکم کے لئے کان پر ہاتھ رکھا۔ فرمایا۔ زور سے اینٹھ، قیامت کے دن کے بدلے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اس فعل کا بدلہ یہیں پورا ہو جائے۔ (ایضاً)

جو نام نہاد "مومنین" حضرت عثمان اور دوسرے پیکرِ ایمان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان میں گستاخانہ کلام کرتے ہیں، انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ان حضرات کے بعد امت محمدیہ کی تاریخ کے شرف و کرامت میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب اور درجات و مراتب ہماری حدِ تحریر سے باہر ہیں[1]۔ سرتاپا محاسن ہی محاسن ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

دامنِ رسالت کے خاص تربیت یافتہ، شوہرِ خاتونِ جنت سیدۃ فاطمہ زہرہؓ، پدرِ امامین ہمامینؓ، مثیلِ ہارون، مبشر بالجنۃ، پھر بھی آخرت کی اتنی فکر تھی کہ آپ ایک روز قبرستان میں بیٹھے تھے، کسی نے پوچھا۔ ابوالحسن! یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ جواب دیا۔ میں ان لوگوں کو بہت اچھا ہم نشین پاتا ہوں، یہ کسی کی بدگوئی نہیں کرتے اور آخرت کی یاد دلاتے ہیں۔ (خلفائے راشدین)

حضرت علی مرتضیٰ کی عبادت شبانہ کے متعلق ضرار اسدی کا آنکھوں دیکھا بیان ہے کہ خدا کی قسم! میں نے حضرت علیؓ کو بار ہا دیکھا کہ رات ختم

---

[1] عجیب ہے فاضل مضمون نگار پہلے تین خلفائے کرام کی منقبت تو اس اعتراف عجز کے بغیر کر گئے حالانکہ ایسا اعتراف اس وقت مناسب ہوتا ہے جب چھوٹوں کے بعد بڑے کی توصیف کی جائے! (مدیر)

ہونے کو ہوتی تو وہ اپنی ڈاڑھی پکڑ کر اس قدر بیقرار ہو جاتے تھے جیسے ایک مار گزیدہ بیقرار ہو جاتا ہے، اور بڑی دردناک آواز میں روتے، اور کہتے۔ اے دنیا جا! میرے بجائے کسی اور کو فریب دے، تو میرے سامنے کیوں آتی ہے؟ مجھے کیوں اپنا شوق دلاتی ہے، یہ بات مجھ سے بہت بعید ہے میں تجھ کو تین طلاق بائنہ دے چکا ہوں، میں ان سے رجوع نہیں کر سکتا، تیری عمر بہت کم اور تیری قدر و منزلت بالکل بےحقیقت ہے، آہ! زادِ راہ کم سفر طویل، اور راستہ وحشت ناک ہے۔ (خلفائے راشدین)

حضرت علیؓ اپنے عہدِ خلافت میں بازاروں میں جاتے، وہاں راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ بتاتے، بوجھ ڈھونے والوں کے بوجھ اٹھا دیتے، کسی کے جوتے کا تسمہ گر جاتا تو اسے اٹھا کر دیدیتے اور یہ آیت تلاوت کرتے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَّالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (س، قصص)

وہ جو آخرت کا گھر ہے اس کو ہم نے ان لوگوں کے لیے بنایا ہے جو زمین پر نہ سرکشی کرنا چاہتے ہیں اور نہ فساد پھیلانا، اور آخرت (کی فلاح و سعادت) متقیوں کے لئے ہے

(خلفائے راشدین)

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بڑے مرتبہ کے صحابی تھے، سابقون الاولون کے شرف سے ممتاز تھے، بارگاہِ رسالت سے "امین الامۃ" کے لقب سے سرفراز تھے، جس مجلس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعتِ خلافت ہوئی اگر حضرت ابوعبیدہؓ چاہتے تو ان کے ہاتھ پر ہی بیعت ہوتی، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت میں آپ کو یکساں اعزاز و احترام حاصل رہا۔ آپ مجاہدینِ شام کے سپہ سالارِ اعظم تھے، شام کی فتح کا امتیازِ خصوصی آپ ہی کو حاصل ہے۔ آپ بھی جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، آپ کے خوفِ خدا کا بھی وہی حال تھا جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا امتیازِ خصوصی ہے، خدا کی عظمت و جلالت کی یاد سے اکثر آپ پر گریہ طاری ہو جاتا، ایک بار ایک شخص آپ کے گھر گیا۔ دیکھا کہ آپ زار زار رو رہے ہیں، اس شخص نے تعجب سے پوچھا خیریت تو ہے، آپ اس قدر رو کیوں رہے ہیں -؟

ایک روز حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی آئندہ فتوحات اور خوش حالی کے تذکرے کے سلسلے میں شام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ ابوعبیدہ! اگر اس وقت تک تمہاری عمر وفا کرے تو تمہارے واسطے صرف تین خادم کافی ہوں گے، ایک خاص تمہاری ذات کے لئے، ایک اہل و عیال کے لئے، اور ایک سفر کی رفاقت کے لئے، اسی طرح سواری کے لئے تین جانور کافی ہوں گے، ایک تمہارے لئے، ایک تمہارے غلام کے لئے اور ایک سامان کے لئے، لیکن اب دیکھتا ہوں تو میرا گھر غلاموں اور میرا اصطبل گھوڑوں سے بھرا ہوا ہے، آہ! میں رسول اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا، حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہوگا جو قیامت کے دن اسی حال میں مجھ سے ملے گا جس حال میں میں اس کو چھوڑ جاؤں گا۔ (مہاجرین جلد اول)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا صحابۂ کرام میں بڑا مرتبہ تھا۔ انہوں نے جہادِ شام میں حضرت ابوعبیدہؓ کے شانہ بشانہ رومیوں سے جہاد کیا تھا، ایک بار اسلامی لشکر میں طاعون پھیلا، حضرت معاذ بن جبلؓ بھی مرض میں مبتلا ہوئے، بار بار پوچھتے صبح ہوئی؟ لوگ کہتے ابھی نہیں، صبح ہوئی تو آپ کو اس کی خبر دی گئی۔ آپ نے فرمایا۔ اس رات سے خدا کی پناہ جس کی صبح جہنم میں داخل کرتی ہو، مرحبا اے موت مرحبا! تو اس دوست کے پاس آئی ہے جو فاقہ مست ہے۔ الٰہی! میں تجھ سے جس قدر ڈرتا ہوں تجھے خوب معلوم ہے، لیکن آج مجھ کو تجھ سے بڑی امیدیں ہیں، میں نے کبھی دنیا اور درازیٔ عمر کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ درخت بولنے اور نہر نکالنے میں وقت صرف کروں، بلکہ اس لئے کہ بدی اور برائی سے دور رہوں، نیکی اور بھلائی کو فروغ دوں اور ذکر[1] کے حلقوں میں علماء کے پاس بیٹھوں،

موت کے وقت آپ پر گریہ طاری تھا۔ لوگوں نے تسلّی دیتے ہوئے کہا آپ رسول اللہ کے صحابی ہیں، اس کے علاوہ بھی آپ کے بڑے بڑے فضائل و

[1] یہاں ذکر کے حلقے سے مراد وہ "حلقۂ ذکر" ہرگز نہ سمجھنا چاہئے جو بعد کے صوفیاء میں رائج ہوا بلکہ علماء کی وہ مجلس مراد ہے جس میں اللہ اور دینِ شریعت کے عزیز ہی کا ذکر ہوا کرتا تھا ایسا

دیعات ہیں، آپ کیوں روتے ہیں؟ آپ نے فرمایا مجھے نہ موت کی پریشانی ہے اور نہ دنیا چھوڑنے کا غم مجھے عذاب اور ثواب کی فکر ہے۔

اسی حالت میں روح اپنے رب کے حضور چلی گئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی، لیکن وہ بھی خوف خدا سے بے پرواہ نہ تھے چنانچہ ان کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز والد بزرگوار کے سامنے کھانا لایا گیا۔ اس دن وہ روزے سے تھے، ان کو صحابہ کرام کی عسرت و تنگی کا زمانہ یاد آگیا۔ کہنے لگے۔ مصعب بن عمیرؓ جنگِ اُحد میں شہید ہوگئے۔ انہیں ایک چادر میں کفنایا گیا جس سے پورا جسم ڈھک نہ سکتا تھا، سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے، اور پاؤں ڈھانکے جاتے تو سر کھل جاتا۔ حضرت حمزہؓ شہید ہوئے، وہ بھی مجھ سے بہتر تھے ہمیں دنیا کی وسعت و فراغت دی گئی ہے، اس لئے ہمیں خوف ہے کہ ہم نے جو نیک کام کئے ہیں کہیں ان کی جزا یہی چیزیں نہ ہوں۔

یہ کہہ کر زار زار رونے لگے۔ اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ (سیر المہاجرین)

صحابۂ کرامؓ میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا درجہ بہت بلند تھا آپ کی پوری عمر حق کی تلاش اور اس کے بعد حق کی خدمت میں گذاری حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودتے ہوئے آپ کی شان میں "سلمان منا من اہل البیت" ارشاد فرمایا تھا، آپ خشیتِ الٰہی کے اس مقام پر فائز تھے کہ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

وان جہنم لموعدھم اجمعین — جہنم ان سب کے وعدہ کی جگہ ہے۔

تو ایک چیخ ماری اور سر پر ہاتھ رکھ کر بھاگے اور پورے تین روز تک غائب رہے، مدائن کے حاکم تھے جو سلطنتِ فارس کا پایۂ تخت رہ چکا تھا، اس زمانے میں بھی آپ کا یہ حال تھا کہ شہر میں نکلتے تو کوئی اجنبی آپ کو پہچان نہ سکتا تھا، ایک بار ایک شخص نے جانور کے لئے چارہ خریدا آپ سے کہا۔ اسے میرے گھر پہنچا دو۔ آپ چارہ سر پر رکھ کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ رستے میں جو شناسا ملتا کہتا دیجئے میں پہنچا دوں، اس شخص نے پوچھا۔ یہ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا تو وہ بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے درخواست کی کہ آپ بوجھ مجھے دیدیں لیکن آپ نے فرمایا میرے لئے اس میں ثواب ہے، اور چارہ اس کے گھر تک پہونچا دیا۔

آپ کو ہر وقت قیامت کا خوف دامنگیر رہتا، آپ کے ارشادات عبرت سے لبریز ہوتے تھے، ایک بار مدائن سے شام آئے تو نہایت شکستہ اور ابتر حالت میں تھے۔ لوگوں نے پوچھا۔ آپ نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ فرمایا۔ آرام اور راحت تو صرف آخرت کے لئے ہے۔

ایک بار فرمایا۔ تین چیزیں مجھے اس قدر غمگین کرتی ہیں کہ مجھے رونا آجاتا ہے، ایک تو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ اور ان کے صحابہ کی جدائی، دوسری چیز قبر کا عذاب، اور تیسری چیز قیامت کا خوف۔

حضرت سلمان فارسیؓ فرمایا کرتے تھے۔ قیامت کے ہولناک مناظر سے دل لرزتا ہے۔ خدا کے حضور پیشی کا خیال آتا ہے تو طبیعت بے چین ہو جاتی ہے کیا معلوم جنت کی طرف جانا ہو یا آتش دوزخ کا سامنا کرنا پڑے، طالب دنیا پر تعجب ہے کہ موت اس کے تعاقب میں ہے اور وہ امید طلب اور آرزوؤں میں مست ہے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے یا ناراض پھر تعجب کی بات ہے کہ وہ قہقہے لگا رہا ہے (سیر المہاجرین)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ میں خشیت الٰہی کے ساتھ رقت قلبی بھی موجود تھی، خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے، بصرہ کے قیام کے زمانے میں آپ نے ایک بار خطبہ دیا اس میں فرمایا۔ لوگو! خوب روؤ اور رونا نہ آئے تو کم سے کم رونی صورت بنا لو کیونکہ دوزخی جنہوں نے اپنی دنیا منسکر گزاری ہوگی اسقدر روئینگے کہ آنسو خشک ہو جائینگے، پھر خون کے آنسو روئینگے آنسو کی فراوانی کا یہ حال ہوگا کہ ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو بہہ نکلیں گی (ایضاً)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نہایت معروف صحابی ہیں، اصحاب صفہ میں آپ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، ان پر خشیت الٰہی کا کتنا اثر تھا؟ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوگا۔ شفیہ اصبحی شام میں رہتے تھے کسی ضرورت سے مدینہ منورہ آئے، دیکھا لوگ ایک شخص کے گرد جمع ہیں، پوچھا

۱؎ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں اس طرح کی روایتوں کا نقل کرنا شاید مفید سے زیادہ مضر ہو! (مدیر)

کون بزرگ ہیں؟ لوگوں نے نام بتایا، اشفقیہ نے حضرت ابوہریرہ سے درخواست کی کہ مجھے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنایئے جسے آپ نے خود حضور کی زبان مبارک سے سنا ہو۔

حضرت ابوہریرہ نے فرمایا، میں ایسی ہی حدیث سناؤں گا، یہ کہا اور چیخ مار کر بے ہوش ہوگئے، ہوش میں آئے تو کہا، میں تم سے ایسی حدیث بیان کروں گا جسے آنحضرت نے اسی گھر میں مجھ سے ارشاد فرمائی تھی۔ اس وقت میرے اور حضور کے سوا کوئی تیسرا موجود نہ تھا۔ یہ کہہ کر پھر چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئے۔ بے ہوشی دور ہوئی تو منہ پر ہاتھ پھیر کر بولے میں تم سے ایسی ہی حدیث بیان کروں گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی اور میرے اور آنحضرت کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ یہ کہہ کر پھر زور سے چیخے اور غش کھا کر منہ کے بل گر پڑے۔

اشفقیا اصبحی نے آپ کو سنبھالا۔ افاقہ ہوا تو کہا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں کے فیصلے کے لئے نزول فرمائے گا تو سب سے پہلے تین آدمی طلب کئے جائینگے۔ قرآن کا عالم۔ راہ خدا کا مقتول اور مالدار۔ اللہ تعالیٰ عالم قرآن سے دریافت فرمائیگا۔ کیا میں نے تمہیں قرآن کا علم نہیں دیا تھا؟ وہ جواب دے گا۔ ہاں اے اللہ! خدا فرمائے گا۔ تونے اس پر کیا عمل کیا؟ وہ شخص جواب دیگا۔ رات دن اس کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے، تو اس لیے تلاوت کرتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کا خطاب دیں۔ وہ خطاب تجھ کو مل گیا، پھر مالدار سے سوال کریگا کیا میں نے تجھ کو صاحب مقدرت بنا کر لوگوں سے بے نیاز نہیں کر دیا تھا؟ وہ جواب دے گا۔ ہاں اے اللہ۔ خدا پوچھے گا۔ تونے کیا کیا؟ وہ عرض کریگا۔ صلہ رحمی کرتا تھا، اور صدقہ دیتا تھا۔ خدا فرمائیگا۔ تو جھوٹا ہے۔ تیرا مقصد یہ تھا کہ فیاض اور سخی کہلائے اور لوگوں نے کہا۔ پھر وہ شخص بلایا جائے گا جو راہ خدا میں مارے جانے کا مدعی ہوگا، اس سے پوچھا جائیگا کہ تو کیوں قتل ہوا؟ وہ جواب دیگا۔ تونے اپنی راہ میں لڑنے کا حکم دیا تھا۔ میں تیری راہ میں لڑا اور مارا گیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیگا۔ تو جھوٹا ہے۔ تیرا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں شجاع اور بہادر کہلائے اور تجھے یہ کہا جاچکا۔

یہ حدیث بیان کر کے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے زانو پہ ہاتھ مارا اور فرمایا۔ ابوہریرہ۔ سب سے پہلے انہیں تینوں سے دوزخ کی آگ بھڑکائی جائےگی۔ (سیر المہاجرین)

حضرت عمرؓ کی سیرت کے چند نمایاں پہلو

پروفیسر اسرار احمد (ایم اے)

[۱] حضرت عمرؓ کی سیرت پر لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اتنی بڑی شخصیت کی سیرت پر کوئی بڑا آدمی ہی قلم اٹھا سکتا ہے خصوصاً علامہ شبلی کی کتاب الفاروق کے بعد جو کہ اس ضمن میں حرف آخر کا حکم رکھتی ہے۔ واقعی شبلی مرحوم ہی سیدنا عمر فاروق کی سیرت نگاری کے منصب سے خوب عہدہ برآ ہوئے خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اب سیرت فاروقی پر کچھ لکھنا محض تیمّن اور برکت حاصل کرنے کے لئے ہی ہو سکتا ہے، اقتدِ مکرر کا لطف حاصل کرنے کے لئے۔ ورنہ مولانا شبلی کی تحریر پر شاید اب کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ اور مواد (ریسرچ Material) کے اعتبار سے کوئی "الفاروق" پر اضافہ کر بھی دے مگر شبلی کا قلم کہاں سے لائے گا!

حضرت عمر کا سلسلۂ نسب آٹھویں پشت میں جا کر آنحضرت صلعم سے مل جاتا ہے۔ حضرت عمر کا خاندان خطابت اور علم الانساب میں ماہر سمجھا جاتا تھا حضرت کے والد خطاب بھی قبیلۂ قریش کے نہایت معزز آدمیوں میں سے تھے حضرت عمر ہجرت نبوی سے چالیس برس پہلے پیدا ہوئے۔ شرفائے مکہ کے طریقے کے مطابق لڑکپن میں آپ کو نیزہ بازی۔ تیر اندازی۔ پہلوانی اور شہسواری کے فنون حربی سکھائے گئے۔ عکاظ کے مشہور میلے میں عرب کے مشہور پہلوانوں سے اکثر کشتی لڑتے تھے۔ اور مقابل پر غالب آتے۔ حضرت کو علم الانساب میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ فن شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ آپ لکھنا بھی جانتے تھے اور یہ اس زمانے کے لحاظ سے ایک نہایت غیر معمولی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت کی بعثت کے زمانے میں قریش میں صرف سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے اور ان میں ایک حضرت عمر بھی تھے حضرت عمر کی شخصیت کے وقار اور وجاہت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم اکثر دعا مانگتے تھے کہ کسی طرح حضرت عمر مشرف بہ اسلام ہو جائیں تاکہ اسلام اور مسلمانوں کو تقویت حاصل ہو اور کسمپرسی کی حالت دور ہو۔ جس دن حضرت عمرؓ ایمان لائے ہیں کفار مکہ نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ آج مسلمانوں نے ہم سے سارے بدلے چکا لئے۔ حضرت حذیفہ کا قول مشہور ہے کہ حضرت عمر کے اسلام لانے کے بعد سے ہی اسلام دنیا میں تدریجاً سر بلند ہوتا چلا گیا اور جب سے آپ شہید ہوئے ہیں اسلام کی اقبالمندی زوال آمادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

مسلمان ہونے کے تھوڑے عرصہ کے بعد ایک دن آپ نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ اگر ہم حق پر ہیں تو پوشیدہ طریقے سے تبلیغ کیوں کریں حق کو علی الاعلان اور برملا کہنا چاہئے اس کے بعد آپکے مشورے سے تمام صحابہ دو صفیں بنا کر باہر نکلے۔ ایک صف کی رہنمائی حضرت حمزہ کر رہے تھے اور دوسری صف کی حضرت عمر۔ اس جسارت کو دیکھ کر کفار مکہ کو سخت صدمہ پہنچا اور اکثر کلیجہ پکڑ کر رہ گئے۔

حضرت عمر نے جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو نرالی شان سے۔ اب تک یہ طریقہ تھا کہ لوگ اپنی ہجرت کا حال کسی کو بتاتے نہ تھے اور اکثر صحابہ رات کی تاریکی میں چپکے سے نکل جاتے تھے لیکن حضرت عمر نے اس چیز کو گوارا نہ کیا اور علی الاعلان ہجرت کر کے جانے کی ٹھان لی۔ صحابہ نے بیان کیا ہے کہ رخصت ہوتے وقت ایک ہاتھ میں برہنہ شمشیر تھی اور دوسرے ہاتھ میں تیر و کمان۔ سب سے پہلے کعبہ شریف میں حاضر ہو کر سات مرتبہ طواف کیا اور دو رکعت نماز مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر پڑھی۔ اس کے بعد قریش کے سرداروں کے حلقے میں آئے اور سب کو مخاطب کر کے

---

[۱] میں نے اس مضمون میں امیر علی کی تاریخ سے الفاروق سے اور محمد شبلی صدیقی کی سیرۃ الفاروق سے اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے استفادہ کیا ہے

کہا کہ "تمہارے منہ کالے ہوں جو شخص اپنی ماں کو بے فرزند اور اپنی بیوی کو بیوہ کرنا چاہتا ہو وہ میرا راستہ روکے" کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ آپ کو روکنے کی کوشش کرتا۔ حضرت عمر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ غزوۂ بدر میں ظہور پذیر ہوا۔ اس غزوے میں آپ کے ماموں عاص بن ہشام کفار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے۔ اتفاق سے ان کا مقابلہ حضرت عمر سے ہو گیا۔ انہوں نے خدا اور رسول کے مقابلہ میں اپنے ماموں کا ذرہ برابر خیال نہ کیا اور ان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اسلام کے بارے میں شروع ہی سے کس قدر پر خلوص اور یکسو تھے۔ اس قسم کی یکسوئی ایمان کے معاملے میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ اسلام اور ایمان کے بارے میں کسی کی رو رعایت کرنا جانتے ہی نہ تھے۔

مذکورہ ذیل چند واقعات سے آپ کے فضائل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ آپ کا یہ رویہ ہمیشہ اپنے عاملوں کے ساتھ رہا کہ جب کبھی کسی کو عامل بنا کر بھیجتے تو پہلے یہ شرط لگا دیتے کہ وہ شخص ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا۔ کبھی عمدہ کھانا نہ کھائے گا۔ باریک کپڑا پہن کر باہر نہ نکلے گا۔ اور ضرورتمند لوگوں کے لئے کبھی اپنا دروازہ بند نہ کرے گا۔ اپنی رہائش گاہ پر کسی قسم کا پہرہ نہ بٹھائیگا۔ اگر اس کے خلاف عمل کرتا ہوا پایا گیا تو سزا کا مستحق ہوگا۔ ایک دفعہ آپ کا جی چاہا کہ مچھلی کا گوشت کھائیں۔ ایک شخص کو سانڈنی پر سوار کر کے مچھلی لانے کے لئے بھیجا۔ وہ شخص مچھلی تو لے آیا لیکن اس کو بہت دور جانا پڑا اور اتنا فاصلہ طے کرنا پڑا اور اس تیزی سے کہ سانڈنی تھک گئی۔ وہ شخص حضرت عمر کی عادت کو جانتا تھا اس نے آپ کے پاس پہونچنے سے قبل اونٹنی کو خوب نہلا دھلا لیا تاکہ گرد و غبار صاف ہو جائے لیکن جلدی میں کان صاف کرنے بھول گیا۔ کانوں میں اندر غبار بدستور اٹا رہا۔ حضرت عمر کی تیز نگاہ سے یہ کوتاہی کہاں چھپ سکتی تھی کانوں کے اندر کے غبار کو دیکھ کر فرمایا کہ کان دھونا بھول گئے۔ میری خواہش نے اس بے زبان کو ناحق ستایا ہے میں یہ مچھلی ہرگز نہ کھاؤں گا۔

عبید اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک دن حضرت عمر ایک بڑی مشک کاندھوں پر اٹھائے لئے جاتے تھے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا ہے تو فرمایا کہ میرا نفس ذرا آمادہ بہ غرور و تمکنت ہوا تھا اس لئے اس کو درست کر کے اپنی جگہ پہ لا رہا ہوں۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کو غصہ آیا ہو اور کسی شخص نے خدا کے خوف کا ذکر دیا ہو یا قرآن کریم کی کوئی آیت تلاوت کر دی ہو اور آپ کا غصہ وہیں ٹھنڈا نہ ہو گیا ہو۔ اس قسم کی سینکڑوں روایات مشہور ہیں لیکن طوالت کے خوف سے صرف چند پر اکتفا کیا ہے۔ ان روایات سے آپ کو حضرت عمر کے مزاج کی افتاد کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی قسم کی باتوں کی وجہ سے آج دشمن بھی آپ کی بزرگی اور عظمتِ کردار کے معترف ہیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔

عرب میں روحانی تربیت کا آغاز اگرچہ اسلام سے ہوا لیکن اسلام سے پہلے بھی اہل عرب میں بہت سے ایسے اوصاف پائے جاتے تھے جو تمغائے شرافت خیال کئے جاتے تھے اور جن پر ہر قوم ہر زمانے میں ناز کر سکتی ہے۔ یہ اوصاف اگرچہ کم و بیش تمام قوم میں پائے جاتے لیکن بعض بعض اشخاص ان اوصاف میں زیادہ ممتاز ہوتے تھے۔ اور یہی لوگ قوم سے ریاست و حکومت کا منصب حاصل کرتے تھے ان اوصاف میں فصاحت۔ بلاغت۔ قوت تقریر۔ شاعری۔ نسابی۔ سپہ گری۔ بہادری اور آزادی مقدم چیز میں خیال کی جاتی تھیں۔ حضرت عمر کو قدرت نے ان سب چیزوں میں کافی حصہ دیا تھا[1]۔

گو حضرت عمر خود شاعر نہیں تھے لیکن شاعری سے انہیں قدرتی لگاؤ تھا۔ ان کو تقریبًا تمام مشہور شعراء کا کلام ازبر تھا۔ لیکن ان تمام شعراء میں وہ تین کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ یہ تین شاعر امرأ القیس۔ زہیر اور نابغہ ہیں۔ ان تینوں میں بھی وہ زہیر کو افضل مانتے تھے اور اس کو اشعر الشعراء کہا کرتے تھے۔ اہل عرب آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ عربی کا بہترین شاعر کون ہے لیکن اس پر سب اتفاق کرتے ہیں کہ یہ تینوں

---

[1] سیرت الفاروق۔

شاعر صف اول میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے حضرت عمرؓ کے نزدیک زہیر ان تینوں میں افضل ترین شاعر ہے، اس فضیلت کی وجہ ایک دفعہ انہوں نے یہ فرمائی "زہیر نامانوس الفاظ کی تلاش میں نہیں رہتا۔ اس کے کلام میں پیچیدگی نہیں ہوتی۔ اور ہمیشہ اسی مضمون کو باندھتا ہے جس سے اچھی طرح واقف ہے۔ جب کسی کی مدح کرتا ہے تو انہیں اوصاف کا ذکر کرتا ہے جو واقعی ان میں موجود ہوتے ہیں" اخلاق لحاظ سے بھی زہیر کا کلام بے داغ ہے حالانکہ وہ زمانہ جاہلیت کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جس پر اسلامی معیار اخلاق کی روشنی میں بھی کوئی اعتراض وارد کیا جا سکتا ہو۔ یہ اس کی سلامت روی۔ سنجیدگی اور خلاقِ سلیم کی بیّن دلیل ہے۔ جس قسم کے اشعار حضرت عمرؓ کو پسند تھے ان میں خود داری۔ آزادی۔ شرافتِ نفس۔ حمیت۔ عبرت وغیرہ کے مضامین پر اظہار خیال کیا گیا ہو۔ فوج کے سرداروں اور عاملوں کو یہ حکم بھیج رکھا تھا۔ "لوگوں کو اچھے اشعار یاد کرنے کا حکم دو کیونکہ وہ اخلاق کی بلند باتیں اور صحیح رائے اور انساب کی طرف راستہ دکھلاتے ہیں"۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں "اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عمرؓ نے شاعری کے بہت سے عیوب بھی مٹا دیئے۔ اس وقت تمام عرب میں یہ طریقہ جاری تھا کہ شعراء شریف عورتوں کا نام علی الاعلان لیتے تھے اور ان سے اپنا عشق جتاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس رسم کو بالکل مٹا دیا تھا اور اس کی سخت سزا مقرر کی۔ اسی طرح ہجو گوئی کو ایک جرم قرار دیا۔ اور حطیئہ کو جو مشہور ہجو گو شاعر تھا اس جرم میں قید کر دیا"۔

عبادت و ریاضت:۔

خلافت کے کاموں کی وجہ سے دن میں نوافل پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی اس وجہ سے نوافل پڑھنے کا اہتمام رات کے وقت فرماتے تھے۔ صبح کو نماز کے لئے تمام گھر والوں کو خود اٹھاتے۔ فجر کی نماز میں اکثر بڑی بڑی سورتیں پڑھنا پسند کرتے تھے۔ نماز باجماعت پڑھنے کی انتہائی کوشش کرتے۔ نماز باجماعت کو تمام رات کی عبادت پر ترجیح دیتے تھے۔ بعض اوقات جہاد کے انتظام میں اس قدر مصروفیت اور انہماک بڑھ جاتا کہ نماز میں بھی اس کا خیال باقی رہتا۔ خود فرماتے کہ نماز پڑھتا جاتا ہوں اور میدان جنگ کی صفیں درست کرتا جاتا ہوں۔ آخرت کے حساب کتاب سے ہمیشہ خائف رہتے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر اس کو یاد کرتے تھے۔ ایک دفعہ ابو موسیٰ اشعری سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیوں ابو موسیٰ تم اس پر راضی ہو کہ ہم لوگ جو اسلام لائے اور ہجرت اختیار کی اور رسول اللہ کی خدمت میں ہر جگہ حاضر رہے تو ان تمام باتوں کا ہمیں یہ صلہ ملے کہ برابر سرابر چھوٹ جائیں اور کوئی پکڑ نہ ہو۔ ابو موسیٰ نے کہا نہیں میں تو اس پر ہرگز راضی نہ ہوں گا۔ مجھے تو بہت کچھ امید ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں عمرؓ کی جان ہے کہ میں تو صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ ہم بے مواخذہ چھوٹ جائیں۔ انتقال کے وقت یہ شعر ورد زبان تھا ؎

ظلومٌ لنفسی غیر انی مسلمٌ	(میں نے اپنی جان پر ظلم کئے ہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ مسلمان ہوں
اُصَلّی الصلوٰۃ کلّھا اصومُ	اور نماز میں پڑھتا ہوں اور روزے رکھتا ہوں)

اخلاق و عادات:۔

حضرت عمرؓ کی عادات میں تواضع اور سادگی کو سب سے زیادہ دخل حاصل تھا عظمت اور جاہ و جلال کے لحاظ سے اس زمانے میں کون ان کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اسی سادگی سے زندگی گزارتے تھے کہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا۔ حالانکہ سامنے ہوتے تھے اور لوگ دریافت کرتے تھے۔ کہ امیر المومنین کہاں ہیں۔ ریاست کے کاموں سے فرصت ہوتی تو پیوند زدہ کپڑے اور پھٹی ہوئی جوتیاں پہن کر مدینہ کی گلیوں میں نکل کھڑے ہوتے۔ کسی مریض کے گھر کا پانی بھر دیتے۔ کسی کے گھر کا سودا سلف لا کر اس کے حوالے کرتے۔ کسی معذور بڑھیا کا کھانا خود پکا کر دے آتے۔ تھک جاتے تو مسجد کے کسی گوشہ میں عمامہ یا ہاتھ سرہانے رکھ کر سو جاتے۔ اکثر مدینہ سے مکہ تک سفر کیا لیکن کبھی خیمے اور

؎ الفاروق

شامیانے ساتھ نہیں لئے۔ راستے میں آرام کرنا ہوتا تو کسی درخت پر چادر تان دیتے اور اسی معمولی سائے کے نیچے لیٹ جاتے۔ ایک دفعہ خطبے میں خلاف موقع فرمایا کہ لوگو! میں ایک زمانے میں اس قدر نادار تھا کہ لوگوں کا پانی بھر کر لا دیا کرتا تھا اس کے عوض میں وہ مجھے کچھ چھوارے دیتے تھے اسی پر میرا گزر تھا۔ یہ کہہ کر منبر سے اتر آئے۔ لوگ حیران ہوئے کہ اس بات کا کیا محل تھا۔ دریافت کرنے پر فرمایا میرا نفس ذرا اترانے لگا تھا، اس جملے سے اس کا علاج کرنے کی کوشش کی ہے۔

آخر میں میں چاہتا ہوں کہ حضرت عمر کی شخصیت پر مجموعی حیثیت سے ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تاکہ ناظرین کے ذہن میں مضمون ختم کرتے کرتے ایک مرتبہ پھر اسلام کے اس بطل جلیل کی مجموعی صفات کا نقشہ کھنچ جائے۔ یہاں میں پھر علامہ شبلی مرحوم کی تحریر سے مدد لینا چاہتا ہوں انہوں نے جس ولولے۔ شوق۔ اور خلوص سے الفاروق کے خاتمہ میں فاروقِ اعظم کی سیرت کا جائزہ لیا ہے۔ اور جس نکتہ رسی۔ فصاحت و بلاغت اور ایجاز سے عہدہ برآ ہوئے ہیں میں اس کا عشر عشیر بھی پیش نہ کر سکوں گا اس بنا پر میں الفاروق کی اصل عبارت نقل کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

لیس من اللہ مُستنکرٍ	خدا کی قدرت سے یہ کہاں بعید ہے کہ تمام عالم ایک
ان یجمع العالمَ فی واحدٍ	فرد میں سما جائے)

"قانون فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ فضائل انسانی کی مختلف انواع ہیں اور ہر فضیلت کا جدا راستہ ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی فضیلت کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن اور فضائل میں اسکو بہت کم حصہ ملا۔ سکندر بہت بڑا فاتح تھا لیکن حکیم نہ تھا۔ ارسطو حکیم تھا لیکن کشورستان نہ تھا بہت سے نامور گزرے ہیں جو بہادر تھے لیکن پاکیزہ اخلاق نہ تھے۔ بعض صاحب تدبیر تھے لیکن علم و فضل سے بے بہرہ تھے۔ اب حضرت عمر کے حالات اور ان کی مختلف حیثیتوں پر نظر ڈالو۔ صاف نظر آئے گا کہ وہ سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی مسیح بھی تھے اور سلیمان بھی۔ تیمور بھی تھے اور نوشیرواں بھی۔ ابو حنیفہ بھی تھے اور ابراہیم ادہم بھی۔ دنیا کے مشہور سلاطین جن ممالک میں بھی پیدا ہوئے وہاں مدت سے حکومت کے آئین قائم تھے اس لئے ان سلاطین کو کوئی نیا قائم نہ کرنا پڑی۔ بخلاف اس کے حضرت عمر جس خاک سے پیدا ہوئے وہ ان چیزوں کے نام سے بھی آشنا نہ تھی۔ ان حالات کے ساتھ ایک وسیع مملکت قائم کر دینا۔ اور ہر قسم کے ملکی انتظامات مثلاً تقسیم صوبجات و اضلاع انتظام محاصل۔ صیغۂ عدالت۔ فوجداری اور پولس۔ پبلک ورکس۔ تعلیمات۔ صیغۂ فوج کو اس قدر ترقی دینا اور ان کے ضابطے اور اصول مقرر کرنا حضرت عمر کے سوا اور کس کا کام ہو سکتا تھا۔ تمام دنیا کے حکمرانوں میں کوئی ایسا بھی دکھا سکتے ہو جس کی قمیص میں دس دس پیوند ہوں۔ کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے یہاں پانی بھر آتا ہو۔ فرش خاک پر سو رہتا ہو جہاں جاتا ہو جریدہ و تنہا چلا جاتا ہو۔ پھر رعب و داب یہ کہ عرب و عجم اس کے نام سے لرزتے ہوں اور جس طرف کا رخ کرتا ہو زمین دہل جاتی ہو۔ اخلاق کے لحاظ سے دیکھو تو انبیاء کے سوا اور کون شخص ان کا ہم پایہ مل سکتا ہے۔ زہد و قناعت۔ تواضع و انکسار خاکساری و سادگی۔ راستی و حق پرستی۔ صبر و رضا شکر و توکل یہ اوصاف ان میں جس کمال کے ساتھ پائے جاتے تھے کیا لقمان۔ ابراہیم ادہم۔ ابوبکر شبلی۔ معروف کرخی وغیرہ میں پائے جا سکتے تھے؟"

آخر میں مضمون کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا مسلمانوں کو آج یہ توفیق دے کہ وہ اس عظیم شخصیت کی زندگی سے سبق حاصل کریں اور اس کو شمع راہ بنا کر چلیں تاکہ ذلت و رسوائی جو ان سے چمٹ گئی ہے اس کو دور کر کے سرفرازی کی زندگی گذارنے کے قابل اور مستحق ہو سکیں۔

خلفائے راشدین کے دور میں قضا کا انتظام

نجم الدین اُحیائی — (رفیق دار المبلغین لکھنؤ)

اہل عرب دورِ جاہلیت میں حضارت و تمدن سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس لئے عموماً ان کے فیصلے نوک زبان کے بجائے نوک سنان سے ہوتے تھے مگر کبھی تلوار اٹھانا ان کے لئے مشکل ہوتا تو وہ اپنے قضایا اپنے قاضیوں سے فیصل بھی کرواتے جن کو وہ عارفین[1] کہتے تھے مگر ایسے فیصلوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔

اسلام آیا اس نے جس طرح ان کی زندگی کے اور شعبوں کو بدلا اسی طرح اس شعبہ میں بھی کافی تبدیلی پیدا کی چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور مسلمانوں کی تعداد دن بدن بڑھنے لگی جس کے نتیجہ میں ان میں کچھ اختلافی معاملات پیش آئے تو ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے معاملات کسی شخص کے روبرو لے جائیں ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مناسب اور لائق کون مل سکتا تھا چنانچہ وہ اپنے معاملات آنحضورؐ کے سامنے لیجانے لگے۔ حدیث و سیر کی کتابوں میں ایسے بہتیرے واقعات مذکور ہیں۔ مثلاً کندہ اور حضر موت سے دو شخص آئے۔ حضرمی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص نے میری زمین غصب کرلی۔ کندی نے عرض کیا حضرت یہ میری زمین ہے اور میرے قبضہ میں ہے اس کا اس میں کچھ بھی حق نہیں ہے۔ آپ نے حضرمی سے فرمایا کہ تمہارے پاس دلیل ہے عرض کیا نہیں فرمایا تمہارے لئے قسم ہے دوسرے نے عرض کیا حضرت یہ فاجر ہے اس میں کچھ بھی تقویٰ نہیں فرمایا اچھا نہیں تو تم قسم کھاؤ وہ قسم کھانے کے لئے چلا آن حضورؐ نے فرمایا اگر جھوٹی قسم کھالی تو یہ ظلم ہوگا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے منہ پھیرلیگا[2]

صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی غیر مسلم بھی اپنے معاملات لے کر آتے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہود آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دو زانیوں کا مقدمہ پیش کیا آن حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ تم توریت میں کیا سزا پاتے ہو عرض کیا زناکار کی سزا رسوائی اور کوڑے۔ حضرت عبداللہ ابن سلام موجود تھے فرمایا تم جھوٹ کہتے ہو تورات میں رجم ہے وہ لوگ توراۃ لائے اور آیت رجم پر ہاتھ رکھکر سیاق و سباق پڑھنے لگے حضرت عبداللہ ابن سلام نے کہا ہاتھ اٹھاؤ ہاتھ اٹھایا تو آیت رجم موجود تھی جس کے نتیجہ میں دونوں رجم کئے گئے[3]۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان فیصلوں کے درمیان میں ایسے اصول بتا گئے جو آپ کے بعد خلفائے راشدین کی سچی رہنمائی کرتے رہے خلفاء نے ہمیشہ اس کی پیروی کی بذات خود آنحضورؐ نے بھی ان اصولوں کو اپنانے کی ترغیب دی تھی۔ معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو آپ نے یمن کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا کہ تم فیصلے کیسے کروگے۔ عرض کیا کتاب اللہ سے، فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ؟ عرض کیا رسول اللہؐ کی سنت سے فرمایا اگر اس میں بھی نہ پاؤ؟ عرض کیا میں اجتہاد کرونگا اور ٹھیک فیصلہ تک پہنچنے میں کوتاہی نہ کرونگا۔ آنحضورؐ نے (خوشی سے) معاذؓ کے سینہ پر مارا اور فرمایا:۔

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما یرضی بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہؐ کے رسول کو ایسے امر کی توفیق دی جس سے رسول اللہ راضی ہیں۔

---

[1] دول العرب، صفحہ ۲۱ — [2] مشکوٰۃ شریف ص ۳۲۶ — [3] کنز العمال بحوالہ الفاروق ج ۲ ص ۵۴ فرستادہ

خلفائے راشدین نے ہمیشہ یہ اصول پیش نظر رکھا اور قضاۃ کو خاص طور سے اس کی اجازت دیتے رہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو ایک فرمان میں لکھا کہ مقدمات اول قرآن مجید کے مطابق فیصل کرو قرآن مجید میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث اور حدیث نہ ہو تو اجماع (کثرت رائے) کے مطابق اور کہیں پتہ نہ لگے تو خود اجتہاد کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اگر کوئی شخصیت سب سے زیادہ با اثر تھی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت تھی۔ مسلمان اپنے معاملات بھی فیصلہ کرانے کے لئے انہیں کے پاس آتے مگر ان کے دور میں قضا کا کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا اس کے دو سبب ہیں:—

۱:۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کندھوں پر جونہی خلافت کا بار پڑا عرب کے مختلف گوشوں میں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک لگے ایک طرف مدعیان نبوت اور مرتدین نے عرب کو کذب و افترا سے بھر دیا اور دوسری طرف مانعین زکوٰۃ نے زکوٰۃ نہ دے کر اسلام کے ایک اہم رکن کو بے حیثیت کرنا چاہا اس لئے ضرورت تھی کہ پوری قوت انہیں فتنوں کے دبانے میں لگائی جائے چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور اسی میں مشغول رہے اور فتنوں کے دبانے کے بعد اتنا وقت ان کو نہیں ملا کہ سکون سے کسی نئے کام کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ ان کی خلافت کی کل مدت صرف دو سال تین ماہ اور دس راتیں تھیں[1]۔

۲:۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں جو روح پھونکی تھی وہ فطرت انسانی کے ہم آہنگ تھی اور جو لوگ اسلام لائے تھے ان کی طبیعتیں انتہائی سچی اور سلجھی ہوئی تھیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور مبارک میں بھی زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی جو تعداد کے اعتبار سے بہت کم تھے جس کی وجہ سے اختلافات کم ہوتے تھے دوسرے اسلامی حکومت کے حدود ابھی بہت محدود تھے جس کی وجہ سے ابھی ضرورت نہیں تھی کہ قضا کے لئے باقاعدہ انتظام کیا جائے۔

دور فاروقی میں داخلی فتنے تقریباً سب کے سب فرو ہو چکے تھے اگر ان کے کچھ اثرات تھے تو وہ بھی چند مہینوں میں ختم ہو گئے دوسری طرف مسلمانوں کی تعداد بہت ہی تیزی سے بڑھنے لگی اور غیر مسلم اسلام کے دامن میں کثرت سے پناہ لینے لگے تیسری طرف اسلامی حکومت کے حدود تقریباً دو گنے ہو گئے جس کے نتیجہ میں معاملات اور اختلافات کی تعداد زیادہ ہو گئی، جسے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضرورت محسوس کی کہ کوئی ایسا محکمہ قائم کیا جائے کہ جس کا تعلق انتظامیہ سے الگ ہو اور وہ خود ایک مستقل محکمہ ہو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے قضا کا باقاعدہ انتظام کیا اس محکمہ کا قیام ان کی اولیات میں داخل ہے[2]۔

چنانچہ آپ نے مختلف شہروں اور صوبوں میں قاضیوں کو متعین کیا ان کا تعین بڑے غور و فکر سے کیا گیا اس میں وہی لوگ لئے گئے جو سر برآوردہ اور مسلمانوں میں اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے پایۂ تخت یعنی مدینہ منورہ کے قاضی زید ابن ثابت مقرر کئے گئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کاتب وحی رہ چکے تھے وہ سریانی اور عبرانی زبان کے ماہر تھے اور علوم فقہیہ میں سے فرائض کے فن میں تمام عرب میں ان کا جواب نہ تھا[3]۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو بھی مدینہ میں قاضی بنایا[4] انہوں نے دمشق میں بھی قضا کا کام کیا کعب ابن سور الازدی رضی اللہ عنہ بصرہ کے، عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ فلسطین کے، اور عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ کے قاضی تھے ان کے بعد کوفہ کے قاضی شریح بنائے گئے[5]

یہ کبار تابعین میں سے ہیں پچھتر سال تک قاضی رہے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کے فتنہ میں تین سال کے لئے معطل کر دیئے گئے تھے پھر حجاج نے ان کو قاضی بنا دیا[6] ان کی تقرری کا واقعہ عجیب ہے "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر ایک گھوڑا خریدا اور امتحان کے لئے

[1] کنز العمال بحوالہ الفاروق ج ۲۔ [2] خضری ص ۲۹۲۔ [3] تاریخ الخلفاء ص ۹۳۔ [4] الفاروق صیغہ عدالت [5] خضری ص ۱۳۱ ج ۲ [6] صفۃ الصفوۃ

ایک سوار کو دیا گھوڑا سواری میں چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے واپس کرنا چاہا گھوڑے کے مالک نے انکار کیا اس پر نزاع ہوئی اور شریح ثالث مقرر کئے گئے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اگر گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی ہے تو گھوڑا واپس کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں حضرت عمرؓ نے کہا حق یہی ہے اور اسی وقت شریح کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔[۱]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قاضیوں کو خوب سوچ سمجھ کر متعین کرتے صرف دور ہی سے نہیں بلکہ قریب سے بھی پرکھ لیتے۔ ان قاضیوں کے علاوہ قیس بن العاص سہمی، جمیل ابن عامر ابو مریم الحنفی، سلمان بن ربیعۃ الباہلی، عبدالرحمٰن بن ربیعہ، ابو قرۃ الکندری عمران بن الحصین حضرت عمرؓ کے زمانے کے قضاۃ ہیں[۲]

یہ محکمہ دورِ فاروقی میں وسیع ہوتا گیا اپنے اسلاف کی طرح خود فاروق اعظمؓ بھی مقدموں کا فیصلہ کرتے ایک عورت اپنے شوہر کو لے کر آئی شوہر نے اس کی لونڈی سے دوران سفر میں جماع کر لیا تھا۔ آپ نے شوہر سے دریافت فرمایا اس نے عرض کیا کہ حضرت میری عورت نے اس لونڈی کو ہبہ کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دلیل لاؤ ورنہ تمہیں سنگسار کر دوں گا مگر اس کے بعد عورت نے خود ہی اقرار کر لیا کہ اس نے شوہر کو ہبہ کر دیا تھا[۳] صرف مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی اپنے مقدمات حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کرتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فیصلہ غیر مسلم کے حق میں ہوتا ایک مسلم اور ایک یہودی دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت عمرؓ نے حق یہودی کی طرف دیکھا اور اس کے حق میں فیصلہ کر دیا[۴]

دورِ فاروقی گزر جانے کے بعد دورِ عثمانی آیا حضرت عثمانؓ نے اس محکمہ میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ کی انھوں نے اپنے خلافت کے دوران میں عمر فاروقؓ کی پیروی کی خود بھی بعض معاملات کا فیصلہ کرتے خلافت کا تاج پہنتے ہی ان کے سامنے سب سے پہلا مقدمہ حضرت فاروقؓ کے صاحبزادے حضرت عبیداللہ رضؓ کا پیش کیا گیا انھوں نے ہرمزان اور جفینہ کو اس گمان میں قتل کر دیا تھا کہ وہ دونوں حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کی سازش میں شریک تھے عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ بیعت کے بعد مسجد میں تشریف فرما ہوئے اور عبیداللہ بن عمرؓ کو بلایا مہاجرین و انصار بھی وہاں موجود تھے آپ نے لوگوں سے کہا کہ آپ حضرات مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ ان کو قتل کر دیں لیکن بعض مہاجرین نے کہا ابھی کل عمرؓ شہید کئے گئے ہیں اور آج ان کا بیٹا قتل کیا جائے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے عرض کیا حضرت اللہ تعالیٰ نے آپ کو مجاز بنا دیا ہے کہ آپ مسلمانوں کے معاملے میں جو چاہیں کریں۔ آج یہ معاملہ پیش ہے کیا آپ کو پورا اختیار نہیں؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ہاں میں مقتولین کا ولی ہوں اور میں دیت چاہتا ہوں جسے میں اپنے مال سے ادا کر دوں گا۔ یہ بہترین اس مشکل کا حل تھا[۵]

ہمیں دورِ عثمانی میں محکمہ قضا کی کوئی خاص تفصیل نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت عثمانؓ نے کوئی تبدیلی کی ہو۔ مؤرخین عام طور پر حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق محکمہ قضا کی تفصیلات دیتے ہیں اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے قضا کا تذکرہ کہیں کہیں ضمناً کر دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اگر کوئی خاص اس شعبہ کو ترقی نہ دی تو اس میں کچھ کمی بھی نہ ہونے دی حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں مختلف دیار و امصار سے امراء کے متعلق کافی شکایتیں موصول ہوئیں مگر کہیں بھی قاضیوں کے متعلق کوئی شکایت نہیں ہوئی

عثمانی دور کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت شروع ہوتی ہے ان کی خلافت ہنگاموں اور لڑائیوں میں گزری جس کی وجہ سے مؤرخین، عموماً ان لڑائیوں کی تفصیلات ہی زیادہ لکھتے ہیں تاہم ضمناً قضا کے واقعات کا بھی تذکرہ بھی آ جاتا ہے۔ حضرت علیؓ چونکہ خود بہت بڑے قاضی تھے آنحضورؐ نے ان کے متعلق فرمایا تھا۔

اقضاھم علی[۶] (ترجمہ: قضا کی لیاقت لوگوں میں سب سے زیادہ حضرت علیؓ میں ہے۔"

اس لئے حضرت علیؓ نے نہ صرف محکمہ قضا کو برقرار رکھا بلکہ اس کے انتظامی شعبوں میں اور ترقی دی خود بھی کبھی کبھی مسند قضا پر متمکن

---

[۱] الفاروق [۲] خضری [۳] الفاروق [۴] ازالۃ الخفاء مقصد ثانی ج۲ ص۱۲۱ [۵] مشکوٰۃ ص۲۷۴ [۶] خضری ج۲ ص۳۹ [۷] ص۱۸۱۔

ہو جاتے اور فیصلے کرتے تاریخ و سیر کی کتابوں میں ایسے فیصلے منقول ہیں۔ ہم مقالہ کی طوالت کی وجہ سے اس وقت کوئی واقعہ نقل نہیں کر سکتے[1]
حضرت علیؓ نے بھی اپنے قاضی مختلف شہروں اور جگہوں میں متعین کئے ایکے دور میں پائے سلطنت کوفہ کے مشہور قاضی شریح تھے جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

میں نے ابھی تک محکمہ قضا کا تذکرہ اجمالی طور پر کردیا ہے اور خلفاء کے بعض فیصلے بھی نقل کر دیتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ قضا کا انتظام ہر خلیفہ کے دور میں کسی نہ کسی حال میں ضرور رہا اب آپ کے سامنے بعض عنوانات کے تحت اور تفصیلات رکھوں گا۔

اصول قضا

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضؓ نے قضا کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا تو اس کے لئے آئین و قوانین بھی متعین فرماتے جو تمام کے تمام قرآن و حدیث سے مستنبط تھے ہمارے سامنے اس وقت دو فرمان موجود ہیں۔
ایک فرمان ہے جسے علامہ شبلی رحؒ نے طبقات الفقہا علامہ بیہقی رحؒ کے حوالے سے الفاروق میں نقل کیا ہے جو کوفہ کے قاضی ابو موسیٰ اشعری رضؓ کے نام ہے اور دوسرا فرمان ہے جسے مشہور مورخ خضری رحؒ نے اپنے محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ میں نقل کیا ہے جو قیس بن ابی العاص قاضی مصر کے نام ہے دونوں کے الفاظ باہم ملتے جلتے ہیں اور مفہوم تقریباً ایک ہی ہے۔ علامہ شبلی رحؒ نے پھر اس فرمان کا خلاصہ کیا ہم اسی خلاصہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ قاضی کو عدالتانہ حیثیت سے تمام لوگوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہیئے۔ ۲۔ بار ثبوت عموماً مدعی پر ہے۔ ۳۔ مدعا علیہ اگر کسی قسم کا ثبوت یا شہادت نہیں رکھتا تو اس سے قسم لی جائے گی۔ ۴۔ فریقین ہر حالت میں صلح کر سکتے ہیں لیکن جو امر خلاف قانون ہے اس میں صلح نہیں ہو سکتی۔ ۵۔ قاضی خود اپنی مرضی سے مقدمہ کے فیصلے کرنے کے بعد اس میں نظرثانی کر سکتا ہے۔ ۶۔ مقدمہ کی پیشی کی ایک تاریخ معین ہونی چاہیئے۔ ۷۔ تاریخ معینہ پر اگر مدعا علیہ حاضر نہ ہو تو مقدمہ یکطرفہ فیصل کیا جائے گا۔ ۸۔ ہر مسلمان قابل ادائے شہادت ہے لیکن جو شخص سزا یافتہ ہو جس کا جھوٹی گواہی دینا ثابت ہو وہ قابل شہادت نہیں[2]۔
یہی وہ اصول تھے جن پر محکمہ قضا کی بنیادیں استوار ہوئیں اور بعد کو ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ یہ اصول اپنے زبان حال ہی سے اپنے کامل و مکمل ہونے کی شہادت دے رہے ہیں ان پر مزید تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

قاضیوں کی ایمانداری

خلفائے راشدین کے دور میں تاریخ ایک بھی ایسا قاضی (Judge) پیش نہیں کرتی جس پر کسی قسم کی بددیانتی کا الزام ہو بلکہ ان کا ہر ایک فرد شریعت کا مکمل پابند ہوتا اور صحیح فیصلوں تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرتا عبداللہ بن مسعود رضؓ کوفہ کے قاضی تھے وہ اپنے فیصلوں میں کسی کی رعایت نہ کرتے اور نہ اپنے اس عہدے کی وجہ سے یہ چاہتے کہ لوگ ان کی عزت کریں انکی مشایعت میں چلیں جیسا کہ آج کے حکام کا شعار بن چکا ہے ایک بار نکلے کچھ لوگ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے رک کے فرمایا کیا تمہیں کوئی ضرورت ہے لوگوں نے عرض کیا نہیں فرمایا لوٹ جاؤ کیونکہ اس طرح چلنا تابع کے لئے ذلت اور متبوع کے لئے فتنہ ہے[3]۔

مساوات

امیر ہو یا غریب۔ راعی ہو یا رعایا ان کی نظر میں سب یکساں تھے۔ قاضی شریح رضؓ ایک مشہور قاضی ہیں۔ ان کو حضرت عمر رضؓ نے متعین کیا تھا۔ حضرت علی رضؓ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی انہیں برقرار رکھا یہ کوفہ کے قاضی تھے حضرت علی رضؓ کی زرہ گم ہو گئی تھی اتفاق سے ایک یہودی کے پاس اسے دیکھ لیا فرمایا زرہ میری ہے اسے میں نے نہ تمہارے ہاتھ فروخت کیا ہے اور نہ ہبہ کیا ہے یہودی نے کہا زرہ میری ہے اور میرے قبضہ میں ہے۔ حضرت علی رضؓ نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا قاضی شریح نے

---

[1] ایسے واقعات ازالۃ الخفاء و اخبار القضاۃ میں کافی ہیں [2] الفاروق [3] صفۃ الصفوۃ ص۱۶۱ ج۱۔

یہودی سے دریافت کیا کہ تم کیا کہتے ہو اس نے کہا کہ زرہ میری ہے اور میرے قبضہ میں ہے پھر حضرت علی رضؓ سے دریافت کیا آپ کے پاس، کوئی دلیل یا شہادت ہے فرمایا ہاں قنبر اور حسن شاہد ہیں قاضی شریح نے کہا کہ بیٹے کی شہادت باپ کے لئے جائز نہیں۔ بالآخر فیصلہ یہودی کے حق میں ہوا مگر یہودی نے یہ دیکھ کر زرہ بھی واپس کر دی اور خود مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

اس فیصلہ پر نگاہ ڈالئے حاکم وقت ایک طرف مدعی بنا ہوا ہے اور مدعا علیہ ایک حقیر آدمی ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ غیر مسلم ہے مگر قاضی کے فیصلہ میں ذرا سی لچک نہیں ہوتی۔ اور وہ صاف وہی فیصلہ کرتا ہے جو اصول اور قانون کے مطابق ہے۔

قاضیوں کو تنبیہ

درصل اس کی وجہ یہ تھی کہ خلفا خود بھی قاضیوں کو پوری تاکید کرتے کہ وہ اصول و ضابطہ کے خلاف نہ کریں اور موقعہ بموقعہ ان کو تنبیہ بھی کرتا کرتے ایک دفعہ حضرت عمرؓ اور ابن ابی کعبؓ میں کچھ نزاع ہوئی ابی نے زید بن ثابتؓ کے یہاں مقدمہ دائر کیا حضرت عمر رضؓ مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے زیدؓ نے تعظیم دی حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے پھر یہ کہکر ابی رضؓ کے برابر بیٹھ گئے۔ ابیؓ کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ اور حضرت عمر رضؓ کو دعوی سے انکار تھا ابی رضؓ نے قاعدہ کے مطابق حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہی لیکن زیدؓ نے ان کے رتبہ کا پاس کر کے ابی رضؓ سے درخواست کی کہ امیر المومنین کو قسم سے معاف رکھو حضرت عمر رضؓ اس طرفداری پر برہم ہوئے زید کی طرف مخاطب ہو کر کہا جبتک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمر رضؓ دونوں برابر نہ ہوں تم منصب قضا کے قابل نہیں سمجھے جا سکتے لہ

فیصلوں کی ارزانی

خلفائے راشدین کے دور مسعود میں قاضیوں کا جو حال رہا شاید تاریخ ایسے لوگوں کو پیش نہیں کر سکتی جن سے ایسے حالات ظاہر ہوں مگر جو سب سے بڑی چیز ان کے دور میں تھی وہ یہ تھی کہ فیصلے انتہائی آسانی سے ہو جاتے دور حاضر کی طرح تاریخوں پہ تاریخیں نہیں پڑتی تھیں بلکہ ادھر مدعی اور مدعا علیہ آئے اور شہادتیں لی گئیں اگر شہادت نہیں ہے تو قسم پھر معاملہ صاف تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک نالی ایک شخص کے باغ سے گذرتی تھی انھوں نے بدلنا چاہا مگر باغ والے نے رد کر دیا دونوں حضرت عمر رضؓ کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی باتیں پیش کیں حضرت عمرؓ نے سنا اور ان کو بدلنے کی اجازت دیدی۔ ایک شامی حضرت عمرؓ کی خدمت میں آیا اور اپنی عورت کے متعلق شکایت کی کہ اس کا ایک شخص کے ساتھ ناجائز تعلق ہے حضرت عمرؓ نے فوراً ابو واقد لیثی کو اس کی طرف بھیجا انھوں نے اس سے دریافت کیا کافی اصرار کے بعد اس نے اقرار کر لیا حضرت عمرؓ نے اس کے بعد رجم کا فیصلہ کر دیا تہ

اس قسم کے بہتیرے واقعات ہیں شاید ہی کوئی مقدمہ ایسا ہے جس کے فیصلہ کرنے میں قاضیوں کو کئی دن لگ گئے ہوں مہینوں اور سالوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔

خلفائے راشدین کے دور مبارک کے اس محکمہ کی اگر یہی خوبی دیکھی جائے تو دور حاضر کی متمدن سے متمدن حکومت میں اس کی مثال نہیں مل سکتی پس ماندہ ممالک کو تو چھوڑیئے ان ملکوں میں دیکھئے جہاں کے رہنے والے اپنے کو تہذیب کا دیوتا اور تمدن کا علمبردار کہتے ہیں تو آپ کو ان فیصلوں کی صحیح قیمت کا اندازہ ہوگا۔

الغرض خلفائے راشدین کے دور میں قضا کا بڑا اچھا انتظام رہا اور دنیا کے سامنے ایک ایسی مثالی عدالت آگئی جہاں فیصلے روپیوں کے بل بوتے پر نہیں بلکہ حق و انصاف کے بھروسے پر ہوتے جس عدالت کے قاضیوں نے شاہ و گدا وزیر اعظم اور چپراسی کو ایک نگاہ سے دیکھا! دنیا کو پھر ایسے قاضیوں اور ایسی ہی عدالتوں کی ضرورت ہے تاکہ انصاف قائم ہو سکے اور دنیا کو انصاف کیلئے جو روپیہ اور وقت خرچ کرنا پڑتا ہے اس سے نجات مل جائے!

لہ تاریخ الخلفاء منفا صفحہ ۱۲۵ ؎۲ الفاروق ؎۳ ازالۃ الخفاء صفحہ $\frac{121}{2}$ ۔

مسجد سے میخانے تک

از ملّا ابن العرب مکی

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے حتیٰ کہ مولوی دستار علی کے جوغے کی بھی ایک حد ہے، مگر اس ستم ظریفی کی کوئی حد نہیں کہ مجھ بد نصیب کو خلافت نمبر میں لکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لکھنا کیا جھک مارنا کہئے۔ بیوی سے لیکر صوفی کرامت اللہ تک سے مشورہ کیا کہ خدارا بتاؤ خلافت نمبر کے لئے کیا لکھوں، لیکن کہیں سے صائب مشورے کا سراغ نہیں لگا۔ بیوی تو کہنے لگیں:۔

"بھاڑ میں جائے خلافت نمبر۔ آج فقط بائیس تاریخ ہے اور آٹا دال گرم مصالحہ سب ختم ہے۔ ایندھن تو کل ہی صاف ہو لیا تھا صبح چائے آپ کی کاپی سے بنائی ہے۔۔۔"

"مار ڈالا۔۔۔ بھاگوان کونسی کاپی؟۔۔۔"

"اجی ہوگی کوئی سی۔ آج بھی ایندھن نہیں آیا تو کتابوں سے کھانا پکے گا۔"

صوفی صاحب نے چہک کے فرمایا:۔

"اماں اپنے خلیفہ شہامت علی پہ لکھ ڈالو کچھ۔ انکی کرامتوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ کہو تو میر صاحب سے "خزینۃ الاولیاء" لا دوں اس میں حضرت پیر دولھا کے تیس ہزار خلفاؤں کے چشم دید احوال درج ہیں۔"

میں نے بیکسی سے ان کی طرف دیکھا۔ چہرے پر نور اور آنکھوں میں تصوف کا جلال لہریں مار رہا تھا۔ ابھی ابھی شام کا ناشتہ کرکے فارغ ہوئے تھے۔ "کیا بتاؤں صوفی صاحب میں تو تیس لاکھ خلیفاؤں کے احوال لکھ سکتا تھا، مگر ایڈیٹر تجلی کی وہابیت میری عاقبت برباد کر دے گی۔ وہاں تو خلافت کا مطلب کچھ اور ہی لیا جا رہا ہے۔"

"کیسا؟"

"وہی پرانا قصہ خلافتِ راشدہ، اسلامی نظامِ حکومت، آسمانی سیاست۔"

"لاحول ولا قوۃ ۔۔ کہیں ان باتوں کا زمانہ دھرا ہے۔ بھائی صاحب وہ تو ایک ظاہری خلافت تھی جو تیس سال میں تمام ہوئی۔ اصلی خلافت تو باطنی ہے جو نہ کبھی تمام ہوئی نہ ہوگی۔ اب ہمارے مرشد ہی کو دیکھ لو، بظاہر کب کا پردہ فرما گئے، مگر آج بھی پچھمی ملکوں کی ساری مملکت انھی کے قبضے میں ہے مجال ہے ان کی مرضی کے بغیر ایک تنکہ ادھر سے اُدھر ہو لے۔"

"اور پوربی ممالک؟" میں نے عالمِ یاس میں پوچھا:۔

"وہ خواجہ مقدور علی کے حلقے میں ہیں۔"

"اور جنوبی؟"

"اجی اب ہٹاؤ۔ چھ بج گئے ہیں، ساڑھے چھ پہ فاتحہ شروع ہونی ہے، چلوگے؟"

"چلوں گا بشرطیکہ آپ کندھے پر سوار کرکے لے چلیں۔"

"دھت شیطان۔" وہ اس طرح لجا گئے جیسے میں نے کوئی ناجائز بات کہہ دی ہو۔ انھیں غالباً عرسِ کلیر کا وہ واقعہ یاد آگیا تھا جس میں وہ تبریزی درگاہ والوں کے مقابلے میں آگھرے کی جھمکا بائی کو کاندھے پہ ڈال کے بھاگ پڑے تھے۔ یہ واقعہ طویل ہے پھر کبھی دُہراؤں گا۔

"چلو نا۔ آج مکھن حلوائی سے خاص گلدانے بنوائے ہیں۔۔"

انھوں نے ٹھوکا دیا۔

"مغرب کی اذان چھ پچیس پر ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔۔

"پونے سات سے پہلے کیا فراغت ہوگی۔"

"ہاں ہاں بس رہنے دو کیوں بہانے ڈھونڈتے ہو۔ ہم جانتے ہیں

فاتحہ میں جانے سے تمہاری وہابیت میں فرق آجائے گا۔"

"نہیں فاتحہ میں ضرور چلوں گا ـــ مگر نماز تو آپ کو بھی پڑھنی ہی ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پڑھ لیں گے فاتحہ کے بعد۔ وقت تو عشا کی اذان تک رہتا ہے۔"

انھوں نے ڈبیا سے ایک پان کھایا پھر اکھڑے ہوئے لہجے میں بولے:۔

"خیر تم جاؤ۔ کلدانے ہم گھر ہی بھجوا دیں گے۔"

اس طرح صوفی صاحب اور بیوی صاحبہ دونوں سے مایوس میں نماز مغرب پڑھ کر جنگل کی طرف ٹہل گیا۔ ظاہر ہے جب آدمی یاس و حرمان کا شکار ہو گا تو ویرانے ہی کی طرف چلے گا۔ گردن ڈالے چلا جا رہا تھا کہ شیخ نجابت الدین مل گئے۔

"ارے ملا کدھر چلے؟"

"قیمتی جنگل میں اکیلا ہے مجھے ..... ارر ... شیخ صاحب آپ ہیں۔ معاف کیجئے گا میں کسی اور دھیان میں تھا۔"

"ہم جانتے ہیں کس دھیان گیان میں رہتے ہو وہی سڑی ہوئی ملائیت! یار تم نے بھی خود کو برباد کر لیا۔ ہماری بات تو مبیش کرتے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں شیخ صاحب قصور تو والدین کا ہے۔"

"کیا بات ہوئی؟"

"میرا نام تجمل حسین خاں رکھ دیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ آپ جانتے ہی ہیں ـــ بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے۔"

"شروع کر دی خرافات ـــ چلو اب بدل لو نام"

"قیامت آجائے گی۔ پچھلے سال پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ نہ صرف اپنا نام بدلوں گا بلکہ صاحب زادوں کو بھی تجمل خاں نمبر ایک۔ تجمل خاں نمبر دو وغیرہ قرار دوں گا۔ مگر بیوی نے سارا پروگرام برباد کر دیا۔"

"کیوں بیوی کا اس میں کیا نقصان تھا؟" وہ حیرت کو ہنسی میں لپیٹتے ہوئے بولے:۔

"کیا عرض کروں" میں نے سرد آہ کھینچی "وہ مفتی توکل حسین ہیں نا ... ان کے دادا کا نام تجمل حسین ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے جو سنا کہ ملا اپنا نام تجمل حسین رکھ رہا ہے تو ساری دنیا میں طوفان کھڑا کرتے پھرے کہ ملا میرے مرحوم دادا کے اسم پاک کی ریڑھ مارنے چلا ہے۔ مجھے لوگوں نے سمجھایا کہ ایسا غضب مت کرو میں نے صاف کہہ دیا کہ کروں گا اور بیچ کھیت کروں گا۔ اب جناب توکل حسین نے ایک اور داؤ کھیلا۔ دوڑے دوڑے میری بیوی کے پاس پہنچے اور پٹی پڑھائی کہ دیکھو ملانی تمہارا نکاح ملا صاحب سے ابن العرب ملّی کے نام پر ہوا تھا اگر انھوں نے نام بدلا تو فتوے کی رو سے نکاح بھی فوراً ٹوٹ جائے گا اور حشر تک نہیں جڑے گا۔ ملانی کو یقین نہیں آیا تو اس نے بالا ہی بالا ہمسائے کی لڑکی سے استفتاء لکھوا کر مفتی غفران علی کی خدمت میں بھیج دیا۔ مفتی موصوف آپ جانتے ہی ہیں تجمل حسین کے لنگوٹیا یار ہیں۔ انھوں نے بھی جواب لکھ کے بھجوا دیا کہ از بسکہ اسموں ہی پر نکاح کا انحصار ہے۔ نام بدلنا گویا ولدیت بدلنا۔ یعنی نسل و نسب کا بدلنا ہے جو حرام الحرام ہے۔ اس سے نکاح فی الجملہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بیوی نے پوچھا تھا "فی الجملہ" کیا چیز؟ انھوں نے جواب دیا تھا طلاق مغلظہ کو کہتے ہیں۔ بیوی نے دریافت کیا تھا "از بسکہ" کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے ارشاد فرمایا تھا ایسی طلاق کو کہتے ہیں جس میں حلالہ بھی کافی نہیں ہوتا ـــ بس پھر کیا ملانی نے جو غدر مچایا ہے تو سات محلے کہرام مچ گیا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر روتی ہے کہ .....

"اماں ختم بھی کرو" شیخ صاحب جھنجھلا گئے "تم تو چرخہ چلا دیتے ہو۔ خیر میں اس وقت تمہاری ہی تلاش میں نکلا تھا۔ لو یہ دس کارڈ۔"

انھوں نے چوغا نما کرتے کی اندرونی جیب سے راشن کارڈوں کی گڈی نکال کر میری طرف بڑھائی:۔

"اتنے کافی نہ ہوں تو اور منگوا دوں؟"

"یہ تو بہت ہیں۔ مہینے میں بس سات آٹھ سیر آٹے کی کھپت ہے ایک ہی کافی رہتا۔"

"بات کرتے ہو .... اپنے رب کا آٹا منگوا کر بیچ دینا دس بیس بچ ہی رہیں گے ..... ہاں تو کہنا یہ تھا کہ اپنے سیٹھ بنسادری لال ابھی سے آنے والے الیکشن کی تیاری شروع کر رہے ہیں۔"

"ابھی سے ـــ ابھی تو بہت دن ہیں۔"

"کہاں دن ہیں — مہینے اور سال تو ہوا کی طرح گذرتے ہیں کچھ بھی ہو اب کی جیت کے رہنا ہے۔"

"خدا کامیاب کرے...." میں نے بے دلی سے کہا۔

"دعاؤں سے کام نہیں چلے گا۔ اب کی تم بھی ورک کر رہے ہو۔ پروگرام یہ ہے کہ ابھی تو صرف ایک گھنٹہ روز تمھیں دینا ہوگا۔ پھر چھ مہینے رہ جائیں گے تو دو گھنٹے روز اور آخری دو ہفتوں میں آل ٹائم ورک...."

"باپ رے باپ.... ایڈیٹر تجلی نے سن لیا تو...."

"پھر وہی ایڈیٹر تجلی ایڈیٹر تجلی" وہ بھنا گئے "آخر ان سے کیوں دم نکلتا ہے۔ پچھلی دفعہ بھی انھی کے ڈر سے کنّی کاٹ گئے تھے۔ اب کی بھی...."

"آپ نہیں سمجھیں گے.... وہ چچا کے رشتے سے میری بیوی کے بھائی ہیں...."

"ہوتے ہوں گے۔ کون سے روک دے رہے ہیں...."

"یہی تو مصیبت ہے۔ وہ شخص.... وہ شخص...."

"کیا شیخ تیخ لگائی — لو یہ لو۔"

انھوں نے جیب سے چند نوٹ نکال کے میری ہتھیلی پر رکھے اور مٹھی دبانے لگے:۔

"یہ ایڈوانس ہے۔ پیشگی۔ اب کی سیٹھ نے چالیس ہزار الگ رکھدیئے ہیں۔"

میں نے نوٹ گنے۔ یہ دس دس کے تین تھے۔ نئے 'کرارے' گویا ابھی چھپ کے آئے ہوں۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"عیش" وہ کھٹ سے بولے "قسم قرآن کی یاروں کے ساتھ چلوگے تو عیش ہی عیش ہے...."

"پھر بھی....؟"

"بس تمہارا دماغ ہمارا کام۔ دس درجن آدمی بھی چاہو گے تو چٹکی بجاتے حاضر کر دیئے جائیں گے۔ گاڑی مفت، لاؤڈ اسپیکر مفت خوراک مفت —"

"لیکن شیخ صاحب" میں نے بسورتے ہوئے کہا "سیٹھ صاحب کی تو پچھلی مرتبہ ضمانت بھی ضبط ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں ان سے بڑا خود غرض اور سود خوار آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اماں چالیس ہزار کچھ کم ہوتے ہیں —؟"

"وہ تو بجا ہے.... لیکن تعجب ہے اُن جیسا مکھی چوس اتنی بڑی رقم کیسے اُٹھا دے گا۔"

وہ ذومعنی انداز میں مسکرائے پھر سرگوشی کے طور پر کہنے لگے:۔

"مسٹر رانگھڑا کے پاس چار سال پہلے کیا تھا۔ بس ایک کوٹھی ایک گاڑی اور لاکھ سے بھی کم بینک بیلنس.... پھر وزارت میں پہنچنے کے بعد کیسا ہے۔ .... تین کوٹھیاں.... دو بیوک کاریں — سترہ لاکھ کا بینک بیلنس — دو کاٹن ملوں میں آٹھ آنے کی شرکت! یہ سب برکتیں آخر ہمارے سیٹھ کو بھی تو نظر آ رہی ہیں!"

"ہوں.... اوں.... خیر.... یہ بتلایئے ان تیس کو کس حساب میں لکھوں؟"

"حسابِ دوستاں در دل — کل شام فصاحت میاں کے یہاں پہنچ جانا۔ لالہ شمبھو مل بھی آ رہے ہیں۔ مفتی قطب الدین کی بھی دعوت ہے۔ اچھی میٹنگ رہے گی۔"

"مگر میں ابھی چند روز کوئی خدمت نہ کر سکوں گا۔"

"کیوں؟"

"ستارے! — میرا ستارہ مریخ کے اردب میں آگیا ہے۔"

"جانے بھی دو.... تم سے تو ستارے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ دیکھو آنا ضرور...."

ان کے چلے جانے کے بعد میں نے نوٹوں کو کان کے قریب جاکر کھڑکھڑایا تو ایسا روح پرور نغمہ ان کاغذ کے ٹکڑوں سے نکلا کہ کان کے کوکر دے کھوپڑی کی آخری سرحد تک شہد کی بوندیں سی ٹپکتی چلی گئیں.... ہائے یہ دیپک راگ — دل و دماغ کی محرابوں پر جیسے ہنڈے جل اٹھے ہوں۔ تیس کو دس سے ضرب اور پھر حاصل ضرب کو دس سے ضرب دیکر دل ہی دل میں جو حساب پھیلایا تو یوں لگا جیسے اچانک ہوا میں اُڑا جا رہا ہوں۔ کہکشاں کے لہراتے ہوئے آنچل سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا، پریوں کی نرم و گداز باہوں کے سہارے، سُرمئی فضا کی بیکراں وسعتوں میں دُور بہت دُور، اُفق کے اُس پار، جہاں حسن و عشق ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چہل قدمی کرتے ہیں، ظالم سماج کی زد سے باہر — مستی ہی

مستی، رنگ ہی رنگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"تڑاخ، شائیں ۔"

یہ میرا ماتھا ایک درخت کے جھکے ہوئے تنے سے ضرب کھا گیا تھا اور بس۔ اری کے حسین خواب کھوپڑی کی شاندار سنسناہٹ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ واقعی یہ ضرب کا قاعدہ بھی خوب ہے۔ اگر آخری حاصل ضرب کو مزید ایک دو بار ضرب دینے کی توفیق ہو جاتی تو کیا تعجب تھا پریاں مجھے دولہا بنا کر کوہ قاف تک لے جاتیں اور وہیں سے بیٹھا بیٹھا میں ظالم سماج کو ٹھینگا دکھایا کرتا۔ لیکن ماتھا اتنی زور سے پھوٹا تھا کہ ساری ہوا نکل گئی۔

اب وہی میں تھا، وہی ظالم سماج، وہی دائیں بائیں سے آتی ہوئی بدبو اور وہی خلافت نمبر کا دیو! ۔۔ یا اللہ کیا کروں۔ کیا لکھوں۔ نہ لکھوں تو جان کے لالے۔ لکھوں تو عاقبت برباد۔

ماتھا ملتے ہوئے ذہن نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ الیکشن کی ایک شاندار نظم تیار کر لی جائے۔ ایڈوانس تو لے ہی لیا ہے۔ انتخاب کی جنگ میں نظم، نثر بھی چلتا ہے۔ نظم بعض اوقات ووٹروں کے تزکیۂ نفس میں بے حد کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ ابھی پچھلے الیکشن میں ڈی۔ این ملوتھرا کو زیادہ تر فلک گورداسپوری کی نظموں ہی نے تو کامیاب کرایا تھا۔ یہ حلقہ بی کے امیدوار تھے۔ کانگریس کا ٹکٹ نہیں ملا تو یہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ انتخابی نشان ایک بیل اور ایک گائے کی مشترکہ تصویر تھی۔ آج تک فلک موصوف کا ایک بند بچے بچے کی زبان پہ ہے:۔

بیل پتا اور گیتا ماتا — دونوں مل کر ہیں اَن داتا
ان داتا کو چوٹ نہ دینا — اور کسی کو ووٹ نہ دینا
پربھو تیرا بھلا کرے گا دے بھگتوں کو دان
کہنا میرا مان دِوانے کہنا میرا مان

اس پر کسی نے کہا تھا:۔

"لے دِوانہ ہوگا تو تیرا باپ!"

ساتھ ہی ایک پرانے استاد بیچ مجمع کے کھڑے ہو کر چیخے تھے

"اور صاحب زادے، دِوانے کی تی کہاں گئی؟"

چاروں طرف سے آوازیں آئی تھیں 'بیٹھ جاؤ' 'بیٹھ جاؤ'۔

"کیسے بیٹھ جائیں" استاد تڑخے تھے "الیکشن کا مطلب یہ تو نہیں کہ زبان و ادب کا ستیاناس کیا جائے۔ دوانے کی تی لاؤ۔"

فوراً ہی کچھ اور لوگوں نے شور و شر شروع کر دیا تھا لیکن یہ فتنہ جلد ہی دب گیا جب چھیدا پہلوان کی سرکردگی میں ایک درجن کے قریب سورما گرجتے ہوئے بڑھے۔

"ہم دیں گے تجھے ی"

"ککڑو نمبے کدھر گیا۔ سنبھال بڈھے کو"

"ابے ٹانگ کھینچ لے۔"

"گدی پہ ہاتھ دے۔"

وغیر ذلک

ثابت ہوا کہ استاد موصوف فاختہ کے نشان والے امیدوار کے دھڑے کے آدمی تھے۔ شاگردوں سمیت آئے تھے، لیکن ادھر والوں نے تو تین درجن "والنٹیر" ناکوں پر لگا رکھے تھے۔ نتیجہ یہ کہ جلسہ کامیاب رہا۔ فلک صاحب کی پتلی گردن میں اتنے ہار پڑے کہ ناک ناف سے جا ملی۔ تب سے اب تک یہ عالم ہے کہ جب بھی نظر آتے ہیں رکوع کیے نظر آتے ہیں۔

تو جناب میں کیوں نہ ابھی سے نظمیں تیار کرنی شروع کر دوں۔ دس پانچ خود پڑھوں گا۔ دس پانچ بانٹ دوں گا۔ چالیس ہزار میں سے کم سے کم پانچ ہزار تو نظموں کے حصے میں آنے ہی چاہئیں۔

گھر لوٹا تو کھانا سامنے رکھتے ہوئے بیوی نے کہا:۔

"کپڑے والا حساب لیکے آیا تھا تقاضا کر رہا تھا۔"

"کوئی بات نہیں کل نمٹا دوں گا۔"

"دودھ والے نے بھی لڑکا بھیج کے کہلوایا تھا کہ حساب کے علاوہ اگر سو پچاس اور دیدو تو احسان ہوگا میں بھینس خرید رہا ہوں۔"

"ہاں ہاں کیا حرج ہے۔ ۔ ۔ ۔ بچارہ بھلا آدمی ہے۔"

"دھوبن بھی آئی تھی۔ تین دفعہ کی دھلائی ہے۔ صبح آنے کو کہہ گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے بھی تو آخر ضرورت ہوگی۔"

"خالو آبا نے بھی اپنے پیسے مانگ کے بھیجے تھے۔ ۔ ۔"

"بے شک۔ ان کا بھی آخر کیا قصور ہے، دو مہینے ہو گئے۔ چلو اب انشاء اللہ یہ سارے پاپ کٹ جائیں گے۔"

بیوی نے کڑی نظروں سے گھورا" وہ شاید ان غیر متوقع

جوابات سے بدک گئی تھیں۔

"آپ کو تو بس مذاق سوجھتے ہیں۔ میں کس کس کو ٹلاتی جاؤں۔"

"ارے مذاق سے کیا مطلب ــــ بھاگوان میں جتنا سنجیدہ اس وقت ہوں اتنا تو شاید اپنے جنازے پہ بھی نہیں ہوں گا۔"

"ہٹو.... تم سے کون سر مارے۔"

"تو سچ مچ جناب مذاق ہی سمجھ رہی ہیں۔ لاحول ولا۔ لو دیکھو۔"

میں نے جیب سے وہی نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھائے انھوں نے نظروں ہی نظروں میں انھیں گنا اور منہ بسور کے بولیں:۔

"یہ تو بس تیس ہی ہیں۔ اکیلے کپڑے ہی والے کے اُنتیس روپے چھ آنے چاہئیں۔"

"کیا حرج ہے۔ یہ تو فقط ایڈوانس ہے۔ ضرب کا فارمولا انھیں تین سو، تین ہزار بھی بنا سکتا ہے۔"

"کیا نہ ٹھیک تھا۔ یہ تو تین لاکھ بنیں گے۔"

"خیر اتنے تو نہیں۔ سیٹھ نے کل ہی چالیس ہزار بُک کئے ہیں۔"

"بس ہٹو۔ تم ضرور ایک دن گھر بار نیلام کراؤ گے۔ میں تو صبح ممانی اتّو کے یہاں جا رہی ہوں۔ تم جانو تمھارا کام۔"

"اچھا ہے چلی جاؤ۔ پرسوں تیج درے کے عرس میں پونا والی گلابو کی ٹولی آ رہی ہے۔ صوفی برقان سر ہو رہے تھے کہ اپنے یہاں ٹھیرا لو۔ میں کیسے ہاں کہتا۔ اب اپنی عدم موجودگی میں تو تمھیں اعتراض نہ ہوگا؟"

ان کا پارہ چڑھ گیا۔

"اے ہے.... رنڈیوں کو میرے گھر ٹھیراؤ گے...."

"آ ررر.... زبان سنبھال کے ــــ رنڈی کہتی ہو۔ زنانِ عاشقانِ اولیاء۔"

"جھاڑو پھر جائے.... رنڈی رنڈی رنڈی ہزار دفعہ کہوں گی۔"

"کافر ہو جاؤ گی...."

"کافر ہوں گے رنڈیوں کے لگے سگے۔ یہاں کسی گلابو پلابو کا سایہ بھی آ لے...."

"میں نے تو اسی لئے صوفی صاحب سے ہنکارہ نہیں بھرا تھا۔ اب تم جا ہی رہی ہو تو سوچا کیا حرج ہے...."

"جائے مری جوتی.... بڑے آئے بھیجنے والے۔ جاؤں گی مگر ممانی کے نہیں صوفی کوفی کے گھر جاؤں گی۔ انھوں نے ہی تمھیں بگاڑا ہے۔ وہ سناؤں گی کہ یاد کریں گے۔"

"لے وہاں مت جانا۔ فاتحہ کے گلدانے کھلا دیئے تو مرغی بن کے کُڑکو گی۔"

"بہت کُڑکی.... دیکھو جان نہ جلاؤ۔ یہ روپے بھی اگر صوفی ہی جی سے لائے ہو تو انھی کے منہ پہ مارو۔ مجھے نہیں چاہئیں۔"

"لایا تو انھیں سے تھا ــــ کہہ رہے تھے اگر گلابو کی ٹولی کو ٹھیرا کے میزبانی سنبھال لو تو سو روپے اور دوں گا...."

"سو جوتے ماروں گی رنڈی کے منہ پہ۔ تمھیں شرم نہیں آتی ایسی حرّافاؤں کا نام منھ سے نکالتے.... ہمیں نہیں چاہئیں روپے دوپے یہ تیس بھی تم نے رکھے تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

"دھمکی دیتی ہو!"

"کیوں نہ دوں گی۔ اللہ اور رسول نے کہاں بتایا ہے کہ رنڈیوں کے پیچھے پھرا کرو۔"

"پھر وہی رنڈی۔ بادا ان کا شرعی نام زنانِ عاشقانِ اولیاء ہے۔"

"آپ کی زبان پہ اللہ میاں انگارے رکھیں گے ولیوں کا مذاق بناتے ہیں...."

"اور سنو۔ میں بناتا ہوں مذاق۔ یہ نام تو صوفیوں کے وظیفوں میں داخل ہے۔ خیر چھوڑو۔ روپے واپس کرا رہی ہو تو قرض خواہوں سے کیسے نبٹو گی؟"

"نبٹ لوں گی میں۔ آپ واپس کر آئیے۔"

"آخر پھر بھی؟"

"بھیا خدا رکھے مر نہیں گئے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں یہ کارخانہ بس آپ ہی کی تنخواہ سے چل رہا ہے۔"

"ہائیں.... اور نہیں تو کیا؟" میں اُچھل پڑا۔

"منھ دھو رکھئے۔ سو روپے میں کہیں گذارے چلتے ہیں۔"

"تو پھر؟"

"پھر.. پھر یہ کہ انھوں نے منع کر دیا تھا آپ سے نہ کہوں ــــ ہائے اللہ میں نے تو کہہ بھی دیا.... اجی کچھ نہیں آپ صوفی ٹوفی کے رو

واپس کر آئیے اللہ ہمارا انتظام کرے گا۔"

"ہوں.... یہ قصے ہیں.... تمہارا مطلب بھیا سے ایڈیٹر تجلی ہی ہیں نا؟"

"اور کون؟ خدا رکھے ان کے سوا مرا اور کون بھیا ہے۔"

"بات تو کھول ہی چکیں، ذرا تفصیل بھی بتاؤ۔"

"وہ خفا ہوں گے...."

"ہوں گے تو ہولیں گے — کیا فرق پڑتا ہے — جبھی تو میں کہوں ایک دفعہ تم نے لڑ بھڑ کے تنخواہ میرے سر ڈالدی تھی تو دو دن ہی تاریخ کو سلفہ کیوں اڑ گیا تھا۔"

وہ کھلکھلا کے ہنسیں۔ ان کی ہنسی بہت دنوں بعد ایسی لگی جیسے کانسی کی تھالی میں چاندی کے روپے جھنجھنا اٹھے ہوں۔

"آپ سے تو غصہ بھی کرنا مشکل ہے۔ بھلا سلفہ اڑنا کیا ہوتا ہے۔"

"ارے وہی۔ پیسے خلاص اور مہینے کے سولہ دن باقی۔ بلکہ وہ تو وہی اخبث مہینہ تھا، اکتیس کا —"

وہ پھر ہنسیں۔ میرے خدا آج تو ان کی ہنسی اتنی ہی دلکش تھی جتنی شادی کے مہینے دو مہینے بعد تک محسوس ہوتی رہی تھی۔

"تلاوت...." میں نے ٹوکا "میں تمہارے بھیا کی بات پوچھتا ہوں۔"

"بات کونسی لمبی ہے۔ پار سال میں اور بھابی اپنی گھر گرہستی کی بات کر رہے تھے کہ بھیا نے بھی سن لیا۔ کہنے لگے کہ دیکھ شمیمہ تیرا میاں تو ہے.... گ.... گ...."

"گدھا" — میں نے لفظ پورا کر دیا۔ وہ جنابہ ذرا ادا کرتے شرما رہی تھیں۔

"جی ہاں — یہی انھوں نے فرمایا تھا۔ تو کہنے لگے اسکی تنخواہ بڑھانے کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے فرعون بنا دیا جائے۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے تم نہیں سمجھوگی۔ تم تو بس یہ کیا کرو کہ جو قرضے استطاعت سے باہر ہو جائیں ان کی فہرست اپنی بھابی کے ہاتھ مجھے بھیجدیا کرو — مگر اس گدھے پر ظاہر نہ کرنا، بلکہ وقتاً فوقتاً جتاتی رہنا کہ گذر نہیں ہو رہا ہے، فلاں کا قرضہ دینا ہے وغیرہ۔"

"وہ مارا" — میں نے فرطِ جوش میں نعرہ لگایا۔ اس نعرے کی صحیح اہمیت آپ جبھی سمجھ سکتے ہیں کہ میم پر تشدید لگا کر واؤ کو میم سے ملادیں اور زور سے دہرائیں "وُمّارا"

خیر یہ تو سب ہوا — لیکن خلافت نمبر کا پرابلم جوں کا توں باقی تھا۔ رات کے بارہ بجے تک غور کرتا رہا کیا لکھوں، لیکن شاید دماغ کا فنری ٹوٹ گیا تھا کہ گاڑی چل ہی کے نہیں دے رہی تھی۔

صبح ناشتہ میں بیوی صاحبہ وہی ایک انڈا اور ایک چائے لائیں تو بے اختیار زبان سے نکل گیا۔

"بیگم۔ دماغ بالکل چھوارہ ہوگیا ہے۔ ناشتے میں ایک چھٹانک مکھن اور دو چار پھل تو ہونے ہی چاہئیں۔"

"ڈالئے کہیں ڈاکہ — یہ انڈا بھی اب ڈھائی آنے کا ہوگیا ہے —"

"تو کیا ہوا۔ فیض اینڈ کو کی بیکری میں انڈا توس مکھن سب ملتے ہیں۔ نیاز و پھل والا بھی اُدھار کو انکار نہیں کرے گا — دیکھو شوہر کے حقوق شریعت میں بہت آئے ہیں۔"

میری آواز میں بے کسی اور التجا تھی۔ وہ پھر ہنسیں مگر اس وقت یہ ہنسی اچھی نہیں لگی۔

"تم ہنستی ہو — حالانکہ رونا چاہئے۔ بخدا اگر خلافت نمبر کے لئے کچھ نہ لکھا گیا تو تمہارا بھائی مار ڈالے گا۔"

"بہت مارا — اتنے سالوں سے پھل اور مکھن ہی کھا کر لکھتے رہے نا؟"

"اجی اسی لئے تو دماغ کی چربی نکل گئی۔ کل ڈاکٹر کو دکھایا تھا اس نے بتایا کہ تمہارے اندر اے سے لیکر زیڈ تک کوئی بھی وٹامن باقی نہیں ہے۔ پھل اور مکھن کھاؤ نہیں تو بھسم ہوجاؤ گے۔"

"تو ڈاکٹر ہی سے کہا ہوتا اپنے یہاں تین چار سو روپے مہینہ پر کمپاؤنڈر رکھ لے۔ سو روپے میں تو گاجر مولی بھی مشکل سے ملتی ہے۔"

"اب نوبت۔ بھلا تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ مہینے کے مہینے حساب بھائی کو پکڑا دیا کرنا۔"

"جی ہاں مذاق ہی ہوگیا حساب پکڑانا۔ بھیا بھی تو آخر بال بچے دار ہیں۔"

اچانک دروازے پر کسی نے ہانک لگائی:—

"ملّا صاحب!" — ظالم نے "صاحب" اس طرح کھینچ کر کہا تھا

کہ جان ہی نکل گئی۔ نکلنی ہی تھی۔ یہ کاتب صاحب کے سوا کون ہوسکتا تھا۔ ڈرتا سہمتا باہر گیا۔ ان کے ایک ہاتھ میں قلم، ان دوسرے ہاتھ میں لاٹھی نما بینت تھی۔ میں نے بڑی کوشش سے منھ کو ایسا بنالیا تھا جیسے دو سال سے دق میں مبتلا ہوں۔ سینے کو دبا کے کھانسا، غرغرا کے آہ بھری، پھر کانپتی ہوئی آواز میں عرض کیا:-

"بھائی ۔۔۔ میرا کہا سنا معاف کرنا ۔۔۔ رات ڈبل نمونیا کا حملہ ہوا ہے۔ ابھی تک خطرے سے باہر نہیں ہوں۔"

"اوہ" وہ بیچارے گھبرا گئے "آپ اٹھ کیوں آئے ۔۔ ۔۔ آرام فرمائیے میں ابھی ایڈیٹر صاحب سے کہہ کر ڈاکٹر بھجواتا ہوں ۔۔۔"

"نہ ۔۔۔ نا۔ خدا کے لئے ڈاکٹر نہیں میں فرنگی دواؤں پر لعنت بھیجتا ہوں"

"تو حکیم شریف صاحب کو بلا لاتا ہوں ۔۔۔"

"او نہیں ۔۔۔ اب دوا کا نہیں دعا کا وقت ہے"

انھوں نے مشتبہ نظروں سے گھورا۔ در اصل آخری جملہ کہتے ہوئے میری آواز اپنے اصلی کڑاکے پہ آگئی تھی۔ میں اس گھبراہٹ میں کہ وہ ڈاکٹر حکیم کو نہ چڑھالائیں ایکٹنگ ہی بھول گیا تھا۔ ہاتھ سینے سے گر کر پیٹ پہ ڈھلک آئے تھے۔

"آپ تو پیٹ پکڑ رہے ہیں" انھوں نے مشکوک لہجے میں سوال کیا تھا۔

"اررر ۔۔۔ آہ ۔۔۔ بات یہ ہے اس کم بخت نمونیے میں دل نیچے کی طرف دوڑتا ہے۔ بس ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے ۔۔۔ جیسے۔ سینہ خالی، آنکھیں ویران دل کی حالت کیا کہئے ۔۔۔"

وہ شاید اصلیت بھانپ گئے۔

"تو میں ایڈیٹر صاحب سے کہے دیتا ہوں کہ مضمون نہیں ملا"

وہ لوٹنے لگے۔

"ہاں ہاں ۔۔۔ کہہ دو ۔۔۔ کہہ ۔۔۔ مگر ادھر سنو تو ۔۔۔ اماں کیا غضب کر رہے ہو ۔۔۔ تم بھی یار دشمن ہی نکلے — دیکھو نمونیے کے تو مارو گولی۔ اب دفتر جانے کی بجائے دو چار گھنٹے ادھر ادھر ٹہل آؤ۔ میں کچھ نہ کچھ لکھ کے رکھتا ہوں۔ تھوڑا لے لینا پھر آگے دیدوں گا"

"ایڈیٹر صاحب تو میرے انتظار میں ہوں گے۔ انھوں ہی نے کہا تھا کہ نہ لکھا ہو تو یہ بینت سر پہ مارنا۔"

"اجی کیا کہنے تھے آپ کے ۔۔۔۔ ابھی گردن توڑ کے ہاتھ میں دیدوں گا ۔۔۔ اور اماں نہیں۔ لو تم مار لو۔ خدا کے لئے ہلکے ہلکے ایک دو مار لو۔ پھر تو دفتر نہیں جاؤ گے؟"

"جیسی آپ کی مرضی"

اس فقرے کا کیا مطلب تھا — یہ سمجھنے کے لئے مجھے تمام باطنی قوتوں کو آنکھوں میں سمیٹ لانا پڑا۔ ہوسکتا تھا وہ اجازت کو مرضی سمجھ کر ایک دو جڑ ہی دیں۔ اسی لئے سراپا نگاہ بن کر ایک ایک آنکھ سے ان کے ہاتھ اور ایک آنکھ سے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس وقت منکشف ہوا کہ اللہ نے دو آنکھیں کیوں دی ہیں۔

خیر وہ سعادت مند نکلے اور حماقت کئے بغیر چلے گئے۔

اب میرے لئے دو ہی راستے تھے۔ یا کاتب کا منھ جھلسیں یا وصیت لکھ کے کفن پہن لوں — مگر وصیت میں بھی تو قلم ہی چلانا ہوگا۔ اس سے بہتر ہے کہ الیکشن پر نظم ہی کیوں نہ لکھ ڈالوں۔

پس اے تجلی کے ناظرینو! عام اس سے کہ تم صنف لطیف ہو یا جنس کثیف مضمون کے لئے تو مجھے معاف کرو۔ ہاں نظم حاضر ہے۔ اس میں مزا نہ آئے تو اپنی قسمت پر آنسو بہانا۔ مزا آجائے تو خواجہ کھڑے بڑے رحمۃ اللہ علیہ کے روضے پر چادر چڑھا کے عرض کرنا کہ ملا کو عمر نوح عطا فرمائیے ۔۔۔۔ مگر ہاں طوفان نہیں آنا چاہئے۔!

نظم اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے

کہ

عنوان ہے اس کا بفضلہٖ تعالیٰ

"الیکشن"

(ملا زندہ صحبت باقی)

الیکشن

اسے پڑھنے سے پہلے "مسجد سے میخانے تک" ضرور پڑھئے تاکہ شانِ نزول سے بے خبر نہ رہیں۔　　ملا ابن العرب مکی

مجھ سے اے دوست الیکشن کی حکایت مت پوچھ
کیا گذر جاتی ہے دو دن میں قیامت مت پوچھ

یہ الیکشن کے مجاہد، یہ خطیبانِ کرام　　قوم کے عشق میں ہے جن کے لئے چین حرام
جنکے ہونٹوں پہ ہیں اصلاح کے اونچے دعوے　　کھائے جاتی ہے جنھیں حبِّ وطن، فکرِ عوام

ان کی تولید کا موسم ہے الیکشن اے دوست
فصلِ حب الوطنی، عشق کا سیزن اے دوست

لے وہ تیار ہیں، عدوں کے فلک بوس محل　　لے وہ انصاف برسنے کو ہے، گرجے بادل
لے وہ بیکاری و افلاس نے دم توڑ دیا　　لے وہ لہرائے نئی صبح کے رنگیں آنچل

امن برسنے کو ہے غربت کے شبستانوں میں
جھونپڑے سارے بدل جائیں گے ایوانوں میں

چار سمتوں سے اٹھا اپنی ہی تعریف کا غل　　باتوں باتوں میں بندھے خدمت و ایثار کے پل
لومڑی صاف یہ کہتی ہے کہ ہوں شیرِ ببر　　اور زاغوں کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم ہیں بلبل

قوم کے درد سے پھٹتے ہیں کلیجے کتنے
غم کی بھٹی میں تپے جاتے ہیں بھیجے کتنے

جن بچاروں کو کبھی غم سے سروکار نہ تھا　　جن کے کاندھوں پہ شفقت کا کوئی بار نہ تھا
بال بچوں کے لئے رزق کمانے کے سوا　　جن کے حصے میں جہاں کا کوئی آزار نہ تھا

آج وہ درد کی تصویر بنے پھرتے ہیں
ملک اور قوم کی تقدیر بنے پھرتے ہیں

عمر بھر جن کو رہی خدمتِ انسان سے لاگ　　نہ جلی جنکے دلوں میں کبھی احساس کی آگ
جن کے کردار کی پستی نے ہمیشہ لوٹا　　رحم و انصاف و رواداری و مذہب کا سہاگ

آج دعوے ہے انھیں صاحبِ کردار ہیں ہم
لیلیِ قوم کی الفت میں گرفتار ہیں ہم

جن کے ہر فکر کا محور تھے فقط کام و دہن   جنکے جسموں کو گراں ہوتے تھے بستر کے شکن
فرشِ مخمل کے سوا اور کہیں چلنے سے   جنکے تلووں میں بڑے زور کی ہوتی تھی چبھن
آج سڑکوں پہ وہ پیدل ہی چلے جاتے ہیں
آتشِ جذبۂ خدمت سے جلے جاتے ہیں

ہائے یہ پھول سے چہروں پہ غمِ قوم کی گرد   اُف یہ بارِ غمِ خدمت سے لچکتے ہوئے مرد
ہائے یہ قوم کے دُکھ درد کا تلاطم احساس   ہائے بیتاب نگاہوں میں یہ افسانۂ درد
کچھ نہ پوچھو کہ بڑی سخت گھڑی آئی ہے
آج ناگفتہ بہت حال تمنائی ہے

جس نے جتنا بھی کیا مکر کا طومار بہم   لے گیا چھین کے وہ فتح کا زرّیں پرچم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالان   طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم
دُکھ پڑوسی کا بھی کل تک جسے معلوم نہ تھا
خیر سے آج نمائندۂ جمہور ہوا

آکے اسٹیج پہ ہر شیشہ گرِ لفظ و بیاں   بن گیا وقت کا بقراط، حکیمِ دوراں
طنطنہ ایسا کہ ڈالے گا ستاروں پہ کمند   ایسے دعوے کہ الٹ دے گا بساطِ امکاں
میں نے ہر مردِ الیکشن کو زبسکہ دیکھا
رستم و لینن و سقراط و ارسطو دیکھا

دوڑتے دوڑتے پیروں میں پڑے ہیں چھالے   قوم کے عشق میں سارے ہی جتن کر ڈالے
ووٹ اور نوٹ میں کچھ فرق نہیں ہے ایسا   صرف اک حرف بدلتے ہیں بدلنے والے
ایک ہی چیز سیاست بھی تجارت بھی ہے
مفتیِ وقت یہ کہتا ہے عبادت بھی ہے

سچ تو یہ ہے کہ بڑی جنس گراں ہے کُرسی   عقل و دانائی و حکمت کا نشاں ہے کُرسی
متفق اس پہ ہیں سب مسلم و ہندو مُلّا   جنتِ دیدہ و دل راحتِ جاں ہے کُرسی
مکر سے جبر سے جیسے بھی ملے لے بھاگو
دام اس جنس کے جو کچھ بھی لگیں دے بھاگو

لوگ کہتے ہیں کہ روٹی جو نہیں کچھ بھی نہیں   دال بازار میں سستی جو نہیں کچھ بھی نہیں
ہے مگر قوم کے لیڈر کا یہ ارشادِ عظیم   اپنی تقدیر میں کُرسی جو نہیں کچھ بھی نہیں
جھوٹ، بہتان، دغا، وعدہ خلافی کیا ہے
قوم سے عشق ہے اور عشق میں سب چلتا ہے

[illegible] مولانا اشرف علیؒ [illegible] کا خاص [illegible] قیمت [illegible]

خلافتِ معاویہؓ ویزید

کے دوسرے ایڈیشن پر

فاضل مؤلف جناب محمود احمد عباسی کا مقدمہ



پہلا ایڈیشن صرف ایک ہزار طبع ہوا تھا، اس وقت ناشر کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دو ڈھائی مہینے کے قلیل عرصہ میں یہ ایڈیشن ختم ہو جائے گا اور مانگ برابر بڑھتی رہے گی حتیٰ کہ بعض شائقین ٹیلیگرام بھیجکر کتاب کے نسخے طلب کریں گے اور کتنے ہی آرڈر دوسرے ایڈیشن کی طباعت تک ملتوی کرنے ہونگے کتاب کی اس عام مقبولیت کا راز فی الحقیقت اس امر واقعہ میں مضمر ہے اور جو موجب صد طمانیت و مسرت ہے کہ ملّت کی نشأۃ ثانیہ (renaissance) کے موجودہ دور میں روایت پرستی، توہمات اور شخصیت پرستی کے ہزار سالہ بندھنوں سے افراد ملّت کے فکر و نظر کو بالآخر چھٹکارا ملنے لگا ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ کو فکر صحیح کی توفیق۔ راقم الحروف کو پاکستان و بھارت سے جو خطوط روزانہ ڈاک سے موصول ہوتے ہیں ان سے بخوبی واضح ہے کہ اسلامی تاریخ کے بعض مستور گوشوں کے بے نقاب ہو کر حقیقتِ حال کا انکشاف ہو جانے کا ملّت کے ہوشمند طبقے نے کس خوشدلی سے خیر مقدم کیا ہے۔ کتاب کے جو چند نسخے تبصرے کے لئے بھیجے گئے تھے ان پر اب تک دو چار ہی تبصرے ہوئے ہیں۔ ماہنامہ "تجلّی" کے فاضل مدیر مولانا عامر عثمانی نے ماہ جولائی کے شمارہ میں کتاب پر جو تبصرہ کیا ہے وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"کتابیں روز لکھی جاتی ہیں لیکن زیر نظر کتاب ان کتابوں میں ہے جو صدیوں میں ایک آدھ لکھی جا سکتی ہے فاضل مصنّف جناب محمود احمد عباسی نے انتہائی دیدہ ریزی اور تلاش و تحقیق کے بعد "خلافتِ معاویہ ویزید" کے بارے میں وہ فرید و وحید مواد پیش کیا ہے جس سے ہر انصاف پسند آدمی پر منکشف ہو جاتا ہے کہ حقیقت کیا تھی اور آج کن خرافات و کذبات کو حقیقت کہا جا رہا۔"

"لامتناہی پروپیگنڈے نے (امیر) یزیدؒ کی شخصیت کو جتنا بھیا[نک] [بنایا] حضرت حسینؓ کی شہادت کو جس درجہ مظلومانہ اور دیگر تفصیلا[ت] کو جس قدر ڈرامائی بنا دیا ہے ان کے تعصب سے بلند ہو کر ٹھنڈ[ے] اور تحقیق پسند دل و دماغ سے اگر اس کتاب کا مطالعہ کیا جا[ئے] تو چند جزئیات سے اختلاف کے باوجود یقین ہے کہ من حیث المجموع اس سے اتفاق ہی کرنا ہوگا۔ روایت اور درای[ت] دونوں ہی کے فنی تقاضوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے فاضل مصنف نے مضبوط دلائل پیش کئے ہیں اور بے حد کاوش کے ساتھ ا[یسا] مواد سامنے لائے ہیں جو صدیوں کے پروپیگنڈے اور رافسان[ہ] جذباتیت کی گرد میں اٹی ہوئی "تاریخ کربلا" کا حقیقی چہرہ نکھا[رتا ہے]

جزاھم اللہ خیرا لجزا[ء]

"حاصل تبصرہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو دیانت داری کے ساتھ ا[س] کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ تاریخ کربلا پر تحقیقی زاویے [سے] نگاہ ڈالنے کا موقع میسر آئے اور بعض تاریخی شخصیتوں کے متعل[ق] غالی تصورات ذہنی وراثت میں ملے ہیں ان کی تنقیح ہو سکے۔ ہم مص[نف] کو ان کی عرق ریزی محنت اور بالغ نظری پر مبارک باد پیش کر[تے ہیں] انشاء اللہ آخرت میں انہیں بہترین اجر ملیگا کیونکہ انہوں نے پیش ک[یا]

تفصیلات سے صرف امیر معاویہؓ ہی نہیں کثیر صحابہ رضوان اللہ علیہم کے دامن کردار کو ہرزہ سراؤں کے دروغ وافتراء کی گرد سے پاک و صاف دکھاتی ہیں اور (امیر) یزیدؒ کے بارے میں جو صحیح معلومات انہوں نے پیش کی ہیں وہ یقیناً امیر معاویہؓ کو اس الزام سے صاف بچا لے جاتی ہیں کہ انہوں نے خلافت کو غلط قسم کی شہنشاہیت میں تبدیل کیا اور نااہل بیٹے کو ولی عہد بنا بیٹھے۔ وَ لِلّٰہِ دَرُّ المصنف"

فاضل تبصرہ نگار نے جس بے بنیاد الزام کا اشارہ مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا معاویہؓ نے خلافت کو غلط قسم کی ... شہنشاہیت میں تبدیل کیا اور نااہل بیٹے کو ولی عہد بنا بیٹھے وہ آج بھی مدعیان علم و فضل کے زبان قلم سے کبھی نہ کبھی دہرایا جاتا ہے اور اموی خلافت کے ان بہترین اور منور ترین ایام کو بدترین اور سیاہ ترین ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک فاطمی عالم صاحب نے جو اپنے آپ کو اہل سنت و الجماعت کا مقتدا اور دین کا پیشوا سمجھتے ہیں یہ باور کرانا چاہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت معاذ اللہ ناکام رہی اور آپ کی اُمت تیس چالیس برس بھی آپؐ کا برپا کردہ نظام آپ کے بعد برقرار نہ رکھ سکی۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے اپنے ماہنامہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے جس پر سبائیوں نے ان کو ہدیۂ تبریک بھی پیش کیا ہو وہ یہ ہے کہ :-

"اموی فرمانرواؤں کی حکومت حقیقت میں خلافت نہ تھی ان کی حکومت اپنی روح میں اسلام کی روح سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس دہم سترق کو ان کی حکومت کے آغاز ہی میں محسوس کر لیا گیا تھا — چنانچہ اس حکومت کے بانی امیر معاویہ کا اپنا قول یہ تھا کہ انا اول الملوك (میں سب سے پہلا بادشاہ ہوں)۔"

ان صاحب کی جرأت کا یہ عالم ہے کہ جمہور صحابۂ کرامؓ کے اجماع کو ہیچ قرار دیکر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا معاویہؓ بدعت کے اولین علمبردار ہیں انہوں نے "جمہوریت" کے بجائے "شخصی" حکومت کی بنیاد ڈال کر اسلام کے سیاسی نظام کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جس جماعت گرامی کو کرامًا بَرَرَةً (عبس) میں شامل فرمایا (یعنی بہت ہی بزرگ و پاکباز گروہ ہیں) اور جن کے متعلق حتماً فرمایا "وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" (ان سب سے اللہ نے حسن سلوک کا وعدہ کیا ہے (حدید ۱۰)) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کے بارے میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ذریعہ ہدایت بنائے، صحابۂ کرامؓ نے جنھیں اپنا متفق علیہ امام مانا اور ان پر اجماع کو اپنا مبارک دور جانا، حضرت حسنؓ و حسینؓ اور دوسرے اکابر اہل بیتؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن جعفر طیارؓ وغیرہم نے جن سے بیعت کی وہ ان صاحب کے نزدیک جمہوریت کُش، ظالم اور مبتدع تھے یعنی خلیفۂ راشد ہونے کے بجائے ملک عضوض کے بانی۔ کاش انھوں نے سوچا ہوتا کہ جن بزرگواروں نے امیر المؤمنین سیدنا معاویہؓ پر اجماع کیا اور انھیں امام مفترض الطاعۃ جانا (یعنی ایسا امام جس کی اطاعت واجب ہو) وہ کس پایہ کے ہیں اور اللہ و رسول اور جمہوریت کے نزدیک ان کا کیا درجہ ہے اسی طرح جن صحابۂ کرامؓ نے امیر المؤمنین یزیدؒ کی ولایت عہد اور پھر دس برس بعد ان کی خلافت پر اجماع کیا وہ کون تھے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ، سیدنا عبد اللہ بن جعفر طیارؓ، سیدنا جابر بن عبد اللہؓ، سیدنا انس بن مالک رضوان اللہ علیہم اور سیکڑوں دیگر صحابہؓ جن کے تذکرے اور تراجم راقم الحروف کی مبسوط کتاب میں درج ہیں ان سب نے امیر المؤمنین یزیدؒ کی ولایت عہد کی منظوری دی اور جو حضرات ان کی خلافت کے وقت زندہ تھے انہوں نے ان کی خلافت و امامت کی تائید و توثیق کی۔ صرف دو حضرات نے جو ان کے خلاف کھڑے ہوئے ان کا ساتھ نہیں دیا اور ان کے اقدامات کو درست نہ سمجھا۔

کاش ان صاحب نے مغربی جمہوریت ہی کی لچک پر غور کر لیا ہوتا کہ فرانس، امریکہ اور انگلستان کا نظام سیاسی اپنے بنیادی اختلاف اور عملی تفاوت کے باوجود ساری دنیا کے نزدیک جمہوری کہلاتا ہے جب لفظ جمہوریت کی خود اس لفظ کی پاسداری کرنے والوں کے نزدیک اتنی صورتیں ہو سکتی ہیں تو مسلمانوں کے عملی نظام کے مختلف صورتیں کیوں نہیں ہو سکتیں؟

کیا یہ صاحب کہہ سکتے ہیں کہ حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبرؓ سے لے کر حضرت علیؓ تک خلیفہ کے برسر اقتدار آنے کا ایک ہی دستور تھا؟ انھیں یہ نظر آتا ہے یا نہیں کہ ہر ایک صاحب بالکل نئے طریقے پر سریر آرائے خلافت

ہوئے۔ اور جس جمہوریت کا نام لیا جاتا ہے اس کے مطابق ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی استصواب رائے عامہ نہیں ہوا۔ امیر المؤمنین عثمان ذوالنورینؓ کے متعلق رائے شماری البتہ ہوئی تھی۔ لیکن صرف اہل مدینہ کی۔ باقی عالم اسلام سے قطعاً کچھ دریافت نہیں کیا گیا۔

اسلامی تاریخ میں اگر کوئی شخص ہے جس کا انتخاب بالکل پہلی بار امت کے عام استصواب سے ہوا تو وہ امیر المؤمنین یزیدؒ ہیں اس کے بعد غور طلب ہے کہ حضرت خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر المؤمنین فاروق اعظمؓ کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنایا، اور قطعاً کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ اس تقرر کی تمام ذمہ داری آپ نے اپنے اوپر لی۔ اب اگر دنیا کے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کی طرح آپ بھی موت کے منہ اور چنگل سے نکل آتے اور زندہ رہتے تو کیا حضرت فاروق اعظمؓ سے ولایت عہد کا یہ عہدہ چھین لیا جاتا؟

اب دیکھنا چاہیے کہ امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب امیر یزیدؒ کو ولی عہد مقرر فرمایا تو اپنی مرضی سے نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کے مشورے سے۔ پھر اس مشورہ کو جب آپ نے من وجہ قبول فرما لیا تو دوبارہ اسے عالم اسلام کے نمائندہ وفود کے سامنے پیش کیا۔ لیکن ان کی اکثریت کے فیصلے کے باوجود مطمئن نہیں ہوئے جب تک کہ اہل مدینہ کی بھاری اکثریت نے تائید نہ کر دی حالانکہ حضرت علیؓ کے وقت سے اہل مدینہ ارباب حل وعقد نہیں رہے تھے۔

پھر کیسی عجیب بات ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کا تقرر تو جمہوری سمجھا جائے اور علیٰ منہاج النبوۃ، لیکن امیر المؤمنین یزیدؒ کا تقرر، صحابہ کرام کے اس زبردست اجماع کے باوجود غیر جمہوری اور بدعت سیئہ قرار دیا جائے، محض اسلئے کہ وہ خلیفۂ سابق کے دوست اور رفیق نہیں ہیں، فرزند ہیں۔

اب دریافت طلب ہے کہ "الحمد" سے لے کر "والناس" تک اور موطا سے لے کر ابن ماجہ تک وہ کون سی آیت اور کون سی حدیث ہے جس میں باپ کے بعد بیٹے کی خلافت کی حرمت یا کراہت کا ادنیٰ شائبہ بھی ثابت کیا جا سکے۔

پھر آیت مبارکہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (ان کے مسائل باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔)

اس آیت کو بڑے اہتمام سے موقع بے موقع پیش کیا جاتا ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ مریض کے بارے میں انجینئر سے، آب پاشی کے نظام کے سلسلے میں خانقاہ نشین سے، صحت عامہ کے بارے میں کمانڈر فوج سے، اور عدلیہ کے متعلق تاجر سے مشورہ کرنے والا شخص عقلمند سمجھا جائے گا یا احمق؟

اگر امرھم شوریٰ بینھم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر کس و ناکس سے بات کی جائے، وہ اہل ہو یا نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ امور سیاسی میں اصحاب سیاست اور ارباب حل وعقد ہی سے مشورہ کیا جائیگا اور انہیں کی بات سنی اور مانی جائے گی۔

سیدھی اور صاف راہ جس پر بے غل وغش چلا جا سکتا ہے اور جو ہمیشہ موجب فلاح ہوگی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مہاجر وانصار اصحابؓ کی راہ ہے جنھوں نے جان و مال کی بازی لگا کر دین قائم کرنے کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور سخت سے سخت آزمائش میں بھی ثابت قدم رہے۔ یہی مہاجر وانصار رضی اللہ عنہم خدا اور بندوں کے نزدیک علمبرداران دعوتِ محمدیہ کے پیشوا ہیں حقائق دینیہ کے جزئیات وکلیات سب انہی پر کھلے اور دین کی تمام برکتوں کا نزول انہی کے قلوب پر ہوا۔ انہی کے طریقے پر چلنے سے سکینہ نازل ہوتا ہے اور رشد و ہدایت کی راہ ملتی ہے۔

گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے والے، دروغ گو، باطل پرست، ہوا و ہوس کے بندے اور ناقابل اعتبار لوگوں کی بیان کردہ باتوں پر توجہ کرنا سخت خطرناک ہے، بے وجہ صلحا کی عزت وحرمت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور آدمی دنیا وآخرت کا عذاب مفت میں سمیٹتا ہے۔

دین کے برپا کرنے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی اچھی طرح اپنی دعوت کی کنہ وحقیقت سمجھتے ہیں۔ آپ کی سنت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں نجات ہے اگر آپ بعض [illegible]ں کی خواہشات کی پذیرائی فرماتے تو یہ امت قسم قسم کی مشکلات میں مبتلا ہو جاتی۔ اگر آپ نے لگا بندھا کوئی سیاسی نظام اس امت کو عطا فرمایا ہوتا تو اس کے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے، اور سر مو اس سے تجاوز کی گنجائش نہ رہتی لیکن چونکہ آپ کی دعوت متحرک و فعال اور ترقی کناں دعوت ہے اور آپ کی امت قیدِ زمانی و مکانی سے آزاد ہے۔ نسل اور وطن کا

بیڑیاں کاٹ کر، زبان اور ذہن کے طوق اتار کر آپ نے اسے انتہائی آزادی عطا فرمائی ہے، اس لئے نہ وہ کسی خاندان سے وفاداری و وابستگی کی مکلف ہے اور نہ کسی کی ذات سے اسے چند لچک دار، موزوں اور اصیل اصول عطا ہوئے ہیں۔ جنھیں ہر زمانے میں اور زمین کے ہر خطہ پر وہ اپنی صوابدید کے مطابق، اپنے حالات کے تحت اپنے مفاد کے پیش نظر اور اپنی مصلحتوں کو سمجھ کر عملی جامہ پہنانے کی مجاز ہے جس عہد کے مسلمان جس سیاسی نظام کی تشکیل کریں گے وہ سیاسی نظام عند اللہ و الناس مقبول ہوگا بشرطیکہ تقاضہا ئے دعوت محفوظ رہیں جو محض یہ ہیں: اقامت صلوٰۃ یعنی مساجد کی تنظیم اور باقاعدہ سرکاری طور پر جماعت کا قیام (۲) زکوٰۃ کی وصولی اور احکام کے مطابق اسے کام میں لینا (۳) اچھی باتوں کے حکم اور بری باتوں سے روکنے کا سرکاری انتظام کرنا۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ (الحج: ۴۱)

(ان لوگوں کو جب ہم زمین پر حکمرانی عطا فرماتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ان اچھائیوں کا حکم دیتے ہیں جن کی خوبی عیاں ہے ان برائیوں سے روکتے ہیں جن کی شناخت ظاہر ہے اور اللہ ہی کے ہاتھ میں تمام امور کی انجام دہی ہے)

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب کو آزما لیا۔ مہاجرین اور انصار کے سینے اپنے نور اور اپنی معرفت سے بھر دیئے اور ان کا طرز عمل ہمیشہ کے لئے امت کے واسطے مشعل راہ بنا دیا۔

یہ ہے اس امت پر اللہ کا فضل اور اس کی نعمت کہ اپنے کسی مسئلے میں وہ عملی نمونہ سامنے رکھنے سے محروم نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس امت کی تشکیل کی اس کے اولین علمبرداروں نے ایک ایک مسئلہ حل کرنے کی عملی صورتیں پیش کر دی ہیں، اور سب کے سامنے تجربہ کر کے کامیابی کی راہیں دکھا دیں۔ خلافت اور جنگ کے مسائل بھی بتا دیئے، آئینی اور عمرانی امور میں اختلاف کا طریقہ بھی بتا دیا اور صلح و صفائی کے آداب بھی۔ یہ مہاجرین و انصار جو راہ چلیں اور جس امر پر مجتمع ہو جائیں وہی حق و صواب ہے۔

اولٰئک ھم الراشدون۔

اور سب کا ایمان ظنی و اعتباری ہے۔ صرف قوی آثار سے اسے مؤمن باور کیا جاتا ہے لیکن ازواج مطہرات، مہاجرین و انصار خلفائے اسلام، غزاۃ قسطنطنیہ، فاتحین ہند، قاتلین مرتدین۔ مقاتلین روم و شام و فارس کے ایمان کی شہادت اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے۔ اس پر شک کرنے والا اپنے ایمان کی خیر منائے۔

امیر المؤمنین سیدنا معاویہؓ سے یہ قول منسوب کرنا کہ "میں سب سے پہلا بادشاہ ہوں" کذب محض ہے۔ جس روایت سے یہ قول نقل کیا جاتا ہے اس کے اسناد تک منقطع ہیں — پہلا راوی تو مجہول الاسم ہے یعنی "عن شیخ من المدینۃ" (ص۱۳۵ ج۸ البدایۃ والنہایۃ)۔ پھر کیا یہ نسلی تعصب کا کوئی جذبہ ہے یا لاعلمی اور کوتاہ فہمی کا سبب ہے کہ ایک جلیل القدر صحابی سے یہ قول منسوب کیا جاتا ہے۔

اموی خلافت کے تقریباً آخر تک صحابہ کرام کا دور تھا امیر المؤمنین عبد الملکؒ اور ان کے بعد اگرچہ اموی خلیفہ خلفاء سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم طبقے کے اعتبار سے سب کے سب تابعی ہیں اور امیر یزیدؒ بھی لیکن کاروبار خلافت صحابہ کرامؓ چلا رہے تھے والیوں میں، امراء عساکر میں، قضاۃ میں، ارباب شوریٰ میں اور اصحاب تبلیغ و اشاعت میں ہر جگہ صحابہ کرام نظر آتے ہیں۔ یہ خلافت انہی کی خلافت تھی اور تمام اجتماعی نظام انہی کے ہاتھ میں تھا۔

چونکہ ان بزرگوں کی ترقیاں اور ان کے برپا کردہ نظام سیاسی کی برکتیں اہل کفر و نفاق پر شاق تھیں اور ان کے دل اس کے انتہا عروج کا خیال کر کے غیظ و غضب سے بھر جاتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی روایتوں کے ذریعے اس دور کی نورانیت ماند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں اللہ کا فرمان سچ ثابت ہو گیا۔ لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ (تاکہ ان کے سبب کافروں میں غیظ و غضب پیدا کر دے (سورۂ فتح)

یہی مضمون آیت استخلاف میں بھی بیان ہوا ہے :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ -

(نور ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے انھیں یقیناً زمین پر حکومت عطا فرمائیگا۔ ایسے ہی جیسے ان سے پہلے لوگوں کو عطا فرمائی تھی اور یقیناً ان کے لئے ان کا وہی دین برپا کرے گا جو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اور یقیناً وہ ہر خوف کے بعد انہیں امن عطا فرمائے گا، وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرینگے اب بھی کوئی منکر ہو تو یہ لوگ بدراہ ہیں۔

اس آیت نے فیصلہ کر دیا کہ خدائے تعالیٰ نے تکوینی طور پر صلحائے اُمت ہی کو حکومت عطا فرمائی، اور ان کے تحت جو نظام برپا رہا وہ وہی تھا جو اللہ کے ہاں مقبول ہے، ان کی ہر مصیبت کے بعد اس نے انہیں سکون بخشا، ہر فتنہ کے بعد امن نصیب کیا اور ہر مشکل پر انہیں قابو کر دیا۔ ان کی یہ صفت تھی کہ وہ سوائے اللہ کے اور کسی کے آگے گردن نہیں جھکاتے تھے اب جو لوگ اس وعدے کے باوجود دینِ حق قبول کرنے سے منکر ہوے وہ بدراہ ہیں اور جنھوں نے اس الٰہی وعدہ کے باوجود خلافت کے نظام پر نکتہ چینی کی اور اسے غیر صالح بتایا وہ بھی بدراہ ہیں۔

اسلئے راقم الحروف تمام مسلمانوں سے عموماً اور علم تاریخ کے طلبہ سے خصوصاً عرض پرداز ہے کہ صحابہ کرام رضی کے حالات و سیرت پر گفتگو کرتے یا اسلامی تاریخ مرتب کرتے وقت کتاب و سنت کے مقرر کردہ آداب کی پابندی کریں۔ دشمنانِ دعوت کی مفتریات و تلبیسات سے بے اعتنائی برتیں۔

عدل و تقوے و تحقیق کا طریقہ یہ ہے کہ روایات سے قطع نظر کر کے صرف واقعات کا احصار کیا جائے اور روایات کو یا تو محدثین کرام کے اُصول پر جانچا جائے یعنی روایتاً یا عہد حاضر میں درایت کی جو تکنیک ہے اس پر پرکھا جائے اور اگر فقہائے اسلام کی راہ اختیار کی جائے تو سب سے اچھی کہ روایتاً اور درایتاً دونوں طرح سے بات کی تحقیق کی جائے۔

تاریخ کا منشا، روایات کا انبار لگانا نہیں اور نہ یہ جو طبری، واقدی، مسعودی اور سیوطی وغیرہ نے اختیار کیا کہ جو روایت جہاں سے ملی ٹانک دی۔ قرآن مجید کے مطابق تاریخ نام ہے ترتیب زمانی کے ساتھ واقعات کی تدوین کا۔ اور واقعات بھی جو اخلاف کے لئے موجب عبرت ہوں تاکہ حق کے ساتھ بزرگان پیشین کی پیروی کریں اور حق کے ساتھ ان کی غلطیوں سے بچیں۔ یعنی جس طرح اللہ نے فرمایا ہے اسی کی پیروی میں مورخ کہہ سکے بلکہ اسے کہنا ہی چاہیے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ؕ

(یوسفؑ ۱۱۱)

ترتیب زمانی کے ساتھ ان کے واقعات کی روئداد عقلمندوں کے لئے موجب عبرت ہے، یہ کوئی وضع کردہ جھوٹی بات نہیں بلکہ وہ ہے جس کی توثیق مبرہن محسوس واقعات سے ہوئی ہے اور اس میں ہر تفصیل ہے اور اہل ایمان کے لئے ہدایت و رحمت کے اس میں اسباب ہیں۔

یہی صحابہؓ و تابعین تھے جنھوں نے اپنی مرضی سے اپنی آزاد رائے سے بلا کسی جبر و اکراہ کے امیر المؤمنین یزیدؒ سے بیعت خلافت کی اور اس پر مستقیم رہے۔ اِن عالم صاحب نے جن کا ذکر اوپر ہوا یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر حسینؓ و یزیدؒ کا الیکشن۔ آزادانہ رائے سے ہوتا تو اول الذکر ہی کو ووٹ ملتے اور ثانی الذکر آخری شخص ہوتا جسکو رائے دی جاتی۔ اِن صاحب نے صریحاً واقعات سے چشم پوشی کی ہے الیکشن سے مراد اگر جمہور اُمت کی رائے معلوم کرنے سے ہے تو جیسا عرض کیا گیا مملکتِ اسلامی کے ہر ہر علاقہ میں ان ہی کے نمائندگان کے ذریعے رائے معلوم کی گئی اور بلا کسی جبر و اکراہ کے معلوم کی گئی وہ سب کی سب رائیں امیر یزیدؒ کے حق میں تھیں۔ حضرت حسینؓ کو نہ ولایت

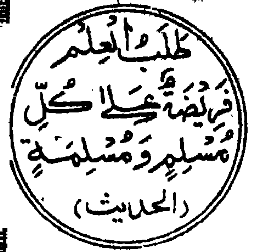
عہد کے وقت اور نہ بیعت خلافت کی توثیق کے وقت ان کے خاندان کا کوئی قابلِ ذکر حصہ ملا اور نہ خود بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے خاندان کے کسی فرد کا کوئی ووٹ حاصل ہوا جیسا کہ اس کتاب میں بالوضاحت بیان ہوا ہے کہ ان کے اپنے عزیزوں میں سے معدودے چند نوجوان حضرات کے علاوہ ان کے اٹھارہ بھائیوں میں سے صرف پانچ نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کے گیارہ بھائیوں نے اقدامِ خروج سے اختلاف کیا اور باوجود دعوت کے کسی طرح ان کا ساتھ نہ دیا۔ صحابہؓ و تابعین کے بارے میں ان صاحب کی یہ سوءِ ظنی حد درجہ قابلِ ملامت ہے کہ ان صحابہ و تابعین نے محض لالچ سے، دھمکی سے یا جبر و اکراہ سے ایک نااہل شخص سے بیعت خلافت کی۔ سبائی راویوں کی مکذوبہ روایتوں پر اعتماد کر لینے اور طبری و مسعودی جیسے مؤرخین کے بیانات کو بغیر تنقید کے باور کر لینے ہی کا یہ سبب ہے کہ ایسے ایسے ذی علم حضرات بھی بدگمانی کا شکار ہو کر صحابہ و تابعین کی طرزِ عمل پر زبانِ طعن دراز کرنے سے اجتناب نہیں کرتے۔

یہ کتاب ابتدائے عہدِ اُموی کے واقعات اور سیرتِ معاویہؓ و یزیدؒ کا مختصر خاکہ ہے جس کے بارے میں راویوں نے صریحاً کذب بیانی کی ہے اور اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ اس سے متأثر ہو جاتے ہیں اسی لئے یہ چند جملے لکھے گئے ہیں۔ موجودہ عہد میں مناقب و مثالب کی وضعی روایتوں سے استشہاد نہیں کیا جا سکتا۔

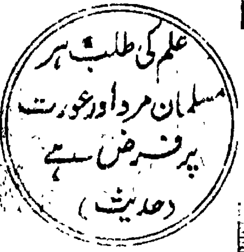
کذب بیانی، افتراء پردازی، سب و شتم اور تفرقہ اندازی کا نام تاریخ نہیں ہے مولانا حالیؒ نے ہمارے شاعروں کے متعلق فرمایا ہے ؎

عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے ؛ بری بات کہنے کی گر کچھ سزا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے ؛ مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

لیکن کتبِ تاریخ میں افتراء و تلبیسات کا مطالعہ کرنے کے بعد راقم الحروف کا جی چاہتا ہے کہ آخری مصرعے میں "شاعر" کی بجائے "راوی" کر دے۔ یہ ابومخنف لوط بن یحییٰ، یہ محمد بن سائب کلبی اور اس کا بیٹا ہشام اور اسی قماش کے دوسرے مفتری اور کذّاب لوگوں نے ہماری تاریخ کو مسخ کر دیا اور طبری جیسے لوگوں نے اپنے دلوں کی بیماری کو پوشیدہ رکھ کر ان مفتریوں اور کذّابوں کا تمام سرمایۂ زور اُمت کو گمراہ کرنے کے لئے جمع کر دیا اور جو لوگ شیخ جلال الدین سیوطی کی طرح "حاطب اللیل" ہیں یعنی اندھیری رات میں لکڑیاں جمع کرنے والے، کہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہاتھ میں کام کی لکڑی آئی یا بیکار و زہریلی انہوں نے تاریخ الخلفاء جیسی کتابیں لکھ کر اخلاف کو اسلاف سے بدظن کرنے کا سامان فراہم کر دیا اور یوں اکثر لوگوں کے فکر و نظر پر مکذوبہ روایتوں کے پردے پڑتے گئے ؛



نفیس دینی و علمی کتابیں



کتابیں طلب کرنیوالے چند باتوں کا لحاظ ضرور رکھیں

(۱) تحریر اتنی صاف ہو کہ آرڈر کی تفصیل اور آپ کا پتہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو (۲) مجلّد اور غیر مجلّد کی بھی وضاحت کر دیجئے (۳) تقریباً بیس روپے سے زائد کتابیں منگانے کی صورت میں ریلوے پارسل میں کفایت رہتی ہے۔ اگر یہ کفایت مطلوب ہو تو اپنا اسٹیشن لکھئے۔ پارسل ریل سے اور بلٹی کی رسید ڈاکخانہ سے وی پی بھیجی جائے گی (۴) اگر آپ نئے خریدار ہیں تو بیس روپے یا اس سے زائد کے آرڈر پر کچھ روپے پیشگی روانہ فرمایئے جنھیں وی پی میں کم کر دیا جائے گا (۵) ڈاکخانہ سے وی پی کی اطلاع ملتے ہی چھڑا لیجئے، دیر کرنے سے واپس ہو جاتی ہے (۶) اگر آپ کو گمان ہو کہ وی پی توقع سے کچھ زائد رقم کی ہے تو اسے واپس نہ کریں، بلکہ وصول کر لیں۔ آپ کے اطلاع دینے پر مکتبہ یقیناً ہر شکایت کا ازالہ کرے گا۔

قرآن مترجم و معریٰ

قرآن بدو ترجمہ — (۱) شاہ رفیع الدینؒ (۲) مولانا اشرف علیؒ متوسط سائز میں مجلّد کریچ کا ھدایہ ساڑھے بارہ روپے۔ بہت بڑے سائز میں مجلّد کا ہدیہ پچیس روپے (اس کی لکھائی بہت جلی ہے)

قرآن بیک ترجمہ — مولانا اشرف علیؒ۔ مجلّد کریچ کا ہدیہ ساڑھے دس روپے۔

قرآن بلا ترجمہ — جلی قلم، روشن حروف عکسی مجلّد کا ہدیہ آٹھ روپے

قرآن مترجم — ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ۔ تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مطبوعہ بجنور۔ مجلّد چرمی پشتہ پچیس روپے

قرآن کی تفسیریں

تفسیر ابن کثیر — احادیث کی روشنی میں آیات کا مفہوم ظاہر کرنیوالی وہ تفسیر جو دنیا بھر میں مشہور و مقبول ہے۔ ترجمہ سلیس، لکھائی چھپائی پسندیدہ۔ پانچ جلدوں میں مکمل۔ ہدیہ مجلّد پچپن روپے۔ کوئی بھی جلد علیحدہ نہ مل سکیگی۔

تفسیر موضح القرآن — شاہ عبدالقادر محدّث دہلویؒ کی یہ تفسیر اردو تفاسیر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے کلاں سائز۔ ہدیہ مجلّد اعلیٰ بیس روپے۔ غیر مجلّد سولہ روپے۔

تفسیر بیان القرآن — مولانا اشرف علیؒ کی یہ عظیم تفسیر اپنا جواب آپ ہے۔ دو قسموں میں مہیا کی جا سکتی ہے۔

● بہت بڑا سائز۔ بارہ حصوں میں مکمل۔ ہدیہ غیر مجلّد ساٹھ روپے۔ دو جلدوں میں مجلّد ستّر روپے ● تجلّی جیسا سائز تیس پارے تیس میں مکمل غیر مجلّد ساٹھ روپے۔ پانچ جلدوں میں مجلّد پینسٹھ روپے۔ دوسری قسم کا ہر پارہ الگ بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔ فی پارہ دو روپے

تفسیر حقّانی — مولانا عبدالحق محدّث دہلویؒ کی تفسیر نایاب ہو گئی تھی اب ہر ماہ ایک پارہ چھپ رہا ہے۔ اب تک اکیس پارے چھپ چکے ہیں۔ فی پارہ دو روپے (صرف پارۂ اوّل چھ روپے جو تین حصوں پر مشتمل ہے)۔

تفہیم القرآن اوّل، دوم — مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی وہ عظیم الشان تفسیر جو غیر ضروری تفصیلات سے بچاتے ہوئے آپ کو براہِ راست مغزِ قرآن تک پہنچاتی ہے۔ دل نشیں۔

مستند اور ذہن میں اُتر جانے والی۔ ابھی پہلی اور دوسری جلدیں فراہم کی جا سکی ہیں۔ جلد اوّل مجلّد ساڑھے بارہ روپے۔ جلد دوم مجلّد ...

علوم قرآنیہ

البیان فی علوم القرآن

"مشہور تفسیر حقانی" کے مصنف مولانا عبدالحق محدّث دہلویؒ کی عظیم الشان کتاب وہی ہے جس کی توصیف میں علامہ انور شاہ صاحبؒ جیسے علامہ نے یہ الفاظ لکھے کہ "اگرچہ اس کی نظیر ممکن ہے، لیکن واقع نہیں" خدا کی ذات و صفات تاریخ ملائکہ جزا و سزا، قبر جنت، دوزخ، نبوت، ناسخ و منسوخ، استعارہ و کنایہ اور اختلاف قرأت کی بحثیں، صفحات ۶۳۰ کاغذ لکھائی چھپائی معیاری۔ قیمت چودہ روپے (مجلد پختہ سولہ روپے)

قصص القرآن

قرآن کے بیان فرمودہ قصص پر لاجواب کتاب عظیم معلومات کا خزانہ مستند اور محققانہ تفصیلات سے مالامال۔ حصہ اوّل سات روپے۔ حصہ دوم چار روپے حصہ سوم ساڑھے پانچ روپے۔ حصہ سوم ساڑھے پانچ روپے --- حصہ چہارم سات روپے۔ مکمل سیٹ منگانے پر قیمت تئیس روپے۔ (مجلد مطلوب ہوں تو ایک پختہ جلد پر ڈیڑھ روپیہ بڑھ جائے گا)۔

لغات القرآن

قرآنی لغات کی تشریح آسان زبان میں جو لوگ قرآن کو بلا ترجمہ سمجھنے کی خواہش اور شوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بڑی مدد فراہم کرتی ہے۔ مجلد چار ...

علم الحدیث

مؤطا امام مالکؒ (مترجم عربی مع اردو)

احادیث و آثار کا وہ مجموعہ جو بخاری سے پہلے مرتب ہوا، سلیس ترجمہ کے ساتھ عربی متن بھی ہے۔ ہدیہ بارہ روپے مجلد کرعی تیرہ روپے (مجلد اعلیٰ چودہ روپے)۔

بخاری شریف (خالص اردو)

قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب بخاری کا سلیس اردو ترجمہ تین جلدوں میں مکمل ہدیہ چوبیس روپے۔ مجلد پختہ ستائیس روپے۔ مجلد اعلیٰ تیس روپے (مجلد کا مطلب تین الگ الگ جلدیں ہیں)۔

مشکوٰۃ شریف (خالص اردو)

مشکوٰۃ شریف کا بھی سلیس اردو ترجمہ دو جلدوں میں حاضر ہے۔ ہدیہ سولہ روپے۔ مجلد پختہ اٹھارہ روپے (مجلد اعلیٰ بیس روپے)

ترمذی شریف (خالص اردو)

سفید عمدہ کاغذ حصہ اوّل مجلد نو روپے۔ حصہ دوم مجلد نو روپے (دونوں حصے بیک وقت طلب کرنے پر سولہ روپے

مشارق الانوار (مترجم)

بخاری و مسلم کی صرف قولی احادیث کا نفیس انتخاب۔ ترتیب فقہی ابواب پر ہے جس سے یہ معلوم کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ کونسا مسئلہ کس حدیث سے نکلا ہے۔ ترجمہ کیساتھ تشریح بھی ہے اور عربی متن بھی) ہدیہ چودہ روپے۔ مجلد پندرہ روپے (مجلد اعلیٰ سولہ روپے

بلوغ المرام

مشہور امام فن حافظ ابن حجرؒ کی یہ کتاب بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور دیگر کتب معتبرہ سے منتخب کئے ہوئے دینی احکام کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ ترجمہ مع عربی متن مجلد آٹھ ...

ترجمان السنّۃ

احادیث کی بہترین تفہیم و تشریح پر مشتمل اردو زبان میں اپنی قسم کی واحد کتاب، اشتہار میں اس کی خوبیوں کا اجمالی تعارف بھی مشکل ہے۔ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جلد اول دس روپے (مجلد بارہ روپے) جلد دوم نو روپے (مجلد گیارہ روپے) جلد سوم دس روپے آٹھ آنے (مجلد بارہ روپے آٹھ آنے)

صحیفۂ ہمام بن منبّہ

بخاری و مؤطا امام مالک سے بھی قدیم وہ کتاب حدیث جو مشہور صحابی ابوہریرہؓ نے اپنے شاگرد ابن منبہ کے لئے مرتب کی۔ ہدیہ ساڑھے تین روپے ...

بستان المحدثین

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی ایمان افروز کتاب کا اردو ترجمہ۔ بلند پایہ محدثین کے حالات اور خدمات و تالیفات کا پاکیزہ تذکرہ۔ مجلد پانچ روپے۔

ابن ماجہ (اردو)

صحاح ستہ کی کتاب ابن ماجہ کا مکمل اور سلیس ترجمہ۔ شائقین حدیث کیلئے نادر تحفہ۔ صفحات ۶۶۰ ہدیہ مجلد بارہ روپے۔

علم الحدیث

فلسفۂ علم الحدیث کی عمدہ تحقیق۔ قیمت سوا روپیہ

کتاب ... المسلم ... تحفہ ... عظ ..

سوانح اور تذکرے

حضرت صدیق اکبرؓ از مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے
حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ جسمیں آپ کے ذاتی حالات و سوانح عظیم الشان کارناموں، دینی و سیاسی خدمات جلیلہ، اخلاق و مکارم اور عہد صدیقیؓ کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کے علاوہ اس دور کے اہم دینی، سیاسی، فقہی اور تاریخی مباحث و مسائل پر بڑی جامعیت اور تحقیق سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے۔ مجلد کرمچ آٹھ روپے

الفاروق امیر المومنین خلیفۂ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات و سوانح پر علامہ شبلیؒ کی یہ کتاب دنیا بھر میں مشہور ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ساڑھے پانچ سو سے زائد صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع پر لاجواب ہے
قیمت مجلد بارہ روپے

حیات امام ابوحنیفہ یعنی سیرۃ النعمان علامہ شبلیؒ کے قلم سے فقیہ اکبر امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے مفصل حالاتِ زندگی، دلچسپ اور ایمان افروز
قیمت تین روپے (مجلد چار روپے)

تجلیات عثمانی شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی علمی زندگی کے مفصل حالات آپ کے علم تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، منطق، فلسفہ، مناظرہ، تقریر، اردو، فارسی، عربی ادب اور سیاسیات پر سیر حاصل تبصرہ، بڑے ۱۲ صفحات جلد پر حسین سہ رنگا گرد پوش۔ قیمت مجلد ساڑھے دس روپے۔

سیرت اشرف حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کی مفصل سیرت صفحات ۱۵/ مجلد بارہ روپے۔

حیاتِ ولی شاہ ولی اللہؒ اور ان کے آباؤ اجداد، اولاد اور اساتذہ کا تذکرہ۔ مجلد کی قیمت، چھ روپے۔

حیات امام احمد بن حنبلؒ مصر کے مایۂ ناز محقق ابوزہرہ کی معرکۃ الآراء کتاب "ابن حنبل" کا نفیس اردو ترجمہ۔ امام احمدؒ پر یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے
قیمت دس روپے

محمد بن عبدالوہابؒ از مولانا مسعود عالم ندوی۔ بارھویں صدی ہجری کے مشہور مصلح شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی سیرت اور دعوت پر علمی و تحقیقی تصنیف جسمیں مشرق و مغرب کے تمام مآخذ پوری طرح کنگھال کر غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ قیمت ڈھائی روپے

الغزالی امام غزالیؒ پر مولانا شبلی نعمانیؒ کی تحقۃ التالیف۔ جو بالکل کمیاب ہے (کاغذ رف) غیر مجلد دو روپے

سیرت عمر ابن العزیزؒ اس جلیل القدر ہستی کی سوانح اور حالات جس کی خلافت کو اکثر علماء نے پانچویں خلافت راشدہ سے تعبیر کیا ہے۔ مجلد کی قیمت تین روپے۔

ردِ شرک و بدعت

تقویۃ الایمان (اردو) شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی وہ مشہور زمانہ کتاب جس نے اہل بدعت میں ہلچل ڈال دی۔ قیمت چار روپے (مجلد پانچ روپے)

الشہاب الثاقب (اردو) بدعات کے رد میں ایک مفید کتاب
قیمت پونے دو روپے

کتاب التوحید ردِ شرک و بدعت میں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی نفیس کتاب۔ قیمت مجلد تین روپے

بدعت کیا ہے؟ مولانا عامر عثمانی اور تین دیگر حضرات کے مضامین کا مجموعہ جو شرک و بدعت اور توحید و سنت کے فرق و امتیاز پر لاجواب مواد پیش کرتا ہے۔ مجلد تین روپے۔

ردِ عقائد بدعیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب تھا یا نہیں ۹۱ پر مفصل و مدلل بحث۔ قیمت ایک روپیہ

شاہ اسمٰعیل شہید اور معاندین اہل بدعت کے الزامات حضرت اسمٰعیل شہیدؒ پر اہل بدعت کے ہوائی الزامات کا کافی و شافی رد۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ (مجلد دو روپے)

فیصلہ کن مناظرہ مجلد ڈیڑھ روپے

تصانیف مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اصلاح الرسوم مسلمانوں میں رائج شدہ رنگ برنگی رسموں کی شرعی پوزیشن کیا ہے؟ اسکا تحقیقی جواب۔ مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

تعلیم الدین دین کی تعلیم سے متعلق عمدہ تنبیہات و منومات پر مشتمل۔ مجلد ایک روپیہ بارہ آنے۔

دعوات عبدیت مولانا اشرف علیؒ کے چند مواعظ کا مجموعہ جو عرصے سے نایاب تھا اس کے نو حصے مکمل ہو چکے ہیں۔ ہر حصہ مجلد اور ہر حصہ کی قیمت پونے دو روپے

عقائد وفقہ

بہشتی زیور مولانا اشرف علیؒ کی وہ شہرہ آفاق کتاب جو روزمرہ کے تمام دینی مسائل کے علاوہ سیکڑوں مفید مضامین پر مشتمل ہے۔ قسم اول مکمل مدلل مجلد پندرہ روپے۔ قسم دوم غیر مدلل مجلد سات روپے (دونوں قسموں میں فرق یہ ہے کہ قسم اول میں تو حاشیہ پر عربی کتب کے حوالے دیئے گئے ہیں اور قسم دوم میں حاشیہ نہیں ہے۔ اصل مضمون دونوں کا ایک ہے)

دین کی باتیں اسلام، ایمان، عمل صالح، ارکان اسلام، اخلاق، حقوق، سیاست اور خدمت دین کے طریقوں پہ نہایت دل نشیں اور ایمان افروز گفتگو۔ بلاک کی عمدہ چھپائی۔

قیمت پونے دو روپے

عقائد الاسلام قاسمی اسلام کے جملہ اصولی عقائد کو سہل زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ خطاب اگرچہ بچوں سے ہے لیکن بڑوں کے لئے بھی کتاب بیحد مفید ہے کیونکہ تمام اصولی عقائد سے بڑے بھی کم ہی باخبر ہیں۔ ڈھائی روپے (مجلد تین روپے)

ادبیات

شاہنامۂ اسلام جدید حصہ اول — از مولانا عامر عثمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک اور اس کے بعد پہلی خلافت راشدہ کا قیام، خلیفۂ اول کا انتخاب کیونکر عمل میں آیا۔ جنگی اصول، معرکہ آرائیاں، تاریخ کی روشنی

صداقتیں زبان شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت مجلد تین روپے

دیوان غالب نفیس ایڈیشن جس میں غالب کی تحریر کا عکس ان کی تصویر اور بعض ایسے اشعار شامل ہیں جو دوسرے ایڈیشنوں میں نہیں پائے جاتے۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے

بیان غالب شرح دیوان غالب (از آغا محمد باقر ایم۔ اے)

اپنی شرح کے ساتھ حسب ضرورت دوسروں کی رائے بھی پیش کر دی ہے۔ جس کے باعث مجموعی حیثیت سے اچھی شرح ہو گئی ہے کتابت وطباعت اچھی کاغذ سفید۔ مجلد مع کور، ضخامت ۶۲۸ صفحے

قیمت چھ روپے

کلیات اقبال ڈاکٹر اقبال کے اردو کلام کا انتخاب۔

قیمت مجلد پانچ روپے

آتش گل شہنشاہ غزل جگر مرادآبادی کا نیا مجموعۂ کلام۔ جس پر حکومت ہند نے انعام دیا۔ مجلد مع کور

قیمت پانچ روپے

فردوس ماہر القادری کی وجد انگیز نظموں کا دلپذیر مجموعہ

قیمت ساڑھے تین روپے۔

اردو کے چاند تارے اردو کے تقریباً تمام باکمال شاعروں کا مصور تذکرہ اور نمونۂ کلام۔

قیمت مجلد ساڑھے تین روپے

نبض دوراں ہند و پاک کے مشہور شاعر جناب انور صابری کا مجموعۂ کلام۔ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے

[illegible] علم وفنون

اصح السیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تاریخی واقعات پر مشتمل، بے نفیس، مفصل، مستند اور دلچسپ علمی وتحقیقی کتاب "سیرۃ النبی" کی ضخیم مجلدات کے سوا اردو میں کوئی کتاب سیرۃ اس کے پلے کی نہیں۔ مجلد دس روپے

حصن حصین (مترجم) دعاؤں، مناجاتوں، وظیفوں، اور جامع کلمات کا مشہور مجموعہ

قیمت مجلد آٹھ روپے

مقدمہ ابن خلدون — یہ شہرہ آفاق کتاب اُردو ترجمہ ہو کر آ گئی ہے۔ مجلّد پشتہ

قیمت پندرہ روپے (مجلّد اعلیٰ سترہ روپے)

اساس عربی — عربی سیکھنے کے لئے عربی صرف و نحو کے قواعد کی عمدہ کتاب۔ پانچ روپے (مجلّد چھ روپے)

ملفوظات آزاد — دینی، علمی، ادبی، سیاسی، تفریحی، تنقیدی اور تعریفی مسائل کے سلسلہ میں۔ ڈھائی روپے

فتوح الغیب (اُردو) — ایمان، تقویٰ، صبر، فقر، خیر و شر، جبر و قدر، سنت و بدعت اور شریعت و طریقت وغیرہا کے عنوانات پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مشہور و معروف مقالات کا مجموعہ جس میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کا مبسوط تعارفی مقالہ بھی شامل ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

حکایاتِ صحابہؓ — صحابی مردوں اور عورتوں وغیرہ کے سبق آموز واقعات جن کے مطالعے سے روح تازہ اور سینہ کشادہ ہوتا ہے۔ قسم اوّل مجلّد تین روپے۔ قسم دوم سوا دو روپے۔

تحریک اخوان المسلمین — مصر کی مشہور اسلام پسند جماعت "اخوان المسلمین" جس کے کئی رہنماؤں کو پھانسیاں دی دی گئیں۔ کیا ہے؟ اس سوال کا معتبر اور مفصل جواب حاصل کرنے کیلئے مصر کے محمد شوقی کی یہ قابلِ اعتماد کتاب ملاحظہ فرمائیے جس کا سلیس اُردو ترجمہ سید رضوان علی نے کیا ہے۔ قیمت مجلّد تین روپے

عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ — مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی وہ کتاب جو فرنچ اور دیگر زبانوں میں بھی بے شمار چھپی۔ عجیب کتاب ہے متعلقہ نقشے اور بدر، خندق، اُحد اور دیگر تاریخی مقامات کے چونتیس فوٹو بھی منسلک ہیں

قیمت ڈیڑھ روپیہ (مجلّد دو روپے)

اُسوۂ حسنہ — حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ پر ایک نفیس کتاب جسے پڑھ کر باطل شکنی اور حق دوستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں بعض ایسی مفید باتیں ملیں گی جو عام طور پر کتب سیرت میں نہیں ملتیں۔ سوا دو روپے (مجلّد سوا تین روپے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات — شاہانِ عالم، عرب حکمرانوں قبائلی سرداروں اور عاملوں کے نام دربارِ رسالت کی خط و کتابت اور معاہدات، ضروری تشریحات اور اصل خطوط کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ قیمت سوا دو روپے۔

حدیث اور قرآن — از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ حدیث کا تعلق قرآن سے کیا ہے۔ دین میں حدیث کو کیا حیثیت حاصل ہے۔ رسالت کسے کہتے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس طرح کے سوالات کے دل نشین اور مدلل جوابات، یہ کتاب خالص تبلیغی نقطۂ نظر سے چھاپی گئی ہے۔ چنانچہ سفید کاغذ کے ڈیڑھ سو صفحات کی قیمت صرف بارہ آنے۔ ٹائٹل رنگین نفیس۔

مکاتیب سید سلیمان ندوی — قیمت مجلّد سوا تین روپے۔

کتاب الصلوٰۃ — "نماز" پر امام احمد ابن حنبلؒ کی مشہور کتاب ترجمے کے ساتھ امام صاحب کے اثر انگیز حالات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ قیمت مجلّد ڈیڑھ روپیہ۔

اسبابِ زوالِ اُمت — علامہ امیر شکیب ارسلان کی معرکۃ الآراء تصنیف۔ قیمت مجلّد ڈیڑھ روپیہ۔

صراطِ مستقیم — از شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ۔ نیا ایڈیشن عمدہ کتابت و طباعت۔ ڈھائی روپے۔ (مجلّد تین روپے)

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں — اشتراکیت کی عملی ناکامی پر ایک محققانہ کتاب۔ قیمت تین روپے۔

احسن الصلوٰۃ — نماز، وضو، تیمم اور غسل کے فرائض و واجبات، سنن، مستحبات اور مفسدات و مکروہات کو نہایت وضاحت سے درج کیا گیا ہے۔ صفحات ۴۸ صرف پانچ آنے۔

رحمۃ اللعالمین — غیر مسلموں کی مدلل شہادتوں سے رسول اللہؐ کی عظمت و سطوت کا ثبوت صفحات ۳۲ — تین آنے

محکمات — قرآن کی بعض آیات اور ان کی تفسیروں پر علامہ عبداللہ العمادی کا عالمانہ تبصرہ و محاکمہ۔ دو روپے بارہ آنے۔

اُردو کا مقدمہ — اُردو کے بارے میں ادیبوں، شاعروں، سماجی کارکنوں، سیاسی لیڈروں اور اہلِ علم و فضل کی شہادتوں پر مشتمل دلچسپ ڈرامہ، جو پُر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو کے حق میں دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک روپیہ۔

حقیقت — جماعت اسلامی پر کئے گئے بعض اعتراضات پر مولانا عامر عثمانی کی مفصل تنقید۔ قیمت دو آنے۔

انسانیت موت کے دروازے پر
(از مولانا آزاد)

اس میں جن ۳۹ مشاہیر عالم کے آخری سبق آموز لمحات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:-
چاروں خلفائے راشدینؓ۔ حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ۔ حضرت معاویہؓ۔ حضرت سلمان فارسیؓ۔ حضرت عمرو بن العاصؓ۔ امام شافعیؒ۔ مامون الرشید اور حجاج بن یوسف وغیرہ (تاریخ کربلا بھی شامل ہے۔ اسے منگانے والے "شہید اعظم" نہ منگائیں)
قیمت مجلد ساڑھے تین روپے

سنتِ رسول
مصنفہ:- مترجمہ:- ملک غلام علی۔ مقدمہ: مولانا مودودی مدظلہ
"سنت" کے موضوع پر بے حد وقیع کتاب۔ مجلد سوا دو روپے

آئینہ حقیقت نما
اس قیمتی کتاب میں مشہور مورخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے ان تمام الزامات کی مدلل صفائی پیش کی ہے جو متعصب حضرات فاتحین اسلام پر لگاتے رہے ہیں۔ طرز تحریر بے حد دلچسپ۔ استدلال محکم۔ نقد مضبوط۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب معیاری۔ مجلد بارہ روپے

جمہوریت اور مغربی تحریکیں
یورپ میں جمہوریت پر کیا بیتی اور انسانیت کے بلند نصب العین تک پہنچنے میں کیا کیا رکاوٹیں پیش آئیں؟ - اس پر اونچے علمی انداز کا تبصرہ۔ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے۔

رہنمائے مدینہ
مدینہ منورہ کی مختصر تاریخ اور مقاماتِ ماثورہ کی تشریح۔ قیمت ایک روپیہ۔

تصانیف مولانا منظور نعمانی۔

اسلام کیا ہے؟ (مجلد ڈھائی روپے)
دین و شریعت (مجلد تین روپے)
آپ حج کیسے کریں (مجلد دو روپے)
معارف الحدیث حصہ اول (مجلد سوا پانچ روپے) حصہ دوم (مجلد ساڑھے پانچ روپے)

مولانا احمد سعید کی مقبول و معروف کتب

جنت کی کنجی معہ دستکور سوا تین روپے
دوزخ کا کھٹکا (سوا دو روپے) خدا کی باتیں (ڈھائی روپے)
ایمان کی باتیں (پونے دو روپے)

کتب لغت

مصباح اللغات
عربی اردو لغت کی عظیم الشان کتاب۔ پچاس ہزار سے زائد الفاظ کی تشریح۔ المنجد، قاموس، تاج العروس، نھایہ، منتھی الارب اور اسی پائے کی دیگر لغات کا نچوڑ۔ مجلد سولہ روپے۔

کریم اللغات
عربی و فارسی کے جو محاورات اور الفاظ اردو میں رائج ہیں ان کی اردو تشریح۔ یہ لغت بھی اردو لکھنے اور سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ قیمت دو روپے (مجلد ڈھائی روپے)

القاموس الجدید
جدید اردو عربی لغت۔ اب تک ایسی کوئی ڈکشنری نہیں تھی جو اردو سے عربی بنانے میں کما حقہ مفید ہو سکے۔ جائے شکر ہے کہ ایک دیدہ ور محقق نے اس کمی کو بہترین طریقے پر پورا کر دیا ہے۔ چھوٹے ص ۶۷۴ صفحات کی اس ڈکشنری کی خصوصیات بہت ہیں صرف چند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں (۱) بیس ہزار اردو الفاظ و اصطلاحات کی حروف تہجی پر ترتیب اور ان کا پچاس ہزار سے زیادہ عربی الفاظ و محاورات میں لغوی اور اصطلاحی دونوں قسم کا ترجمہ (۲) تمام ہی شعبہ ہائے زندگی سے متعلق جدید اصطلاحات و تعبیرات کی تفہیم (۳) محل استعمال، طریق استعمال اور صلات و صفات کی توضیح (۴) مراسلت اور ترجمے وغیرہ کا مکمل مواد۔ لکھائی چھپائی پسندیدہ۔ جلد کریج سنہری ڈائی والی۔ قیمت سات روپے۔

اردو ہندی لغت
سائنسی، سماجی، صنعتی، تجارتی، صحافتی، عدالتی اور دفتری۔ غرض جملہ قسم کے الفاظ کی توضیح۔ مفرد کے علاوہ مرکب الفاظ کی بھی تشریح ہے۔ ہندی سیکھنے والوں کیلئے مفید ترین چیز۔ مجلد ساڑھے تین روپے

تجلی کا خاص نمبر

اب بھی مل سکتا ہے ایمان وعمل کے مسئلہ پر تفصیلی محققانہ بحث، نذر ونیاز، فاتحہ وعُرس اور سماع موتی وغیرہ کا جائزہ وغیر ذلک۔

اسی میں مولانا شیخ احمد کا مشہور مقالہ "مولانا مودودی اور تصوف" بھی شامل ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

نوٹ:۔ تنہا یہی نمبر منگانا ہو تو منی آرڈر سے ایک روپیہ بارہ آنے بھیج دیجئے۔ وی پی طلب کریں گے تو دو روپے دو آنے خرچ ہو جائیں گے

مبتدیوں کی تجوید

قرآن پڑھنے اور پڑھانے والوں کیلئے بہترین ہے۔ تجوید کے طریقے آسان زبان میں پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف بارہ آنے۔

احکام القمار

جس میں جوے کی تعریف، اس کے اقسام اور احکام، حدیث وقرآن سے پیش کئے گئے ہیں۔ مستند عالم مفتی محمد شفیع صاحب کے قلم سے۔ قیمت صرف چار آنے

جلاء الابصار اردو ترجمہ نور الانوار شرح المنار

یہ ترجمہ عرصے کیا ہے۔ اس کے چند نسخے مل گئے ہیں۔ ضرورتمند حضرات فوری توجہ کریں۔ دو جلدوں میں مکمل ہے۔ غیر مجلد بارہ روپے اور مجلد سولہ روپے۔

خلفائے راشدین

(از مولانا عبد الشکور صاحب ایڈیٹر النجم لکھنؤ) خلفائے راشدین کی سیرت پر بے نظیر کتاب ہے۔

عربوں کی گذشتہ تجارت اور انگلستان کی صنعت وحرفت

اس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں نے تجارت کی بدولت کس طرح اور کتنی ترقی کی۔ قیمت صرف آٹھ آنے۔

اشاعت اسلام

دنیا میں اتنی جلد اسلام کس طرح پھیلا؟ مخالفینِ اسلام اس سلسلے میں کیا کیا کہتے ہیں؟ اور اس کا جواب کیا ہے؟ یہ سب کچھ ٹھوس دلائل کے ساتھ اس میں ملیگا۔ کاغذ، طباعت، کتابت سب عمدہ۔ قیمت چھ روپے۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

مشہور محقق عالم مولانا مسعود عالم ندویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب حضرت سید شہیدؒ کی چلائی ہوئی تحریک اور ان کے کارناموں پر تبصرہ وتنقید اور غیروں کی غلطیوں کی نشاندہی اور تردید وغیرہ۔ قیمت ڈھائی روپے۔

تاریخ عالم

حضرت آدمؑ سے لیکر رسول اللہؐ تک کے تمام انبیاء کے حالات مع تاریخ پیدائش ووفات اور مکمل تاریخ اسلام ودیگر اقوامِ عالم کی تاریخ کے علاوہ دنیا کے مشہور ممالک اور ریاستوں کی تاریخ۔ مجلد ساڑھے چار روپے۔

اسلام اور انسانی قانون

علامہ عبد القادر عودہ شہیدؒ کی ایک نفیس کتاب ترجمہ سلیس ہے

قیمت صرف پندرہ آنے

سدِ باب ذریعہ

علامہ ابن قیم کا ایک عجیب مضمون جس میں ۹۹ مثالوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو حرام کرتا ہے تو اُس تک پہنچانے والے تمام وسائل و ذرائع کو بھی ممنوع کر دیتا ہے۔ قیمت دس آنے

تفسیر فیض الرحمن

بسم اللہ الحمد اور معوذتین کی تفسیر شاہ ولی اللہؒ اور دیگر اکابرین کی آراء کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔ ہدیہ دو روپے۔

تحفۂ اثنا عشریہ (اردو)

از حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی

ترجمہ:۔ مولانا سعد حسن خاں یوسفی۔

پیدائش وتاریخ مذہب شیعہ۔ اُن کی مختلف شاخیں۔ اُن کے اسلاف علماء اور کتب کا بیان۔ اُلوہیت، نبوت، امامت اور معاد کے بارے میں اُن کے عقائد، اُن کے مخفی مسائل فقہیہ، صحابہ کرام، ازواج مطہرات اور اہل بیت کے حق میں اُن کے اقوال وافعال اور مطاعن مکائدِ شیعہ کی تفصیل، ان کے اوہام، تعصبات اور ہفوات کا بیان۔ قیمت مجلد مع حسین ڈسٹ کور بارہ روپے۔

ختم نبوت کامل ہر سہ حصہ

مصنفہ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جس میں ایک سو سے زائد آیات قرآنی اور دو سو دس احادیث رسول اور اجماعِ اُمت اور سیکڑوں اقوالِ صحابہ وتابعین وائمہ دین سے مسئلہ ختم نبوت کے ہر پہلو کو

واضح کیا گیا ہے اور شبہات کے شافی جوابات دیئے گئے ہیں۔
قیمت مع ڈسٹ کور چھ روپے

اصول تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ایک قیمتی رسالہ کا سلیس اردو ترجمہ مع حواشی مفیدہ۔ ایک روپیہ

تلاش راہ حق ایک طالب حق کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور میاں طفیل محمد کے خطوط۔ قیمت مجلد پونے دو روپے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات آج کی شستہ اور دلکش زبان میں ان تعلیمات اسلامی کی تفصیل جن کی ہر مسلمان کو ہر وقت ضرورت ہے۔ قیمت سوا روپیہ۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات و خطبات سیرت طیبہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ضروری ارشادات و تعلیمات کا خلاصہ۔ احادیث کی ایمان افروز تشریحات۔ ہدیہ مجلد ڈھائی روپے۔

تصویریں (از اسعد گیلانی) دلچسپ افسانوی انداز میں پیش کردہ سبق آموز حقائق۔ مجلد سوا تین روپے۔

آدم کے تین بیٹے (از اسعد گیلانی) ایک تمثیل جو دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ مجلد پونے دو روپے۔

تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو (از اسعد گیلانی) موضوع نام سے ظاہر بڑی دلکش اور ایمان افروز کتاب ہے۔ قیمت مجلد تین روپے۔

مبتدی مردوں، عورتوں اور بچوں کیلئے

سیرت رسولؐ	۱۰/	پیارے رسولؐ	۵/
سراپائے رسولؐ	۱۴/	حلیۃ النبیؐ	عہ/
آداب النبیؐ	۸/	رسول اللہ ﷺ کے اخلاق مجلد	عہ/
رسول اللہ ﷺ کے معجزے	عہ/	رسول مقبولؐ کی دعائیں	۴/
رسول اللہ ﷺ کی نمازیں	۴/	حضرت خدیجہؓ	
حضرت عائشہؓ		حضرت فاطمہ زہرہؓ	۱۰/
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۱۲/	حضرت عمر فاروقؓ	

حضرت عثمان غنیؓ	عہ/	حضرت علیؓ	۱۴/
حضرت حمزہؓ	۱۲/	حضرت بلالؓ	۸/
حضرت معاویہؓ	۷/	حضرت معاذ بن جبل	۵/
حضرت سلمان فارسیؓ	۵/	حضرت ابوالدرداءؓ	۴/
حضرت انسؓ	۴/	ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ	ایک روپیہ
خواتین اسلام	۸/	سید اسمٰعیل شہیدؒ	۷/
غوث الاعظم	۴/	مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ	۸/
آخرت کے فکرمندوں کے پچاس قصے	۶/	جہانگیر	سوا روپیہ
شاہجہاں	۸/	نادر شاہ (ڈرامہ)	۶/
رستم	عہ/		

پاک بیبیاں (تمام ازواج مطہراتؓ کی سوانح) ۱۲/
رسول اللہ ﷺ کے دو محبوب حضرت زیدؓ اور حضرت اسامہؓ ۸/
عہد رسالت کے دو بچے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ عہ/
درسگاہ رسولؐ کے دو طالب علم حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ عہ/
صحابہ کرام کس طرح زندگی گذارتے تھے ان کے معمولات کیا تھے؟ عہ/

انجمن حمایت الاسلام لاہور کی کتب

اردو کا قاعدہ	۲/	اردو کی پہلی	۳/
اردو کی دوسری	۷/	" تیسری	۱۰/
" چوتھی	۱۲/		

مولوی اسمٰعیل والی کتب

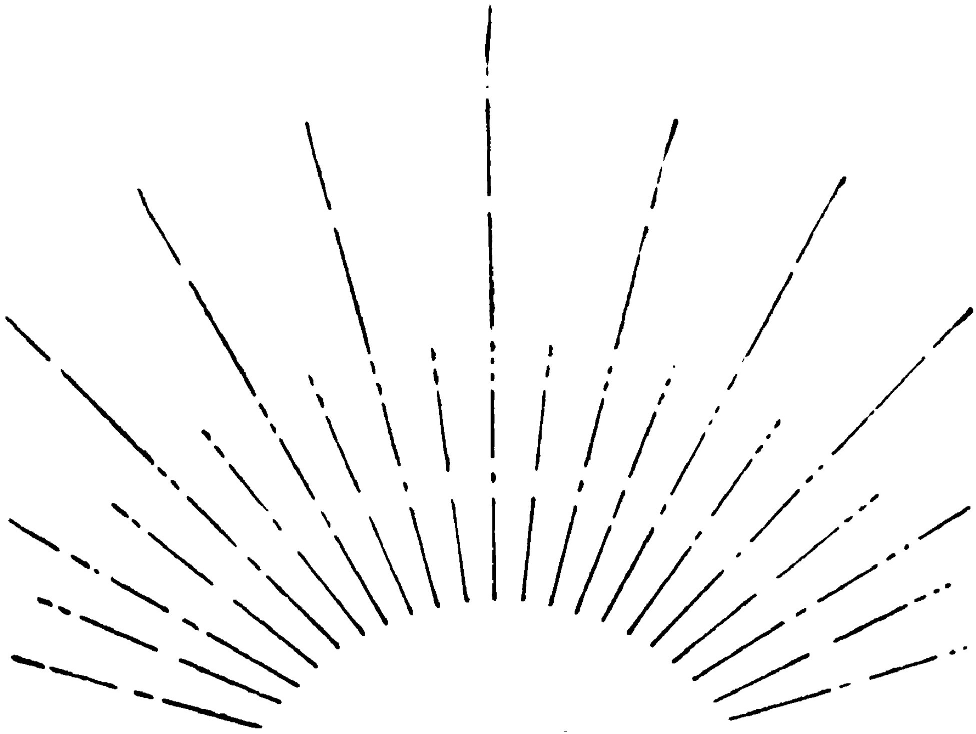
قاعدہ اردو	۲/	اردو کی پہلی	۳/
اردو کی دوسری	۶/	" تیسری	۱۰/
" چوتھی	۱۲/	" پانچویں	عہ/

تعلیم الاسلام عکسی مکمل در سہ حصہ۔ ایک روپیہ چھ آنے
تاریخ الاسلام در سہ حصہ مکمل بچوں کے لئے۔ دو روپے چھ آنے

ہماری دعوت	نو آنے	فیصلہ کن مناظرہ مجلد	ڈیڑھ روپیہ
نماز اخلاص	آٹھ آنے	نماز کی حقیقت از مولانا منظور نعمانی	۱۲/
سلاطین ہند کی علم پروری	عہ/	کلمۂ طیبہ کی حقیقت	چھ آنے
تقدیر کیا ہے؟ از مولانا اشرف علی		فضائل درود و سلام	

ماہنامہ تجلّی دیوبند

۱۱ (۲۵)



ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

8 As.



سرمہ نور بصر

جسے صرف مریض ہی آنکھوں والے نہیں، بلکہ صحت مند آنکھوں والے بھی استعمال فرماتے ہیں۔ کیونکہ یہ بینائی کو گھٹنے نہیں دیتا۔ اپنے یہاں کے ایجنٹ سے خریدیئے۔ اس میں ڈاک خرچ کی بچت ہوگی۔ نہ ملے تو براہِ راست اس پتہ سے طلب کیجئے۔

تین ۳ شیشی یکجا منگانے پر ڈاک خرچ معاف

دارالفیض رحمانی دیوبند (یوپی)

تاجدار مدینہ ؐ کی صاحبزادیاں ؓ

اہل بیت کے نام نہاد مدعیوں کے مسلسل پروپیگنڈے کا اثر یہ ہے کہ اکثر اہل سنت بھی بس فاطمۃ الزہرا ؓ کے نام نامی سے باخبر ہیں اور رسول اللہ ؐ کی دوسری صاحب زادیوں سے انکی عقیدت کا کوئی پیوند نہیں۔ یہ کتاب اس مجرمانہ لاپروائی کے ازالہ کی ایک عمدہ کوشش ہے جو تحقیقی مواد پر مشتمل ہے۔ قیمت چودہ آنے۔

کلیات جگر

جگر مرادآبادی ؒ کے زندگی بھر کے کلام کا منتخب مجموعہ

صفحات ۳۵۲ مجلد چھ روپے۔

مفتاح اللغات عربی اردو ڈکشنری

تیس ہزار سے زائد قدیم و جدید عربی الفاظ کا جامع و مستند ترجمہ مع عربی، اردو محاورات و ضرب الامثال اور اہم اشیاء کی عکسی تصاویر
قیمت مجلد دس روپے

تصانیف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

تفہیمات	چار روپے
رسائل و مسائل جلد اول	پانچ روپے
اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی	ساڑھے تین روپے
اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	ایک روپیہ
حقوق الزوجین	ڈیڑھ روپیہ
حقیقت نفاق	ڈیڑھ روپیہ
دعوت اسلامی	ایک روپیہ
دینیات	ڈیڑھ روپیہ
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	ڈیڑھ روپیہ
مرتد کی سزا اسلامی قانون میں	بارہ آنے
اسلام اور ضبطِ ولادت	بارہ آنے
نشانِ راہ	چھ آنے
قرآن اور پیغمبر	پانچ آنے
جبر و قدر	دو آنے
اسلامی حکومت کسطرح قائم ہوتی ہے	چھ آنے
حقیقتِ ایمان	چھ آنے
حقیقت صوم و صلوٰۃ	آٹھ آنے

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

حقیقتِ شرک	دو روپے
حقیقتِ توحید	ایک روپیہ
حقیقتِ تقویٰ	گیارہ آنے
تدبر قرآن	سوا تین روپے

جماعت اسلامی کیخلاف لکھی گئی تین کتابوں کے مدلل جوابات

فتویٰ دیوبند کا جائزہ	سوا روپیہ
رحمانی تبصرہ کا جائزہ	چھ آنے
کشفِ حقیقت کا جائزہ	سوا روپیہ

ان تینوں کی یکجائی اور رعایتی قیمت دو روپے آٹھ آنے

تخریب و تعمیر (از نعیم صدیقی)	تین روپے
معروف و منکر	تین روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

حقیقت عبودیت:- از امام ابن تیمیہ، چودہ آنے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

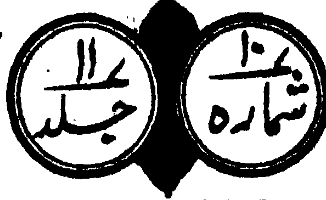


ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت چھ روپے۔ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۵ شلنگ

بشکل پوسٹل آرڈر



فہرست مضامین مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء

نشان خریداری

اگر اس دائرے میں سُرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں، خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ (وی پی چھ روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام و مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائیگا۔

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو پی)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

پاکستان کا پتہ:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۸۰ مینا بازار
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

[illegible]

آغازِ سخن

سفر پاکستان کے نتیجے میں دو ماہ تک تجلّی تقریباً ایک ہفتہ کی تاخیر سے شائع ہوتا رہا۔ آخر کار ہم کوشش کر کے نومبر کا شمارہ ٹھیک وقت پر لے ہی آئے تھے اور توقع تھی کہ آگے بھی وقت کی پابندی ہوتی رہے گی۔ لیکن ایک ناگزیر مصروفیت نے پھر پابندیٔ وقت کا خون کر دیا ہے اور یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں کچھ دیر سے پہنچ رہا ہے۔

یہ ناگزیر مصروفیت کیا تھی؟ اسی کی تفصیل ہم ہدیۂ ناظرین کرنے چلے ہیں۔ تجلی کے ہندوستانی قارئین کی بہت بڑی تعداد اس سے واقف ہے کہ نومبر کے دوسرے عشرے میں جماعت اسلامی ہند کا آل انڈیا اجتماع بڑی شان و شوکت کے ساتھ دہلی میں چار دن تک منعقد رہا ہے اور راقم الحروف کو بھی اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ کہنے کو اجتماع چار دن کا تھا لیکن سفر ۸ر نومبر کو اختیار کرنا پڑا اور واپسی ۱۸ر نومبر کو ہوئی۔ گویا پورے دس دن اس مبارک تقریب کی نذر ہو گئے اور یہی وہ دس دن تھے جس میں زیر دست شمارے کی تکمیل ہو جاتی تو یہ ٹھیک وقت پر آپ کے ہاتھوں میں پہنچتا لیکن ہمیں ذرّہ برابر افسوس نہیں کہ یہ ایام قرطاس و قلم سے دوری میں گذرے اور پرچہ لیٹ ہو گیا، بلکہ انتہائی خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اُس مسرت انگیز اجتماع میں شرکت اور اُس کی مبارک مشغولیتوں سے ہمکنار ہونے کی توفیق عطا فرمائی جس کی خاطر خواہ منظر کشی کا حق آسانی سے ادا نہیں ہو سکتا۔

وقت تنگ ہے، اور اجتماع سے واپسی پر ہم بیمار بھی ہو گئے ہیں۔ اس لئے حق ادا ہو جاتا تو کا ہے وارد ہے لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ کچھ نہ کچھ تذکرہ کئے بغیر چین کی نیند سو جائیں۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی قرار واقعی کیفیت و ہیئت کا صحیح تعارف صرف مشاہدے سے ہو سکتا ہے، لفظ و بیان کی عکاسی ان کی حقیقی تصویر سامنے نہیں لا سکتی۔ یہ اجتماع بھی اسی قسم کی ایک چیز تھی۔ لال قلعے اور جامع مسجد کے درمیان ایک وسیع قطعۂ ارض پر لگے ہوئے بہت بڑے پنڈال کا طول و عرض تو بہ آسانی گزوں اور فٹوں کے حساب سے بتایا جا سکتا ہے یہ بھی بتانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ یہاں کتنے برقی قمقموں نے کیسے حسین مناظر پیش کئے۔ یہ بھی واضح کرنا نہایت آسان ہے کہ کتنے ہزار آدمیوں نے کس دلچسپی اور شوق کے ساتھ اجتماع کی تمام نشستوں میں حصّہ لیا اور کیسے سکون اور نظم و انضباط کے ساتھ ساری کارروائیاں اختتام پذیر ہوئیں۔ لیکن یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ وہاں کی مجموعی فضا ایک مومن کے قلب و روح کے لئے کن سرمدی کیفیتوں کا پیغام تھی۔ وہاں کا ماحول سازِ حیات کے کن تاروں کو چھیڑ رہا تھا۔ وہاں لئے ہوئے ہر سانس میں کن نکہتہائے بے نام کی خوشبو بسی ہوئی تھی کہ جیسے رگوں میں دوڑنے والا خون عطر و عنبر کی وادیوں سے گذر رہا ہو۔

روپیہ خرچ کر کے بڑے بڑے پنڈال بنا لینا بہت آسان ہے۔ دھواں دار تقریروں اور دلچسپ پروگراموں کے ذریعہ دس بیس ہزار آدمیوں کو جمع کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں پھر ضرب در ضرب کے اصول پر ان کی پبلسٹی بھی بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، لیکن وہ حسنِ انتظام، وہ نظم و ضبط، وہ سلیقہ اور رکھ رکھاؤ جس کا مشاہدہ اس عظیم الشان اجتماع میں ہوا ہے، یقین کیجیے کہ بے حد مشکل کام ہے اور من حیث المجموع

دوسری جماعت کے جلسوں میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

ہمیں تو مشیت ایزدی کا اعجاز ہی نظر آیا کہ ملک کی موجودہ فضا میں عین دارالسلطنت میں اُس جماعت کا اتنا شاندار اور تاریخی اجتماع ہو جائے جس کے خلاف بدگمانی کی فضا پیدا کرنے اور زہر اُگلنے میں ایرے غیرے تو درکنار کیسے کیسے سنجیدہ اور بھاری بھرکم حضرات سطحیت پر اُترنے سے باز نہیں رہے۔ جسے ارباب اقتدار میں کباب کی ہڈی خیال کیا جاتا ہے اور جس کا زن بچہ کولھو میں پلوا دینے کی تمنائیں غیروں ہی میں نہیں اپنوں کے بھی دلوں میں مدت سے انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ دہلی میں اس جماعت کے چند ہی رکن ہیں اور رامپور سے دہلی منتقل ہوئے اسے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں گذرے ہیں، لیکن اچانک اتنا بڑا اجتماع کر گذرنا ثابت کرتا ہے کہ انسان عزم و ہمت کے ساتھ کسی منزل کی طرف بڑھے تو اللہ کی نصرت ضرور اس کا ساتھ دیتی ہے اور ایمان و عمل کا صالح اشتراک وہ حیرتناک نتائج پیدا کرتا ہے کہ ناموافق حالات میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مگر ناسپاسی ہوگی اگر ہم اُس حکومت اور اُس قانون کا بھی تھوڑا بہت شکریہ نہ ادا کریں جس کے زیر سایہ یہ اجتماع ممکن ہوا ہے۔ جماعت اسلامی سیکولرازم کی مخالف ہے۔ وہ سیکولرازم کے مقابلہ میں ایک ایسی حکومت چاہتی ہے جو انسانی و اخلاقی قدروں کی نگہبان ہو اور اللہ کے بندوں پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کی کوشش کرے لیکن اس خواہش کے ساتھ ساتھ یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ جتنی گنجائشیں ہندوستان کے سیکولر دستور میں ہر مذہب و ملت کے لئے موجود ہیں اور برادرانِ وطن کی عام فرقہ پرست ذہنیت کے باوجود اجتماعی انصاف کی جو روح سیکولر دستور میں جولاں ہے اور اسلامی دعوت برپا کرنے کے جس قدر مواقع موجودہ دستور کے زیر سایہ پائے جاتے ہیں انکی نظیر موجودہ دنیا کے کسی ایسے ملک میں نہیں ملتی جہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد غیر مسلموں کے زیر نگیں زندگی گذار رہی ہو۔ غیر مسلموں کا تو کیا ذکر۔ خود اُن ملکوں میں بھی جن کے فرماں روا خود مسلمان ہیں آزادی تحریر و تقریر معیار یہاں اس درجہ نہیں جتنا کہ ہندوستان میں ہے۔ اجتماع کی بعض تقریروں میں دیگر باطل نظریات کی طرح سیکولرازم کے نظریہ پر بھی خاصی لے دے کی گئی ہے اور ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافت راشدہ اور حکومت الٰہیہ کے جس آئیڈیل کو سامنے رکھ کر جماعت اسلامی ہر دوسرے نظریے کو سقیم و ناقص قرار دیتی ہے وہ واقعی ایسا ہی برتر و اعلیٰ ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی بھی دوسرا نظریہ لائق قبول نہیں، لیکن خیالی اور عملی دنیا میں جو فرق ہے اس کو نظر میں رکھا جائے تو یہ بات بہت قابل غور ہو جاتی ہے کہ کیا ہمارے موجودہ حالات میں سیکولرازم بھی کمیونزم اور ڈکٹیٹرشپ وغیرہ کی طرح شدید مخالفت کا مستحق ہے۔ کیا وہ دلائل جو سیکولرازم سے مکمل احتراز اور سیاست سے دامن کش رہنے کے بارے میں جماعت اسلامی پیش کرتی ہے عملی سطح پر بھی اتنے ہی جاندار ہیں جتنے وہ کاغذ اور زبان پر معلوم ہوتے ہیں؟

ہم کیا اور ہماری رائے کیا۔ مگر جو تھوڑی سی سوجھ بوجھ ہمیں اللہ نے دی ہے وہ کسی طرح اس بات پر مطمئن نہیں ہوتی کہ سیکولرازم سے مکمل حریفانہ سلوک کیا جائے جبکہ جماعت اسلامی کی نظریاتی منزل عملی زندگی کی سطح سے ابھی اتنی دور ہے کہ شاید آسمان بھی زمین سے اتنی دور نہ ہو کوئی کہہ سکتا ہے کہ ملک ہمارا ہے۔ حکومت ہماری ہے۔ اجتماع کی اجازت مل گئی اور پھر بخیر و خوبی مکمل آزادی کے ساتھ یہ اختتام پذیر ہو گیا تو اس میں کسی کا کیا احسان۔ کیوں ہم ممنونیت کی زحمت اُٹھائیں۔ کونسی نعمت ہمیں بخش دی گئی ہے۔

بے شک کاغذی آئین اور نظری منطق کے اعتبار سے یہ غرہ بجا ہے لیکن حقائق و واقعات اس کا ساتھ نہیں دیتے جو جماعت اہلِ اقتدار کی بلیک لسٹ میں سرفہرست ہو، جس سے وابستگی اعیانِ حکومت کے نزدیک جرم کی حیثیت رکھتی ہو، جس کے بارے میں ملک کا وزیر اعظم کہہ چکا ہو

[illegible] ہیں کہ صوبائی حکومت نے
جس کا مزاج ہی بگاڑ دیا ہو اور جو واقعۃً لادینی نظام کے لئے
ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہو اسے عین دارالسلطنت میں کھل
کھیلنے کی اجازت دیدینا ایک ایسا سلوک ہے جسے احسان کا
نہیں مگر شرافت کا درجہ ضرور دینا چاہئے اور اس شرافت کا
سہرا مرکزی حکومت کے ارباب منصب کے سر تو جاتا ہی ہے،
مگر اس دستور کے سر بھی جاتا ہے جو جمہوری ہونے کے ساتھ ساتھ
سیکولر بھی ہے۔ جماعت اسلامی چاہے ہماری ہمنوا ہو یا نہو
مگر ہم تو ذاتی طور پر دہلی سرکار کو یقیناً خراج تحسین پیش کرینگے
کہ اس نے جمہوریت کی لاج رکھ لی ہے اور مسلمانوں کو یہ محسوس
کرنے کا موقع دیا ہے کہ ابنائے وطن کی عام بے مہریوں کے باوجود
اس ملک میں مسلمانوں کے لئے زندگی کا وسیع میدان ہے جس میں
قدم قدم پر خار مغیلاں اور اینٹ پتھر سہی لیکن ایسی کوئی بندش
نہیں کہ ارباب ہمت راستہ صاف کرنے کی جدوجہد ہی کر سکیں

ہم جماعت اسلامی کے بدنام ترین حامیوں میں سے ہیں، لیکن یقین کیجئے اگر دشمن بھی ہوتے تب بھی مذکورہ اجتماع کے نظارے سے ہمیں بے حد خوشی ہوتی۔ کیونکہ اس سے قطع نظر کہ اس کے طفیل مسلمانوں کے ژولیدہ مسائل کس حد تک حل ہوئے اور معاشرے کی اصلاح کا کیا راستہ نکلا مجرد اس کا منظر ہی مسلمانوں کی زندگی کا ایک صحت مند مظہر تھا جس نے ہر آنکھ والے کو محسوس کرایا کہ اقامتِ دین کی دعوت لے کر اٹھنے والے سنجیدگی، وقار، خوش انتظامی، نظم و نسق، رکھ رکھاؤ اور سلیقہ مندانہ خدمت میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ باہر سے آئے ہوئے تقریباً چار ہزار شرکاء کے علاوہ باشندگان دہلی نے بھی اس اجتماع میں نہایت ذوق و شوق سے حصہ لیا۔ اگرچہ ان کی ضیافتِ طبع کے لئے اسٹیج پر نہ تو کسی خوش گلو شاعر سے نظمیں پڑھوائی گئیں نہ سنجیدہ و خشک تقریروں کے دوران میں ان جذباتی لگاوٹوں سے کام لیا گیا جو لذت پسندی کے ذوقِ عام کو تسکین دے سکتیں مگر ہر نشست تقریباً بیس بائیس ہزار آدمیوں پر مشتمل ہی اور مقالات و تقاریر کو اس دلچسپی اور انہماک کے ساتھ سنا گیا کہ معلوم ہوتا تھا مقرر یا مقالہ خواں کے سوا یہاں سب بے زبان ہی بیٹھے ہیں۔ اس کیفیت کو برے معنی بھی پہنائے جا سکتے ہیں؛ لیکن سامعین کی یہ کیفیت پروگرام اور مقالات و تقاریر کی جس سپاٹ متانت اور بوجھل ہوشمندی کا ثمرہ تھی اسے، ہم حزم و احتیاط کے پہلو سے لائق تعریف ہی کہیں گے۔ عوام جلسے کا مطلب سمجھتے ہیں عشاء کے بعد چار پانچ گھنٹے ڈٹ کر بیٹھنا اور دو چار خوش گلو قرآن خوانوں کی لحن نوازی سے لطف اندوز ہونے کے بعد ایک دو بلند بانگ شاعروں کا پرجوش کلام سننا۔ پھر لچھے دار تقریروں سے حلق تک پیٹ بھرنا۔ جماعت اسلامی کے جلسوں میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ صبح نو سے گیارہ تک جلسہ۔ پھر دو سے چار تک۔ پھر بعد مغرب سے عشاء تک۔ بعد عشاء تو دو دن ہوا جس میں ایک دن پروگرام سے زائد تھا اور ہوا صرف دو گھنٹے۔ گویا جتنا وقت عام جلسے شباب پر آنے میں لیتے ہیں اتنے وقت میں یہاں محفل ہی ختم ہو گئی۔ ان تمام بوالعجبیوں کے باوجود پنڈال کا بھرا چلنا اور ہزاروں آدمیوں کا جما رہنا ثابت کرتا ہے کہ مسلم عوام میں اب بھی قیادت کی تڑپ اور رہنمائی کی جستجو شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ انھیں احساس زیاں باقی ہے اور اس کی تلافی میں ذہنی طور پر خاصے سرگرداں ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اجتماع کو یہ بے مثال کامیابی اس دلی شہر میں ہوئی جہاں جماعت اسلامی کے بارے میں بہانت بہانت کا پروپیگنڈہ تھا کہ اس نے تو اپنی حدیثیں بھی الگ بنائی ہیں۔ جہاں مولوی محمد میاں صاحب والی جمعیۃ العلماء کا مرکز ہے اور جہاں بعض جوکر ٹائپ "علماء" یہ اشتہار چھاپتے ہیں کہ جماعت اسلامی انگریزوں کی ایجنٹ ہے۔

راقم الحروف کو ایک بزرگوار پر بڑا رحم آیا۔ یہ اپنی لانبی سفید ریش اور جھریوں دار بدن کے آئینے میں ایسے لگ رہے تھے جیسے ابھی ابھی قبر سے اٹھے چلے آ رہے ہوں۔ ان بیچارے نے پنڈال سے باہر ایک کتابچہ تقسیم کیا۔ اس میں مولانا مودودی پر کئے گئے ان فرسودہ اعتراضات کو جمع کیا گیا تھا جن کی خاک بھی اب لحد میں نہیں ملتی ـــ جی چاہا کہ ان سے ادب کے

ساتھ عرض کروں کہ حضرت محترم! مولانا مودودی اس اجتماع میں تشریف نہیں لائے نہ ان کا کوئی مرید یہاں موجود ہے۔ آپ یہ اعتراض نامہ انھیں ڈاک سے بھیج دیں تو بہتر ہو۔ لیکن پاس جا کر ان کا چہرہ دیکھا تو کچھ ایسی بیکسی اور معصومیت اس پر نظر آئی کہ، بس السلام علیکم کہہ کر رہ گیا اور سلام کا جواب انھوں نے کچھ اس انداز سے جھوک کر دیا جیسے کہہ رہے ہوں تم خود ہو گے السلام علیکم!

دہلی کے مسلمان عوام نے جس فیاضی اور فراخ دلی سے جماعت اسلامی کے اجتماع کا خیر مقدم کیا ہے اسے ہم خدا کا خاص فضل سمجھتے ہیں اور اسے بھی تفضل ہی سمجھتے ہیں کہ جمعیۃ العلماء کے اخبار الجمعیۃ نے اجتماع کی خبروں کا بلیک آؤٹ کر کے اپنے ارباب حل و عقد کی وسیع النظری اور سیر چشمی کا جغرافیہ واضح کر دیا۔ مانا کہ جمعیۃ العلماء جماعت اسلامی سے اختلاف رائے رکھتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ بعض امور میں اس کی رائے نسبتاً درست بھی ہو لیکن صحافتی دیانت کا یہ تقاضا تو بہرحال تھا ہی کہ جس اجتماع نے دارالسلطنت میں دھوم مچا رکھی ہو چپے چپے پر جس کا تذکرہ ہو اسے بطور امرِ واقعہ کے اپنے اخبار میں تسلیم کر لیا جائے۔ اجتماع کے دوسرے دن خبر شائع ہوتی بھی ہے تو چند سطروں کی غیر نمایاں طور پر۔ حالانکہ اسی دن فتح پوری کے ایک چھوٹے سے جلسے کی خبر اس سے زیادہ جگہ میں چھاپی جاتی ہے۔

ایک اور تماشا الجمعیۃ نے کیا۔ امیر جماعت مولانا ابو اللیث صاحب کی جس اختتامی تقریر کا اعلان مطبوعہ پروگرام میں کیا گیا تھا وہ فی الحقیقت ہوئی تو کہیں بھی نہیں مگر الجمعیۃ کے فاضل نامہ نگار نے بلا تکلف لکھ ڈالا کہ مولانا ابو اللیث نے یوں فرمایا اور یوں فرمایا۔

خیر یہ سب کچھ کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ جس نے جو کیا تاریخ اسے ریکارڈ کر رہی ہے اور ہر فرد اور ہر گروہ کے اعمال نامے فرشتے لکھے جا رہے ہیں۔ خوشی اس کی ہے

کہ چندے کے نام پر ایک پیسہ وصول کئے بغیر جماعت اسلامی کا اتنا عظیم الشان اجتماع کر گزری ہے۔ طبعزاد الزامات کے سہارے اسے بدنام کرنے والوں کا طلسم خاصی دور تک دھواں ہو کر رہ گیا ہے۔ سننے والوں نے سن لیا کہ یہ جماعت نہ تو کوئی نیا اسلام پیش کرتی ہے نہ اپنے سے باہر کے مسلمانوں کو نام کا مسلمان سمجھتی ہے۔ یہ تو سیدھی سچی وہی دعوت پیش کر رہی ہے جو قرآن و حدیث نے کی، جو صحابہ و تابعین نے کی۔ جو تمام علمائے حق نے کی۔

البتہ راقم الحروف کو ایک اعتبار سے قدرے مایوسی ہوئی اور میرا خیال ہے اجتماع میں شریک ہونے والے تمام ہی عامۃ المسلمین اس مایوسی میں شریک ہوں گے جماعت اسلامی جن بنیادوں پر قایم ہوئی ہے، جو کچھ اسکی دعوت ہے، جس صلاح و فلاح کی یہ طالب ہے اس کا اجمالی علم تو تقریباً سبھی کو ہے۔ تمام مسلمان جانتے اور مانتے ہیں کہ خدا کی بندگی، رسول کی اطاعت اور اسلام کی خدمت امورِ ضروریہ ہیں۔ پھر جن لوگوں نے جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھا ہے انھیں تفصیل کے ساتھ بھی معلوم ہے کہ جماعت اسلامی ان امور کی تعبیر کس نہج سے کرتی ہے۔ انکا دائرہ اس کے نزدیک کہاں تک وسیع ہے، وہ کن زاویوں سے قومی و ملکی مسائل کو دیکھتی ہے۔

لیکن نہ جانے کیوں میں کچھ اس طرح کی امید لیکر دہلی گیا تھا کہ اس اجتماع میں وہ اس سے زیادہ بھی کچھ کہے گی جو اب تک کہتی رہی ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ تجویزیں ایسی ضرور سامنے لائے گی جو ہندوستانی امت مسلمہ کے الجھے ہوئے مسائل میں سنگ میل نہ سہی تو اشاریہ ضرور بن سکیں۔ وہ اس افتراق و تشتت اور عناد و کشمکش کے بارے میں جو مختلف مسلم جماعتوں کے مابین موجود ہے اور جس نے امت مسلمہ کا شیرازہ منتشر کر رکھا ہے عوام و خواص کے آگے کوئی جچی تلی اسکیم نہ سہی تو پختہ تجویز ضرور رکھے گی۔ وہ سیاست سے مکمل انقطاع اور سیکولر نظام سے کلی بیزاری کے عوض امت کو کوئی ایسا پیغام دیگی

انھیں دوسری راہوں سے ہٹا کر اقامت دین کی جدو جہد کی طرف لا سکے اور انھیں صرف ذہنی ہی نہیں عملی سرو فیت بھی عطا کرے۔ وہ سامعین کی استعداد کے مطابق ایسی توضیحات سامنے لائے گی جو اقامت دین کی کامیابی کے بارے میں امت کو امید کی ہلکی سی کرن عطا کر سکیں، جو یہ باور کرا سکیں کہ جس بلند و برتر منزل کو ہدف بنایا گیا ہے اس تک پہنچنا ممکن بھی ہے۔

لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس باب میں تشنگی ہی رہی اہل حق نے اپنی حق پسندیوں کا اعلان و اظہار خوب خوب کیا۔ مولانا ابو اللیث کا خطبہ اگرچہ کسی غیر معمولی طرز و اسلوب کا حامل نہ تھا۔ نہ اس میں کوئی ایسی امتیازی چیز تھی جو سامع و قاری کو چونکا دے اور احساس دلائے کہ واقعۃً جماعت اسلامی ہی وہ واحد جماعت ہے جس کی رہنمائی امت مسلمہ کو موجودہ و آئندہ مسائل سے بحسن و خوبی عہدہ برآ کر سکتی ہے۔ لیکن اس میں حق پرستی کی تب و تاب، ایمان کی تڑپ اور اعلائے کلمۃ الحق کی تمنا یقیناً انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اس کو سننے اور پڑھنے سے احساس ہوتا تھا کہ صاحب خطبہ صرف "مولوی" ہی نہیں ہیں۔ مسائل حاضرہ سے واقف بھی ہیں اور باطل کی نقاب پوش تحریکوں کے کچے چٹھے سے اچھی طرح باخبر بھی۔

خطبہ کے علاوہ جتنے مقالات اور تقاریر نے سامعین کو نوازا ان میں بھی صالحیت، حق کیشی، خلوص و للہیت اور ایمان و ایقان کا نور جاری و ساری تھا۔ ان میں بھی حق پرست دلوں کی آرزوئیں منھ سے بول رہی تھیں۔ ان میں بھی کفر و طغیان، فسق و فجور اور جور و ستم کے خلاف بیزاری و نفرت کا لاوا ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ لیکن بایں ہمہ کوئی ایسا نکتہ ہمیں تعبیر کے پلے نہیں پڑا جو مسلمانوں کے موجودہ احوال کے تعلق سے دل میں چبھ کے نہ رہ جائے۔ جو واقعات کے دائرے میں کسی فوری اقدام کا سبق دیتا ہو۔ جو صاف طور پر یہ واضح کر سکے کہ جماعت اسلامی اور جماعت تبلیغی کا جوہری و بنیادی فرق کیا ہے۔

ہم آمادہ نہیں ہیں کہ فکر و نظر اور طریق تبلیغ کے دائروں میں جو نمایاں فرق ان دونوں جماعتوں میں ہے اسے نہ دیکھ سکیں لیکن یہ فرق جوہری نہیں ہے۔ بنیادی بھی نہیں ہے۔ جوہری و بنیادی جب ہوتا جب جماعت اسلامی نظام باطل سے مکمل انقطاع اور سیاسیات سے یک قلم گوشہ گیری کی بجائے پیش رفت اور اقدام کی کوئی مثبت اسکیم سامنے لاتی۔

مولانا حامد حسن صاحب کی تقریر معرکۃ الآراء سمجھی گئی۔ واقعی ان کے پیش فرمودہ مطالب بابانگ دہل بتا رہے تھے کہ موجودہ دنیا کے مسائل و وقائع اور سیاست و معیشت پر ان کی گہری نظر ہے۔ فن سیاست کی بین الاقوامی اصطلاحات سے وہ کافی باخبر ہیں۔ فساد و صلاح کی تکنک کو وہ خوب سمجھتے ہیں اور اسلام ہی کو دنیا کے تمام مسائل کا شافی و کافی حل ثابت کرنے میں ان کی زبان علم و فہم کے موتی بکھیرتی ہے۔ دو گھنٹوں میں انھیں تین موضوعات پر بولنا تھا۔ بین الاقوامی مسائل۔ ملکی مسائل اور خاص ہندوستانی امت مسلمہ کے مسائل۔ ظاہر ہے ہم سامعین کے لئے تو تیسرا ہی موضوع دلکش ہو سکتا تھا۔ لیکن اتفاق کہئے یا مشیت ایزدی کہ مولانا موصوف نے سارا وقت پہلے ہی دو موضوعات پر صرف کر دیا اور اونچی سطح کے سامعین چاہے سیراب ہو گئے ہوں لیکن عوام پیاسے ہی رہ گئے عوام کو بین الاقوامی اور ہمہ گیر ملکی سیاست سے کیا لینا۔ انھیں تو خود اپنے حشر سے دلچسپی ہے اور یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں بلکہ قدرتی اور فطری ہی امر ہے کہ عوام اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں علمی موشگافیاں اور اونچی اونچی باتیں ان کے کام نہیں آسکتیں اگلے کسی وقت میں مولانا موصوف کا پروگرام نہیں تھا اور تقریر کے خاتمے پر بھی اس کا اعلان نہیں کیا گیا کہ رہا ہوا سب سے ضروری موضوع کب بیان ہوگا۔ باہر نکل کر جب مختلف حضرات سے گفتگو ہوئی تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ صرف میں ہی نہیں اور لوگ بھی اس کمی کا شدید احساس کر رہے ہیں۔ غالباً اسی احساس کا رد عمل تھا کہ رات کو پھر مولانا موصوف کی تقریر کرائی گئی اور اس میں انھوں نے ۲ گھنٹے خطاب عام فرمایا۔

ماجرہ کا ارادہ مقالات کی دونوں تقریروں پر مفصل اظہارِ خیال کرے گا۔ چنانچہ ضروری اقتباس بھی لئے تھے لیکن وقت کی تنگی اور بیماری اس کی اجازت نہیں دیتی اس لئے تفصیل سے گریز کرتا ہوں۔ مختصراً یہ کہ پہلے دو موضوعات پر انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ علمی و فنی حیثیت سے بلند ہونیکے باوجود بعض سطحی اور ناپختہ آراء سے خالی نہ تھا۔ چند اجزائے کلام تو ایسے تھے کہ سمجھ ہی میں نہ آسکے۔

رات کے خطاب میں اگرچہ انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ امتِ مسلمہ کے مسائل پر کلام کیا، لیکن انتخابی سیاست سے انقطاع کے حق میں اور حصّہ لینے کے خلاف جو درجہ بدرجہ بحث انھوں نے کی وہ پُرمغز نہیں تھی۔ بعض مراحل میں تو ان کا استدلال خاصا نامحکم رہا۔ سیاست میں حصّہ لینے کے جن مفاسد کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ وہی ہیں جنھیں جماعت اسلامی کے لٹریچر میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ ہمارا پہلے بھی خیال تھا اور آج بھی خیال ہے کہ سیکولر اسٹیٹ کی ملازمت اور لادینی سیاست میں حصّہ لینے کے خلاف جماعت اسلامی کا نقطۂ نظر ناشافی اور غیر اطمینان بخش ہے۔ مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں نے دلائل کے ذریعہ اس کی تشریح بھی کی ہے اور ہماری ناقص رائے میں یہ تشریح قابلِ فہم بھی ہے۔ مولٰنا حامد حسن صاحب نے جماعتی نقطۂ نظر کو اس انداز سے بیان فرمایا گیا اس کے مثبت دلائل پر آج تک کوئی قابلِ لحاظ اعتراض اُٹھایا ہی نہیں گیا اور یہ ایسا واحد اسلامی نقطۂ نظر ہے جس کی محکم تردید ممکن ہی نہیں ہے — ہم سمجھتے ہیں اس انداز میں ادّعا اور خود پسندی پائی جاتی ہے۔

بڑا ستم یہ ہے کہ مولانا موصوف نے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے اتحاد و تعاون کو کسی شمار میں نہیں رکھا بلکہ اس کے برعکس اسے لاحاصل قرار دیا۔ ہو سکتا ہے وہ بعض الفاظ تقریر کی روانی میں کہہ گذرے ہوں اور نیت ان کی نیک ہو لیکن تاثر ان کی تقریر کا بہرحال یہی رہا کہ مسلمانوں کا باہمی افتراق و تشتت کسی دردمندانہ توجہ کا مستحق نہیں۔ جماعت اسلامی اسے کوئی اہمیت نہیں دیتی کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتیں سر جوڑ کر سوچیں اور قدم ملا کر آگے بڑھیں۔ وہ اونچے مقام پر کھڑے ہو کر ایک ہی لہجے اور ایک ہی پرواز میں دین و اخلاق کا پیغام نشر کرنا کافی سمجھتی ہے اور اس کی پروا نہیں کرتی کہ باہمی افتراق اور سیاست سے بے تعلقی کی صورت میں اقامتِ دین کی گاڑی عمل کی راہوں میں چلے گی کیسے۔

فحش لٹریچر کی اشاعت کے سلسلہ میں انھوں نے ایک خاص ادارے کا نام لیا۔ یہ بات بھی اچھی نہیں تھی شخصی تذلیل و تحقیر اُس مقامِ بلند سے فروتر ہے جس پر جماعت اسلامی فائز ہے۔ اُسوۂ رسولؐ بھی اس کے خلاف ہی ہے۔

حاصلِ گفتگو یہ کہ جماعت اسلامی کا یہ کُل ہند اجتماع متعدد اعتبار سے نہایت کامیاب رہا۔ ہزاروں سامعین کا قابلِ فخر اجتماع۔ شائستہ و پُروقار نشستیں۔ مثالی نظم و انتظام۔ ایمان افروز مقالات۔ حق پسندانہ تقریریں۔ رونق ہی رونق۔ پاکیزگی ہی پاکیزگی۔ کلکتہ، بمبئی، میسور، مدراس اور نہ جانے کہاں کہاں سے شمع حق کے پروانے کھنچے چلے آئے۔ دلوں میں اعلائے کلمۃ الحق کا جذبہ، روحوں میں اسلام کی تڑپ، ذہنوں میں صلاح و فلاح کی تمنائیں۔ جامع مسجد میں پانچ وقت شاید ہی عرصہ دراز سے اتنی بھری پُری نمازیں ہوئی ہوں۔ جامع مسجد کا علاقہ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں مستقلاً عید آگئی ہو۔ بہت بڑی کامیابی اس اجتماع کی یہ ہے کہ اس کے ذریعے جماعت اسلامی نے دہلی کے عوام پر اپنا وجود ثابت کر دیا۔ اور وہ عظیم پبلسٹی حاصل کی جو بعض جماعتوں کو دس اجتماعات پر بھی حاصل نہیں ہوتی۔

پھر یہ فائدہ بھی اس اجتماع کا کم نہیں ہے کہ جماعت اسلامی کی جو دعوت پڑھے لکھے حلقوں میں گشت کر رہی تھی اس کے قدم اب عوام کی بارگاہ میں بھی پہنچ گئے ہیں اور اس خواہش کی تخم ریزی ہوگئی ہے کہ جماعت اسلامی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ (باقی بر صفحہ ۵۵)

تجلی کی ڈاک

اونچی دکان پھیکا پکوان

سوال:- از احمد حسین - ایر آسام -

کچھ دنوں قبل میری نظر سے ایک کتاب گذری جس کا نام "الامن والعلے" ہے - جو اہل بدعت کے پیشوا مولوی احمد رضاخاں کی تصنیف ہے - اس میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "تقویۃ الایمان" پر تنقید کی گئی ہے - ان کی ساری تنقیدیں تو تار عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں - مگر ایک تنقید جو اشتراک فی العلم کی اس عبارت پر کہ :-

"ظاہر کی چیزوں کو دریافت کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے جب چاہیں کریں جب چاہیں نہ کریں - سو اس طرح غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو جب چاہے کر لیجئے یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے کسی ولی اور نبی کو، جن اور فرشتے وغیرہ کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی "

ظاہراً مجھ جیسے کم علم عوام کے لئے بہت وزندار معلوم ہوتی ہے - مولوی صاحب موصوف کے تنقیدی الفاظ یہ ہیں :-

"او! اللہ عزّوجل کو سخت عیب لگانے والے بے ادب گستاخ یہ ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کی شان نہیں وہ اس بیہودہ جہل شان سے پاک و منزّہ ہے اس کا علم اس کی صفتِ ذاتیہ ہے اس کے اختیار سے نہیں اس کی مخلوق نہیں ازلی ابدی ہے حادث نہیں او! بدعقل بدزبان - غیب کا دریافت کرنا اختیار میں ہونے کے یہی معنی ہیں یا کچھ اور کہ بالفعل تو معلوم نہیں مگر چاہے تو معلوم کر سکتا ہے - تف بر روئے بیدینی - یہ تیرا موہوم خدا جاہل بالفعل محل حوادث ہو گا - سچا خدا تیری اس گالی سے بے نہایت متعالی ہے " وغیرہ وغیرہ -

یہ ہیں خاں صاحب کے من و عن الفاظ جو میں نے درج کئے -

الجواب:-

آپ کے سوال کا جو عنوان ہم نے قائم کیا ہے وہ تفنن پر مشتمل نہیں ہے - واقعہ یہ ہے کہ مولانا احمد رضاخاں صاحب ایک بہت بڑے گروہ کے پیشوا ہیں - انھیں سیکڑوں لوگ مجدد، امام اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں - اس اعتبار سے "اونچی دکان" کا استعارہ ان کی ذات گرامی پر واقعتہً منطبق ہوتا ہے - لیکن جو لوگ ان کے اس اندازِ تحریر کو دیکھیں گے جس کا ایک نمونہ آپ نے نقل کیا وہ اس کے سوا کیا کہیں گے کہ ان بزرگوار کو تو عالموں جیسی زبان بھی لکھنی نہیں آتی - اسی کا نام "پھیکا پکوان" ہے - زبان سے گذر کر معانی پر آیئے تو وہ بھی اتنی نیچی سطح کے ہیں کہ کسی سنجیدہ مفکر سے ان کی توقع نہیں کی جا سکتی - حیرت ہے آپ ایک ایسے اعتراض کو وزن دار محسوس کر رہے ہیں جو لائقِ التفات تک نہیں ہے - فرض کیجئے زید کے گھر سے دس ہزار روپے چوری ہو جاتے ہیں - وہ افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وا حسرتا! اگر میں نے یہ روپے گھر کی بجائے بینک میں رکھے ہوتے تو چوری نہ جاتے -

اس پر بکر بھڑک اٹھتا ہے کہ زید تو کافر ہوا - وہ تقدیر کا انکار کر رہا ہے - تقدیر ہی جب یہ تھی کہ روپیہ

پھر دیکھئے تو زید کا یہ کہنا کہ جنگ میں ٹک ٹکے سے وہ بچ جاتا ہے صحیح معنی رکھتا ہے کہ اس کے نزدیک تقدیر کے نوشتے اٹل نہیں ہیں!

فرمائیے۔ بکر کی اس منطقی موشگافی پر آپ التفات کریں گے؟

دوسری مثال لیجئے۔ زید بکر سے اصرار کر رہا ہے کہ کل ہمارے گھر ضرور آنا۔ بکر کہتا ہے ضرور آؤں گا۔ زید کہتا ہے۔ دیکھو ایسا نہ ہو رک جاؤ۔ بکر کہتا ہے — ناممکن ہے۔ رک کیسے سکتا ہوں۔

اس پر طلحہ شور مچا دیتا ہے کہ بکر مرتد ہوا۔ وہ خدا کو قادرِ مطلق نہیں سمجھتا۔ اگر سمجھتا تو یہ کیسے کہتا کہ میرا رکنا ناممکن ہے۔ خدا کو پوری قدرت ہے کہ کل اسے زید کے گھر جانے سے روک دے تو رکنے کو ناممکن کہنا خدا کی قدرت کاملہ سے انکار اور اپنی خدائی کا اعلان ہے!

کہیئے۔ طلحہ کے اس فنکارانہ واویلا پر آپ توجہ دیں گے؟

اگر نہیں دیں گے اور یقیناً نہیں دیں گے تو جو وجہ یہاں آپ کو قبولِ اعتراض سے روک رہی ہے وہی بعینہٖ پیش فرمودہ سوال میں بھی موجود ہے۔ جس طرح تقویۃ الایمان کی سادہ عبارت سے فاضل معترض نے ہولناک منطقی نکتہ پیدا کیا ہے اسی طرح دونوں مثالوں میں معترضین کے نکالے ہوئے نکتے بھی منطقی اعتبار سے غلط نہیں کہے جا سکتے۔ پھر بھی انہیں سرتاسر غلط بجز انصاف بتاتا ہے کہ آپ اور ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بنیادی حقیقت کو سمجھتا ہے کہ جو گفتگو جس سطح پر ہو رہی ہو اسے اسی سطح کے معیاروں سے ناپا جانا چاہئے۔ ہر فن، ہر موضوع کی کچھ حدیں ہیں۔ کچھ مقامات ہیں۔ بات اگر روزمرہ کی زبان میں ہو رہی ہے تو منطق اور علم کلام کی کسوٹی پر نہیں کسی جائے گی۔ ادبی مقالے کو سائنس کے شکنجے میں نہیں جکڑا جائیگا اصطلاحی زبان کو لغت اور فلسفے کی مار نہیں دی جائے گی۔

تقویۃ الایمان کی جس عبارت پر فاضل معترض علم کلام و الٰہیاتی فلسفے کے حملے ضرب لگائے ہیں وہ روزمرہ کے اسلوب اور عام فہم طرز میں ہے جو دار تعلیم و تفہیم ہے۔ اللہ کا علم صفت ذاتی ہے اور قدیم ہے حادث نہیں یا کسی حادثے کا محل نہیں۔ اس طرح کی دقیق باتیں ظاہر ہے کہ عوام کی سطح سے بلند ہیں۔ ان کا تعلق فلسفۂ الٰہیات سے ہے اور ان پر بحث و گفتگو علماء کا ایک جداگانہ موضوع ہے۔ تقویۃ الایمان اس موضوع کے دقیق نکات بیان کرنے کے لئے نہیں لکھی گئی، بلکہ وہ تو اُن فاسد عقائد و اعمال کے رد میں لکھی گئی ہے جو کج فکر علماء کی فاسد نگاہی سے عوام میں مقبول و مروج ہو گئے ہیں اور حضرت شہیدؒ کے پیش نظر عوامی اصلاح ہے نہ کہ فلسفۂ الٰہیات کی غامض بحثیں۔ اسی لئے انھوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جو روزمرہ کی ہے، اور جس کا مفہوم سمجھنے میں معاند و متعصب کے سوا کسی کو بھی کوئی مغالطہ نہیں لگتا۔ جو شخص اس زبان پر فلسفہ و کلام کی چاند ماری کرتا ہے اس کی مثال اُن معترضین کی سی ہے جن کا ذکر ابھی دو مثالوں میں آیا۔ نارمل حالات میں کسی مطالعہ کرنے والے کے فرشتے بھی تقویۃ الایمان کی معترض فیہ عبارت میں زندقہ و بے دینی کے جراثیم نہیں دیکھ سکتے تھے، لیکن مولانا احمد رضا خاں صاحب کی جگہ بیٹھ جائیے تو یہ کیا دنیا کی ہر کتاب کی متعدد سادہ عبارتیں کفر و الحاد، حماقت و سفاہت اور ہذیان و لغویت کا پلندہ نظر آئیں گی۔ اور تو اور خود قرآن موصوف کے کلامی نشتر کی جراحت سے نہیں بچ سکتا جیسا کہ ابھی ہم آپ کو دکھلائیں گے۔

متوسطین کے لئے اتنا لکھنا کافی تھا، لیکن موٹی سمجھ والے شاید ابھی تک تشفی حاصل نہ کر سکے ہوں اس لئے ہم دو اور دو چار کی طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دیکھئے۔ فاضل معترض یہی تو اعتراض فرما رہے ہیں کہ اس عبارت سے اللہ کے علم بالفعل کی نفی ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس کا علم ازلی ابدی ہے۔ جو کبھی بھی ابد تک ہونا ہے اسے ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بھی چیز ان کے علم سے باہر ہو اور وقت ضرورت وہ اسے معلوم کریں۔ ان کا علم انکی عین ذات میں داخل ہے۔ غیر مخلوق ہے۔ وغیرہ۔

اب ذرا قرآن اٹھائیے۔ آلِ عمران کے چودھویں رکوع میں اللہ فرماتا ہے:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ۔

کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ نے معلوم نہیں کیا کہ تم میں کون لڑنیوالے ہیں اور نہ یہ معلوم کیا کہ تم میں کون ثابت قدم رہنے والے ہیں۔

+ + + +

+ + + +

کیا سامنے آیا؟ غور سے دیکھ لیجئے ہم نے کہیں تحریف تو نہیں کر دی۔ جتنے مستند ترجمے مل سکیں سب پر نظر ڈال لیجئے اور پھر ایمانداری کے ساتھ فیصلہ دیجئے کہ جو اعتراض تقویۃ الایمان کی عبارت پر جڑ دیا گیا تھا کیا وہی اس سے زیادہ شدت و صراحت کے ساتھ نعوذ باللہ خود قرآن پر وارد نہیں ہو جاتا؟ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ اللہ خود فرما رہا ہے کہ ابھی تو ہم نے معلوم ہی نہیں کیا تم آگے کو کیسے ثابت ہونے والے ہو ــــ اب بتائیے۔ فاضل معترض کے طعنہ ہائے بے دینی و بے عقلی کی زد عیاذاً باللہ کہاں تک جا کے پڑتی ہے۔

اور لیجئے۔ سورہ توبہ رکوع ۲ میں ارشاد باری ہے:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً۔

کیا تم گمان کرتے ہو کہ (یونہی) چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے معلوم ہی نہیں کیا کہ تم میں سے کن لوگوں نے جہاد کیا ہے اور سوائے اللہ، رسول اور مومنوں کے کسی کو اپنا خصوصی دوست (بھیدی۔ یار غار) نہیں بنایا ہے۔

+ + + +

ٹھیک وہی بات جو سورہ آلِ عمران میں بیان ہوئی۔ گویا تقویۃ الایمان کے معترض کے مریض تعقل کے لئے دوسری صریح تنبیہ۔

سورۂ حدید رکوع ۳ بھی دیکھ لیجئے:۔

وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ۔

اور تاکہ معلوم کرے اللہ کہ کون اسکی اور اسکے رسولوں کی مدد کرتا ہے بن دیکھے

یہ تیسری واضح تنبیہ ہے۔ ایک دفعہ تقویۃ الایمان کی عبارت اور معترض کی خامہ فرسائی پھر سے دیکھ لیجئے اور دل پہ ہاتھ رکھ کے کہئے کہ ادب و انشاء کے حدود اور گفتگو کے سیاق و سباق سے بے بہرہ ہو کر جو حملہ حضرت شہیدؒ کی بے غبار عبارت پر صلواتوں کے باڑھ کے ساتھ کیا گیا تھا کیا بعینہٖ وہی حملہ قرآنِ کریم کی متذکرہ تینوں آیات پر اس سے زیادہ شدت کے ساتھ نہیں ہوتا۔ فاضل معترض ـــ اللہ ان کی خطاؤں سے درگذر فرما کر رحمت سے نوازے اگر تعصب، اشتعال اور کج نگاہی کے اندھیرے میں گم ہو کر آیاتِ الٰہیہ کو نہ بھلا بیٹھے ہوتے تو ہرگز وہ بدزبانی نہ کرتے جو انھوں نے حضرت شہیدؒ کے بارے میں کی ہے۔ ان کی منطقیانہ نکتہ سنجی کی زد اتنی قطعیت کیساتھ آیاتِ الٰہیہ پر پڑتی ہے کہ کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقتِ حال کیا ہے؟ کیا یہ عقیدہ ہی غلط ہے کہ اللہ ابدالآباد تک پیش آنے والے ہر واقع کو ہمیشہ سے جانتا ہے بلکہ اس کا معاملہ ہم بندوں ہی جیسا ہے کہ جب کوئی بات ظہور میں آگئی اس وقت اسے علم ہوا جیسا کہ متذکرہ آیات کے ظاہرِ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ یا عقیدہ تو یہی درست ہے مگر آیات اپنے ظاہری الفاظ پر محمول نہیں کی جائیں گی؟

ہمارا جواب یہ ہے کہ عقیدے میں کوئی غلطی نہیں اور اللہ کا علم ازلی و ابدی ہے لیکن غلطی اُس فکر و نظر میں ہے جسے یہ ہوش نہیں کہ اصطلاحی زبان کیا ہوتی ہے اور زبان و بیان کے مروّجہ اسالیب کس طرح فلسفہ و منطق کی خوردہ گیریوں سے بلند ہوتے ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فلسفہ کی سطح پر نہیں بلکہ ادب و انشاء کی سطح پر کلام فرمایا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ان کے کسی صحابی کو یا کسی اور عالم کو کبھی ان سے یہ دھوکا نہیں لگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کو غیر ازلی اور حادث بیان فرما رہے ہیں بلکہ وہ یہی سمجھتے رہے کہ باری تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان مروّجہ طریق گفتگو کے ایک معروف اسلوب میں کلام فرمایا ہے انھیں خوب معلوم ہے کہ کون ثابت قدم مجاہد نکلے گا اور

کرین اس کے برعکس لیکن وہ ہم انسانوں کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے تنزیل فرما رہے ہیں۔

ٹھیک یہی معاملہ صاحب تقویۃ الایمان کا ہے۔ اگر ان سے براہِ راست سوال کیا جاتا کہ تم اللہ کے علم کو قدیم مانتے ہو یا حادث؟ ذاتی مانتے ہو یا صفاتی؟ جوہری مانتے ہو یا عرضی؟ تو یقیناً ان کا جواب علمائے حق کے مسلک کے مطابق ہوتا۔ لیکن جس جگہ کی عبارت پر اعتراض کیا گیا ہے وہاں اس طرح کا کوئی سوال درپیش نہیں تھا بلکہ یہ سوال درپیش تھا کہ جس طرح اللہ کو غیب کا علم ہے کیا اسی طرح کسی اور کو بھی ہو سکتا ہے یا ہوا ہے؟ بدقسمتی سے مسلمانوں ہی میں ایک گروہ یہ لغو ترین عقیدہ رکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب تھا۔ کچھ لوگ دو قدم آگے بڑھ کر اولیاء اللہ کے بارے میں بھی یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ جب چاہے اپنی باطنی قوت سے اُمورِ غیبی پر آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ حضرت شہیدؒ تقویۃ الایمان میں انھی بوالفضولیوں کا رد فرما رہے ہیں اور ان کا اندازِ گفتگو وہی معروف اصطلاحی اسلوب رکھتا ہے جو متذکرہ آیات میں ہے۔ اگر آیات کی تاویل کی جا سکتی ہے تو ان کے قول کی تاویل کیوں نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے تو کھل کر وہ بات نہیں کہی ہے جس پر صلواتیں سُنائی جا رہی ہیں قرآن نے کھل کر بے ریب لفظوں میں کہا ہے کہ ابھی تو اللہ نے یہ معلوم ہی نہیں کیا۔ ابھی تو وہ یہ معلوم کرے گا۔ وغیر ذلک

~~~

مولانا احمد رضا خاں صاحب کے معتقدین متوسلین اس ایک اعتراض پر قیاس فرمالیں کہ ان کے پیشوا نے بندگانِ توحید کو گمراہ ٹھیرانے کے لئے کس حد تک علم و متانت کا دامن چھوڑ دیا ہوگا۔ ہم جتنا کچھ مطالعہ موصوف کے طرزِ فکر اور ان کے ہم مسلکوں کے علم کلام کا کر پائے ہیں یہی ثابت ہوا ہے کہ غلو اور افراط و تفریط نے ان حضرات کی نگاہ کا زاویہ ہی بگاڑ دیا ہے۔ بھرے کمالیں ہی اگر ناقص ہو تو دنیا کی حسین سے حسین شے کی تصویر اسی طرح خراب آئے گی جس طرح جیسے آگے ہر منظر ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی اصلاح کی توفیق دے۔

~~~

ہم اگر فاضل معترض ہی کی سطح پر آجائیں تو لیجئے انکی اسی گل افشانی میں ایک فقرہ ہے جو انھیں اللہ کی شان میں گستاخی کرنے والا ثابت کرتا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ "اس کا (اللہ کا) علم صفت ذاتیہ ہے اس کے اختیار سے نہیں"۔۔۔۔ اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ اللہ کا علم اس کے اختیار سے باہر ہے۔ تو گویا موصوف کے نزدیک اللہ مختارِ کُل نہیں۔ مختارِ کل وہی ہوتا ہے جس کے اختیار سے کوئی شے باہر نہ ہو۔ علم جیسی ہمہ گیر اور اساسی چیز جس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو وہ کیسے مختارِ کل ہو سکتا ہے۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ موصوف اللہ کے اختیارِ کلی کے منکر ثابت ہوگئے اور سیدھے سادے لوگوں سے ہمیں منوں دادِ تحسین مل گئی۔

مگر نہیں دوستو۔ یہ مکھی مار قسم کے اعتراض جڑنا شریفوں کا کام نہیں۔ ہمارا یہ اعتراض محض ویسی ہی شعبدہ بازی ہے جیسی حضرتِ موصوف نے دکھلائی ورنہ اس کی صحیح جگہ ردّی کی ٹوکری کے سوا کہیں نہیں۔ بھولے سے بھی مت کہنا کہ احمد رضا خاں صاحب اللہ کے اختیارِ کلی کے منکر تھے۔

فال نکالنا

سوالؔ:۔ از سیّد رحمت اللہ بستی منگلم۔

قرآنی آیات سے فال نکالنا اور اس کے نتیجے پر یقین کرنا کتاب وسنت کی رو سے کیا ہے؟

الجوابؔ:۔

فال چاہے قرآن سے نکالی جائے چاہے دیوانِ حافظ وغیرہ سے۔ ہماری نظر میں اس کا کوئی مقام دین میں نہیں ہے۔ اسلام نے کسی ایسے موقع پر جب آدمی کسی مباح کام کے

گئے ذکر کئے ہیں ان میں سب ہی اور فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کر گزرنے یا چھوڑنے کے انتخاب کی اجازت دی ہے۔ استخارہ شگون اور ٹوٹکے وغیرہ کی قسم سے نہیں ہے۔ اس میں مومنین کے لئے ایک اعتباری قسم کی تسلی کا سامان بہم پہنچایا گیا ہے اور بس۔ تیقن کا لزوم اس میں بھی نہیں۔ یعنی استخارے کے بعد جو کام کیا گیا ہے ضروری نہیں کہ وہ مادی نتائج اور ظاہری توقعات کے لحاظ سے مفید ہی ثابت ہو۔

رہا فال تو ہمیں نہیں معلوم کہ اس کا رواج مسلمانوں میں کس بنیاد پر ہوا اور کیوں ایک اٹکل پچو طریق کو معتمد قرار دے لیا گیا کتاب و سنت اس کی تعلیم نہیں دیتے۔

مذاہب اربعہ

سوال ۳: (ایضاً)

شعر: دینِ حق را چار مذہب ساختند
رخنہ در دینِ نبی انداختند

یہ کس کا شعر ہے اور مطلب کیا ہے؟

الجواب ۳:

یہ تو نہیں معلوم کس کا شعر ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ کسی غیر مقلد شاعر کا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ فقہی امور میں چار اماموں کی تقلید سے جو چار مسلک و مذہب بن گئے ہیں شاعر انھی کو دینِ حق میں رخنہ خیال کر رہا ہے۔

حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ تقلید انتہائی ضروری چیز ہے بشرطیکہ وہ اپنی محتاط حدود میں رہے۔ تقلید کے نتیجے میں مختلف مکتب ہائے فکر کا ظہور میں آنا بھی قدرتی بات ہے۔ اس سے نہ دین میں رخنہ پڑتا ہے نہ کوئی اور آفت آتی ہے۔ دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں جس کے بہت سے اصول و فروع میں اس کے علماء باہم دگر اختلاف نہ رکھتے ہوں۔ پھر ہر عالم کے پیچھے کچھ نہ کچھ مقلد آ جاتے ہیں اور مختلف گروہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہی حال دین کا بھی ہوا۔ یہ نہ کوئی حادثہ ہے نہ مفسدہ۔ صنعتِ کردگار کی بوقلمونی اور تنوع پسندی کا ایک مظہر ہے جو نفس کی دسیسہ کاری سے بچ جائے تو رحمت ہی رحمت ہے۔

لیکن شاعر مذکور کو یا اور کچھ لوگوں کو جو مسلک و مذہب کے اختلافات دین میں رخنہ اندازی کے مرادف محسوس ہوتے ہیں تو یہ تشخیص کی غلطی ہے۔ ہمارا مرض فقہی مکتب ہائے فکر کا اختلاف نہیں، بلکہ نفس امارہ کی پرورش اور تذکیۂ قلب سے محرومی ہے آپ کسی ایک مشرب و مسلک والے گروہ کے نہاں خانے میں جھانک کر دیکھ لیجئے۔ اتحادِ مذہب کے باوجود وہاں بھی آپ کو نوع بہ نوع اختلافات و منافقات ہی کی گرم بازاری نظر آئیگی جاہ و مال اور چھوٹے چھوٹے مفادات وغیرہ کے لئے کشمکش اور تنازع۔ یہ نفسانیت ہی کی مفسدہ پردازی ہے کہ اتحاد بین المسلمین ختم ہو گیا ہے۔ فقہی مذاہب چاہے پچاس ہوں یا دو بھی نہ ہوں افتراق و انتشار جوں کا توں موجود رہے گا کیونکہ اس کی جڑیں فکر و نظر کے اختلاف میں نہیں، بلکہ نفس و خواہش کی ناپاک زمین میں ہیں۔

غیر مقلد پہلے بھی رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ کیا خود ان کے مابین بعض مسائل میں اختلاف رائے نہیں ہے؟ کیا ان کا جملہ فقہی مذاہب ختم کر کے ایک مسلک پر جم جانا دین و ملت کے لئے کسی قابلِ لحاظ منفعت کا باعث بنا ہے؟

ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ دین کی مغلوبیت میں فقہی اختلافات کا کوئی دخل نہیں۔ جب آپ دو مختلف مسلک والوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھیں تو یہ ہرگز مت سمجھئے کہ یہ لڑائی جھگڑا فقہی اختلاف کا پیدا کردہ ہے، بلکہ اصل سبب تو قلوب کا مریض ہونا ہے۔ یہ فقہی اختلاف، یہ لڑائی جھگڑا تو اس کا صرف ایک مظہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے مرض کی علامت کہہ لیجئے۔ سبب بہرحال نہیں ہے۔ فقہی مسائل پہ نہیں لڑیں گے تو یہ کسی اور معاملے میں لڑیں گے۔ کیونکہ نفوس جب موٹے ہوں اور ہر شخص ذاتی غرض و خواہش کا بندہ بن گیا ہو تو قدم قدم پر طرح طرح کے مفادات کا ٹکرانا فطری بات ہے۔ اس چکر میں کبھی نہ پھنسیئے کہ امتِ مسلمہ کا موجودہ ضعف و انتشار مختلف ائمہ کی تقلید کے باعث ہے۔ اگر تقلید ترک کر دی جائے تو اتحاد و نظم کا سورج طلوع ہو جائے گا۔ یہ نہایت سطحی

دیوانگی

سوال :۔ از غلام رسول شاہ ۔ کشمیر

کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام اس بارے میں ۔ جب کہ کشمیر میں ایک حاجی الحرمین نے اپنے دو فرزندوں کو کہہ دیا کیا آپ حضرت اسماعیل کی طرح آداب فرزندی ادا کرنے کے لئے تیار ہیں ؟ تسلیم کے بعد دونوں فرزندوں کو کلہاڑی کے ایک ایک وار سے شہید کر دیا گیا ۔ اسلام کی رو سے اس فعل کو کیا قرار دیا جائے ؟

الجواب :۔

پاگل پن قرار دیا جائے ۔ ایسے مجرم کے دو ہی علاج ہیں ۔ یا تو پاگل خانے میں داخل کیا جائے بشرطیکہ اطمینان بخش معلومات کے بعد وہ سچ مچ دیوانہ ثابت ہو ۔ یا پھر اسے پھانسی چڑھایا جائے ۔ پھانسی بھی ڈھنڈورا پیٹ کر دینی چاہئے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو ۔

طوفان جہالت

سوال :۔ از سلطان حسین ۔ بمبئی ۔

اس طرف دیہات میں ایک مرشد صاحب گھومتے ہیں جن کا نام معین الدین شاہ ہے ۔ کافی لوگ ان کے مرید ہیں ان کے ایک مرید مولوی افضل حسین صاحب قریشی موضع کولمبہ کی مسجد میں پیش امام ہیں ان کے پاس ایک کتاب ہے "گنجینۂ اکبری" ۔ اس میں کچھ روزمرہ کی دعائیں درج ہیں ۔ عجیب بات ہے کہ اس میں صفحہ ۶۵ پر ذیل کی روایت ملتی ہے :۔

ایک دن رسالت پناہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ شریف کی مسجد میں بیٹھے تھے کہ ابلیس لعین آپ کی خدمت میں آیا ۔ سرکار نے فرمایا کہ اے بدبخت تو کہاں سے آیا ۔ یا رسول اللہ میں بدبخت نہیں ہوں اس واسطے کہ ایک دعا ہے کہ اسے پڑھ کر جنت میں جاؤں گا ۔ سرکار یہ بات سن کر متعجب ہوئے ۔ پس جبریل نے اللہ جل شانہ کے حکم سے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ بدبخت سچ کہتا ہے اس دعا کو اس سے سیکھ لیجئے اور اپنی امت کو پڑھنے کے لئے تاکید فرمائیے کیونکہ جو کوئی اس دعا کو خلوص نیت اور اعتقاد سے پڑھے گا انشاء اللہ جنت میں جائے گا ۔ یا رسول اللہ اس ملعون کو چالیس سال اس کی موت سے قبل یہ دعا فراموش ہو جائے گی ؟

الجواب :۔

افسوس جاہلی ماحول اور علم و عمل کے قحط نے امت مسلمہ کے کثیر افراد کو حماقت و سفاہت کی اس پست سطح پر پہنچا دیا ہے کہ بد سے بدتر باتوں کو بھی وہ مزے سے ہضم کر لیتے ہیں اور ذرا احساس نہیں کرتے کہ مسلمان کی حیثیت میں انھیں کن اعمال و عقائد سے واسطہ رکھنا چاہئے اور کن سے احتراز ۔ جو کچھ آپ نے گنجینۂ اکبری سے نقل کیا وہ لرزہ خیز ہے ۔ ایسی گمراہ کن کتابوں کو مجسم لعین سمجھئے اور مل جائیں تو آگ کی نذر کر دیجئے ۔ جھوٹی حدیثیں تو بہت گھڑی گئی ہیں اور ان کے گھڑنے والوں کا دوزخی ہونا بھی یقینی ہے لیکن حیرت ان بدبختوں پر ہے جو گھڑنے کا جرم ذلیل کرنے کے ساتھ توہین رسول ۔ بلکہ اللہ کے ساتھ تمسخر کی بھی جسارت کر گذرتے ہیں ۔ پھر مزید حیرت ان دیوانوں پر ہے جو دعوۂ ایمان کے باوجود ان ناپاک اختراعات کو سینے سے لگا لیتے ہیں اور ان کا تعفن انھیں محسوس نہیں ہوتا ۔

مسلمان کا دماغ جہالت نے خراب نہ کر دیا ہو اور اسلامی آئیڈیالوجی سے اسے کچھ بھی مس ہو تو ایسے شخص کے منھ پر تھوک دے گا جو اسے یہ زہریلی اطلاع دینے کی جرأت کرے کہ ختمی مرتبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعائے نجات شیطان سے سیکھی تھی ۔ نعوذ باللہ من ذالک تماشا ہے کہ جس ابلیس کے کفر و تکبر پر عمر بسر کر رہا اللہ نے نفرین کی ۔ لعنت بھیجی ۔ اسے ایک ایسی عجیب دعا یاد ہو جو جبرائیل علیہ السلام کو بھی یاد نہ ہو اور جبرئیل رسول اللہ کو تلقین فرمائیں کہ اسے شیطان سے سیکھ لیجئے ۔ تو یہ وہ آدمی شیطان کا چیلہ ہے جو ایسی خرافات کا سبق

فرمانا ہے اگر وہ سچ مچ ایسی روایتوں کو مرغوب رکھتا ہے اور ان کی قباحت اسے محسوس نہیں ہوتی تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے پاس نہ عقل ہے نہ ایمان۔ اس کے سائے تک سے دور بھاگئے۔

شکایت

سوال:۔ از مظفر حسین۔ ضلع میرٹھ۔

آج عرصہ پانچ سال کے بعد آپ کے تجلی میں ایک بات کھٹکی۔ یا تو میری کم علمی کی وجہ سے یا حقیقتاً ایسا ہی ہے جیسا کہ میں سمجھا ہوں۔

تجلی کی ڈاک سوال نمبر ۲ کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اشعار کی توجیہ کر لینی چاہئے۔ شاعری میں عموماً عقائد کا بیان نہیں ہوا کرتا توقع نہیں ہے کہ ان کے عقائد خدانخواستہ کسی طرح کے شرک سے ملوث ہوں گے۔ اب زیادہ تحقیق ان کے بارے میں انھیں سے کی جا سکتی ہے۔ نشان زدہ جملہ تھوڑی سی تسلی ضرور کرتا ہے۔ لیکن ہمیں توجیہ کا سبق آج آپ کی طرف سے بالکل نیا معلوم ہوا ہے اس سے پہلے بارہا ہم آپ کو شعروں پر بھی کھلے بندوں تنقید کرتے ہوئے دیکھ چکے اور آپ کی تنقید پسند آئی۔ حالانکہ ان کی بھی توجیہ ہو سکتی تھی۔ بعض مرتبہ مولانا امام الدین صاحب کے شعروں سے بھی ہلکے رن کے شعروں پہ آپ کی تنقید زور شور سے ہوئی ہے اور دیگر شاعروں کے عقیدے تک آپ تشریح کر چکے ہیں اور مولانا امام الدین صاحب کی برأت یہاں تک آپ فرما گئے کہ خدانخواستہ کسی طرح کے شرک سے بھی ملوث ہوں گے۔ اس سے یا تو تھوڑی سی طرفداری ثابت ہوتی ہے یا آپ نے کچھ جھجک محسوس کی ہے۔ یہ دونوں باتیں آپ کی ذات خاص کے شایان شان نہیں۔

ہم آپ کے نادیدہ گرویدہ ہی اس بات سے ہیں کہ اس دور میں قلمی اور اس سے بھی بڑھ کر جہاد کی توفیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عنایت فرمائی ہے اللّٰھم زد فزد۔ مولانا امام الدین صاحب کے شعر جو کہ دعوت اخبار کے سرورق پر ثبت ہیں اس سے پوری جماعت سبکدوش نہیں ہو سکتی اگر ان کی علیحدہ کسی تصنیف پر یہ شعر ہوتا تو مضائقہ نہیں تھا۔ لہٰذا آپ نظر ثانی کی زحمت گوارا فرمائیں۔

الجواب:۔

سچ پوچھئے تو ماہِ گذشتہ کا جواب نمبر ۲ ہم نے اپنے قلم کو بہت روک کے لکھا تھا جس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ دنوں سے امام الدین صاحب رام نگری ہم سے بہت ناراض ہیں۔ ہمارے خلاف انھوں نے مستقل کتاب میں بھی اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اور ابھی ماہنامہ دار العلوم میں بھی تند و تلخ مضمون لکھا ہے۔ اس صورت میں ہمارے قلب نے گواہی دی کہ موصوف کے بارے میں جو کچھ بھی لکھو ٹھنڈے دل اور نرم قلم سے لکھو۔ اوروں پر جس شدت سے تم نشترِ تنقید چلاتے ہو اسی شدت کو اگر یہاں بھی اختیار کیا تو اس میں نفسانیت کا دخل ہوگا۔ انھوں نے تمھیں سخت سست کہا ہے، چڑایا ہے، بے نقط سنائی ہیں اس لئے ان پر کڑی تنقید کرتے ہوئے تمھارے نفس کو آسودگی ملے گی۔ وہ خلوص باقی نہیں رہے گا جو دوسروں پر نقد کرتے ہوئے رہتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے روئے مبارک پر ایک بار ایک حریف نے تھوک دیا تھا اور اسی پر آپ اس کے قتل سے باز آ گئے تھے۔ دریافت کرنے پر وجہ یہ ظاہر فرمائی تھی کہ پہلے میں اسے قتل کرتا تو اس میں ذاتی عداوت کو کوئی دخل نہ ہوتا صرف اللہ کے لئے قتل کرتا، لیکن اب کہ اس نے میرے منھ پر تھوک دیا ہے میرے فعلِ قتل میں ذاتی عداوت کا جذبہ بھی آمیز ہو جاتا۔

حضرت علیؓ پر اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں، بڑی اونچی بات فرما گئے ہیں۔ کما حقہٗ پیروی کا یارا تو کس میں ہے جس درجے میں بھی ہو ہمیں اپنے اِن بے مثال بزرگوں کی پیروی کرنی چاہئے۔

ویسے خالص قانونی زاویۂ نظر سے دیکھئے تو ہم ناروا رعایت یا تائیدِ باطل کے مرتکب نہیں ہوتے ہیں، بلکہ جواب ٹھیک ہی دیا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ شاعری میں عقائد کا بیان کم ہی ہوتا ہے۔ دوسروں کے بعض اشعار پر ہم جو عقیدے کے پہلو سے تنقید کر گذرے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو شاعر کے عقائد کا ہمیں پہلے سے علم ہوا اور اسی علم کی روشنی میں ہم نے فیصلہ دیا کہ اس نے رسماً نہیں بلکہ حقیقتاً عقیدے

کی کا اظہار کیا ہے۔ یا پھر شاعر عقائد کے اعتبار سے ہمارے لئے قطعاً اجنبی تھا اور ہم فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ شعر میں جو کچھ اس نے کہا ہے وہ محض شاعری ہے یا عقیدہ بھی۔ ایسی حالت میں عقیدے کی بحث کا یہ فائدہ نظر میں رہا کہ اگر واقعۃً شاعر نے عقیدے ہی کا ذکر کیا ہو تو اسے تنبیہ ہو جائے گی اور اگر وہ محض شاعری کر رہا ہے تو قارئین و سامعین کو تنبہ ہو جائیگا

رام نگری بزرگ کے بارے میں ہم اور آپ سب جانتے ہیں کہ وہ جماعت اسلامی سے نہ صرف تعلق رکھتے ہیں بلکہ اس کی طرف سے مدافعت کا بھی فرض سرگرمی کے ساتھ انجام دیتے رہے ہیں۔ ایسے شخص کے اشعار میں اگر کبھی وہ خیالات نظر آئیں جو جماعت اسلامی کے طرزِ فکر سے جوڑ نہ کھاتے ہوں تو غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ ان کا تعلق عقائد سے نہ ہوگا بلکہ شاعرانہ طور پر نظم ہو گئے ہوں گے۔ اس گمان کی تصدیق یا تکذیب خود موصوف ہی سے ان کے عقائد دریافت کر کے کی جا سکتی ہے یہی مشورہ ہم نے دیا۔ اسے طرف داری پر محمول کرنا صحیح نہیں۔ ہاں یہ احساس آپ کا درست ہے کہ مذکورہ جواب ہمارے معروف انداز سے کچھ مختلف ہے۔ ہم نے اس کی نفسیاتی وجہ عرض ہی کر دی۔ مزید یہ عرض کر دیں کہ اپنی طبیعت کی اشتعال پذیری اور تندی پر ہم رفتہ رفتہ قابو پانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنے عیب نہ دیکھ سکتے ہوں۔ ہمیں اپنی تلخ گفتاری کے عیب کا ہمیشہ احساس رہا ہے اور اس کا اظہار بھی متعدد بار کر چکے ہیں۔ بعض لوگ ہماری ناقدانہ گرما گرمیوں اور شعلہ نوائیوں کو چاہے کتنی ہی داد دیں لیکن یہ داد ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتی کہ تلخ گفتاری کوئی ہنر ہے۔ عیب ہنر نہیں بن سکتا چاہے موتیوں میں تول دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شیریں زبانی کی توفیق عطا فرمائے۔

"دعوت" کے صفحات میں کسی نظم کا بلا اختلاف شائع ہو جانا اصولاً تو واقعی یہی معنی رکھتا ہے کہ جماعت اسلامی اس سے متفق ہے۔ کیونکہ یہ جماعت ہی کا پرچہ ہے لیکن عملی سطح پر دیکھئے تو علی الاطلاق ایسا سمجھنا درست نہ ہوگا۔ پرچے کے مضامین نظم و نثر کا مدار ادارے کے محدود افراد پر ہوتا ہے۔

بعض حالتوں میں تو یہ ایک ہی فرد کی صوابدید پر منحصر ہوتے ہیں۔ یہ فرد یا افراد جن ہجوم میں اگر کسی نظم یا شعر کو سرسری مطالعے کے بعد شریک اشاعت کر دیں اور اس کے بعض قابل اعتراض پہلو ان کی نظر میں آنے سے رہ جائیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ امام الہند صاحب کے حق میں چونکہ پہلے بھی حسن ظن کی دعوات موجود تھیں اس لئے ان کے اشعار کو خصوصی غور و فکر کے بغیر چھاپ دینا اور بھی قرین قیاس ہوا۔ دعوت میں بعض دوسری چیزیں بھی ایسی ہی آتی رہی ہیں جنھیں غیر ذمہ دارانہ طور پر چھاپا گیا ہے۔ مثلاً علی بہادر صاحب کی کتاب "معاویہ و یزید" پر بچکانہ تبصرہ۔ یا ۱۹؍ ستمبر ۶۰ء کا ایک مضمون جس میں شیعہ سنی نزاع کے سلسلہ میں ناواقفیت پر مبنی باتیں کہی گئی ہیں۔

طلاق کیوں؟

سوال عجیب۔ از محمد شمس الحق۔ بہار

مقیم کی بیوی اپنے بھائی کو جب کہ اُن کی اپنی ماں ایک مہینہ کا بچہ چھوڑ کر انتقال کر گئی اور دودھ پلانے کے لئے کوئی دوسرا انتظام نہ ہونے پر اپنے شوہر کی اجازت سے دودھ پلا رہی ہے۔ ایسی حالت میں بعض علماء نے طلاق کا فتویٰ لگایا ہے۔ براہِ مہربانی آپ از روئے شریعت جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب:۔

آج کل لفظ "علماء" کی مٹی خراب ہے۔ کیسے مانا جائے کہ وہ لوگ "علماء" ہیں جو بے پر کا فتویٰ صادر فرما سکتے ہوں۔

معلوم ہوتا ہے استفتاء کچھ اور ہوگا ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ متذکرہ صورت میں طلاق کا فتویٰ دیدیا جائے۔ ہر حال میں یہ نکتہ ذہن نشین فرمالیجئے کہ طلاق کی ڈور مرد کے ہاتھ میں ہے نہ عورت کے کسی اپنے فعل سے طلاق واقع ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبتک شوہر اس سے طلاق کو مشروط نہ کر دے۔

قبروں پر فاتحہ

سوال: — از وزیر احمد ۔ منڈو پور ۔

آپ نے جولائی ۱۹۶۸ء میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ "جب اسوۂ رسولؐ اور آثار صحابہؓ سے کھلم کھلا قبروں پر فاتحہ پڑھے جانے کا ثبوت ملتا ہے تو ہماری کیا مجال کہ مطلقاً ناجائز کہدیں۔"

ازراہ مہربانی بتلائیے کہ کب آنحضرتؐ اور صحابہؓ نے قبروں پر فاتحہ پڑھی معتبر کتب حدیث و روایات سے بیان فرمائیں۔ یہاں قسم قسم کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔

الجواب: —

"فاتحہ" سے ہماری مراد دعائے رحمت و مغفرت تھی اس دعا کے لئے کسی خاص سورۃ یا ورد کا تعین نہیں ہے۔ مختلف لوگ مختلف سورتیں پڑھتے ہیں۔ جن سورتوں کو بھی بطور برکت پڑھا جائے اور دعائے مغفرت شامل کر لی جائے وہ جائز ہیں مشکوٰۃ باب زیارۃ القبور میں متعدد روایات آئی ہیں جن سے قبروں پر پہنچکر اہل قبور کے لئے دعائے رحمت کی تلقین ہوتی ہے۔ اس تلقین کو صحابہ نے حسب ضرورت قبول کیا ہے۔ یہی منشا تھا ہمارے لکھنے کا کہ قبروں پر دعائے رحمت اسوۂ رسولؐ اور آثار صحابہؓ سے ثابت ہے۔

علم غیب

سوال: — از عبد القادر غوث ۔ مراد آباد ۔

جب غیب کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے اور کسی کو حاصل نہیں تو پھر علم نجوم و اعداد وغیرہ کے ماہروں کی پیشین گوئیاں کیوں صحیح ہوتی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ عملیات اور نقوش میں اثر ہوتا ہے؟

الجواب: —

(علم غیب کے موضوع پر اس سوال کے علاوہ بھی کئی خطوط ہمارے سامنے ہیں اس لئے قدرے مفصل جواب دیتے ہیں تاکہ سب کا جواب ہو جائے)۔

دو باتیں سمجھ لی جائیں تو انشاء اللہ اس باب میں کبھی کوئی الجھن اور غلط فہمی پیدا نہ ہوگی۔

اوّل یہ کہ علم غیب کی تعریف صرف اتنی نہیں ہے کہ آدمی کو بعض غائب اشیاء کا علم ہو جائے۔ بلکہ اس میں لازماً یہ شرط بھی شامل ہے کہ اس علم کا کوئی ذریعہ اور وسیلہ نہ ہو۔ بغیر کسی توسط اور رابطے کے یہ علم حاصل ہو گیا ہو۔ گویا اگر سوال کیا جائے کہ علم غیب کسے کہتے ہیں تو صحیح جواب یہ نہ ہوگا کہ علم غیب غائب چیزوں سے واقف ہو جانے کو کہتے ہیں بلکہ جواب یہ ہوگا کہ کسی غائب شے کے بغیر کسی ذریعے اور وسیلے کے معلوم ہو جانے کو علم غیب کہتے ہیں۔

دوئم یہ کہ علم کے وسائل و ذرائع مختلف نوعیتوں کے ہوتے ہیں۔ کبھی بالکل واضح، کبھی پیچدار، کبھی لطیف تر، کبھی اتنے مخفی کہ بہت عقیل و فہیم لوگ ہی ان کا ادراک کر سکتے ہیں، کبھی ایسے مشکل کہ مجرد عقل و فہم سے ان پر آگاہی ناممکن ہے صرف وہی لوگ ان سے مطلع ہو سکتے ہیں جنھوں نے اس باب میں کافی علم حاصل کیا ہو۔

ایسی صورت میں ہمیں کسی علم کی ظاہری ہیئت و کیفیت سے حیران ہو کر یہ فیصلہ دینے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے کہ یہ علم غیب ہے۔ ہمیں وسائل و ذرائع کا ادراک نہیں ہو سکا تو یہ لازم نہیں کہ واقعۃً وسائل و ذرائع موجود ہی نہ ہوں۔

دونوں ہی باتوں کو مثالوں سے سمجھئے:۔

ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ لیجئے اس دیگچی میں پانی بھر کے چولھے پر چڑھا دیجئے میری پیشین گوئی ہے کہ اس میں سے بھاپ نکلے گی اور رفتہ رفتہ پانی کم ہوتا چلا جائے گا۔ اب سیدھے سادے اعتبار سے تو یہ علم غیب ہی ہے۔ کیونکہ اس کا دعوے آنے والے زمانے سے متعلق ہے اور اس کی پیش کردہ دیگچی میں ابھی تک پانی نہیں بھرا گیا ہے۔ پانی بھرا جانا پھر چولھے پر چڑھ کر اس کا بھاپ بننا ابھی امورِ غیب ہی میں سے ہیں۔

تو کیا اسے علم غیب کہا جائے گا؟

ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں — کیوں؟ — اس لئے کہ آپ جانتے ہیں اس کی پیشین گوئی کے لئے اسباب و وسائل موجود ہیں۔ وہ اصول موجود ہے جو مشاہدے کے نتیجے میں قطعی مان لیا گیا ہے۔ تجربہ موجود ہے۔

ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں ابھی زید سے فلاں بات

معلوم کر سکتا ہوں۔ زید تو سو میل دور ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سو میل دور سے کوئی بات فوراً نہیں معلوم کی جا سکتی۔ پھر بھی آپ یہ نہیں کہیں گے کہ یہ شخص علم غیب کا دعویٰ کر رہا ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں ٹیلیفون کے ذریعہ وہ اپنا دعویٰ صحیح ثابت کر دکھائیگا

اس طرح کی ہزار مثالیں ہر شخص کے سامنے ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ علم غیب کا اطلاق صرف اسی علم پر ہوتا ہے جو اسباب و وسائل سے بے نیاز ہو۔ واسطوں کے ذریعے جو علم حاصل ہوا ہو اسے علم غیب نہیں کہیں گے۔

اب دوسری بات کو مثالوں سے سمجھئے:۔

پانی آگ پر چڑھ کر بھاپ بنے گا اس علم کا وسیلہ بالکل واضح ہے۔ دن رات کا تجربہ اور مشاہدہ اسے مسلمات میں شامل کر چکا ہے۔

اسی طرح سیکڑوں میل دور سے گفتگو کر لینے کا ذریعہ سب کو معلوم ہے۔ ٹیلیفون پیش پا افتادہ چیز بن چکا ہے۔ لیکن فرض کیجئے زید کے گھر میں ٹیلیفون نہیں ہے اور پھر بھی وہ مذکورہ دعویٰ کرتا ہے۔ اس وقت بات پیچیدہ ہو جائے گی۔ جو لوگ عقیل و فہیم ہیں وہ تو سمجھ لیں گے کہ ٹرانسمیٹر بھی ایک ذریعہ ہے۔ لیکن بے خبر اور کم عقل لوگ اس کا تصور نہ کر سکیں گے اور اس دعوے کے صحیح کر دکھلانے کی صورت میں وہ زید کے "عالم الغیب" ہونے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکیں گے۔

چاند سورج کب کیوں گہن ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ ہر شخص نہیں جانتا۔ محض عقل و فہم سے بھی اس کے اسباب و علل معلوم نہیں کئے جا سکتے بلکہ فلکیات وطبعیات کے علم و فن کا سہارا لینا ضروری ہوگا۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ مدتوں پہلے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو چاند گہن ہوگا اور فلاں کو سورج۔ یہانتک بتا دیا جاتا ہے کہ دنیا کے فلاں فلاں حصے میں کس کس تناسب سے یہ گہن دیکھنے میں آئے گا۔

تو کیا ہمیں صرف اس لئے ان اعلان کرنے والوں کو عالم الغیب کہہ دینا چاہئے کہ اُن اسباب و ذرائع کا ہمیں پتا نہیں جن کے ذریعہ قبل از وقت گہن کے اوقات معلوم کر لئے گئے ہیں؟

حکیم کہتا ہے کہ تم نے اگر فلاں چیز کھائی تو فلاں مرض میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ آپ کھاتے ہیں اور مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو کیا صرف اس بنیاد پر حکیم کو عالم الغیب کہہ دیا جائیگا کہ آپ اس شے کے اثرات سے واقف نہیں ہیں؟

اسی طرح کی بے شمار مثالیں واضح کرتی ہیں کہ غیب کے مجرد علم کو "علم غیب" نہیں کہا جا سکتا چاہے اسباب و علل ہماری سمجھ سے بالاتر ہوں۔

علم نجوم ہو یا علم اعداد۔ ان سب کی حقیقت یہ ہے کہ تجربات، مشاہدات اور فکر و تدبر کے ذریعہ کچھ اصول و فروع وضع کر لئے گئے ہیں۔ مظاہر فطرت اور طبعیات میں مسلسل غور و فکر کرنے والوں نے اپنی تمام معلومات کو جمع کر کے عقل کے سپرد کیا اور عقل نسلاً بعد نسلٍ اس راہ میں تگ و دو کرتی گئی۔ نتیجے میں بہت سے اصول و ضوابط ظہور میں آئے۔ ان میں بعض صحیح ثابت ہوئے بعض غلط۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نجومیوں کی تمام پیشین گوئیاں صحیح ثابت نہیں ہوتیں۔ کچھ درست نکلتی ہیں کچھ نادرست۔ جو درست نکلتی ہیں ان کی جوہری حیثیت ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص دوپہر میں پیشین گوئی کرے کہ اب سے آٹھ گھنٹے بعد ہر طرف تاریکی چھا جائے گی۔ ظاہر ہے یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوگی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سورج کے وظیفۂ حیات سے تو ہر خاص و عام واقف ہے، لیکن ستاروں کی رفتار، ان کے بروج، ان کے اثرات وغیرہ سے بس وہی لوگ واقف ہیں جنھوں نے اِس علم کو حاصل کیا ہے اور یہ علم اسی طرح ایک عقلی و تجرباتی علم ہے جیسے سائنس۔

تو کیا کسی نجومی کی بعض پیشین گوئیوں کو صرف اسلئے "علم غیب" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ہم علم نجوم سے ناواقف ہونے کے سبب ان پیشین گوئیوں کے اسباب و علل سے آگاہ نہیں ہیں؟ اگر ایسا ہو تو سائنس داں دنیا کے سب سے بڑے عالم الغیب ثابت ہوں گے۔ کیونکہ ان کی ترکتازی تو اس درجہ میں پہنچ چکی ہیں کہ نجومی اور رمّال بیچارے کسی شمار ہی میں نہیں رہ گئے۔

علم نجوم کس طرح بنا۔ اسے مثالوں سے سمجھئے:۔

اب سے دو ہزار سال قبل ستاروں کی رفتار پر غور و فکر کرنے والے بعض لوگوں نے یہ دیکھا کہ ستارہ نمبر ۱ مہینے بھر میں اتنا سفر طے کرتا ہے اور اس رفتار سے چل کر فلاں فلاں برجوں میں اتنے اتنے دنوں میں پہنچتا ہے اور پھر مثلاً دس سال کے بعد اپنی جگہ لوٹ آتا ہے اور نئے سرے سے یہی سفر شروع کرتا ہے۔ اس مشاہدے کو بار بار دہرایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ واقعتاً درست ہے اور اس ستارے کا وظیفۂ حیات یہی ہے

اب بہت دنوں تک یہ غور ہوتا رہا کہ کونسے برج میں پہنچکر اس کے کیا اثرات دنیا پر پڑتے ہیں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے تاریخ اور عالمی وقائع پر نظر رکھی گئی۔ کافی دنوں کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ جب یہ ستارہ فلاں برج میں پہنچتا ہے تو فلاں نوع کے واقعات عالم میں پیش آتے ہیں۔ اس اندازے کی صحت کیلئے ظاہر ہے بار بار کا تجربہ درکار تھا۔ آنے والوں نے یہ تجربہ جاری رکھا اور اس کے نتیجے میں مختلف اصول بنے۔ پتا چلا کہ جب فلاں برج میں یہ ستارہ پہنچتا ہے تو فلاں نوعیت کے امور ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ امور بعض وقت تو تمام دنیا میں یکساں ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض وقت کسی خاص سرزمین، کسی خاص برِّ اعظم، کسی خاص ملک تک محدود رہتے ہیں۔ ان اختلافات کے تحت مختلف اصول و نظریات بنائے گئے اور انھیں بعد کے لوگوں نے آزما کر دیکھا کچھ درست ثابت ہوئے کچھ نادرست نکلے۔

اب اگر ایک نجومی پیشین گوئی کرتا ہے کہ فلاں سن میں عالمی جنگ چھڑ جائے گی تو اس کی بنیاد غیب دانی نہیں، بلکہ ایسا ہی کوئی تجرباتی اصول ہے جس کا ذکر ہوا۔ مثلاً صدیوں کے مسلسل مشاہدے نے یہ دکھلایا ہے کہ فلاں ستارہ جب فلاں برج میں پہنچ جاتا ہے تو دنیا میں جنگ وجدل اور مار دھاڑ کو خوب فروغ ہوتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ جن جن زمانوں میں دنیا لڑائی بھڑائی کا میدان بنی ہے اس ستارے کو اسی برج میں دیکھا گیا ہے۔ اس صورت میں یہ حساب لگا کر کہ کب وہ ستارہ مذکورہ برج میں پہنچ رہا ہے پیشین گوئی کر دینا غیب دانی نہیں، بلکہ اسباب و علل کے سہارے ایک متوقع نتیجے کا اعلان ہے۔ اگر یہ توقع درست ثابت ہوئی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ غلط نکلی تو کہا جائے گا کہ اصول بنانے میں چوک ہوئی۔ یا تو یہ اتفاق ہی تھا کہ ستارے کی مذکورہ برج میں موجودگی اور جنگ وجدل میں ایک مدت تک توافق رہا یا ستارے کی وہ رفتار ہی دائمی نہیں ہے جسے دائمی سمجھکر فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ یہ فلاں وقت تک فلاں برج میں پہنچ جائے گا۔

حاصل یہ کہ علم نجوم ہو یا علم اعداد۔ بنیاد ان سب کی اسباب و علل پر ہے اور ان کے اصول و فروع مشاہدۂ فطرت کے ذریعے نکالے گئے ہیں جن میں سے بعض درست ہیں اور بعض نادرست۔ انسان کو جو بھی علم حاصل ہوگا وہ لازماً کسی نہ کسی ذریعے اور وسیلے پر مبنی ہوگا چاہے یہ ذریعۂ و وسیلہ جلی ہو یا خفی۔ عیاں ہو یا نہاں سادہ ہو یا پیچدار۔ محسوس ہو یا غیر محسوس۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کا کلام نازل ہوا۔ اگر حضورؐ خود ہی نہ بتا دیتے کہ ایک فرشتہ اسے لاتا ہے تو کیا کسی طرح بھی اس ذریعہ کا علم انسانوں کو ہو سکتا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتے کہ یہ علم غیب ہے۔ حالانکہ یہ علم غیب نہ ہوتا۔ اللہ نے خود قرآن میں بھی اس فرشتے کی اطلاع دیدی ہے تاکہ ذریعۂ نزول مؤکد و مصرح ہو جائے رسول اللہؐ کو باری تعالیٰ نے اور بھی بے شمار امورِ غیب پر مطلع فرمایا۔ ان میں سے جن کے بارے میں یہ تصریح نہ مل سکی کہ ذریعۂ اطلاع کیا تھا ان سے کم عقلوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ حضورؐ عالم الغیب تھے۔ حالانکہ ذہن اگر کند نہ ہو تو اس تصور کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب ہو سکتا ہے۔ اللہ ہی ہے جو اپنے علم میں وسائل و ذرائع کا محتاج نہیں۔ کیونکہ وہ تو وسائل و ذرائع اور اسباب و علل کا بھی خود ہی خالق و مالک ہے باقی ہر جاندار وسائل کا محتاج ہے خواہ یہ عیاں ہوں یا مخفی۔ یہی حقیقت ہے جسے قرآن میں کئی جگہ واضح کیا گیا ہے۔

لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ	اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔
اور وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ۔	اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں غیب کو اسکے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض اُمورِ غیب کو اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر منکشف کیا ہے، لیکن اس کی حیثیت انفعال کی ہے فعل کی نہیں یعنی ایسا نہیں کہ کسی نبی نے ایک امرِ غیبی کو اپنی کسی سعی و جہد سے معلوم کر لیا ہو یا اس کے باطن میں کوئی ایسا آئینہ اللہ نے رکھ دیا ہو جس میں وہ جب چاہے اُمورِ غیبی کا نظارہ کر لے بلکہ جس امرِ غیبی سے مطلع کرنا اللہ نے پسند فرمایا اسے یا تو عالمِ رویا میں نبی کو دکھلا دیا یا دل و دماغ پر القاء فرما دیا یا فرشتے کے ذریعہ آگاہی دیدی۔ ان تمام صورتوں میں نبی کی حیثیت فاعل کی نہیں منفعل کی رہی ہے، پھر ان تمام قسم کی غیب رسائیوں میں وسائل و ذرائع کا بھی کچھ نہ کچھ واسطہ رہا ہے۔ رویا یا القاء کی سائنس چاہے ہم انسانوں کو معلوم نہ ہو، لیکن اللہ کی سنت یہی ہے کہ وہ ہر فعل کو وسائل و ذرائع ہی کے واسطے سے انجام دیتے ہیں۔ روشنی دی تو اس کے لئے سورج تخلیق کیا۔ حالانکہ وہ چاہتے تو محض کُن سے اُجالا کر سکتے تھے۔ اپنے دین کو غالب کیا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تلوار بھی اُٹھوائی۔ آپ کو ابتلاؤں سے بھی گذارا۔ جنگیں بھی کرائیں حالانکہ چاہتے تو اِن اسباب کے بغیر بھی پلک جھپکتے ان کا دین غالب ہو سکتا تھا۔

رویاء اور القاء کی ٹیکنیکل کیفیت چاہے ہمیں معلوم نہ ہو۔ اب سے کچھ دنوں پہلے کائناتی شعاعوں کے وجود سے کون واقف تھا۔ کسے خبر تھی کہ ایک حقیر ایٹم میں طاقت کا خزانہ بند ہے۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ جس پانی کو ہم غٹ غٹ پیتے ہیں وہ لاتعداد جراثیم پر مشتمل ہے۔ ضرور ہے کہ رویا اور القاء کے لئے بھی اللہ نے کچھ لطیف وسائل رکھے ہوں۔ کچھ عناصر جنبش میں آتے ہوں۔ کچھ توانائیاں، کچھ شعاعیں کچھ جوہر حرکت کرتے ہوں۔ ایسی صورت میں رویا و القاء سے معلوم ہونے والے اُمورِ غیب بھی علم غیب کے دائرے سے نکل گئے۔

لیکن کوئی اس توجیہ کو تسلیم نہیں کرتا تو یہ تو یہ بہرحال اسے ماننا ہی ہوگا کہ جس امرِ غیب کی خبر اللہ نے دی ہے اسکے تعلق سے کوئی شخص عالم الغیب نہیں کہلا سکتا۔ نیز جس خبر کو اللہ دینا چاہے وہی مل سکتی ہے نہ یہ کہ جملہ امورِ غیب سے آگاہی ہو جائے۔

اُن لوگوں کو اپنے دماغ کی مرمت کرانی چاہئے جو یہ لغو ترین اور احمقانہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ کو علم غیب تھا۔

عملیات و نقوش میں اثر ضرور ہوتا ہے۔ بے اثر دنیا کی کون سی چیز ہے۔ سائنس کا دائرۂ عمل اگرچہ مادیات تک ہی محدود ہے لیکن مادی ہی پیمانوں پر یہاں تک معلوم کیا جا چکا ہے کہ کوئی بھی لفظ جو انسان کی زبان سے نکلتا ہے وہ داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے کچھ اثرات و نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ زبان کی صرف ایک جنبش میں جسم انسانی کی ایک لاکھ سے زائد نسیں حرکت میں آتی ہیں۔ الف بولا جائے تو بدن کی مشینری اُس سے مختلف اثرات قبول کرتی ہے جو با یا تا بولنے کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ بُندے اگر سونے کے ہوں تو وہ صرف زینت ہی کا کام انجام نہیں دیتے ان سے جسم کی خلطوں اور عضلوں اور جوہری مادوں پر بھی ایک خاص اثر پڑتا ہے جو پیتل یا تانبے یا کسی اور دھات کے بُندوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس دریافت سے اُس پُرانے طریقۂ علاج کی بھی توجیہ سمجھ میں آجاتی ہے جس کا تعلق کان یا ہاتھ یا گلے میں کسی خاص دھات کا چھلا یا کڑا وغیرہ ڈالدینے سے ہے تو عملیات و نقوش میں اثر ہونا کیا بعید ہے۔ جادو برحق ہے لیکن اس کی ٹیکنیکل توجیہ نہیں کی جا سکتی ——— اسی طرح عملیات و نقوش کی اثر انگیزی اگر اسباب و علل کی منطق سے سمجھائی نہ جا سکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ وجود ہی نہیں رکھتی۔ جس طرح یہ بتانا مشکل ہے کہ قطرے پہ گہر بننے تک کیا گذرتی ہے اسی طرح یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ عملیات و نقوش کی اثر اندازی کی سائنس کیا ہے۔

تاہم یہ یقینی ہے کہ آج کل ۹۹ فیصد عامل اور نقش نویس خالص دکاندار ہیں جن کے تعویذ پرِ کاہ کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتے

فضل علیؒ

سوال:- از محمد یحییٰ - نارتھ ارکاٹ۔

جناب عالی - لکھنؤ سے ایک ہفت روزہ اخبار "سرفراز" نکلتا ہے جو شاید شیعت کا نقیب ہے۔ فی الوقت میں آپ کی توجّہ

اُس اقتباس کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو ۱۹ ر اکتوبر ۶۲ء کے شمارے میں چوکٹے کے اندر نہایت نمایاں صفحہ اوّل پر چھپا ہے حوالہ علامہ امام ابن تیمیہ کی منہاج السُنّۃ کا ہے۔ عنوان ہے — "تاریخی جھلکیاں" عبارت یہ ہے:-

"اہلِ سنت اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت علیؓ کا مرتبہ بلند ہے اور وہ بمقابلہ دوسروں کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور خدا، رسولؐ اور عامۃ المسلمین کی نظر میں افضل ہیں (منہاج السنۃ جلد دوم صفحہ ۲۰۶ از امام ابن تیمیہ)

ہم عربی سے بے بہرہ لوگ اصل منہاج السنۃ کو کہاں دیکھ سکتے ہیں۔ آپ ابن تیمیہ کا بہت ذکر کرتے ہیں، تو کیا ان کا بھی وہی مسلک رہا ہے جو شیعوں کا ہے۔ براہِ کرم صاف صاف جواب دہی فرمائیں۔

الجوابؔ:-

سرفراز کا ذکر فرمودہ الشوع ہم نے دیکھا۔ کوئی شک نہیں کہ آپکی توجہ دہائی بجا ہے۔ واقعی ایک عام آدمی اس نمایاں اقتباس کو پڑھ کر یہی تصور کرے گا کہ ابن تیمیہ بھی شیعو کی طرح تفضیلِ علیؓ کے قائل ہیں۔ اُس بیچارے کو کیا معلوم کہ منہاج السنۃ تو لکھی ہی گئی تھی شیعہ عقائد کے رد میں اور حضرت علیؓ پر خلفائے ثلاثہ کی افضلیت جتنی شد و مد سے ابن تیمیہ نے ثابت کی ہے وہ جریدۂ عالم پر نقشِ دوام بن کر رہ گئی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ابن تیمیہ ہی کی کتاب سے چند سطریں ایسی نقل کر کے عوام کے سامنے رکھ دیتا ہے جو بالکل خلافِ واقعہ تأثر دینے والی ہوں تو دیکھنا چاہئے کہ وہ شخص کون ہے۔ اگر غیر شیعہ ہے تب تو بد دیانتی اور فریب کا الزام قائم کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر شیعہ ہے تو مورد الزام نہیں ٹھیر سکتا کیونکہ شیعی عقائد میں "تقیہ" ایک ایسا اہم عقیدہ ہے جس کی رو سے کوئی شخص جھوٹ، فریب، تحریف، کتمانِ حق دغا اور ہر طرح کا فراڈ کرنے کے بعد بھی معصوم کا معصوم رہ سکتا ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے یہ اوصاف و حرکات بے نہایت ثواب و سعادت کا موجب بنتے ہیں۔

ابن تیمیہ کیا کہہ رہے ہیں اور ادارہ سرفراز نے انکی عبارت سے کتر بیونت کر کے کیا مفہوم پیش کیا ہے اس کی حقیقت درج ذیل اقتباس کے آئینہ میں دیکھئے جس صفحہ کا اس نے حوالہ دیا ہے اس کی اصل عبارت یہ ہے:-

كلهم متفقون على انه اجلّ قدراً واحق بالامامة وافضل عند الله وعند رسوله وعند المومنين من معاوية وابيه واخيه الذى كان خيرا منه وعلى افضل ممن هو افضل من معاوية رضى الله عنه فالسابقون الاوّلون الذين بايعوا تحت الشجرة افضل من هولاء كلهم وعلى افضل جمهور الذين بايعوا تحت الشجرة بل هو افضل منهم كلهم الا الثلاثة فليس فى اهل السنة من يقدم عليه احدًا غير الثلاثة - (منهاج السنة جلد ۲ صفحہ ۲۰۶)

ترجمہ:- تمام اہلِ سنت اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت معاویہؓ سے، ان کے والد (ابوسفیان) سے اور اُن کے اُن بھائی (یزید بن ابوسفیان) سے جو خود معاویہؓ سے بہتر تھے حضرت علیؓ کا مرتبہ اور استحقاقِ خلافت زیادہ ہے اور وہ اللہ، رسولؐ اور عامۃ المسلمین کے نزدیک ان حضرات کے مقابلہ میں افضل ہیں۔ بلکہ وہ اُن سبھی لوگوں سے افضل ہیں جو معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی افضل تھے پس سابقون الاولون جنھوں نے تحت الشجرہ بیعت کی ان تمام سے افضل ہیں اور علیؓ سوائے تین حضرات کے

باقی تمام ان لوگوں سے افضل ہیں جنھوں نے تحت الشجرہ بیعت کی۔ پس اہل سنت میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تین حضرات کے سوا کسی کو بھی علیؓ پر فوقیت و اوّلیت دیتا ہو۔

دیکھ لیا آپ نے۔ تقابل ابوبکر، عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے نہیں ہے۔ دیگر اصحاب واکابر سے ہے۔ یہ تقیہ ہی کا فیض ہو سکتا ہے کہ پوری بات میں سے بس اتنی بات چُن لی جسے شائع کر کے کم علم لوگوں کو دھوکے میں ڈالا جا سکے۔ ٹھیک لا تقربوا الصلوٰۃ والی حرکت۔

سرفراز شاید کہے کہ ہم نے تو بہ لحاظ اختصار تھوڑی سی عبارت لے لی اور ہمارا مقصود دھوکا دینا نہیں تھا۔ تو یہ قول بجائے خود عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہوگا۔ ابن تیمیہ جن لوگوں کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے فضل پر اتفاق بتا رہے ہیں ان کا ذکر تو آپ نے حذف کر دیا اور تینوں خلفاء کا استثناء بھی دبا گئے اس کا مقصد اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ جو لوگ ابن تیمیہ کی منہاج السنۃ تک نہ پہنچ سکتے ہوں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ شرق و غرب کا یہ نامور امام بھی جملہ اصحاب کے مقابلہ میں حضرت علیؓ ہی کو افضل سمجھتا ہے۔ نہ صرف خود سمجھتا ہے بلکہ تمام اہل سنت کا اس پر اتفاق بتاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر یہ فاسد مقصد پیش نظر نہ ہوتا تو اتنے اہتمام کیساتھ مذکورہ اقتباس کی اشاعت کچھ بھی معنی نہیں رکھتی۔ اہل سنت اگرچہ حضرت معاویہؓ کے گوناگوں اوصاف و مناقب کے مدح خواں ہیں، لیکن یہ وہ کبھی نہیں کہتے کہ حضرت علیؓ مرتبہ کے لحاظ سے ان سے برتر نہیں تھے۔ خلفائے ثلاثہ کے بعد حضرت علیؓ ہی کو خیر الامت اور فائق و برتر ماننا اہل سنت کا معروف مسلک ہے۔ اس کے اثبات و ابلاغ کے لئے اہتمام کے ساتھ چوکٹوں میں اقتباس چھاپنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مقصد تو وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔ یعنی جتنے لوگ بھی دھوکا کھا سکیں کھا لیں کہ ابن تیمیہ کی تصریح کے مطابق تمام اہل سنت علی الاطلاق تفضیلِ علیؓ میں شیعوں کے ہم آہنگ ہیں اور خلفائے ثلثہ کی افضلیت کا افسانہ کسی نے یونہی گھڑ دیا ہے۔

حیف ہے ایسے اوچھے حربوں پر!

[illegible] کا جواب تو ہو گیا، لیکن عوام کو یہ مغالطہ اب بھی لگ سکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ وغیرہ پر حضرت علیؓ کی افضلیت اہل سنت کا متفق علیہ خیال ہوا تو معلوم ہوا کہ باہمی نزاع میں حق لازماً حضرت علیؓ ہی کی طرف تھا۔ معاویہؓ خطا پر تھے۔

اس مغالطہ کی حقیقت پر ہم بارہا تجلّی میں روشنی ڈال چکے ہیں، لیکن پھر ایک بار تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ محض ایک مغالطہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ زید کا من حیث المجموع عمرو سے افضل و فائق ہونا یہ لازم نہیں کرتا کہ تمام مختلف فیہ معاملات میں زید ہی حق پر ہو اور عمرو کو مجموعی مفضولیت کی وجہ سے ہر اجتہاد، ہر رائے میں بر خود غلط مانا جائے۔ مجموعی افضلیت اور چیز ہے اور معاملات و تنازعات میں انصاف بالکل دوسری چیز۔ قانون اور انصاف کی سطح پر آپ نے دیکھا کہ ایک یہودی تک کے مقابلہ میں قاضی نے حضرت علیؓ کا دعویٰ قبول کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ گواہ بھی موجود تھے اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کی باہمی آویزشوں میں محض اس دلیل سے حضرت علیؓ کے ہر اجتہاد کو صواب اور حضرت معاویہؓ کے ہر متقابل اجتہاد کو خطا قرار دینا ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ حضرت علیؓ بحیثیت مجموعی حضرت معاویہؓ سے افضل تھے۔

اس سے ہمیں انکار نہیں کہ اہل سنت کا بڑا حصہ یہی رائے رکھتا ہے کہ حضرت علیؓ کا اجتہاد درست تھا اور حضرت معاویہؓ کا نادرست۔ کوئی حرج نہیں اگر آپ دلائل کا سُراغ لگائے بغیر اکثریت کی اس رائے کو اپنا بھی عقیدہ بنا لیں۔ دلائل کا کھوج لگانا اور علی وجہ البصیرت فیصلے کرنا عوام کے بس کا روگ نہیں ہے۔ نہ وہ اس کے مکلّف ہیں۔ مگر جو شخص بے لاگ انصاف کا متمنی ہو، دلائل کے قوت و ضعف کا شعور رکھتا ہو، فکر و بصیرت کا استعمال جانتا ہو وہ اس کا پابند نہیں ہو سکتا کہ محض اکثریت کی تقلید میں نافہمی کے ساتھ ایک عقیدہ قائم کرے جو اہم ترین اساسی استدلال حضرت معاویہؓ کے فکر و عمل کو مبنی بر خطا قرار دینے سے روکتا ہے اسے ہم تجلّی میں واشگاف طور پر بیان کر چکے ہیں۔ ایک بار پھر دہراتے ہیں کہ مسندِ اقتدار پر متمکن

ہوتے ہی حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ کو یکلخت برطرف کردینا ایسا عجیب عمل تھا کہ تصویرِ انصاف اپنی مجرد شکل میں — یعنی عقیدت اور ذہنی جانب داری سے بالاتر ہوکر اسے کسی طرح قبول نہیں کرتا۔ جو اہلِ فکر معاویہ کی خطا پر اذعان رکھتے ہیں انھوں نے بہت کچھ دلائل دینے کے باوجود اس عقیدے کی قرار واقعی گرہ کشائی نہیں کی ہے کہ اس اقدام کو دین یا دنیا کے کس ٹھوس ضابطۂ عدل کے تحت تحسین و تعریف کا مستحق قرار دیا جائے۔ پھر جن حالات میں اس کا صدور ہوا وہ بدیہی طور پر ایسے ہی تھے کہ عقیدت کا دامن نہ تھامئے تو بے لاگ طریقہ پر سوچنے کا حاصل اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ تدبیر اور سیاسی دُور بینی اس اقدام کی مؤید نہیں تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ خود دورِ علیؓ کے بعض بہترین دماغوں نے یہی فیصلہ دیا تھا کہ یہ جلد بازی ہے۔ غلط تدبیری ہے۔ نہیں پتا چلتا کہ مشوروں کو رد کرکے آمرانہ انداز میں جو قدم اُٹھایا گیا اس سے مشاورت کی جمہوری اسپرٹ کہاں تک زندہ رہی۔

بہرحال جب تک اس اہم ترا ولین اقدام کو سیاسی و آئینی اعتبار سے برحق نہ ثابت کیا جائے اس کے ردِ عمل اور نتائج پر تبرا نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت معاویہؓ کیسے بھی رہے ہوں مگر اپنی دیرینہ خدمات اور ممتاز و معتمد حیثیت کے اعتبار سے اس کے حق دار ضرور تھے کہ سزا سے پہلے انھیں ان کا قصور بتایا جاتا۔ چارج شیٹ لگائے بغیر سزا نافذ کرنے کا جرأت مندانہ اقدام جن اچھے یا بُرے نتائج کو سامنے لائے ان کی تمام تر ذمہ داری سزا نافذ کرنے والے ہی کے سر جائیگی اسلامی جمہوریت ہو یا موجودہ زمانے کے جمہوری تصورات — ان میں سے کسی کی کسوٹی پر اس اقدام کو کھرا ثابت کرنے والے دلائل کم سے کم ہماری نظر سے تو اب تک نہیں گذرے۔ پھر ہم کیسے یقین کرلیں کہ جوابی قدم اُٹھانے والے معاویہؓ سچ مچ خطا پر تھے۔

حضرت علیؓ کی عظمت پر ہماری جان قربان۔ وہ کئی خصوصیات میں حضرت معاویہؓ سے فائق تھے خلیفۂ راشد تھے۔ حق کے شیدائی تھے۔ لیکن سیاست و تدبر کے جس میدان میں انھوں نے معاویہؓ کو چیلنج کیا تھا اس میدان کی شہسواری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے نتیجے میں معاویہؓ ہی کے حصّہ میں آچکی تھی۔ انفرادی ذہانت و فقاہت اور چیز ہے۔ مگر سیاسی تدبّر اور اجتماعی اُمور کی نفسیات اس شخص سے زیادہ کون جانے گا جسے حضرت عمرؓ جیسے مردم شناس نے "کسرائے عرب" قرار دیا اور جس کو تفقہ عطا کئے جانے کی دعا سرکارِ دو عالمؐ نے مانگی۔ حضرت علیؓ ان سے نہ اُلجھتے تو اسلامی فتوحات میں دس سالوں کا خلا کبھی نہ ہوتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ترتیلِ قرآن

سوال:۔ از ادریس

ادھر چند سال سے ایک اہم سوال میرے سامنے ہے جس کا حل آج تک نہ مل سکا۔ مجھے امید ہے کہ آپ روشنی ڈالیں گے۔

یاایھا المزمل ۝ قم الیل الا قلیلا ۝ نصفہ او انقص منہ قلیلا ۝ اوزد علیہ ورتل القرآن ترتیلا — لیکن تاریخ نزولِ قرآن کے مطابق یہ سورۃ اقرء باسم ربک الذی خلق کے بعد کی دوسری سورۃ ہے۔ تب آپ ہی بتائیے کہ رَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیلًا سے کیا مراد ہے؟ اور سورۃ مزمل اقرء باسم کے بعد کی دوسری سورۃ ہے تو کیا اللہ پاک اپنے پیغمبر کو صرف اقراء باسم ہی ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم دے رہا ہے؟

الجواب:۔

سمجھ میں نہیں آیا اس سوال کو آپ نے اہم کیوں سمجھا؟ نزولِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا اور نازل شدہ آیات میں پے در پے اضافہ ہونے والا تھا تو اس میں کیا الجھن ہے کہ نازل شدہ آیات کے علاوہ آگے کو نازل ہونیوالی آیات کو بھی شامل کرکے اللہ نے ہدایت نازل فرمادی۔ ظاہر ہے کہ ترتیل (کھول کھول کر ٹھیر ٹھیر کر صاف پڑھنے) کی ہدایت تمام ہی آیات پر محیط ہے۔ ہدایت کا ٹھیک وقت شروع ہی کا وقت تھا تاکہ آگے کو اس پر عمل ہوتا رہے یہ کہاں مناسب ہوتا کہ بہت سارا قرآن بلا ترتیل پڑھے

جاننے کے بعد اللہ ترتیل کی ہدایت فرمائے۔

یہ آیات اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی تسکین و تشفی کے لئے نہایت لطف و اُنس کے انداز میں نازل فرمائی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وحی کی شدت کے اثرات حضورؐ محسوس فرما رہے تھے اور قریش آپ کے لئے کاہن، مجنوں اور ساحر جیسے خطابات اختراع کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ملاطفت کے ساتھ خطاب فرمایا اور کہا کہ قرآن کو (جس کے نزول کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے) ٹھیر ٹھیر کر ایک ایک حرف صاف پڑھا کرو۔ اس کا فائدہ ظاہر ہے کہ اسی طرح کی تلاوت دل پر زیادہ اثر کرتی ہے اور آدمی کے دل و دماغ معانی کا کما حقہٗ ادراک کر پاتے ہیں۔

ہم نہیں سمجھتے کہ اس سلسلہ میں اور بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہو۔

تفسیر القرآن

سوال ۴۱ :- از اشفاق حسین۔ حیدرآباد دکن۔

(۱) شمس المفسرین استاذ العلماء خیر العلوم خادم القرآن علامۂ دہر حضرت محمد عبد القدیر صدیقی حسرت مدظلہٗ حیدرآبادی اپنی معرکۃ الآراء تفسیر "تفسیر صدیقی" میں لکھتے ہیں کہ عربی میں اِنْزَال دَفْعَۃً اُتارنے کو کہتے ہیں اور تَنْزِیْل رفتہ رفتہ۔ جزو جزو اُتارنے کو۔ قرآن شریف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کا پورا ایک دفعہ ہی اُترا اور پھر وقت بوقت اس کی تبلیغ ہوتی رہی۔ یہ بات کہاں تک درست ہے۔ جواب دیجئے۔

(۲) یہی عالم صاحب اپنی تفسیر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "تفسیر صدیقی میں بطور خاص اس بات کو ثابت کیا گیا کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ نیز مسئلہ نسخ کی بھی تحقیق کی گئی ہے۔ آیت کے ایسے معنی یہاں کئے جاتے ہیں کہ نسخ کی طرف ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا" کیا یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں؟ اس بارے میں جمہور کا کیا فیصلہ ہے؟ اگر یہ نہ مانیں تو کیا نقصان ہے؟

(۳) کیا قرآن شریف کی تفسیر بحیثیت مجموعی یہ معلوم کئے بغیر کہ کونسی آیت کہاں اور کن حالات میں نازل ہوئی کی جا سکتی ہیں؟ اگر کوئی عالم قرآن شریف کی تفسیر شانِ نزول سے بے نیاز ہو کر کرے تو کیا یہ صحت پر مبنی ہو گی جیسا کہ مشہور اور تسلیم شدہ مفسرین کی تفاسیر ہیں؟

الجواب :-

قرآن کے لئے قرآن ہی میں اِنزال و تنزیل دونوں باب استعمال ہوئے ہیں اس لئے ان کے لغوی فرق کو کسی دعوے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ قرآن دنیائے ظاہر میں اک دم پورے کا پورا نازل ہوا یہ بات کبھی کسی نے نہیں کہی۔ نجماً نجماً نزول کی تمام کیفیت اور مدت تاریخی مسلمات میں سے ہے پھر کیسے سمجھ میں آئے کہ صدیقی صاحب نے اس کے خلاف دعوٰی کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے ان کا کچھ اور مطلب ہو گا۔ شاید یہ مطلب ہو کر سماءِ دنیا پر اک بارگی نازل ہوا ہے۔ اس مطلب کے لئے یقیناً کچھ نہ کچھ دلائل موجود ہیں، لیکن جس دعوے کو آپ ان سے منسوب کر رہے ہیں وہ تو دو اور دو پانچ کی طرح غلط ہے۔

(۲) نسخ آیات میں قدیم اختلاف چلا آ رہا ہے۔ دونوں ہی پہلوؤں کے ماننے والے علماءِ اسلاف میں موجود رہے ہیں۔ اگر صدیقی صاحب عدم نسخ ہی کو اولیٰ سمجھتے ہیں تو انہیں ایسا سمجھنے کا حق ہے۔ ہاں یہ حق نہیں ہے کہ قائلین نسخ کو گمراہ قرار دیا جائے۔ ہمارے علم کی حد تک سلف میں کثرت قائلینِ نسخ ہی کی ہے اور ان کے دلائل خاصے وزنی ہیں۔ تاہم اس سے یہاں بحث نہیں۔

(۳) شانِ نزول سے بے نیاز ہو کر قرآن کی تفسیر کر دینا عملاً ناممکن ہے۔ جو اسے ممکن بنانے کی کوشش کرے گا ٹھوکر کھائے گا۔ ہماری نظر سے آج تک کوئی تفسیر ایسی نہیں گذری جس میں از اوّل تا آخر شانِ نزول سے بے نیازی کا کمال سامنے آیا ہو۔ کتنی ہی آیات ایسی ہیں جن میں تلمیح ہے۔ مثلاً الم ترکیف ہی کو لے لیجئے۔ کیا اصحابِ فیل کا تاریخی واقعہ نظر میں رکھے بغیر اس کی تفسیر ممکن ہے؟

کتنی ہی آیات ہیں جو ایسے واقعات سے مربوط ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔ ان کی تفسیر بغیر شانِ نزول کے کیسے ہو گی؟

کتنی ہی آیات ایسی ہیں کہ شانِ نزول کی پاسداری کے بغیر ان کی تفسیر کی تو جاسکتی ہے مگر باری تعالیٰ کی صحیح مراد اور آیات کی معنوی اسپرٹ محفوظ نہ رہ سکے گی۔

اگر تفسیر صدیقی ایسے ہی دعوے پر مبنی ہے تو اسے دنیا کا آٹھواں نہیں پہلا عجوبہ کہیں گے۔

وہی حسینؓ و یزید

سوال ۱:۔ از محمد اسحاق۔ گجرات (پاکستان)

محقق علمائے کرام (جن میں مفکر اسلام مولانا مودودی بھی شامل ہیں) حضرت امام حسینؓ کو ایک اعلیٰ مشن اور صحیح مقصد کا قائد تسلیم کرتے ہیں۔ حق کی راہ پہ چلنے والی جماعتوں کو اکثر حسینی قافلہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ صداقت کیلئے بےمثال قربانی شہدائے کربلا نے دی جو رہتی دنیا تک ملتِ اسلامیہ کے لئے نمونہ ہے۔۔۔ آپ خود بھی امام حسینؓ کو مظلوم اور حق کا علمبردار تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے لکھا تھا:۔

"حسین کے غم میں آنسو تو بہاؤ گے مگر ان کی پیروی میں سر نہیں کٹاؤ گے اور سر کٹانا تو کجا اتنا بھی احساس نہیں کرو گے کہ جس مقصد کے لئے حسینؓ نے جان دی تھی وہ مقصد آج بھی تمھیں پکار رہا ہے۔" (تجلی ماہ جون ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۳)

یہ مقصد کیا تھا؟ اسی کالم کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ مقصد "گردنوں پر مسلط موجودہ حکمرانوں" کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔ ایسے حکمراں "جو گناہ و طغیان اور ہوا و ہوس کی دلدلوں میں ہنکائے لئے جا رہے ہوں"۔ کیا امام حسینؓ نے بھی ایسے حکمراں کے خلاف خروج کیا تھا؟

کیا یہ ممکن ہے کہ عریضہ ہذا کے جواب میں جہاں اس مقصد محولہ بالا کی وضاحت فرما دیں وہیں چند اور الجھنیں بھی سلجھا دیں کہ حضرت امام حسینؓ کو شہادت کا مقام کیونکر مل سکتا ہے، جب کہ وہ خلیفہ کے باغی کی حیثیت سے خلیفہ کی بھیجی ہوئی فوج کے ہاتھوں قتل ہوئے اور حسینؓ کے عقل و تدبر، صبر و حلم اور مصالح امت کے فہم کا کیا حال تھا؟۔۔۔ وہ کونسا درس حیات ہے جو حسینؓ کے کردار سے مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کو مل سکتا ہے؟۔ یزید کی بھیجی ہوئی فوج نے حسینؓ کو شہید کیا تو مسلمہ سیاسی و اصولی طریق کے خلاف وہ ان کی شہادت کی ذمہ داری سے مبرا کیسے ہو سکتا ہے؟ تاریخ گواہ ہے کہ ایسی فوج کی بدعنوانیوں کی تلافی مرکز کرتا ہے خواہ غلطی سپہ سالار کی ہو۔ آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ "یزید اور اس کے فوجی افسروں کی نگاہ میں حضرت حسینؓ کا خون خونِ ناحق نہیں تھا۔" (تجلی اپریل و مئی) مگر ذمہ داری یزید پر نہیں۔ این چہ بوالعجبی ست۔ "جو کچھ پیش آیا بہت برا سہی مگر یزید نہ قاتل تھا نہ قتل کا آرڈر دینے والا" پھر بھی قتل کی ذمہ داری اس پر ڈالتے ہو۔ دوسری طرف آپ کو یہ بھی تسلیم ہے کہ "گرفت کے سلسلہ میں اگر حالات اچانک ایسا رخ اختیار کر لیں کہ جنگ و جدل تک نوبت پہنچ جائے اور شخص مذکور اپنے اعیان و انصار کے ساتھ تیغ بدست مقابلہ پہ اتر آئے۔" (تجلی مئی صفحہ ۲۱) تو کیا یہ بات یزید جیسا ماہر سپہ سالار (فاتح قسطنطنیہ) نہیں جانتا تھا؟

آپ کا جذبہ احترام صحابہ ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے مگر اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ مدحتِ یزید استخفافِ حسینؓ پر منتج ہو رہی ہے۔ آپ کو حسینؓ سے خدا واسطے کا بیر تو ہے نہیں تو آپ ان کا مقام گرانے کے درپے کیوں ہیں۔ گو بالواسطہ سہی۔ براہ کرم امام حسینؓ کا اصل مقام بتایئے جو تاریخی حقائق کی روشنی میں آپ سامنے آتا ہو اور جو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو۔

الجواب:۔

بے شک علماء کی اکثریت حضرت حسینؓ کے اقدامِ خروج کے بارے میں وہ رائے نہیں رکھتی جسے ہم تجلی کے صفحات میں پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے کہ تمام ہی محققین کو ایک صف میں کھڑا کر دیا جائے۔ کیا کوئی ذمہ دار آدمی امام ابن تیمیہؒ اور امام غزالیؒ کے محقق ہونے کا انکار کر سکتا ہے؟ ان میں سے ہر ایک کو تفقہ فی الدین، فہم و ذکاء، علم و تبحر اور فکری امامت و قیادت کا وہ بلند مقام حاصل ہے جس سے کوئی باخبر ناواقف نہیں۔ ان میں سے ہر ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں حیثیت

کا نقطہ ہے یہ حضرات کربلا کے واقعات اور حضرت حسین کے حق میں وہی زاویۂ نظر رکھتے ہیں جو ہم پیش کرتے رہے ہیں۔

اس صورت میں یہ استشہاد کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچا سکتا کہ عوام و خواص کی اکثریت کیا کہتی ہے۔ بہت سی باتیں اپنی مخصوص جذبات انگیز نوعیت کی وجہ سے چل نکلتی ہیں حضرت حسین کی شہادت کا واقعہ جس انداز میں پیش آیا وہ ایسا ہی تھا کہ سننے والوں کے جذبات میں اُبال آئے۔ پھر بیان کرنے والوں نے اپنے تصورات، اپنے اندازِ فکر اور اپنے اغراض و مقاصد کے تحت اسے جس رنگ میں بیان کیا وہ اور بھی عقل سوز اور جذبات خیز تھا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے مالہ و ماعلیہ کو خالص آئینی و اصولی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا موقع بہت کم ملا اور عقل و فہم آغاز ہی میں ایک رُخ پر ڈھل گئے۔ یہ دن رات کا مشاہدہ ہے اور انسانی نفسیات اس کی مثالیں قدم قدم پر پیش کرتی ہے کہ کسی معاملہ میں اگر فکر و نقد کا آغاز جذبات کی آمیزش لئے ہوئے ہو تو عقل و فہم اسی رُخ پر چل پڑتے ہیں جس رُخ پر جذبات کا رجحان ہوتا ہے اور آگے آگے دلائل و شواہد کا چاہے کتنا ہی اونچا انبار لگتا چلا جائے، لیکن بنیاد اس کی درحقیقت عقل پر نہیں جذبے پر ہوتی ہے۔ ادنیٰ سی مثال موجودہ سائنس کی لیجئے جو سائنس داں شروع ہی میں خدا بیزار اور مادہ پرست ذہن لیکر میدانِ سائنس میں تشریف لائے تھے ان کی عقل و فہم نے ہر نئی دریافت، ہر تجربے اور ہر انکشاف کو الحاد و دہریت کی دلیل بنایا اور مذہب کے خلاف اتنا متواتر پروپیگنڈہ کیا کہ سائنس کے مقابلہ میں مذہب کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی۔ کھلے دہریوں کو چھوڑیے۔ جن لوگوں کے پاؤں میں ابھی تک مذہب کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں خود ان کے اکثر و بیشتر افراد اس خوش گمانی میں مبتلا ہیں کہ ترقی، تہذیب، قوت، عظمت اور ہر طرح کی فلاح کا معیار مادی پیش رفت اور سائنسی تگ و دو میں ہے۔ مذہب کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ یا تو مادی مصالح کا غلام بن کر جیئے یا کسی کونے میں چھپ کے بیٹھ رہے۔ اس خوش گمانی کیلئے ان کے پاس وہ بے شمار دلائل عقلیہ کا انبار ہے جو کچھ تو ملحد سائنس دانوں نے مہیا کئے ہیں اور کچھ خود ان کی عقل و بصیرت نے فراہم کر دیئے ہیں

[illegible] اور [illegible] مذہبی [illegible] ایک [illegible] اسی طرح سے اپنے [illegible] جانبدارانہ ہوتا کہ کوئی رجحان آغازِ کار میں موجود نہ ہوتا تو [illegible] مذہب [illegible] نہیں تھی۔ [illegible] اور تجربہ عقل و فہم کو اس کے سوا کوئی [illegible] نہیں دے سکتا تھا کہ مذہب کے [illegible] تصورات [illegible] حق ہیں اور ان کا [illegible] اپنی تمام اعلیٰ قدروں کے ساتھ موجود ہے۔

اس سے پتا چلا کہ صحیح نتائج پر پہنچنے کے لئے آغاز ہی میں فکر و نظر کا غیر جانبدارانہ ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے بلکہ فکر و نظر کا سانچا بنانے میں کسی خاص جذبے اور رجحان نے بھی کارفرمائی کی ہے تو مشکل ہی ہے کہ صحیح نتائج تک رسائی ہو سکے۔

واقعاتِ کربلا، اقدامِ حسینؓ اور موقفِ یزید کی جو حیثیتیں متعین کر لی گئی ہیں ان کی پشت پر چاہے کتنی ہی عوام و خواص کی تائید و تصدیق ہو لیکن ان حیثیتوں کے تانے بانے جذبات کے دھاگوں سے بنے ہیں اور عقل و استدلال کو بطور پالش استعمال کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اس پالش کو کھرچنے کی جرأت کرتا ہے چاروں طرف سے اس پر جذباتی مخالفت کی یلغار ہو جاتی ہے۔

جون سنہ ۶۰ کی جو عبارت آپ نے نقل کی ہے اس کا یہ مفہوم آپ نے غلط سمجھا کہ حضرت حسینؓ کے مشن اور اقدامِ خروج کو ہم بھی حق کی علمبرداری کا مرادف سمجھتے ہیں۔ وہ بے شک مظلوم شہید ہوئے اگر وہ واقعات درست ہوں جو عام طور پر بیان کئے جاتے ہیں، لیکن مظلومیت اور شہادت کا سبب ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ان کا اپنے ارادے سے رجوع کر لینا تھا۔ انھوں نے واپسی کا اذن مانگا تھا اور یہ بھی [illegible] اور وہ یزید کے سامنے پہنچ کر دستِ بیعت پر بھی راضی ہو گئے تھے

[illegible]

کہ اگر کوئی [illegible] وغیرہ۔ یہ مطالبہ بار بار دہرایا اور حضرت حسینؓ کی دانست میں اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ حریف دانست میں لشکر آسانی سے قتل کر دے۔ ایسی صورت میں وہ کیسے عزامت کو منظور کر لیتے۔

رہی حق کی علمبرداری، تو حضرت حسینؓ کی نیت کی حد تک ہم نے پہلے بھی تسلیم کیا ہے اور اب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے فعل و عمل کو حق ہی سمجھ رہے تھے اور ان کا مقام ایک نیک نیت مجتہد کا تھا لیکن امر واقعہ کی حیثیت سے ہم نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ یہ حق و باطل کی جنگ نہیں تھی۔

پھر ہم نے وہ الفاظ کیوں لکھے جن سے آپ کو یہ گمان ہوا ہے کہ حضرت حسینؓ کو ہم بھی عام معنوں میں حق کا علمبردار تسلیم کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ الفاظ ہم نے مخاطبین کے عقیدہ و خیال کی رعایت سے لکھے ہیں۔ ہم نے نوحہ گستان حسین کے اس نفاق اور قول و عمل کی دو رنگی پر توجہ دلائی ہے کہ زبانی جمع خرچ تو کئے جائیں گے۔ ماتم و بین کی محفلیں تو سجائے جائیں گے، عزائی جلوس تو نکالے جائیں گے مگر عملاً جہاد کی گھاٹی میں قدم نہیں رکھیں گے۔ دعویٰ ہے کہ حسینؓ حق کے علمبردار تھے۔ عقیدہ ہے کہ انھوں نے اعلیٰ مقصد کے لئے جان دی۔ شہرہ ہے کہ وہ حق کی سربلندی کے لئے نکلے تھے۔ بہت اچھا! آپ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو بسم اللہ قدم بڑھائیے۔ یہ مقصد تو آج بھی آپ کو پکار رہا ہے۔ بارہ سو برس ہو گئے آپ نے صرف بین و ماتم کیا' سینے پیٹے، چیخ پکار کی مگر ایک مرتبہ بھی حسینؓ کی راہ چل کر جان و مال اور زن و فرزند کی قربانی نہیں دی۔ تاریخ کوئی چھوٹی سی مثال بھی پیش نہیں کرتی کہ محبت حسینؓ کے خیالی ہمالیہ تراشنے والوں نے [illegible] حسینؓ کے اسوے کی پیروی کی ہو۔

[illegible] ہے کہ یزید فاسق و فاجر تھا حسینؓ اس سے نہ ٹکراتے تو اسلام (معاذ اللہ [illegible] گستاخ) ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔ [illegible] آپ [illegible] اسوہ حسینؓ [illegible] ہے تو بعد کے کسی فاسق و

[illegible] آج کے [illegible]

حکمرانوں کے خلاف جناب کس لئے اقدام خروج نہیں فرماتے جب کہ ان حکمرانوں کا فسق تو منھ سے بول رہا ہے۔ یزید بیچارے کا تمام مشہور کردہ فسق انفرادی قسم کا تھا۔ لیکن آج کے نام نہاد مسلم حکمرانوں کے فعل و قول کا پلّے نماز تو پہلے ہی دھکے میں اسلامی اصول و اقدار کی گردن پر پڑتا ہے جس کے نتائج انفرادی گناہوں سے ہزار گنا زیادہ بدتر ہیں۔ لیکن ان کے لئے آپ کے ترکش میں اسوۂ حسینی کا کوئی تیر نہیں۔ ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے آپ جان تو کیا دیتے معمولی جدوجہد بھی نہیں کرتے۔

یہ تھا ہمارے الفاظ کا مفہوم و منشاء۔

خود ہماری دانست میں اسوۂ حسینی صرف یہ ہے کہ آدمی جس کام کو حق سمجھے اس کی راہ میں جان لڑا دے۔ یہ سمجھنا صحیح ہو یا غلط' یہ الگ مسئلہ ہے۔ آفت تو یہ ہے کہ بے عملی کے اس دور میں آدمی باتیں بہت بگھارتا ہے' نمائش بہت کرتا ہے مگر کام کچھ نہیں کرتا۔

قتل حسینؓ کی ذمہ داری یزید پر نہیں۔ اس پر آپ این چہ بوالعجبی است کی پھبتی کسیں یا ہنسی اڑائیں ہدف تنہا ہم نہیں بعض اکابر مثلاً امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ اور قاضی ابوبکر ابن عربیؒ بھی بنیں گے۔ ان کی ہم رکابی میں ہمیں طنز و تشنیع کا کوئی غم نہیں۔

یزید نے قاتلین حسینؓ کو پھانسی اسی لئے نہیں دی کہ آئینی اعتبار سے اس کا جواز نہیں تھا۔ تاریخ سے ایک مثال تو ایسی پیش کر دی جائے کہ کسی حکمران نے باغیوں کی تادیب کے لئے فوج بھیجی ہو اور پھر اس فوج نے باغیوں کو تہہ تیغ کر دیا ہو تو اس حکمران نے اس فوج کے سالار کو بطور قاتل کے پھانسی پر لٹکا دیا ہو۔

بارہا عرض کیا جا چکا ہے کہ مذمت یزید ہمارے پیش نظر نہیں۔ ہمیں تو یزید کے بارے میں منافقین کی آبرو کا پاس ہے۔ ہمیں صحابیت کی لاج رکھنی ہے۔ یہ [illegible] حضرت حسینؓ [illegible] ایسا ہی ہے جیسا [illegible]

کا یہ شبہ کہ دیوبندی اور وہابی حضرات رسول اللہ ؐ کا مرتبہ گھٹاتے ہیں، حضرت حسین ؓ کے لئے مبالغہ آمیز مراتب وضع کر لئے جائیں تو ہم پر ان کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ ہماری نظر میں حضرت حسین ؓ کا اصل مقام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ ایک مقدس صحابی تھے، سبطِ رسول تھے، اتنے معظم تھے کہ بڑے سے بڑا غیر صحابی ولی ان کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی عزت و تکریم ہر مسلمان پر لازم ہے۔ ان کے حق میں حسن ظن رکھنا ضروری ہے۔ ان سے بیر بے ایمانی اور ان سے نفرت سیاہ قلبی ہے۔

بس۔ رہا امامت و سیادت کا یہ مقام کہ انھوں نے آنے والوں کے لئے اجتماعی دائرے میں کوئی سنگِ میل نصب کیا، کوئی لائق تقلید اسوہ دیا، کوئی صور پھونکا، کوئی راستہ دکھایا تو اسے ہماری ناقص فہم سمجھنے سے قاصر رہی ہے۔ ہماری ہی نہیں فی الحقیقت تو اور لوگوں کی فہم بھی اسے سمجھنے سے قاصر رہی ہے۔ ذرا آپ حسین ؓ و یزید کی بحث سے ہٹ کر اہلِ فکر و نظر کے فرمودات و تصورات پر نظر ڈالئے۔ یہی ملے گا کہ اہل الرائے کے مشوروں کو نظر انداز کر کے کوئی بہت بڑا اقدام کر ڈالنا آمریت ہے۔ ڈکٹیٹر شپ ہے۔ خود رائی ہے۔ اور یہ ملے گا کہ انسان اپنی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں اور یہ ملیگا کہ خودکشی گناہِ عظیم ہے۔ اور یہ ملیگا کہ اقتدارِ وقت کے خلاف بہت ہی خاص حالات کے علاوہ خروج و بغاوت ممنوع ہے۔

لیکن جب واقعاتِ کربلا کی بحث آئے گی تو آپ دیکھینگے کہ یہ سارے اصول و نظریات پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں اور علم و عقل کو محض جذبات کا تابع مہمل بنا دیا گیا ہے۔ واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

شاعری یا ہفوات

سوال ۱۳ :- از :- منور حسین خاں زیب۔ جے پور۔

اپنے ایک دوست کے توسط سے میں نے ایک شعر کے بارے میں آپ کا خیال جاننا چاہا تھا۔ خط سے آپ نے جو جواب دیا وہ قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ یہ ارشاد کہ۔

"شاعروں کی من افشانیوں پر فتووں کی فکر بیکار ہے۔"

ایسی حالت میں تو بجا ہے کہ بات محفلِ شعر اور سخن فہم لوگوں تک رہ جائے، لیکن جب فاسد خیالات پر مشتمل اشعار وعظ و تبلیغ اور دینی نوعیت کی تقریبات کی زینت بننے لگیں تو معاملہ نازک ہو جاتا ہے۔ میں ایک نام نہاد "مولوی" کے کچھ اشعار نقل کرتا ہوں جو انھوں نے ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں پڑھے اور اسی نوع کے اشعار یہ صاحب عام مجمعوں میں پڑھتے رہتے ہیں اور حیرت یہ ہے کہ حنفی المذہب حضرات تک ان پر گرفت نہیں کرتے، بلکہ داد و تحسین سے نوازتے ہیں۔ آپ اس قسم کے اشعار پر تجلی میں اظہارِ رائے فرمائیں تو افادۂ عام کا باعث ہوگا۔

الجواب ۱۳ :-

(یہ سوال ایک طویل مراسلے کی تلخیص ہے۔ طول سے بچنے کے لئے تلخیص ضروری سمجھی گئی۔ مراسلہ نگار نے اشعار بھی نقل کئے ہیں جن کا ذکر جواب میں آجائے گا)

بندہ نواز! آپ کے دوست نے ڈاک کے ذریعہ ہم سے اس شعر پر فتویٰ طلب کیا تھا:۔

طلب ہے کفر، طلب کا ہو کیوں خیال مجھے
کہ دو جہان دیئے اس نے بے سوال مجھے

اپنے جواب کی نقل تو ہم نے نہیں رکھی، لیکن کچھ اس طرح کی باتیں تھیں جو ہم نے لکھی تھیں کہ شاعری میں عموماً عقائد کا بیان نہیں ہوتا بلکہ یونہی لوگ پروازِ خیال کے جوہر دکھایا کرتے ہیں اس لئے فتووں کی طلب تو بیکار ہی ہے۔ ہاں یہ شعر حقیقت کے اعتبار سے فاسد تخیل پر مبنی ہے۔ اللہ سے طلب اور دعا تو عبادت ہے۔

اب آنجناب نے یہ بتانے کے لئے کہ اس شعر کا قائل عموماً کس قسم کے شعر کہتا رہتا ہے۔ کچھ اشعار پیش فرمائے ہیں اور خواہش کی ہے کہ تجلی میں ان پر اظہارِ رائے کریں تو لیجئے ہم مختصراً اپنی رائے پیش کئے دیتے ہیں:۔

ہماری نظر میں عقائد کے پہلو سے شعر کی تنقید میں اتنی سختی نہیں برتنی چاہئے جتنی نثر میں برتنی ضروری ہے۔ شاعر لوگ بہت سی باتیں محض واہ واہ یا خیالی نکتہ سنجی

کے طور پر کہہ دیتے ہیں اور ان کا مقصود اظہارِ عقیدہ نہیں ہوتا مثلاً مرزا غالب کا شعر ہے:-

جسمیں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ÷ ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

اس شعر پر عقائد کے زاویے سے تنقید کی جائے تو کیا شک ہے کہ غالب مجرم قرار پائیں گے جس جنت اور جن حوروں کی توصیف میں قرآن رطب اللسان ہو انکی تضحیک تحقیر ایمان سوز قرار دی جا سکتی ہے، لیکن غالب کا سارا کلام دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یہ چلتی ہوئی بات انھوں نے محض شاعرانہ ترنگ میں کہہ دی ہے۔ ورنہ حورانِ جنت کا استہزاء ان کا کوئی ایسا مستقل عقیدہ نہیں جس کا وہ پرچار کرتے رہے ہوں۔ لے دے کے چند شعر اور ایسے ملتے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ جنت کے بارے میں وہ کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں تھے۔ مثلاً:-

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مگر یہ شعر بھی اس انداز کا ہے کہ اچھے محمل پر اتارا جا سکتا ہے۔ لہٰذا شاعری کے دائرے میں اُن پر گمراہی کے فتوے جڑنا غلط ہوگا۔ ہاں اگر تیقن کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جاتی کہ بہشت اور حورانِ بہشت کے متعلق ان کے اشعار سنجیدہ فکر و عقیدے کی بنیاد پر نازل ہوئے ہیں تو برملا اعتراض کیا جائے گا کیونکہ ان اشعار میں قرآن کی تقلیل و تخفیف پائی جاتی ہے۔

ایسا ہی معاملہ دوسرے تمام شاعروں کا ہے۔ اگر ایک شاعر اپنے شعر میں رسول اللہؐ کو مخاطب کرتا ہے تو یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ وہ سرکار کے حاضر و ناظر ہونے کا باطل عقیدہ رکھتا ہے، بلکہ یہ گمان کیا جائے گا کہ خطاب محض شاعرانہ نوعیت کا ہے۔ لیکن اگر داخلی یا خارجی کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ خطاب فی الحقیقت اس کے عقیدے پر مبنی ہے تو کوئی کسر اعتراض و قدح میں نہیں چھوڑی جائے گی۔

"طلبِ کفر" والے شعر کو ہم نے اسی لئے فتووں سے بالاتر قرار دیا کہ شاعر کے افکار و عقائد ہمیں معلوم نہیں تھے۔ لیکن اب کہ آپ نے ان کے بہت سے اشعار نقل فرمائے ہیں ثابت ہو گیا ہے کہ وہ فسادِ عقائد کا شکار ہیں۔ ان کے فاسد اشعار پر داد دینا گناہ اور من حیث الشاعر ان کی تکریم و توصیف جرم۔

حیران ہوں خدا کی محبت کہاں رکھوں
دل میں تو بھر گئی ہے محبت حسینؓ کی

اس طرح کے چٹکلے یکبارگی تو عام قسم کے سامعین سے داد لے سکتے ہیں، لیکن ذرا توجہ سے دیکھئے تو بیہودگی کی حد تک "توحید" ہیں۔ بندوں کی محبت میں لوگ ایسے پھنسے کہ خدا کے مرتبہ و مقام کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔

جب کی رسولِ پاک سے دیدار کی دعا
آئی نظر ہے خواب میں صورت حسینؓ کی

دعا صرف خدا سے کی جاتی ہے۔ غیر اللہ سے ــــ خواہ وہ سرکارِ دو عالمؐ ہی کیوں نہ ہوں ــــ دعا کرنا جہاں و مشرکین کے سوا کسی کا کام نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ لغو تصور دینے کی کوشش کرنا کہ دیدارِ حسینؓ بعینہٖ دیدارِ رسولؐ ہے گمراہی کی انتہا ہے۔ حُبِ حسینؓ بہت سے کج فہموں کے لئے ایسا فتنہ بن گئی کہ اس کی زد میں نہ خدا اور رسول کی حرمت سلامت ہے نہ صحابۂ کرام کی پناہ تھا

جبریل کیوں جھلائیں نہ جھولا حسینؓ کو
خوشنودیِ رسول ہے خدمت حسینؓ کی

جھولا جھلانے کی بات کو ایک شاعرانہ تخیل اور نازک خیالی کا مظاہرہ قرار دیکر معاف کیا جا سکتا تھا لیکن جبکہ شاعر کے دوسرے اشعار ثابت کر رہے ہیں کہ ان کی شعر بازی میں عقائد کی سنجیدگی بھی ہے تو یہ کہنے کے سوا چارہ نہیں کہ ایسے اشعار دیوار سے مار دینے چاہئیں۔

ثابت ہے صاف صاف انا من حسینؓ سے
پیغمبری کا جز ہے شہادت حسینؓ کی

جب آدمی درباری قصیدوں پر اتر آئے تو روک ٹوک بے کار ہی ہے۔ شعبدہ گروں کی سی باتیں جن میں کوئی مغز نہیں

جاتا نہ باغِ خلد میں دینہ ار ایک بھی
ہوتی اگر وہاں نہ سیادت حسینؓ کی

ابھی انھیں کو نہیں کہ کیا بات [illegible]
[illegible] اور عاقبت کے خیال سے آدمی [illegible]
[illegible] کہہ سکتا ہے۔

شامل پڑھو کچھ اور یہ کہتے ہیں جبرئیلؑ
پوری ابھی ہوئی نہیں مدحتِ حسینؑ کی

حضرت جبرئیلؑ کے پیچھے شاعر ہاتھ دھو کے پڑے ہیں حالانکہ جبرئیلؑ ایسے لوگوں کو کبھی لفٹ نہیں دیتے جو اللہ کے دین، رسول اللہ کی تعلیمات اور عدل و صداقت کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے غلو سے بار بار منع فرمایا ہے۔ پچھلی اُمتوں کے دینی بگاڑ کی وجہ بھی یہ بتائی ہے کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی تکریم و تعظیم میں غلو کیا تھا۔ آج اسی راہ پر غلامانِ رسول چل رہے ہیں۔ کہیں رسول کو خدا سے ملایا جا رہا ہے کہیں علی و حسینؓ کو آسمانوں پر چڑھایا جا رہا ہے۔ کہیں اولیاء کی پرستش زوروں پر ہے۔ کہیں قوم و وطن کے بانے نگاریں پر عبودیت کے سجدے لٹائے جا رہے ہیں۔

اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

شاعر موصوف کی فکری بے راہ روی اور اعتدال و انصاف سے لاپروائی اور شوقِ مبالغہ آرائی اس تاریخِ وفات سے بھی ظاہر ہے جو مرگِ جگر کی نکالی گئی ہے۔

سِنِ رحلت کی جو کی فکر تو ہاتف نے کہا
لکھئے تاریخ "جگر صدر نشینِ جنت"

جناب جگر بہت سے اوصافِ حسنہ کے باوجود خالص اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی ولی اور قطب نہیں تھے ۔۔۔ لیکن اگر وہ قطب بھی ہوتے تو جاہلِ مطلق کے سوا انھیں کوئی "صدر نشینِ جنت" نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ مقام سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے۔

سائل نے غلط ہی [illegible] اگر شاعر صاحب نے ہاتف کو [illegible] الشیاطین کے زمرے میں داخل کیا ہے۔ بات [illegible]

ہاتف کا [illegible] ہاتفِ غیب کی آواز نہیں تھی۔ یہ تو محض [illegible] تمام [illegible] تاریخ [illegible] پڑے ہیں آ گئے۔ ان کی دانست [illegible] بھی جن [illegible] والوں نے ہاتف [illegible] خرافات کے تھے امان دونوں ہاتف شاعر [illegible] چنانچہ تاریخ میں ان کے اشعار محفوظ ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ شیطان ہم انسانوں کو خوش رنگ کھلونے دے کر بہت خوش ہوتا ہے وہ کبھی ہمارے اندر سے پکارتا ہے کبھی باہر سے۔ کبھی خواب میں جلوہ دکھاتا ہے کبھی بیداری ہی میں بائیسکوپ شروع کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ رکھے۔

خط

سوال[۱۲]:- نام و مقام ندارد۔

میری نظر سے ایک کتاب "قصص الانبیاء" گذری جس میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے نور سے پیدا کئے گئے۔ میں یہاں اس کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

(اقتباس بسبب طول کے ہم حذف کرتے ہیں جواب سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ تجلی)

مصنف نے ان کتابوں کا حوالہ دیا ہے ۔۔۔

روضۃ الاصفیاء۔ معارج النبوۃ۔ تاریخ گزیدہ۔ تاریخ عالم۔ تاریخ حبیب السیر۔ میں پندرہ دن سے اس بارے میں اس لئے غلطاں پیچاں ہوں کہ جب تک مسلمان کا عقیدہ صحیح نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہوتا۔ بہت سے مولویوں سے بھی دریافت کیا۔ انھوں نے مجھے جواب دیا کہ یہ روایتیں اصل میں [illegible] ہیں۔

الجواب[۱۲]:-

معاف کیجئے گا ہم نے طولِ ناروا سے بچنے کیلئے آپ کے سوال کو مختصر کر دیا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے صرف چند اصولی عقائد شرط ہیں۔ یہ سرے سے کوئی عقیدہ ہی نہیں ہے کہ حضور کس طرح پیدا ہوئے اور کس طرح نہیں۔ قصص الانبیاء جیسی کتابیں [illegible] کم علموں کی گمراہی کا کافی سامان موجود ہے۔

[illegible]

ان فضول روایات میں سے ہے جنھیں کوئی بھی محدث صحیح [illegible] محققین کے یہاں [illegible] حاصل نہیں ہے۔ لولاک لما [illegible] خلقت [illegible] کا قول۔ ایک جعلی [illegible] ہے جو [illegible] کی زبان سے نقل کیا ہے۔

انا من نور اللہ والخلق کلہم من نوری [illegible] اللہ کے نور سے ہوں اور تمام خلق میرے نور سے ہے [illegible] جو شخص حدیث سمجھتا ہے اسے علم حدیث کی ہوا بھی نہیں لگی۔ سیکڑوں کی من گھڑت باتیں ہیں جنھیں جہالت وحماقت کے تحت حدیث مان لیا گیا ہے۔ [illegible] یہ ہے کہ حدیث کی کسی معتبر کتاب میں اس کا وجود نہیں۔ اگر ہوگا تو کسی ایسی کتاب میں ہوگا جو رطب ویابس کا پشتارہ ہوگی۔

حوالوں کی جن کتابوں کا آپ نے ذکر کیا وہ غلط و صحیح کا ملغوبہ ہیں۔ ان کے حوالے سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا جن مولویوں نے مذکورہ ٹائپ کی روایتوں کو روایات صحیحہ کا نام دیا ہے وہ مولوی نہیں بلکہ "چارپائے برو کتابے چند" کا مصداق ہیں۔ یا تو انھیں جہالت نے برباد کیا یا پھر عقل وبصیرت سے تہی دامن رہے۔

قصص الانبیاء کی روایت بتاتی ہے کہ عرش، لوح و قلم، بہشت، انسان وحیوان، ملائکہ و جن، شرم اور عشق تمام چیزیں نور محمدی سے بنیں۔ یہ سنک اور مراق کی باتیں ہیں۔ آپ ان کے چکر میں پڑکر اپنے دماغ کا کباڑا نہ کیجئے یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ رسول اللہ کی پیدائش کے بارے میں فضول قسم کی نکتہ آرائیاں اس ذہنی مرض نے پیدا کی ہیں جسے مراق اور خبط کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے ورنہ قرآن صاف بتاتا ہے کہ سب سے پہلے آدم وحوا پیدا کئے گئے اور بعدہٗ وہ تمام انسان جو رسول اللہ سے قبل ہو گذرے۔ پھر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی تو اسی سادہ، معلوم اور متعینہ طریقے پر جس میں کوئی ندرت کوئی عجب اور کوئی خرق عادت نہیں۔ وہ بشر تھے، ابن آدم تھے، اسی مٹی سے بنے [illegible] سے تھے [illegible]۔ یہ [illegible] کہ پہلا [illegible] نور تھا اور پھر اس نور سے تمام کائنات بنی عجائب پرست ذہنوں کی طرازیاں ہیں۔ قرآن وحدیث میں ان کی کوئی بنیاد نہیں۔ عقل وبصیرت کی بارگاہ میں انکا کوئی مقام نہیں۔ مسلمان ہونے کے لئے بس اتنا عقیدہ کافی ہے کہ حضور اللہ کے رسول تھے اور ان کا لایا ہوا دین واجب القبول ہے۔ اگر بعض معجزات ان کے ثابت ہیں تو سر آنکھوں پر۔ مگر ان میں ان کی اپنی قدرت و اختیار کا کوئی دخل نہیں۔ وہ اللہ کے آگے اسی طرح عاجز وناتواں تھے جس طرح دوسری مخلوق ہے۔ وہ نہ طبعی تحقیق میں نور تھے نہ نوعی اعتبار سے بشر کے علاوہ کوئی مخلوق۔ وہ نہ اللہ کے نور کا جز ہیں نہ مخلوقات کے لئے بمنزلہ مادہ۔ عافیت درست رکھنی ہے تو اہل وہم کے چکر میں نہ پڑئیے ورنہ عقل وبصیرت کی مٹی پلید ہوجائے گی۔

"حقیقت رسالت" کا معاملہ بہت سادہ ہے۔ اللہ نے بندوں کی ہدایت و آزمائش کے لئے انھی میں سے بعض بندوں کو اپنی پیغام بری کے لئے چن لیا اور آخرکار ایک برتر انسان پر اس سلسلہ کو ختم فرمادیا۔ یہ انسان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ انھوں نے ہر وہ چیز بندوں تک پہنچادی جس کے پہنچانے کا اذن دیا گیا تھا۔ نہ صرف قولاً بلکہ لائق عمل امور میں عمل کرکے بھی دکھادیا۔ بس یہ ہے حقیقت رسالت۔ اب جو شخص اس صاف وسادہ حقیقت کو اپنے ذہن کی کجی اور زاویۂ فکر کے فساد کی وجہ سے خواہ مخواہ نکتہ آفرینیوں میں پھنسا دینا چاہتا ہے اسے بوالفضول کے سوا کیا کہیں گے۔

نظر کی نامسلمانی سے فریاد!

قومی جھنڈے کی سلامی

سوال [illegible]:۔ ازعبدالودود۔ دربھنگہ۔

میرے ایک دوست یہاں ہائی اسکول میں ایک اسسٹنٹ ٹیچر ہیں۔ یوم آزادی یعنی ۱۵ر اگست کو انھیں قومی جھنڈے کو سلامی دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہمارے دوست اس کے لئے بالکل راضی نہیں ہیں، چاہے اس ملازمت ہی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اب تک تو وہ کسی نہ کسی طرح بچتے چلے آئے ہیں، لیکن

آئندہ ممکن ہے کہ اور بھی زیادہ جبر ان کے ساتھ کیا جائے۔ بنا بریں ایسی حالت میں صحیح شرعی صورت حال سے مطلع کیا جائے۔

الجواب :-

سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی تقریبات آزادی میں قومی جھنڈے کی سلامی ایک ضابطۂ عمومی کی شکل اختیار کر چکی ہے اس لئے مناسب تو یہ تھا کہ اس کے بارے میں علماء کے کسی ذمہ دار ادارے سے استفتاء کیا جاتا۔ ہم جیسے افراد کا فتویٰ اہمیت کا حامل نہ ہوگا۔ تاہم ادائے فرض کی حد تک اپنے ناچیز خیالات پیش کئے دیتے ہیں۔

یہ تو طے ہے کہ سلامی کی ظاہری شکل وہیئت چاہے کچھ بھی ہو وہ اسی سیاسی مذہب کا جزء ہے جسے قوم ووطن کے نام پر رائج کر لیا گیا ہے۔ اسلام سرے سے اس مذہب ہی کو فاسد قرار دیتا ہے، لیکن جن مجبوریوں میں ہمارے وطن کی امت مسلمہ گرفتار ہو گئی ہے ان کا لحاظ بھی ممکن حد تک ضروری ہے۔

سلامی کی جو شکلیں اپنی ہیئت کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں ان کے اختیار کرنے کی اجازت تو کسی بھی تاویل سے نہیں دی جاسکتی۔ مثلاً ہاتھ جوڑنا، رکوع یا سجدے کا انداز اختیار کرنا۔ ایسے الفاظ ادا کرنا جو اسلامی تصورات کی ضد ہوں۔ یہ ناقابل معافی ہیں اور محض پیٹ کی مجبوری سے گوارا نہیں کئے جاسکتے۔

لیکن جو شکلیں اس درجہ کی نہ ہوں انھیں احتیاط کیساتھ گوارہ کیا جاسکتا ہے۔ احتیاط کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے اعتقاد و نیت پہ نظر رکھے اور سلامی کے وقت خاص طور پر اس یادداشت کو تازہ کرے کہ ہم مسلمان ہیں ہمارے نزدیک قوم و وطن کی محبت حق کی محبت پر مقدم نہیں۔ ہم قوم ووطن کے لئے جان دے سکتے ہیں، لیکن اپنا دین قربان نہیں کر سکتے۔ اس یادداشت کو تازہ ہی کر لینا کافی نہیں، بلکہ الفاظ اور عمل کے ذریعہ دوسروں پر واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ ہمارا موقف کیا ہے اور کن حدوں پر اسلام اور قوم پرستی کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔

شخص اپنے میں اتنی ہمت پاتا ہو کہ دین کی خاطر نوکری قربان کر سکتا ہے اس کے لئے مجبوری کا معیار دوسرا ہے۔ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ عزیمت کی راہ اختیار کرے لیکن جو دون ہمت ہوں یا حالات سے بے بس ہوں ان کے لئے شرعی نقطۂ نظر وہی ہے جو ابھی بیان ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

نفسانیت کے مظاہرے

سوال ۱۶ :- (ایضاً)

یہاں دربھنگہ شہر میں ایک محلہ "بیتا" ہے۔ محلہ میں متصل ہی دو مسجدیں ہیں۔ ایک بڑی دوسری چھوٹی۔ بڑی مسجد محلہ کے عین وسط میں ہے۔ اور چھوٹی مسجد محلہ کے صرف ایک کنارے پہ ہے۔ دونوں مسجدوں میں غالباً احساس برتری اور کمتری کی وجہ سے یا یہ کہ پہلے سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ جمعہ کی نماز ادا ہوتی ہے۔ محلے ہی کے کچھ لوگ اسے بُرا بھی تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا شرعی نقطۂ نظر سے مطلع کیا جائے کہ کیا محلے کے مسلمانوں کا ایسا کرنا جائز ہے؟ اگر جائز نہیں ہے تو انھیں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب ۱۶ :-

نمازِ جمعہ کی افضلیت اس میں ہے کہ شہر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان یکجا ہو جائیں اسی لئے مرکزی مساجد کا نام "جامع" رکھا جاتا ہے اور وہ بڑی بنائی جاتی ہیں۔

لیکن ہر طرح کے عمرانی حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ہر شہر کے تمام ہی مسلمان اس شہر کی جامع مسجد میں جمع ہو سکیں اس لئے اس کا جواز ہوا کہ ضرورت کے مطابق ایک سے زائد مسجدوں میں جمعہ ہو جائے۔ علاوہ ازیں بہت سے تمدنی تقاضے اور بھی ایسے تھے کہ ایک ہی مسجد پر انحصار غیر مناسب ہوتا۔ جگہ کی تنگی کے علاوہ بھی کئی طرح کی دشواریاں ہیں جن کے پیش نظر شہر کی مختلف مسجدوں میں جمعہ جائز قرار دیا گیا ہے۔

لیکن یہ طے ہے کہ نمازِ جمعہ میں اصل چیز اجتماع ہی ہے اور صرف معذوریوں کے لحاظ سے رعایتیں دی گئی ہیں۔ مقبول وہی معذوریاں ہوں گی جن کا اعتبار شریعت نے

کیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ بلا عذر صحیح کے بھی جمعہ کی روح اور اسپرٹ سے دامن بچایا جائے۔

جو صورتِ حال آپ نے پیش کی اگر وہ اِس معذوری پر مبنی ہوتی کہ بڑی مسجد میں محلے کے تمام نمازی نہ سما سکتے تو بلاشبہ دوسری مسجد میں جمعہ درست ہوتا' لیکن سوال صاف بتا رہا ہے کہ یہ معذوری موجود نہیں ہے۔ پھر کیا معذوری ہے جس کی بناء پر یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ دونوں مسجدوں کے متولیوں اور اماموں میں اسی نوع کا اختلاف ہو جیسا دیوبندیوں اور بریلویوں میں ہے۔ اگر ایسا ہے تب بھی اسے ایک عذر قرار دیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر یہ بھی نہیں ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ نفسانیت کے علاوہ اس افتراق کو کس چیز پر مبنی سمجھیں۔ تفصیلی اعتبار سے یہ افتراق چاہے کوئی بھی نوعیت رکھتا ہو لیکن بنیادی لحاظ سے یہ نفسانیت ہی کا مظہر ہے۔

اہل محلہ کے ممتاز حضرات کو چاہئے کہ سر جوڑ کے اس معاملہ پر غور کریں اور نماز جمعہ کے لئے بڑی ہی مسجد معین فرماویں جمعہ کی جماعت کو بلا وجہِ شرعی کے تقسیم کرنا جائز نہیں ہے اور پیش کردہ صورتِ حال میں عوام کی نماز چاہے درست ہو جائے مگر جو لوگ خواص میں داخل ہیں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے اس لائق ہیں کہ شرعی مسائل کو سمجھیں ان کی بے حسی اور تغافل معافی کے قابل نہیں۔ انھیں ضرور اللہ کے یہاں حساب دینا ہوگا کہ کیوں انھوں نے ایک غلط طریقے کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اور اصلاح حال کی سعی نہیں کی۔

قرأۃ فاتحہ

سوال:- از عبد العزیز۔ نارائن کھیڑ۔ ضلع میدک۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

عرض ہے کہ مجھے اخبار اہل حدیث دہلی مورخہ یکم جولائی سنہ ۶۰ء دیکھنے کا موقع ملا۔ "قرأۃ فاتحہ تجلی کا جواب الجواب" از مولانا علی احمد صاحب بنارسی۔ مذکورہ مضمون کے ملاحظہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ تجلی میں جو مضمون شائع ہوا تھا وہ حقیقت سے بعید تھا اور آپ نے طوالت کے چکر میں گھما کر الٹے سیدھے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مولانا بنارسی صاحب کا جواب الجواب پڑھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے تقلید کے چکر میں احادیث صحیحہ تک کو نظر انداز کر دیا اور ان ہی مسائل میں کئی معتبر علماء واحناف کے فیصلہ کن اقوال کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔ پس کافی غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ تقلید کے جنون میں بڑے بڑے علمائے دین بھی لوگوں کو مختلف مسائل میں احادیث صحیحہ کو نظر انداز کر کے قیاس و رائے پر عمل کرنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ بہر حال ہمارا منشاء یہ ہے کہ اہلحدیث یکم جولائی سنہ ۶۰ء کے مذکورہ مضمون کا ایک جواب آپ کی طرف سے بھی دیکھیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ضرور تجلی میں اُس کا جواب دیں گے۔ ورنہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے تجلی میں مستفتی کو خیانت کے ساتھ جواب دیا تھا۔

الجواب:-

جولائی میں ہم کراچی تھے اور تقریباً ڈیڑھ ماہ وہاں قیام رہا۔ اس دوران میں کوئی بھی اخبار نہ دیکھ سکے۔ پھر اخبار "اہل حدیث" تو ہمارے یہاں آتا بھی نہیں ہے اور آنجناب کے مکتوب سے پہلے ہمیں علم ہی نہیں تھا کہ کس نے ہمارے رد میں کیا لکھا ہے۔

لیکن اگر ہم دیکھ بھی لیتے تو جواب نہ دیتے۔ امام کے پیچھے قرأت پڑھنے نہ پڑھنے کا مسئلہ ان فقہی مسائل میں سے ہے جن پر ماضی میں بہت بحثیں ہو چکی ہیں۔ علمائے احناف اپنے مسلک پر وارد ہونے والے ہر اعتراض کا اتنا محکم اور وزنی جواب دے چکے ہیں کہ اتمام حجت میں کسر نہیں رہ گئی۔ اب یہ تو ممکن ہے کہ ہم جیسا کوئی شخص جسے اپنے رسالے میں نوع بہ نوع مسائل سے عہدہ برآ ہونا ہو ضرورت پڑنے پر ایک دو بار کچھ صفحات لکھ دے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر اُس شخص سے دُو بدو ہونے بیٹھ جائے جو پرانی پٹی ہوئی بحثوں کا پشتارہ اٹھا کر میدانِ مناظرہ میں کود پڑا ہو۔ فاتحہ خلف الامام جیسے مسائل مستقل کتابوں کے طالب ہیں اور ہم کتاب لکھنے سے بھی گریز نہ کرتے اگر یہ کام دوسرے لوگوں نے خوش اسلوبی سے انجام نہ دے دیا ہوتا۔ لیکن جب کہ احناف نے بارہا تمام اعتراضات کے دنداں شکن

جوابات دیتے ہیں اور ہزاروں صفحات ان جیسے موضوعات پر موجود ہیں تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ اُن حضرات کے تعاقب میں تجلی کو کتبی بحثوں کا اکھاڑہ بنائیں جن کا کارنامہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ بارہا کے چبائے ہوئے لقمے چباتے ہیں اور ایسا طمطراق دکھلاتے ہیں جیسے فریق ثانی پر کئے جانے والے اعتراضات اور ان کے مسلک کی تائید کرنے والے دلائل آج ہی نئے نئے آسمان سے نازل ہوئے ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رکعات تراویح جیسے مسائل پر جتنا کچھ موافق و مخالف کہنا ممکن تھا وہ سب کہا جا چکا اور جرح و تعدیل کے جتنے نازک سے نازک اور خفی سے خفی گوشے ہو سکتے تھے ان سب کو بحث کی سان پر چڑھایا جا چکا۔

احناف کے جتنے بھی اس نوع کے متفق علیہ مسائل ہیں وہ عقل و علم کے بہترین تناسب و توازن کا شاہکار ہیں جن میں اجتہاد، قیاس، قرآن، سنت اور وسیع تر مصالح کے تمام نازک رشتوں کو بہترین فنی مہارت کے ساتھ احکامِ شریعت کی روح سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جو لوگ زیادہ گہرے نہیں جا سکتے اور ذہنی طور پر اس کے اہل نہیں کہ قانون سازی کی باریکیاں سمجھ سکیں وہ چند سطحی مشاہدات اور پیش پا اُفتادہ مظاہر سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

تجلی کے صفحات شاہد ہیں کہ ہم اہلِ حدیث کے بارے میں متشدد نہیں۔ ہم بالکل پسند نہیں کرتے کہ ان میں اور احناف میں روز روز بحثیں ہوں۔ ہمارے نزدیک اپنے اپنے فقہی مسلکوں پر قائم رہتے ہوئے بھی اتحاد و مودت کی پینگیں بڑھائی جا سکتی ہیں، لیکن یہ سخت افسوس ناک بات ہے کہ اہلِ حدیث حضرات کی طرف سے عوام کو آئے دن یہ تأثر دیا جاتا رہتا ہے کہ حدیث کے پیرو تو فقط ہم ہیں اور احناف تو کورے مقلد ہیں۔ ان کے ہٹے حدیثوں سے زیادہ اپنی رائے کو معزز سمجھتے تھے۔ ان کا مذہب جگہ جگہ حدیث سے ٹکراتا ہے۔

اس کے علاوہ ایسی مثالیں بھی سامنے آتی رہتی ہیں کہ یہ حضرات خود احناف کے مسلک کی تردید میں بعض علمائے احناف ہی کے اقوال من مانے انداز میں پیش کر کے اپنے مسلک کی تائید فرماتے ہیں۔

حالانکہ حق یہ ہے دونوں ہی حرکتیں نازیبا ہیں۔ احناف نعوذ باللہ حدیث کو پس پشت ڈالنے والے تو نہیں مگر ان کا قصور یہ ہے کہ اللہ نے ان کے ائمہ و مشائخ کو وہ ذہانت و ذکاوت عطا فرمائی جو کم فہموں جیسی سطح بینی پر قناعت نہیں کرتی، بلکہ گہرائی میں اُتر کر لطائف کا جائزہ لیتی ہے اور اصول و فروع کی تخریج میں ہمہ جہتی مصالح کا خیال رکھتی ہے اگر کوئی شخص اس گمانِ فاسد میں مبتلا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے زیرک شاگرد اور بعد کے ہزاروں ہزار عالم و فاضل احناف کسی ایسی بات پر متفق ہو گئے ہیں جو احادیثِ ثابتہ کے خلاف ہے تو وہ شخص یا تو جاہل و متعصب ہے یا پھر عالم و مخلص ہے تو عقل و فراست میں کوتاہ ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ہزاروں اصحابِ علم و ورع جو حدیثِ رسول کو حجتِ قطعی مانتے ہوں اور دین و شریعت سے انکی محبت مسلّم ہو وہ کسی ایسے فیصلے پر متفق ہو جائیں جو حدیث کیخلاف ہو۔ کسی کو ایسا نظر آ رہا ہے تو یہ اس کی سطح بینی ہے۔ اس کی نگاہ میں گہرا جانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ وہ سامنے کے مشاہدات کو سب کچھ سمجھ بیٹھا ہے، حالانکہ قانونی دفعات محض سامنے کے مشاہدات سے نہیں بنا کرتیں ان کے لئے غامض و لطیف حقائق کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے اور متعارض دلائل کا ماہرانہ تجزیہ کر کے دیکھنا پڑتا ہے کہ کس جانب کے دلائل بحیثیت مجموعی زیادہ وزنی ہیں۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ حنفی ائمہ و مشائخ ہی میں وہ کیا سرخاب کا پر تھا کہ انھیں ذکاوت و بصیرت زیادہ ملی۔ ہم جواب دیں گے کہ ہم نے جو کچھ کہا وہ روزمرہ کے سادہ انداز میں کہا ورنہ منطقی ترتیب دراصل یہ ہے کہ کسی عالم کے حنفی بننے کے بعد اس پر عقل و بصیرت کا نزول نہیں ہوا، بلکہ جن حضرات کو اللہ نے ذہانت و فطانت کی صلاحیتوں سے نوازا تھا وہی کثرت کے ساتھ حنفی بنتے چلے گئے۔ اسلئے بنتے چلے گئے کہ جملہ فقہائے سلف کے اختلافات پر غیر جانبدارانہ نظریں ڈالنے سے وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ ہر دوسرے مکتبۂ فکر کے مقابلہ میں حنفی مکتبۂ فکر زیادہ

باریک بینی، دور اندیشی، صلاح و توازن اور معاملہ فہمی کا حامل ہے۔ اس کے یہاں تساہل، جلد بازی، سہولت پسندی اور سطحیت نہیں، مستعدی، تحمل، ذہنی جفاکشی اور گہرائی ہے۔ وہ اسباب و نتائج اور علت و معلول کے پیچیدہ تر رشتوں سے گھبرا کر محض قریبی اور سہل الحصول مشاہدات کو سینے سے لگانے کی غلطی نہیں کرتا، بلکہ تمام پیچیدگیوں پر عبور حاصل کر کے آخری حدوں تک پہنچ جاتا ہے اور خادمیت کا حق ادا کرتا ہے۔ اس منطقی ترتیب کے بعد اس وہم کی گنجائش نہیں رہتی کہ احناف میں ہر غاب کا پر ڈھونڈا جائے۔

بات ختم کرتے ہوئے ہم صرف ایک مثال دیں گے۔

رکعاتِ تراویح کی تعداد کا مسئلہ احناف اور اہل حدیث میں مختلف فیہ ہے۔ اس پر آئے دن بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ابھی کچھ روز ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے مسلکِ اہل حدیث کے رد میں ایک کتاب لکھی "رکعاتِ تراویح" (اس پر تجلی اپریل ۵۵ء میں تبصرہ ہو چکا ہے) رکعاتِ تراویح کے جواب میں دو اہل حدیث بزرگوں نے کتابیں لکھیں۔ یہ اس انداز کی تھیں کہ بعض گہرا علم رکھنے والوں اور سیدا مغزوں کے علاوہ جس نے بھی انھیں پڑھا ہوگا یہی سمجھا ہوگا کہ حنفی مذہب تو بڑا الم غلم ہے۔ اس کے مؤیدین تو بڑے جعلساز اور دھاندلے باز ہیں۔ انھیں تو حدیثِ رسولؐ کا بھی کچھ پاس لحاظ نہیں۔

لیکن اب مئو کے ایک فاضل مولانا عبدالباری نے ان دونوں کتابوں کا جواب دیا ہے جو اس طرح شائع کیا گیا ہے کہ اصل کتاب "رکعاتِ تراویح" بھی ساتھ ہے اور اعتراضات و جوابات بھی (اس کتاب پر تبصرہ ان شاء اللہ "تبصرہ نمبر" میں آئے گا)

جسے یہ دیکھنا ہو کہ اہل حدیث اور احناف کتنے کتنے پانیوں میں ہیں وہ بطور نمونہ اس کتاب کو دیکھے۔ اسے پڑھ کر اسے پتا چلے گا کہ احناف کا مسلک کیسی سیسہ پلائی ہوئی بنیادوں پر قائم ہے اور اس پر طرح طرح الزامات عائد کرنے والے علم و عقل کی کس سطح پر ہیں۔ یہی نہیں کہ انھوں نے قدم قدم پر تحریف، تلبیس، مغالطہ دہی اور بد دیانتی کا سہارا لیا ہے بلکہ صاف نظر آجاتا ہے کہ کتنے ہی مقامات پر وہ لطیف و نازک پہلوؤں کو سمجھ ہی نہیں پائے ہیں اور ناسمجھی ہی کی وجہ سے بیچ بیچ خود کو برسرِ حق اور فریقِ ثانی کو گم کردہ راہ خیال کر بیٹھے ہیں۔

یہی حال اسی نوع کے دیگر مباحث کا ہے۔ فاتحہ خلف الامام ہو یا آمین بالجہر وغیرہ۔ اہل حدیث علماء کے فکر و درایت ایک قریبی حد پر جا کر بیتاب ہو جاتے ہیں کہ بس آگے مت بڑھو، یہیں فیصلہ کر دو۔ لیکن احناف کہتے ہیں کہ تفقہ کا حق اس آسانی سے ادا نہیں ہوتا۔ اللہ کی دی ہوئی عقل کو ابھی اور آگے لے چلو، کئی گھاٹیاں اور بھی ہیں۔ خوردبینی جائزہ ابھی اور اسرار نہانی کا انکشاف کرے گا۔ اسی لئے متعدد مسائل میں دونوں کے آخری نتائج اور فیصلوں میں فرق ہو جاتا ہے۔

اے فاضل مکتوب نگار! اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ قرأۃ فاتحہ کی بحث میں تجلی نے احادیث صحیحہ کو نظر انداز کر دیا ہے ـــ نہ صرف تجلی بلکہ آپ کے غور و فکر نے بڑے بڑے علمائے دین کو بھی تقلیدِ کورانہ کے جنون میں گرفتار دکھلایا ہے تو ہم آپ کی بلندیِ فکر کی داد دیتے ہوئے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہیں۔ تقلید سے گزر کر اجتہاد و امامت کے مقام بلند پر پہنچنا بڑی صلاحیتیں چاہتا ہے ہر اہل حدیث اگر ان صلاحیتوں سے مالا مال ہے تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ لیکن ہم نالائق تو خود کو ان صلاحیتوں سے بہرہ ور نہیں پاتے اور مجبور ہیں کہ فقہی اصول و فروع میں تقلید کی راہ اختیار کریں۔ لہٰذا آپ ہمیں خائن کہنے کی بجائے نالائق اور نااہل تصور فرمالیں تو آپ کی عاقبت کے لئے بہتر ہو۔ یہ تصور مطابقِ واقعہ ہوگا اس لئے گناہ نہ ہوگا۔ لیکن "خیانت" کا الزام گناہ بھی ہو سکتا ہے اگر خلافِ واقعہ ہو۔

حضرت عمرؓ کی فتوحات

سوال نمبر — از حکیم عظیم زبیری - امروہہ۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں مختلف امصار و دیار پر جو فوج کشی کی تھی وہ جارحانہ تھی یا مدافعانہ؟ اور قرآن میں کہیں جارحانہ حملوں کے بارے میں بھی حکم آیا ہے یا نہیں۔ آیا ہے تو کن شرائط کے ساتھ اور کن حالات میں۔ آیات مع حوالہ تحریر فرمائیں۔ دراصل کہا جا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جارحانہ حملے کئے جو اسلام کی تعلیم اور حکم قرآنی کے خلاف تھے۔ آپ اس اعتراض کو رفع فرمائیں۔

الجواب:۔

حضرت عمرؓ کے حملوں کو خلاف اسلام کہنے والوں کو آپ نے اگرچہ مجہول رکھا ہے، لیکن ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور بغضِ عمرؓ میں ان کے فاسد فکر و خیال کا پارہ کتنا چڑھا ہوا ہے۔ ان لوگوں کی ناشکری اور کم ظرفی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سب سے زیادہ مبغوض ان کی نظروں میں وہی خلفائے راشدین ہیں جن کی فتوحات اور عزم و عمل کے نتیجے میں ان لوگوں کو زندگی ملی ہے۔ اگر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اسلام پر فتح و ظفر اور کشور کشائی کی راہیں نہ کھولتے تو حدودِ عرب سے باہر کبھی کوئی ماں مسلمان بچہ نہ جنتی اور کفر و شرک کے سوا ان سعادتمندوں کے حصے میں کچھ نہ آتا جو آج پوری بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ ابوبکر و عمرؓ پر کیچڑ اُچھالنے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

خیر آپ جواب سنئے:۔

کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ خود سوال کا مفہوم اور حدود متعین کر لئے جائیں۔ بتائیے — ان معترضین سے پوچھ کر بتائیے کہ جارحانہ اور مدافعانہ حملہ کسے کہتے ہیں۔ اس کی جامع و مانع تعریف کیا ہے؟

ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ علم و فن کے اس دورِ شباب میں بھی بڑے بڑے عقلاء و فضلاء کے درمیان یہ بات صاف نہ ہو سکی کہ جارحانہ حملہ کونسا ہے اور مدافعانہ کونسا۔ ایک ہی حملے کو بعض لوگ جارحانہ قرار دیتے ہیں اور بعض مدافعانہ۔ ہندوستان کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان کو جارح قرار دیتا ہے اور پاکستان اسے غلط قرار دیتے ہوئے ہندوستان کو غلط کار ٹھیراتا ہے۔ مغربی ممالک اور ان کے ہمنوا چین کے حالیہ اقدامات کو جارحانہ کہتے ہیں لیکن روسی بلاک اسے ہرگز جارحانہ نہیں مانتا۔ مصر پر برطانیہ کی یلغار کو بے شمار لوگوں نے جارحانہ ٹھیرایا، لیکن بے شمار لوگ اسے مدافعانہ قرار دیتے ہیں اور دلیل یہ ہے کہ برطانیہ نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر جائز اقدام کیا تھا۔

بحث اس سے نہیں کہ کون ٹھیک کہتا ہے اور کون غلط۔ یہ فیصلہ کون کرے۔ معترضین کو بتانا چاہئے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جارحانہ حملہ اسے کہتے ہیں اور مدافعانہ اسے۔

پھر دوسرے نمبر پر انھیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ جارحانہ حملے کو قرآن نے ناجائز ٹھیرایا ہے۔ محض یہ بات کافی نہیں کہ فی زمانہ جارحانہ حملوں کی مذمت بطور فیشن رائج ہو گئی ہے۔ معترضین اسلامی تعلیم کی منطق بگھارتے ہیں تو انھیں جارحانہ حملے کی جامع مانع تعریف کرنے کے بعد اسلامی تعلیمات ہی کی روشنی میں واضح کرنا ہوگا کہ ہر جارحانہ حملہ حرام ہے۔

پھر تیسرے نمبر پر انھیں حضرت عمرؓ کے تمام ہی حملوں میں سے وہ حملے متعین کر کے دکھانے ہوں گے جو ان کی دانست میں جارحانہ تھے اور علم و عقل کے معروف استدلال کے ذریعہ یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ جارحانہ کی تعریف ان حملوں پر صادق آرہی ہے۔

یہ کنج کاوی کر لیں تب کہیں ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ انھیں جواب دیں اور بتائیں کہ تمھارے دعاوی کس قدر دور از کار ہیں۔ اس کے بغیر محض اتنی سی بات پر کہ انھوں نے آرام کرسی پر لیٹ کر لطیفہ بازوں کی طرح ایک شوشہ چھوڑ دیا، ہمارا جواب کی زحمت اُٹھانا احمق بننے کے مرادف ہوگا۔

ویسے آنجناب کی تسکین کے لئے ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت عمرؓ کی حیاتِ حرب و قتال کا ایک ایک واقعہ ہماری نظر میں ہے۔ تاریخ انسانی کے اس عظیم ترفاتح عظیم

اور تاریخ حرب وقتال کے اس ممتاز ترین سپہ سالار کے کارناموں کا ہر ہر گوشہ اسلام کے سر افتخار پہ تاج زرنگار بن کر جگمگا رہا ہے کم علموں اور نافہموں کو چلتے ہوئے فقروں سے ورغلالینا اور بات ہے، لیکن جہاں تک متین فکر و تدبّر کا تعلق ہے احمق بلکہ جو اس باختہ ہی ہے وہ شخص جو فاتح اعظم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عسکری اقدامات کو خلاف اسلام کہنے کی جرأت کرے۔ حالانکہ یہی وہ اقدامات تھے جس کے نتیجے میں یہ ناشکرا معترض مسلمان کی حیثیت سے زبان کھولنے کے قابل ہے ورنہ کفر و شرک کے علاوہ مجوس کے پاس کیا ہوتا۔

آپ شاید اس لئے اس فاسد پروپیگنڈے سے متأثر ہوگئی ہیں کہ جارحانہ حملوں کی مذمت پر آج کل عالمی پیمانے پر خوب گل افشانیاں ہو رہی ہیں اور جارحانہ حملہ عام آدمی ہر اُس حملے کو سمجھ لیتا ہے جس کی ظاہری شکل یہ ہو کہ ایک قوم دوسری قوم پہ ایک لشکر دوسرے لشکر پر چڑھ دوڑا ہو۔

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ اگر صرف یہ ظاہری اور سطحی شکل ہی جارحانہ حملے کی پوری تعریف گردانی جائے تو ختمی مرتبت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک کے متعدد حربی و عسکری اقدامات جارحیت سے ملوث ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ خلاف اسلام جارحیت کی جو بھی تعریف معترضین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کسی فوجی اقدام پر چسپاں کریں گے وہ خاتم النبیین کے بعض حربی اقدامات پر بھی ضرور منطبق ہو جائے گی۔ اور اُن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقدامات بھی یقیناً اس کے دائرے میں آجائیں گی جن کی غالی محبت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر گندگی اُچھالی جا رہی ہے۔ حضرت علیؓ کی جارحیت تو اور بھی زیادہ مکروہ نظر آئے گی کہ انھوں نے کفار کے خلاف نہیں خود مسلمانوں کے خلاف اقدامات کئے جن کے نتیجے میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے نقصانات ملّت اسلامیہ کو اُٹھانے پڑے۔ مثبت یہ کہ مسلمانوں کی تلواروں نے مسلمانوں ہی کا خون چاٹا، مسلمانوں نے مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں۔ مملکت کا امن وچین غارت ہو گیا۔ اور منفی یہ کہ اسلامی فتوحات کا جو دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اس کی حرکت و جنبش یکلخت رک گئی اور کفر و شرک کو چین کا سانس لینے کا موقع ملا۔

معاف کیجئے گا۔ جواب کا لہجہ ذرا تلخ ہو گیا۔ مگر کیا کریں جب کسی صحابی کے لئے گالی سُننے میں آتی ہے تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے باپ کو گالی دی گئی۔ نہیں بخدا باپ اور ماں کی گالی سے ہمیں اتنی تکلیف محسوس نہیں ہو سکتی جتنی صحابہؓ اور صحابیاتؓ کی شان میں بدزبانی سے محسوس ہوتی ہے۔ بھلا اس جہالت و رذالت کی کوئی حد ہے کہ دو کوڑی کے لوگ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حق پرستی پر انگلی اٹھائیں۔ ویسے تلخی کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سنجیدہ جواب سے بھاگ رہے ہیں۔ صاف صاف بتاؤ جارحانہ حملہ کسے کہتے ہیں؟ پھر ثابت کرو کہ قرآن کی رُو سے یہ حرام ہے؟ پھر صراحت کرو کہ حضرت عمر کا کونسا حملہ اس حرمت کی زد میں آتا ہے؟ انشاء اللہ اس کے بعد ہم ایسا جواب دیں گے کہ اپنا سا منہ لے کے رہ جاؤ گے۔ وباللہ التوفیق

روئے سخن معترضین کی طرف ہے۔ محترم سائلہ بُرا نہ مانیں۔

بچکانی منطق

سوال

ایک صاحب نے چار لمبے صفحوں کا اعتراض نامہ ارسال کیا ہے وہ خیر سے اپنے اہلِ سنت ہونے کے مدعی ہیں کیونکہ حضرت بوبکر و عمر کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھنے کا تکلف گوارا فرمایا ہے۔ لیکن کس بانکی قسم کے اہل سنت ہیں اسکا اندازہ اس طرزِ گفتگو سے کیجئے:۔

> "امیر معاویہ اپنا زور شیر خدا کے ساتھ آزما چکا تھا وہ حضرت حسن کے پاس خلافت کی بھیک مانگنے آیا تو مجسّم رحمت نے اس کی جھولی اس کی خواہش کے مطابق بھر دی۔"

اس انداز کی گفتگو کرنے والا ظاہر ہے کہ ہمارے منہ لگانے کے قابل نہیں ہے، لیکن ان چار صفحات میں بعض ایسے مطالب بھی موجود ہیں جن کی جواب دہی مناسب معلوم ہوتی ہے

کیونکہ ہم نے مختلف وقتوں میں حسینؓ و یزید کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بعض لوگوں نے جرح بھی کی ہے اور اسی جرح کے کچھ حصے ان صفحات میں پائے جاتے ہیں۔ مکتوب نگار کی طفلانہ چرب زبانی سے قطع نظر ہم نفسِ جرح پر کچھ عرض کئے دیتے ہیں۔

(۱) غزوۂ قسطنطنیہ کے مجاہدین کے لئے اللہ کے رسول نے مغفرت کی بشارت دی۔ یہ بشارت بہت سے ان لوگوں کے گلے میں اٹک کے رہ گئی جنھیں ایمان بالحدیث سے زیادہ اپنے علم و فہم اور خواہشات کی پیروی مرغوب ہے۔ حد ہے کہ مہتمم دار العلوم تک نے حدیث کو تحریف و تغلیط کی سان پر چڑھایا اور ہمیں جون ۶۱ئہ کے تجلی میں اس کی نگہداشت کرنی پڑی۔

لیجئے تین دلیلیں اور ہیں جو ہمارے استدراک کے رد میں سامنے آئی ہیں۔

اوّل:- جنگِ قسطنطنیہ غزوہ نہیں کیونکہ رسول کریم کی موجودگی میں نہیں لڑی گئی۔

دوئم:- اس جنگ کی اجازت یاساریۃ الجبل جیسی بصارت و بصیرت رکھنے والے نے نہیں دی تھی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے نفاذ کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

سوئم:- اگر نافذ کر بھی دی جائے تو یزید کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی۔ سارے جنتی ہوں ایک یزید غیر جنتی تب بھی حدیث کی عمومیت اور صحت پر اثر نہیں پڑتا۔ منطق کہتی ہے کہ قانون میں مستثنیات بھی ضرور ہوتے ہیں۔ ہوائی جہاز، بیلون، پتنگ کے زمین کے خلاف اُڑنے کے باوجود کوئی شخص قانونِ ثقل سے انکار نہیں کر سکتا۔

یہ ہیں شاندار دلیلیں جنھیں کٹ حجتی کا شاندار نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی حجت بازی سے شیعہ حضرات عشرہ مبشرہ میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ ہمارا بار بار یہ کہنا کیا غلط رہا کہ خود اہل سنت میں بہت سے شیعی عقائد و تصورات جڑ پکڑ گئے ہیں۔

بالترتیب جواب سنئے:-

(۱) حدیث کے الفاظ چونکہ یہ تھے:-

اوّل جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم۔	میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو شہر قیصر (قسطنطنیہ) پر جنگ کرے گا اس کی مغفرت مقدر ہو چکی۔

+ + + +

لہٰذا اپنے باطل خیالات کی ترویج میں یہ جاہلانہ نکتہ نکالا گیا کہ جنگِ قسطنطنیہ غزوہ ہے ہی نہیں جو اس پر اس بشارت کا اطلاق ہو۔

ان نکتہ سنجوں سے کوئی پوچھے کہ تم نے عربی پڑھی ہے؟ — کوئی عربی داں ایسی لغویات نہیں کہہ سکتا جب تک وہ ہذیان کا شکار نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینۂ قیصر پر کی جانے والی جنگ کو غزوے کا نام دے رہے ہیں اور یہ علامۃ الدہر فرما رہے ہیں کہ وہ غزوہ نہیں تھا۔ انھوں نے شاید یہ دیکھ لیا ہے کہ بعد کے لوگوں نے اصطلاحاً "غزوہ" کے لفظ کو ان جنگوں کے لئے مخصوص کر لیا ہے جس میں سرکار دو عالمؐ بہ نفس نفیس شریک ہوئے۔ بس اس کو بہانہ بنا کر حدیث کی تحریف کرنے بیٹھ گئے۔ حالانکہ انھیں کسی عالم سے دریافت کر لینا چاہئے تھا کہ کیا لسانِ عرب میں یہی اصطلاح پہلے سے بھی رائج ہے اور غزا الغزو کی گردان غزواتِ پیغمبر کے سوا کہیں نہیں چل سکتی۔ عالم سے پوچھنے میں حیا تھی تو لغت کی کتابیں دیکھ لیتے۔ آسانی سے مل جاتا کہ یہ گردان تو ہر طرح کی جنگوں کے سلسلہ میں دہرائی جاتی ہے۔ لغت کے علاوہ خود قرآن جو کہتا ہے:-

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِھِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ کَانُوْا غُزًّی لَّوْ کَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا	اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جو کافر ہوئے اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر میں نکلیں یا جہاد میں ہوں کہ اگر یہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔

کیا آج تک کسی مفسر نے کہا ہے کہ غزاۃ سے مراد صرف وہ جہاد ہیں جن میں رسول اللہ شریک ہوئے ہوں اور اللہ جو ہدایت فرما رہا ہے وہ بس غزواتِ النبیؐ تک ہی محدود ہے؟

نکتہ سنجو! جنگ قسطنطنیہ اگر غزوہ نہ کہلاتی تو جوامع الکلم لسان الوحی صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ ایسے بے بہرہ اور صحت کلامی سے محروم نہیں ہو سکتے تھے کہ یغزون فرما دیتے۔ تف ہے ایسی نکتہ سنجی پر جو افصح الفصحاء سرورِ کونینؐ فداہ امی وابی کے حق میں طنز بن جائے۔

آگے اسی دلیل کے ذیل میں یہ شوشہ بھی نکالا گیا ہے کہ یزید قسطنطنیہ فتح نہیں کر سکا تھا اس لئے اس کے حق میں یہ حدیث مفید نہیں کیونکہ فتح کے بغیر کوئی صلہ نہیں نہ دنیا والوں کے سامنے نہ خدا کے سامنے۔

یہ شوشہ بھی جہل و نادانی کا شاہکار ہے اول تو حضورؐ کی پیش گوئی میں فتح و شکست کا کوئی ذکر نہیں، صرف جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ یہ رسول اللہؐ سے مکابرے کے مرادف ہے کہ وہ تو محض جنگ کرنے کو سبب مغفرت بتائیں اور ہم منہ پھاڑ کے چیخیں کہ نہیں فتح کی بھی شرط لگا دیجئے۔ فتح کے بغیر جنت نہیں دی جا سکتی۔

دوسرے یہ بات بچہ بھی کہہ سکتا ہے کہ مجاہدین کا انعامِ آخرت فتح پر موقوف ہے۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ بدر و احزاب وغیرہ میں بھی جو صحابہؓ معرکہ فتح ہونے سے قبل شہید ہو گئے وہ اجرِ آخرت سے محروم رہے۔ کیونکہ فتح کی نعمت تو زندوں کے حصے میں آئی شہید ہونے والے خالی ہاتھ گئے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

دور کیوں جائیے۔ سید احمد اور اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہما تو اس منطق کی رو سے خواہ مخواہ ہی جاں بحق ہوئے۔ وہ اور ان کے ساتھی اجر آخرت سے کورے رہے کیونکہ فتح نصیب نہیں ہوئی۔ ان کے علاوہ سیکڑوں شہداء ایسے نکلیں گے جنھوں نے راہ خدا میں جان دی مگر فتح سے بہرہ یاب نہ ہو سکے۔ یزید کے بغض میں ہمارے نکتہ سنج چاند پہ دھول اڑانے کی بچکانہ کوشش کر رہے ہیں۔ قرآن و حدیث غازی اور شہید دونوں کے لئے انعامِ آخرت کی بشارت دیتے ہیں۔

مگر کہاں۔ نکتہ سنجوں کی نظر میں تو دورِ رسالت کے بعد کوئی غازی ہوا ہی نہیں۔ کیونکہ غازی اسی غزوے والی گردان کا لفظ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کا اطلاق بغیر رسول اللہؐ کے ہوتا ہی نہیں ہے!

(۲) حضرت عمرؓ نے (یا ساریۃ الجبل کی تلمیح سے آپ ہی کی ذات مراد ہے) بحری جنگ کی اجازت نہیں دی تو اس سے حدیث پر کیا اثر پڑا۔ مبتدی بھی جانتے ہیں کہ بحری جنگ کی اجازت نہ دینا مخصوص حالات پر مبنی تھا یہ بات نہیں تھی کہ بحری جنگ میں کوئی شرعی قباحت ہو۔ حضرت عثمانؓ نے بدلے ہوئے حالات میں اس کی اجازت مرحمت فرما دی تو گھما پھرا کر انھیں بے بصری اور کوتاہ فکری کا الزام دینا بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ بے شک حضرت عمرؓ کی بصیرت و المیت کا جواب نہیں، لیکن حضرت عثمانؓ بھی نادان اور بے بصیرت نہیں تھے۔ بحری جنگ کی اجازت دے کر وہ کسی ایسی بے تدبیری کے مرتکب نہیں ہوئے جسے نمایاں کرنے کے لئے فاروقی بصارت و فراست کا حوالہ ضروری ہو۔ عجیب ہوائی استدلال ہے کہ چونکہ عمر فاروقؓ جیسی بصارت و بصیرت والے نے جنگ قسطنطنیہ کی اجازت نہیں دی تھی اس لئے حدیث کے نفاذ کا وقت ختم ہو گیا۔ حدیث نہ ہوئی بچوں کا کھلونا ہو گیا کہ جس رخ سے چاہا زمین پر پٹخ دیا۔

نکتہ سنجو! رسول اللہؐ کی پیشین گوئیاں اٹکل پچو نہیں ہوا کرتیں۔ انھوں نے اگر کسی شخص یا اشخاص کے بارے میں یہ فرما دیا ہے کہ وہ جنتی یا دوزخی ہیں تو اس میں اس لے دے کی گنجائش نہیں کہ یہ فرمان نافذ ہوا یا محرومِ نفاذ رہا۔ وہ تو اس طرح کے کلمات وحیِ خفی کے ذریعے فرمایا کرتے تھے اور مقصد کوئی معلق بات کہنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ بتانا ہوتا تھا کہ تقدیرِ الٰہی یہ ہے کہیں تقدیریں بھی بدلا کرتی ہیں؟ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کا رسول تو اطلاع دے کہ فلاں گروہ تقدیرِ الٰہی کی رو سے جنتی

ہو! اور ہم آپ عقلی تنگ بندی کے ذریعہ اس تقدیر میں ترمیم و استثنا ء کر ڈالیں؟ چہ خوش کہ حدیث کے نفاذ کا وقت ختم ہو چکا تھا! ــــ یعنی جس جنگ کے لئے پیشین گوئی کی گئی تھی وہی برپا ہوئی تو آپ کہتے ہیں کہ نفاذ کا وقت ختم ہو گیا۔ کیا اس جنگ سے پہلے ہی ہوا ہیں اس کا نفاذ ہو جاتا؟

صاف کہیئے نا یزید کی دشمنی میں ہمیں قولِ رسول سے بھی ٹھٹول کرنے میں تکلف نہیں۔ یہ ٹھٹول کے علاوہ کیا ہے۔

(۳) آپ فرماتے ہیں ــــ "منطق کہتی ہے کہ . . ."

جسے اتنا بھی نہ معلوم ہو کہ "قانون تقل" منطق کے نہیں، سائنس کے دائرے کی چیز ہے وہ اندھیرے میں تیر چلانے کے سوا کیا کرے گا۔ اوّل تو "قانون تقل" ہو یا قانون گردش یا کوئی اور طبعی قانون اس میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی استثناء نہیں ہے اور جو شخص ہوائی جہاز یا پتنگ وغیرہ کے اُڑنے کو مستثنیات کا نام دے وہ سائنس کی ابجد تک سے واقف نہیں۔ وہ تمام ایجادیں جنھیں استثناء کا نام دیا جا رہا ہے قانون تقل کی تردید و تغلیط کر کے نہیں، بلکہ اسی کا تتبع کر کے تشکیل دی گئی ہیں۔ تغیر و تبدّل کی تمام شکلوں کے مجموعے کا نام ہی قانون تقل ہے نہ کہ ہر بدلی ہوئی شکل استثناء ہے۔

لیکن اس دقیق بحث کو چھوڑ کر ہم مانے لیتے ہیں کہ طبعی قوانین میں استثناء بھی ہوتا ہے مگر کیا وعدوں، معاہدوں، پیشین گوئیوں میں بھی خود ساختہ استثناء کی منطق چلا کرتی ہے۔ آپ اعلان کریں کہ اگر میں تیس روزے نہ رکھوں تو میری زوجہ پر طلاق۔ پھر ۲۹ رکھ کر فرمانے لگے کہ محض ایک کی کسر تو استثناً ہے تو کیا طلاق اس منطق سے رُک جائے گی؟

اللہ کے رسولؐ نے دارِ ابوسفیان کو پناہ گاہ قرار دیا تھا کیا اس کے بعد یہ گنجائش رہ گئی تھی کہ دارِ ابوسفیان میں پناہ لینے والے کسی ایک شخص کو بھی استثناء کی منطق سے غیر مامون قرار دیا جائے؟

فتح مکہ کس طرح ہوئی؟ ــــ یہی نا کہ فریق ثانی نے معاہدے کی ایک دفعہ کے خلاف اقدام کر دیا تھا۔ نتیجہ کیا ہوا۔ مکے پر حملہ اور فتح مبین۔ کتنی کوشش کی تھی حریف نے کہ اللہ کا رسولؐ اس ایک اقدام کو استثناء کے طور پر نظر انداز فرما دے۔ لیکن استثناء کی منطق رد کر دی گئی۔

ایک بادشاہ اعلان کرتا ہے کہ جو لوگ فلاں دن فلاں میدان میں جمع ہو جائیں گے ان میں سے ہر ایک کو ہزار روپے انعام ملیں گے۔ اب اگر یہ بادشاہ جمع ہونیوالوں میں سے ایک کو بھی انعام سے محروم رکھے تو کیا اسے وعدہ خلاف نہیں قرار دیا جائے گا؟

دانشورو! منطقی استثناء میں اور وعدہ و عہد میں بڑا فرق ہے۔ معاہدے کی ہزار دفعات ہوں۔ صرف ایک دفعہ توڑ دینے سے پورا معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح وعدہ من مانے مستثنیات کا متحمل نہیں ہوا کرتا۔

پھر معاہدہ اور وعدہ چہ معنی دارد۔ رسول اللہؐ جس بات کی پیشین گوئی کر دیں تو وہ تو تقدیر الٰہی ہے۔ یہ نجومیوں کا سا قصہ نہیں ہے کہ ستاروں کی رفتار اور چند طبع زاد اصولوں کے تحت ایک پیشین گوئی کر دی اور کبھی یہ صحیح نکلی کبھی غلط۔ نہ بشارت مغفرت کوئی ایسی چیز ہے کہ چند ظاہری اسباب و علل سے ایک نتیجہ اخذ کر کے حضورؐ پیش فرما دیں اور پھر یہ اسباب و علل کسی وجہ سے تبدیل ہو جائیں تو یہ نتیجہ بھی معلق رہ جائے۔ بشارتوں اور پیشین گوئیوں میں اسباب و علل کی سائنس اور تخمین و قیاس کا دخل نہیں ہوا کرتا۔ انکی حیثیت تو یہ ہے کہ اللہ کا رسولؐ اپنی خصوصی حیثیت کی بناء پر اللہ کی طرف سے کسی مخفی فیصلے سے آگاہ کیا گیا اور اس کی خبر اس نے دنیا کو دیدی۔ تو کیا سوال رہ جاتا ہے اس جرح و قدح کا کہ پیشین گوئی فلاں وجہ سے نافذ نہیں ہوئی۔ کیا اللہ کے صادر فرمودہ فیصلے بھی نفاذ سے محروم ہو جایا کرتے ہیں کیا قدح یزید میں اللہ تک کا تمسخر جائز ہے۔

مکتوب نگار نے جہاد کے انعامات سے استثناء کی مثال میں اُس شخص کا ذکر کیا ہے جس کو جہاد کرتے دیکھ کر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ یہ جہنمی ہے اور پھر اس شخص نے خودکشی کر لی تھی۔ نیز ابو محجن کی سزا کا تذکرہ فرمایا ہے جو انھیں شراب نوشی کی پاداش میں دی گئی تھی۔ پھر ایک بدری صحابی کا

ذکر ہے کہ انھیں قتل کی سزا دی گئی۔ پھر حضرت عمرؓ کے اُن صاحب زادے کا تذکرہ ہے جن کے بارے میں غلط طور پر مشہور کر دیا گیا ہے کہ انھیں شراب نوشی کے جرم میں ان کے والد نے دوبارہ سزا دی تھی اور اسی سزا میں وہ مر گئے۔

اسوقت ہمیں ان روایات کی صحت اور عدم صحت سے بحث نہیں۔ سب کو صحیح مان لیا، لیکن آخر ان کے پیش فرمانے کا مفاد کیا ہے؟ بڑے طمطراق سے فرمایا جاتا ہے کہ

"فرمائیے آپ کا یزید کس دن بدریوں سے بزرگ و برتر ہو گیا"

ثابت ہوا کہ نکتہ سنجوں کو بغض یزید کے جوش فراواں میں نفس بحث کو سمجھنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔ دانشورو! کون کہتا ہے کہ یزید اصحاب بدر سے بڑھ گیا۔ اصحاب بدر سے تو کیا وہ کسی معمولی سے معمولی صحابی کی بھی ہمسری نہیں کر سکتا کہ صحابیت کی تو شان یکتا ہے۔ لیکن اسکو کیا کیجئے کہ رسول اللہؐ کے فرمانے کے مطابق اللہ نے اسکی تقدیر میں مغفرت لکھ دی تھی۔

پہلی مثال کا جواب یہ ہے کہ جہاد صرف لڑنے بھڑنے کا نام نہیں اس کے ساتھ نیت اور قصد بھی مشروط ہے۔ جو شخص خالص نیت سے جنگ کرے وہی مجاہد ہے اور جو اللہ کی بجائے کسی اور کے لئے جنگ کرے وہ مجاہد نہیں ہے۔ اللہ کے رسول کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس شخص کی نیت اچھی نہیں۔ چنانچہ پیش گوئی فرما دی خرابی نیت کا ثبوت ہاتھوں ہاتھ مل گیا وہ فعل حرام کر گذرا۔ ایسے شخص کا جہنم رسید ہونا انعام جہاد میں استثناء نہیں ہے بلکہ وہ سرے سے مجاہد ہی نہیں تھا۔

ایک اور بات اسی مثال سے واضح ہوئی کہ رسول اللہ کی پیش گوئی ظاہری حالات کے تابع نہیں ہوا کرتی تھی۔ دیکھ لیجئے جس وقت حضورؐ نے مذکورہ شخص کے جہنمی ہونے کا انکشاف فرمایا اس وقت یہ شخص نہایت سرگرمی سے مصروف جہاد تھا۔ ظاہری حالت کہہ رہی تھی کہ بے حساب جنت میں جائے گا، لیکن حضورؐ نے اللہ کے دیئے ہوئے علم کے تحت پیشین گوئی کر دی کہ یہ جہنمی ہے تو کیا اس سے یہ سبق نہیں ملا کہ ظاہری حالت پر مت جاؤ صادق و مصدوقؐ اٹل بات فرماتے ہیں۔ یہ بس مشیت الٰہی تھی کہ فوراً ہی اس پیشین گوئی کی صحت کے لئے خودکشی کی دلیل بھی سامنے آ گئی لیکن اگر یہ نہ آتی تو کیا ہم نعوذ باللہ حضورؐ کو جھٹلا دیتے اور اس شخص کی ظاہری مجاہدانہ سرگرمیوں کا اربعہ ستہ بیان کر کے دعویٰ کرتے کہ رسول اللہؐ کی پیشینگوئی واقع ہونے سے رہ گئی۔ یہ شخص جنت میں گیا۔

اگر نہیں اور ہزار بار نہیں تو یزید کا معاملہ بھی ایسا ہی سمجھئے۔ مان لیا کہ اپنے ظاہری اعمال کے لحاظ سے وہ اتنا ہی برا تھا کہ چشم ظاہر اس کی مغفرت کا فیصلہ نہیں دیتی، لیکن رسول اللہؐ کی پیشین گوئیاں ظاہر کی تابع نہیں ہیں۔ مان لینا چاہئے کہ ظاہری حالات کچھ ہوں صادق و مصدوقؐ کی بات اٹل ہے۔

باقی مثالوں کے پیچھے یہ ناقص گمان کام کر رہا ہے کہ جن صحابہ کو دنیا میں جرم کی سزا ملی وہ اُس تکریم و تعظیم کے مستحق نہ رہے جس کی صحابیت مستحق ہے اور وہ گویا مستثنیات میں شامل ہو گئے۔

اس فاسد گمان کی فوراً اصلاح کر لینی چاہئے۔ دنیا میں کسی جرم سے ملوث ہو کر اس کی سزا پانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اب آخرت میں بھی اس شخص کو ضرور سزا دی جائیگی۔ جن صحابی کو زنا کی پاداش میں سنگسار کیا گیا تھا کیا انکے بارے میں رسول اللہؐ کا یہ فرمودہ بھول گئے کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے جو ایک پوری قوم پر بھی تقسیم کر دی جائے تو سب کو کافی ہو۔

خوب یاد رکھئے۔ شرعی جرائم کی سزا اگر دنیا میں مل جائے تو ضروری نہیں ہے کہ آخرت میں بھی مزید سزا ملے۔ صحابہؓ کے بارے میں صحیح ترین عقیدہ یہ ہے کہ جو گناہ ان سے سرزد ہوئے ان کی کوئی سزا خواہ دنیا میں ملی ہو یا نہ ملی ہو مگر ان کی حسنات کا پلہ اس قدر بھاری ہے کہ

ان کے جہنمی ہونے کا تصور بھی انتہائی لرزہ خیز جسارت ہے۔ ہم صحابیوں کو اس لئے خیر الامت نہیں مانتے کہ وہ سب فرشتے تھے۔ نہیں وہ ہمارے ہی جیسے انسان تھے جنکے پاس نفس بھی تھا، جذبہ بھی اور بشری کمزوریاں بھی۔ عمومی زہد و تقویٰ کے باوجود ان میں سے بعض نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے۔ ان سے غلطیاں ہوئی ہیں، ان کے قدم ڈگمگائے ہیں۔ لیکن اس سے ان کا باہمی شرف کم و بیش ہو تو ہو ہم غیر صحابیوں کے مقابلے میں ہرگز وہ بے عزت نہیں ہوسکتے اللہ نے اٹل قانون بیان فرمایا ہے کہ اِنَّ الحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ (بھلائیاں برائیوں کو محو کر دیتی ہیں) تنہا دیدارِ رسول ہی وہ سعادت ہے کہ خیر و برکت کا خزینہ کہئے۔ پھر اصحاب رسول نے اللہ کے رسول سے جیسی جیسی محبت کی ہے حق کی راہ میں جیسی جیسی ابتلائیں جھیلی ہیں، اسلام کو جیسا جیسا سربلند کیا ہے وہ سب حسناتِ عالیہ کا ایسا دفتر ہے کہ ہمیں یقین ہے ان کی خطائیں اس دفتر کے نیچے دب کر سُرمہ ہو گئی ہوں گی۔ زنا جیسے گناہ کی پاداش میں سنگسار کئے جانے والے صحابی کی مغفرت کا اعلان اگر اللہ کا رسولؐ فرد دیتا ہے تو کیا گنجائش رہ جاتی ہے اس بدگمانی کی کہ کسی صحابی نے شراب پی لی ہو یا کوئی اور گناہ کر لیا ہو وہ اسی طرح دائرۂ مغفرت سے خارج ہو جائے گا جس طرح یار لوگ یزید کو خارج کئے دے رہے ہیں۔

مکتوب نگار نے لایعنی قسم کے دلائل بہت سے دیئے ہیں ان سے تعرض بے کار ہوگا صرف ایک استدلال اور سامنے لاتے ہیں جو مضحکہ خیز ہونے کے باوجود ایسا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اس میں مبتلا پایا گیا ہے۔

> "رسول اللہؐ کو حسینؓ بہت پیارا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ نماز میں رسولؐ کے ساتھ حسینؓ پر درود بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللھم صل علیٰ محمد و علےٰ آلِ محمد ۔ ۔ ۔ پس یزید تو قتل حسین کی سزا بھگتے ہی گا ۔ ۔ ۔"

یہ استدلال اس مفروضے پر قائم ہے کہ "آل" کے معنی "حسینؓ" ہیں۔ ہے اس لغو گوئی کا کوئی سر پیر۔ لمبی بحث کو جانے دیجئے۔ معمولی عربی داں بھی جانتا ہے کہ آل کا اطلاق صرف بیٹے پر نہیں ہوتا، بلکہ پورے کنبے، برادری، گروہ وغیرہ پر ہوتا ہے۔ عربی میں اس کی ہزار مثالیں ہیں۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے دیکھ جائیے کہیں بھی بیٹے کے معنی میں نہیں ملے گا۔ صرف آلِ فرعون ہی آٹھ دس جگہ تو آیا ہی ہے تمام تراجم و تفاسیر دیکھ ڈالئے۔ یہی ملے گا کہ آلِ فرعون سے مراد قوم فرعون ہے یا وہ گروہ ہے جو کفریات میں اس کا ہمنوا اور تابعِ فرمان تھا۔ آج کے محاورے میں جسے "کیمپ" کہتے ہیں۔ وہی مفہوم آل کا ہوتا ہے۔ آلِ فرعون سے پورا فرعونی کیمپ اللہ کا منطوق و مفہوم ہے۔ آلِ ابراہیم کہیں گے تو وہ تمام امت مراد ہوگی جو ملتِ ابراہیمی کی نام لیوا ہے۔ علیٰ ہٰذا آلِ داؤد، آلِ رسول وغیرہ۔ یہ محض شیعی نقطۂ نظر کی دھاندلی بازی ہے کہ آل کو اولادِ رسول میں محدود کر دیا۔ اور مکتوب نگار نے تو غضب ہی کیا کہ تنہا حسین کو "آل" بنا دیا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت حسینؓ ہوں یا کوئی بھی انسان اللہ کے رسولؐ نے تو اپنی بیٹی فاطمہؓ تک کے لئے فرما دیا کہ وہ چوری کرے تو اسکا ہاتھ کاٹ دیا جائیگا اس سے معلوم ہوا کہ قانون اہل بیت اور غیر اہل بیت کے لئے یکساں ہے حسینؓ باوجود سبطِ رسول ہونے کے اگر حکومتِ قائمہ کے بالمقابل اپنی خلافت قائم کرنے چلے تھے تو قانون کا مسلّمہ تقاضا تھا کہ حاکمِ وقت اس کی روک تھام کرتا۔ یہی یزید نے کیا۔ بعد میں حالات ایسے پیش آگئے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت ہو گئی تو اس کی ذمہ داری یزید کے سر نہیں۔ حالانکہ اگر یزید کے سر بھی ہو تو شریعت کا قانون اس کے جہنم رسید ہونے کا قطعی فیصلہ نہیں دیتا۔ اللہ نے اعلان کیا ہے کہ ہم شرک و کفر کے علاوہ ہر گناہ معاف کر سکتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے خبر دی کہ مدینۂ قیصر پر جہاد کرنا ایسی ہی بڑی نیکی ہے کہ سارے گناہوں کو محو کر کے جنت میں پہنچا دے گی۔ اب جیسے

رسول ؐ کے قول میں شک ہے وہ استثناء اور عام نفاذ اور الابلا کے شوشے نکالے جائے۔ ہم تو آمنا وصدقنا کے قائل ہیں۔ حضرت حسینؓ کی محبت میں حدیث کے بخیے نہیں اُدھیڑ سکتے۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

چار شادیاں

سوال:۔ از رفیق احمد۔ کراچی۔

ایک سے زائد شادیوں کے موضوع پر کافی دنوں سے پاکستان میں جس بحث کا چرچا ہے اس پر خیال تھا کہ شاید آپ بھی کچھ لکھیں گے، مگر اب تک ایسا نہیں ہوا۔ خیر آپ شاید اس لئے نہ لکھتے ہوں کہ ہنگامی طور پر اس مسئلہ کا تعلق پاکستان ہی سے ہے اور تجلی ہندوستان کا پرچہ ہے۔ لیکن میں آپ کی توجہ ہفت روزہ "چٹان" لاہور کے ایک خاص اداریہ کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو کم سے کم میرے لئے تو کافی اذیت بخش ثابت ہوا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اسکا بھرپور جواب نظروں کے سامنے آئے۔ جواب ویسے "ایشیا" (لاہور) میں دیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود کہ اس اداریہ کا رخ خاص طور پر مدیر ایشیا جناب نصر اللہ خاں عزیز ہی کی طرف ہے یہ جواب تشنہ اور بے مزا ہے۔ کاش آپ توجہ فرمائیں۔ غالباً گمان ہے کہ چٹان تجلی کے دفتر میں آتا ہوگا۔ یہ اداریہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کے چٹان میں "پھر وہی چار شادیاں" کے عنوان سے آیا ہے۔ اگر چٹان نہ آتا ہو تو مجھے مطلع فرمائیں میں بھیج دونگا۔

الجواب:۔

"چٹان" اور "ایشیا" دونوں ہی دفتر میں آتے ہیں اور عاجز ان کے اکثر مضامین پڑھتا ہے۔ بے شک اُن حضرات کی برکت سے جن کے فکر ونظر کے پیمانے مغرب کی کارگہِ فکر میں ڈھلے ہیں پاکستان میں چار شادیوں کی بحث چل رہی ہے نہ صرف بحث بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگایا جارہا ہے کہ قرآن کی دی ہوئی اجازت واباحت کو قانون کے شکنجے میں جکڑ دیا جائے۔

بظاہر یہ بحث علمی، مذہبی، سماجی ہر دائرے میں شمار ہوسکتی ہے، لیکن سچ پوچھئے تو اس کا تعلق ان میں سے کسی بھی دائرے سے نہیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں یہ سرے سے بحث ہی نہیں ہے بلکہ کچھ برخود غلط لوگوں نے مغرب کے ذخیرے سے چند اوچھے ہتھیار لے کر اسلام کے ایک متفق علیہ اور غیر مختلف فیہ قانون پر جارحانہ حملہ کر دیا ہے اور اس کے نتیجے میں بعض خادمانِ اسلام مجبور ہوئے ہیں کہ اسلام کی طرف سے مدافعت کریں۔ یہ آویزش کسی کے نزدیک بحث کہلانے کی مستحق ہے تو وہ بحث کہتا رہے، میں تو اسے یک طرفہ یلغار سے زیادہ کچھ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

اندازہ فرمائیے چار شادیوں کی اجازت قرآن کی نص قطعی سے ثابت ہے۔ جس میں کوئی ابہام کوئی گھماؤ نہیں۔ پھر قرن اول سے اب تک کوئی صحابی کوئی تابعی کوئی مستند عالم کوئی ثقہ امام ایسا نہیں گذرا ہے جس نے اس کے خلاف کوئی بحث اُٹھائی ہو، کوئی داویلا کیا ہو۔ یہ تو ملتا ہے کہ بعض علماء نے چار کو حرف آخر نہیں مانا، بلکہ چار سے زیادہ کا جواز بھی آیت سے مترشح سمجھا ہے، لیکن یہ نہیں ملتا کہ شاہوں اور وزیروں کو قرآنی اباحت پر قدغن لگانے اور پہرے بٹھانے کا حقدار مان لیا گیا ہو۔

اگر صورتِ حال یہ ہوتی کہ تیرہ سے زیادہ صدیاں گذر جانے کے بعد اچانک کسی ملک میں ایک سے زیادہ شادیوں کی قرآنی اجازت عملاً کسی عظیم فساد کا سبب بن گئی ہوتی اور اِس اجازت سے فائدہ اُٹھانے میں عوام وخواص نے اس درجہ افراط وغلو سے کام لیا ہوتا کہ ظلم وطغیان کے مناظر عام ہوگئے ہوتے اور عدل وانصاف صراحۃً تقاضا کر رہا ہوتا کہ اس اجازت کو قانون کی زنجیروں میں جکڑ کر مظلوم صنفِ نازک کی دادرسی اور ظالموں کی حوصلہ شکنی کی جائے تب تو سمجھا جاسکتا تھا کہ قرآنی اجازت پر بند باندھنے کا داعیہ نفسِ امّارہ کے افق سے نہیں اُبھرا ہے، بلکہ عدل وشرافت ہی کے احساس نے اسے جنم دیا ہے۔ لیکن اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں اس طرح کی صورت حال گھٹیا سے گھٹیا درجے میں بھی موجود نہیں ہے عرب، مصر، ایران، ہند وپاک کہیں کا جائزہ لے لیجئے یہ تو ایک سوال ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے جواز نے معاشرے میں وہ قیامتیں کس کونے آنتر میں برپا کر رکھی ہیں جن کے تذکرے سے

نام نہاد مصلحین کا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ پہلے اعداد و شمار کی سطح پر ہی دیکھئے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والے ہیں کتنے اور کہاں؟ اکثر و بیشتر شہر تو پورے کے پورے ایسے مسلمانوں سے خالی ملیں گے جنھوں نے چار یا تین بیویاں کر رکھی ہوں۔ بعض شہروں میں دو بیویوں والے بھی معدودے چند ہی نظر آئیں گے۔ بعض میں انکی تعداد معتد بہ بھی ہو تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن لوگوں سے بہرحال کم ہی ہو گی جنھیں ہمارے مہذب شہروں کی مسلمان حکومتیں نشہ بازی کے پرمٹ دیتی ہیں۔

یہ تو تھا تعداد کا حال۔ پھر اس تعداد میں کچھ ہی گھرانے ایسے نکل سکتے ہیں جہاں دو بیویوں کا وجود فتنۂ مستقل بن گیا ہو۔ اور پھر بھی یہ فتنہ اتنا محدود ہوتا ہے کہ اجتماعی معاشرت پر اسکا برائے نام بھی اثر نہیں پڑتا اور اس کے بطن سے کسی متعدی و مزمن فساد کا ظہور شاذ کے درجے میں بھی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں گھریلو فتنے، چپقلشیں، ٹکراؤ، کش مکش اور زندگیوں کو جہنم بنا دینے والے مسائل کیا ان گھروں میں موجود نہیں ہیں جہاں ایک سے زیادہ بیوی کا تصور بھی کسی شوہر کو چھو کر نہیں گذرا جہاں اکیلے میاں بیوی کبھی مزاجوں کی نامناسبت کبھی متعدد اور وجوہ سے گھُٹتے دل کی سی زندگی گذارتے ہیں۔ جہاں بیوی شوہر کی آوارہ مزاجی یا سنگدلی یا حماقت و سفاہت کی وجہ سے کانٹوں پر تڑپتی ہے جہاں ساس سُسر اور نند بھاوجوں کے جھگڑے بہو کے ایک ایک سانس کو نشتر بنا دیتے ہیں تو جس منطق سے تعدد ازدواج کو قانون کا خانہ زاد بنانے کے مطالبے ہیں اسی کی رو سے ہر ایک ہی شادی کو قانون کی لونڈی بنا دینے کا مطالبہ کیوں جائز نہ ہوتا؟

ظاہر ہے اور قطعی ظاہر ہے کہ تعدد ازدواج کیخلاف شور و شر ـــ چاہے وہ چرب زبانیوں اور لفاظیوں کے کیسے ہی خوشنما لباس میں آئے ـــ نہ کسی حقیقی ضرورت کا پیدا کردہ ہے نہ اس کے پیچھے علمی و عقلی تقاضے کام کر رہے ہیں، بلکہ اسکا منبع وہی نفسِ امّارہ ہے جسے یورپ کے شعبدہ گروں نے میک اپ کر کے عقل کا نام دیدیا ہے۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ فقط دو قسم کے لوگ تعدد ازدواج پر ناک بھوں چڑھاتے اور اس کے خلاف طاقت کی دہائی دیتے نظر آتے ہیں۔

ایک وہ لوگ جن کے دل و دماغ کو لادینی تعلیم و تربیت غیر اسلامی ماحول اور دیگر نفسیاتی عوامل نے ایک خاص سانچے میں ڈھالا۔ مختلف مسائل کے بارے میں انھیں کچھ خاص رجحانات دیئے۔ ان کا ایک مخصوص زاویۂ نگاہ بنایا۔ ان کی پسند ناپسند کا ایک رُخ معیّن کیا۔ پھر کسی وقتی ضرورت یا تحریک و ترغیب کے تحت وہ دینی مسائل کی طرف متوجہ ہوئے تو قدرتاً مستشرقین ہی کی تصنیفات سے بسم اللہ کی۔ انھی کی تشریحات سے دین کو سمجھا اور کسی منزل میں قرآن کے مطالعہ کی زحمت گوارا کی تو اس لئے نہیں کہ حقیقت کی تلاش کریں، بلکہ اس لئے کہ جن تصورات و عقائد کو وہ مرغوب رکھتے ہیں ان کے دلائل و شواہد ڈھونڈیں۔ حقیقت کی تلاش وہ کر بھی نہیں سکتے تھے، کیونکہ قرآن بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے جو مبادیات ناگزیر ہیں ان تک سے وہ بے بہرہ تھے پھر حقیقت کہاں سے ہاتھ آتی۔ بس ان کی نگاہ میں وہی مزعومات حقائق و معارف بنے رہے جنھیں وہ اپنی دیرینہ تعلیم و تربیت اور مستشرقین کے مبلغ علم سے لیکے چلے تھے۔ بعد میں انھوں نے دینی لٹریچر کا مزید مطالعہ کیا اور اپنی دانست میں علم کے ہفت خواں طے کر لئے لیکن حاصل اس کنج کاوی کا اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ جو تصورات و اقدار انھیں مرغوب تھے انھی کی تقویت میں کوشاں رہے اور ان کے خلاف پڑنے والے دلائل کی تاویلیں کرتے چلے گئے۔ مقدار کے لحاظ سے انکا علم و مطالعہ چاہے کتنا ہی سر بفلک ہو گیا ہو، لیکن بیقاعدگی، بے ترتیبی اور انتشار کے عیب سے پاک نہ ہو سکا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی بھی علم و فن میں قابل اعتماد مہارت کے لئے اسے ایک ترتیب اور باقاعدگی کے ساتھ حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر بے ضابطہ تحصیل اور بے ترتیب مطالعہ کسی اعتماد کی ضمانت نہیں ہوا کرتا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جنھوں نے قرآن اور دینی لٹریچر کا بے ضابطہ مطالعہ بھی بس برائے نام ہی کیا، مگر موقع آنے پر دینی مسائل میں اس طرح رائے زنی کرنے بیٹھ گئے گویا ان سے بڑھ کر

بحر علم کا شناور شاید ہی کوئی ہو۔ جو رجحانات و تصورات مختلف عوامل نے پہلے سے انھیں دے رکھے تھے انھی کو عین حق سمجھتے ہوئے انھوں نے دینی مسائل میں ٹانگ اڑائی اور قرآن کو چھوا تک نہیں۔ یا چھوا تو محض اس لئے کہ اپنے کسی طے شدہ فیصلے اور پسندیدہ زاویۂ نظر کے لئے اللہ کو بھی گواہ بنانے کا شعبدہ دکھلائیں۔ انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ فی الواقع قرآن کیا کہتا ہے۔ اللہ کا کیا حکم ہے۔ دین کی کیا تعلیم ہے۔ انھیں تو صرف اپنے مرغوب تصورات کے لئے سہاروں کی تلاش تھی۔ کبھی تو انھوں نے تکلیف کر کے خود ہی قرآن کے ورق اُلٹے اور اس سے بے پرواہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی معتد بہ علم کی بھی ضرورت ہے محض عقلی تُک بندیوں کے ذریعہ بعض آیات کو منتخب فرما لیا اور زیادہ تر انھوں نے اس سے زیادہ آسان راستہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ پہلی قسم کے لوگوں نے جن آیات کو اپنے حق میں استعمال کیا تھا انھی میں سے انھوں نے بھی خوشہ چینی کر لی اور قرآن پہ دس بیس منٹ ضائع کرنے سے بچ گئے۔

پہلی قسم کے لوگوں میں وہ بعض حضرات شامل ہیں جنھیں عام نقطۂ نظر سے اہل الرائے اور بھاری بھرکم سمجھا جاتا ہے۔ تعدد ازواج کی مخالفت میں ان کے بعض فرمودات ماضی قریب میں سامنے آچکے ہیں اور ان کا قاطع جواب دے کر علماء نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے بڑے پن کی عام شہرت اور متعدد علوم و فنون میں تبحر کے باوجود علم دین میں ان کا حال عطائیوں سے بہتر نہیں ہے۔

دوسری قسم کی مثالیں بھی کافی ہیں اور ــ گستاخی معاف ــ چٹان کے فاضل مدیر جناب شورش کاشمیری کو ہم دوسری ہی قسم میں شمار کرتے ہیں۔ وہ بہت اچھے شاعر ہیں، ان کی نثر رواں اور چست ہوتی ہے۔ انھیں مذہب سے تنفر نہیں مؤانست ہے۔ ان کی کچھ خدمات بھی ہیں۔ ان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن یہ خوبیاں اس خامی کی تلافی نہیں کر سکتیں جو علوم دینیہ سے براہ راست واقفیت کے فقدان اور مغربی انداز فکر کے عطا فرمودہ بعض تصورات کے تسلط سے قدرتاً پائی جانی چاہئے۔ بڑا ستم یہ ہے کہ وہ اس خامی کا احساس نہیں فرماتے، بلکہ حیرت ناک حد تک اس خوش فہمی و خود فریبی میں مبتلا ہیں جسے مناطقہ نے جہل مرکب کا نام دیا ہے۔

خدا خیر کرے بڑی سخت بات ہمارے قلم سے نکل گئی، لیکن کیا کریں جس اداریہ پر یہ گفتگو چلی ہے اس میں بھی اور شورش صاحب کی بعض سابقہ تحریروں میں بھی اس طرح کے اجزاء ہم کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہیں جنھیں دین اور علمائے دین سے استہزاء کہا جا سکتا ہے۔

صفحات میں زیادہ گنجائش نہیں اس لئے سابقہ تحریروں سے صرف نظر کر کے ہم صرف اسی اداریئے کو لیتے ہیں۔ پورا کا پورا نقل ہے تاکہ ہماری معروضات پورے طور پر سمجھی جاسکیں۔

عنوان ہے "پھر وہی چار شادیاں"

فرمایا گیا ہے:۔

"ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے حوالے سے ۲۶ اکتوبر کے اخبارات میں علامہ مشرقی کی چوتھی شادی کے زیر عنوان حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

"لاہور۔ ۲۵ اکتوبر۔ سابق خاکسار تحریک کے لیڈر علامہ عنایت اللہ مشرقی نے چوتھی شادی کی ہے۔ علامہ صاحب کی عمر تقریباً اسی برس ہے اور ان کی چوتھی جواں سال بیوی بنوں میں علامہ مشرقی کے ایک معتقد کی صاحبزادی ہیں۔ رسم نکاح حال ہی میں بنوں میں انجام پائی۔ علامہ صاحب کی پہلی بیوی سے کئی بچے ہیں۔"

علامہ مشرقی سے ہمیں کوئی تعرض نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مختار ہیں۔ اس عمر میں اگر انھیں ماضی کی خونچکاں یادوں کے باوجود شوق چرایا ہے تو وہ کئی بچوں اور تین بیویوں کے شوہر ہونے کے باوصف اپنے اس فعل کا دین مُلّا کی شرعی رو سے استحقاق رکھتے ہیں۔

البتہ اس بارے میں ہم کالعدم جماعت اسلامی کے

ناقوس خصوصی ملک نصر اللہ خاں عزیز مدیر "ایشیا" کے فرمودات ضرور سننا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جب کبھی ہم نے تعداد ازدواج کے مسئلہ پر قلم اُٹھایا انھیں ناگوار گذرا۔ اور بحث و نظر کی ایک ایسی عمارت کھڑی کی جیسے تعداد ازدواج ہی عین اسلام ہے اور جو شخص اس سے منحرف ہوتا یا اس کے برعکس مشورہ دیتا۔ یا صدر مملکت کے اس ارشاد کی تائید میں زبان کھولتا ہے کہ تعداد ازدواج کی شرعی اجازتوں پر علمائے اسلام کو معاشرے کی ضرورتوں کے مطابق غور کرنا چاہئے، تاکہ افراتفری کی روک تھام ہو سکے اور لوگوں نے افراط و تفریط کا جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کا سدّباب ہو۔ مدیر ایشیا اور ان کے ہم خیالوں یا ہم نواؤں کے نزدیک قابل گردن زدنی ہے ظاہر ہے کہ "دینِ مُلّا" کی رو سے اس پر کوئی قدغن نہیں۔ اگر ایک شخص قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہو اور وہ مسلمان تو گویا اُس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کئی بیویوں کا شوہر اور کئی بچّوں بلکہ بہوؤں کا بزرگوار ہوتے ہوئے بھی نوشہ بنے۔ اللہ اور رسولؐ (فداہ امی و ابی) کو گواہ بنا کر دوشیزاؤں کو اپنے حبالۂ عقد میں لے آئے۔ راتوں کو روشن رکھے، چھواروں کا لطف اُٹھائے، شیرنی سے اپنے ذائقہ کا کھٹّاپن دُور کرے، نتیجۃً سرتاپا مومن قانت کہلائے۔ اس کے برعکس اگر کوئی عاجز یہ کہے کہ صدر مملکت کا مشورہ صائب ہے اور کئی کئی شادیوں کے تصور پر فقہی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے تو اس پر ہمارے فاضل دوست بگڑتے ہیں اور بزعمِ خویش اسلام اور اس کی تعبیرات کے تمام حقوق اپنے نام منتقل کر لیتے ہیں۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ تعداد ازدواج کے حامیوں میں سے ننانوے فی صدی وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر اسلام نہیں ہوتا۔ وہ صرف اسلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہم صرف اسی بے لگامی کے خلاف ہیں۔

جن پابندیوں کے ساتھ قرآن حکیم نے تعداد ازدواج کی اجازت بخشی ہے۔ ہم اس سے انحراف کی جسارت ہی نہیں کر سکتے، لیکن جو لوگ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے برابر تعداد ازدواج کو درجہ دیتے اور اسے سنّت نبویؐ کا نام دے کر اپنے لئے راہیں تلاش کرتے ہیں وہ ہمارے نزدیک اسلام کے دوست نہیں بلکہ شرعی رعایتوں کے باب میں استحصالی قوتوں کے مالک ہیں اور ہم انہی بزرگوں سے عرض پرداز ہیں کہ جو چیز وہ اپنی بیٹیوں کے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کی بیٹیوں کے تعلق میں زوجیت کا جزو ہو کر کیونکر جائز ہو جاتی ہے؟"۔۔۔

پاکستان کے صدر محترم کے جس ارشاد گرامی کی آڑ لیکر شورش صاحب علمائے اسلام کی ریش سے بازی کا شغل فرما رہے ہیں اس سے تعرض کرنے کے تو ہم چھوٹے حق دار نہیں۔ موصوف بہت بڑے آدمی ہیں۔ آج بڑا وہی ہے جو طاقت ور ہو۔ کس کی مجال ہے جو اُن کے منھ آئے۔ پھر بھی بتمام ادب اتنا ضرور کہیں گے کہ انھیں بن گانِ بابِ عالی نے غلط رپورٹ دی ہے۔ معاشرے میں تعداد ازدواج کے باعث کہیں کوئی افراتفری نہیں ہے۔ کہیں کوئی حشر نہیں اُٹھ گیا ہے۔ افراط و تفریط تو در اصل ان اذہان و قلوب میں ہے جو بارگاہِ مغرب میں سُرخروئی کی خاطر چاہتے ہیں کہ اسلام اور ملتِ مسلمہ کو ہر اُس چیز سے سبکدوش کر دیں جس پر شیشہ گرانِ مغرب ناک بھوں چڑھاتے ہوں۔ ضعیف الاعتقاد آدمیوں کی طرح تعداد ازدواج کا بھوت محض تخیل کے زور سے پیدا کیا گیا ہے خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن اگر وہی گھریلو نشیب و فراز کسی کے نزدیک بھوت کی حیثیت رکھتے ہوں جو بعض اوقات تعدد ازواج سے پیدا ہو جاتے ہیں تو یہ نشیب و فراز تو ایک ہی بیوی والے گھروں میں بھی کثرت سے موجود ہیں۔ کیا نفس ازدواج ہی کو افراتفری قرار دیا جائے گا؟ کیا نکاح اوّل کے لئے بھی حکومت کو کچھ زنجیریں ڈھالنی ہوں گی؟

پھر یہ بھی عجیب ہی بات ہے کہ صدر محترم علمائے اسلام کو ایک ایسے مسئلہ پر غور و فکر کی دعوت دے رہے ہیں جس کا صریح و

محکم فیصلہ قرآن نے کر دیا ہے۔ معاملہ فقہی اجتہاد و استنباط کا ہوتا تو دعوت قرین قیاس بھی تھی، لیکن واسطہ صریح نص قرآنی سے ہے تو دعوت کو تکلفِ محض سے زیادہ کیا کہیں گے۔ فقہا نے تو اپنے آپ کو اتنا صاحبِ اختیار کبھی نہیں سمجھا کہ اللہ اور رسول ؐ کے صریح و واضح فیصلوں میں ردّ و بدل کر سکیں۔ صدر محترم خود کو اگر اتنا صاحبِ اختیار سمجھتے ہیں تو وہ فقہاء کو دعوت دینے کا تکلف نہ فرمائیں کر گذریں جو کچھ کرنا ہے۔ چٹان جیسے دسیوں جریدے انھیں توصیف کے لئے مل جائیں گے۔

اس سے زیادہ اتنی بڑی شخصیت کی بارگاہ میں ہم اور کچھ عرض نہیں کر سکتے۔ البتہ مدیر چٹان کے بارے میں اہلِ انصاف ہوشمندوں سے سوال کریں گے کہ تعدد ازواج کی جو اجازت و اباحت قرآن کریم کی صریح و محکم آیت سے بلا اختلاف ثابت ہو، اور کم و بیش چودہ سو برسوں میں ایک بھی مستند عالم نے اس کے خلاف زبان نہ کھولی ہو اس پر ایمان و ایقان کو "دینِ ملّا" کی بازاری پھبتی کا ہدف بنانا کیا کسی ایسے مسلمان کا کام ہو سکتا ہے جس کے قلب و ذہن میں کلام الٰہی کی قرار واقعی عظمت و قطعیت راسخ ہو؟ کیا یہ پھبتی خود قرآن ہی پر نہیں جاتی؟ کیا یہ بھی کسی قیاس و اجتہاد یا حدیث کا معاملہ تھا کہ منکرین حدیث کی طرح "دینِ مُلّا" کا نعرہ بلند کر دیا جاتا۔ قرآن کے ناطق احکام پر استقامت کو جو لوگ اکڑ کے ساتھ "دینِ مُلّا" کا نام دیں انھیں جہل مرکب میں مبتلا نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا۔

پھر آگے دیکھئے:۔

"اگر ایک شخص قبر میں پاؤں لٹکائے۔۔"

سے لیکر

"نتیجۃً سراپا مومنِ قانت کہلائے۔"

تک جو بات جس عامیانہ انداز میں کہی گئی ہے کیا وہ سوقیت کی حدوں میں داخل نہیں ہو گئی؟ کیا وہ جنسی گھٹن کے ایک غیر شعوری مظاہرے اور افسانہ نگاری کے ایک عامیانہ پرداز کے سوا بھی کسی علمی و منطقی اہمیت کی حامل ہے؟ کیا اسے کسی بھی پہلو سے "دلیل" کا نام دیا جا سکتا ہے؟

تعددِ ازدواج کے خلاف مغربی افلاطونوں نے جو تصور بخشا ہے وہی شورش صاحب کے ذہن میں جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ اسی کو وہ معصومیت کے ساتھ حق سمجھتے ہیں اور علماء سے اس کے خلاف باتیں سُنکر انھیں تاؤ آجاتا ہے۔ تاؤ میں آدمی کا ذہنی توازن برقرار نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ذمہ دار قلم سے ایسی غیر ذمہ دارانہ اور گھٹیا باتیں نکلی ہیں جو ان کے شایانِ شان نہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ علامہ مشرقی صاحب نے اگر بڑھاپے میں چوتھی شادی کر لی ہے تو کسی کا اس میں کیا بگڑا۔ نکاح لڑکی اور اس کے اولیاء کی رضا سے ہوا ہے تو آپ کو یا معاشرے کو اعتراض کیوں؟

پھر کس مسخرے نے مشرقی صاحب کو اس فعل کی بنیاد پر "مومن قانت" کہنے کی گستاخی کی ہے جو آپ دانت پیس رہے ہیں۔ علماء تو صرف یہ کہتے ہیں کہ مشرقی صاحب نے گناہ نہیں کیا اور اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ قرآن کا دیا ہوا جواز آپ کے افسانوی تمسخر اور بے مغز لفاظی سے تو حرمت میں نہیں بدل سکتا۔ کھل کر کہئے کہ قرآن کے حلال و حرام کو ہم سمعنا و اطعنا کے انداز میں نہیں مانتے، بلکہ اپنی پسند اور خواہش کے تابع کر کے مانتے ہیں۔ رسول ؐ کے آگے ہزار بار بھی فداہ امی وابی لکھیں گے تو یہ استہزاء سے زیادہ کچھ نہ ہوگا جبکہ آپ ان کے لائے ہوئے دین کے اصول و احکام کو اپنی مرضیات کے سانچے میں ڈھالے بغیر قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ بتائیے آپ کا یا معاشرے کے کسی بھی یونٹ کا کیا بگڑا اگر مشرقی صاحب نے چوتھی شادی کر لی۔ کونسا فساد تھا جو رونما ہوا۔ زیادہ سے زیادہ آپ لڑکی کے ہمدرد کا پارٹ ادا کر سکتے ہیں۔ آپ جوانی کی نزاکتوں اور بڑھاپے کی "کثافتوں" کا خوب سے خوب تر نقشہ کھینچ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ عمروں کے اعتبار سے یہ رشتہ غیر مناسب ہے۔ چلئے مان لیا لیکن یہ تو چوتھی شادی کے خلاف دلیل نہ ہوئی بلکہ قانون کو آواز دیجئے وہ کسی بھی بوڑھے کو کسی بھی جوان لڑکی سے شادی کی اجازت نہ دے پہلی اور تیسری چوتھی کا کیا سوال؟

تعددِ ازدواج کو آپ "دین ملّا" فرماتے ہیں تو خدارا بتائیے دینِ مسٹر کیا ہے۔۔ آنجناب اس باب میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ کیا وہ حالیہ رپورٹ آپ کی نظروں سے گذری جس سے خوشخبری ملتی ہے کہ یک زوجگی کے قائل ملکوں اور قوموں

میں حرامی بچوں کی تعداد مصدقہ اور باضابطہ تعداد چالیس اور پچاس اور ساٹھ فی صدی تک پہنچ چکی ہے جب کہ تعدد ازدواج کے قائل ممالک اور اقوام میں یہ اوسط ایک فیصدی بھی نہیں۔ یہ رپورٹ کسی مولوی ملا کی نہیں جو آپ حقارت سے پھینک دیں انھی مغربی محققین میں سے بعض کی ہے جن کے افکار و نظریات دین مسٹر کے لئے وحی کا درجہ رکھتے ہیں۔

فرمایا گیا:-

"جب کبھی ہم نے تعدد ازدواج کے مسئلہ پر قلم اٹھایا انھیں ناگوار گذرا اور بحث و نظر کی ایک ایسی عمارت کھڑی کی جیسے تعدد ازدواج ہی عین اسلام ہے"

گویا نسویرشس صاحب چاہتے ہیں کہ وہ قرآن کی دی ہوئی اجازت کو قانون کی بیڑیاں پہنانے کے لئے بلا تکلف اقتدار کو پکارتے رہیں اور وہ علماء جن پر دین کا تحفظ اور نگہداری فرض ہے انھیں ٹوکیں بھی نہیں زبان میں قفل ڈالے بیٹھے رہیں۔

عینِ اسلام تو نہ تعددِ ازدواج ہے نہ تنہا کوئی اور اصول و حکم۔ مجرد توحید تک کو عین اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ پورے کے پورے قرآن اور مجموعۂ تعلیمات کا نام اسلام ہے۔ تو پھر یوں کہئے کہ جب تک کوئی شخص سارے ہی قرآن کا منکر نہ ہو علمائے اسلام کو خاموشی کے ساتھ یہ تماشا دیکھنا چاہئے کہ دین کے بعض اصول و احکام سے کھیل کیا جا رہا ہے۔

افسوس مدعیانِ علم و فہم کے قلم سے بعض اوقات کیسی کمزور باتیں نکلتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دستور پورا کا پورا اپنی ہر ہر شق اور دفعہ کے ساتھ واجب القبول ہوا کرتا ہے۔ معاملہ چاہے وزارت و صدارت کے اعلیٰ مسائل کا ہو یا گز بھر زمین کا۔ دستور اس کے بارے میں جو فیصلہ کر چکا ہے وہ بہرحال احترام کا مستحق ہو گا۔ کیونکہ دستور کا جز ہونے کی حیثیت سے ہر قانون مساوی اطاعت کا طالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی صرف ایک آیت کا منکر بھی اسی طرح کافر ہے جس طرح پورے قرآن کا منکر اور یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ کو مرتد قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ بخدا میں ان لوگوں سے اس وقت تک مقاتلہ کروں گا جب تک رسی کا وہ ایک ٹکڑا تک نہ دیدیں جو رسول اللہ کے سامنے دیا کرتے تھے۔ دیکھ لیجئے صرف اتنی سی بات کو خلیفۂ اول نے ارتداد کے مرادف قرار دیا کہ کچھ لوگ اپنی زکوٰۃ حکومت کو ادا کرنے کی بجائے انفرادی طور پر تقسیم کرنا چاہتے تھے یا سرے سے تقسیم ہی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ رسی کے ایک ٹکڑے کی ذاتی اہمیت کیا ہے، لیکن اصل اہمیت تو اس بات کی تھی کہ اسلامی دستور میں دراندازی کی جا رہی تھی۔

کسی بھی عدالت میں جائیے آپ دیکھیں گے وکلاء گرماگرم بحثیں کر رہے ہیں اور زبان و بیان کی ساری توانائیاں زیر بحث مقدمہ پر صرف کی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے ہر مقدمہ پورے دستور سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ قانون کی کسی ایک یا چند معمولی یا غیر معمولی دفعات سے متعلق ہوتا ہے تو کیا وکلاء پر بھی آپ نے کبھی یہ طعن کیا کہ یہ مسخرے اس طرح بحث و نظر کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں گویا یہی ایک دفعہ عین دستور ہے۔

ہم علماء پر طعنہ کسنے والوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ بحث دراصل تعدد ازدواج کی ذاتی حیثیت سے نہیں دستوری حیثیت سے ہے۔ اوّل تو تعددِ ازدواج کی عام اجازت اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے معمولی چیز نہیں ہے۔ جو لوگ اس کے چند قریبی اور سطحی پہلوؤں کے پیش نظر ناک بھوں چڑھاتے ہیں ان کی نظر وسیع اور دور بیں نہیں ہے۔ دوسرے قرآن پورا کا پورا ایک دستور فیصل ہے۔ نقص کے احتمال سے پاک۔ ردوبدل کی آفت سے بلند۔ اس میں جو قانون واضح کر دیا گیا وہ چاہے بجائے خود معمولی ہو لیکن دستوری حیثیت میں اتنا ہی غیر معمولی ہے جتنا کوئی بھی بڑے سے بڑا قانون۔ جو شخص اس میں دراندازی کرے گا روکا جائے گا۔ اس لئے روکا جائیگا کہ وہ دستور الٰہی کی توہین کر رہا ہے۔ انحراف و سرتابی کی راہ کھول رہا ہے۔ اس لئے روکا جائے گا کہ دستور الٰہی کے قصرِ رفیع میں آج ذرا سا رخنہ پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کل اچھی خاصی دراڑ کھول دی جائے اور برسوں پوری نقب نظر آئے

اس لئے ردکیا جائے گا کہ قرآنی فیصلوں میں تصرف اور بلا دلیل شرعی ترمیم ناقابل برداشت ہے۔ جو لوگ آج تعدد ازدواج کی قرآنی اباحت کو پا بجولاں کرنے کا اقدام فرما سکتے ہیں وہ کل بعض اور آیات قرآنی میں کیوں دست اندازی کریں گے۔ حدودِ حرم کا تصہ تمام ہوا تو اب آگے بڑھنے سے کون روکیگا۔

ملکی سرحد کی چند بالشت زمین کوئی قیمت نہیں رکھتی لیکن ملک کی حفاظت کرنے والی فوجیں ایک ایک انچ کی خاطر اس لئے کٹ مرتی ہیں کہ غنیم کو اپنی سرحد میں داخل نہ ہونے دینا ہی سب سے اہم اور مقدم تر مسئلہ ہے۔ وہ داخل ہو گیا تو دفاع کی دیوار ٹوٹ گئی اور آگے جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔

رہا علماء کی ناگواری کا گلہ تو شورش صاحب ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں یہ ناگواری بیجا نہیں ہے۔ فرض کر لیجئے علمائے سائنس کے مابین کسی سائنسی مسئلہ پر گفتگو جاری ہو اور میں بیچ میں ٹانگ اڑا دوں تو کیا ان کو ناگوار نہ گذرے گا جب کہ وہ خوب جانتے ہوں کہ میں سائنس کے بارے میں سطحی اور شنی سنائی معلومات سے زیادہ کچھ نہیں رکھتا اور اُس زبان تک سے ناواقف ہوں جس میں سائنس کا پورا دفتر ہے۔ علیٰ ہذا اُن اطباء کی ناگواری بھی کیا حق بجانب نہ ہوگی جن کی گفتگو میں کوئی عطار دخل انداز ہوا ہو۔

ٹھیک ایسا ہی معاملہ دینی مسائل کا ہے علمائے دین کو آپ جیسے حضرات کی دخل اندازی کیوں ناگوار نہ ہو، جب کہ وہ دینی علوم و فنون میں آپ کے مبلغِ علم سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ آپ ان ابتدائی شرائط پر بھی پورے نہیں اُترتے جو علومِ دینیہ میں محققانہ گفتگو کیلئے گھٹیا سے گھٹیا درجے میں ضروری ہیں۔

ارشاد کیا گیا:۔

"ہمارا دعویٰ ہے کہ تعدادِ ازدواج کے حامیوں میں سے ننانوے فیصدی وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر اسلام نہیں ہوتا وہ صرف اسلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہم صرف اسی بے لگامی کے خلاف ہیں۔"

دعویٰ تو روس نے بھی کر رکھا ہے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ دعویٰ تو یہود و نصاریٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارا ہی دین حق ہے۔ دعویٰ کرنا آسان ہے، لیکن ثبوت دینا مشکل۔ ایک فی صدی کا تکلف چھوڑ کر اگر شورش صاحب پورے سو فیصدی بھی کہہ گذرتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا دعویٰ ہوا میں گرہ لگانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تعدادِ ازدواج کے جتنے بھی حامی اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں ان میں سے ایک دو ہی کو معین و مشخص کر کے شورش صاحب واضح فرمائیں کہ ان ان وجوہ سے ان کی حمایت اسلام دوستی سے بعید اور خود غرضانہ انتفاع پر مبنی ثابت ہوتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں انھوں نے محض شوقِ خامہ فرسائی میں اس طرح کا لایعنی دعویٰ داغ دیا ہے ورنہ ننانوے فی صدی تو کجا وہ دس فی صد ـــــ بلکہ ایک فیصد کا بھی ثبوت فراہم نہیں کر سکتے۔ اگر تعدادِ ازدواج کے کسی حامی کے بارے میں آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام اس کے پیشِ نظر نہیں، بلکہ صرف اسلام سے فائدہ اٹھانا پیشِ نظر ہے تو یہ اسی صورت میں قرینِ صحت ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے سال چھ مہینے بعد دوسری یا تیسری یا چوتھی شادی کا پروگرام بنا رکھا ہو اور اس اندیشے کی بناء پر کہ کہیں حکومت تعدادِ ازدواج کے خلاف قانون نہ بنا دے اور اس کا مجوزہ پروگرام کھٹائی میں نہ پڑ جائے تعددِ ازدواج کی حمایت میں زور لگا رہا ہو۔

لیکن جہاں تک ہمارا علم ہے تعدادِ ازدواج کا ایک بھی معروف حامی ایسا نہیں ہے جس نے پروگرام بنانا تو کجا تصور تک کیا ہو کہ اسے موجودہ بیوی پر دو تین بیویوں کا اضافہ اور کرنا ہے۔ ہمارا علم اگر ناقص ہے تو شورش صاحب ہی آگاہ فرما دیں کہ کونسا وہ عالم ہے جس نے خود غرضانہ استفادے کی بنیاد پر داویلا مچا رکھا ہو۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ ایک بھی نام نہ لے سکیں گے حالانکہ ایک یا دو چار نام لے بھی دیں تو فائدہ کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ ننانوے فیصدی کا دعویٰ کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ تعدادِ ازدواج کے حامیوں کی کھیپ کی کھیپ ایسی ہی پوزیشن میں نظر آنی چاہیئے۔ اگر ایک آدھ عالم کے حالات وہ ایسے دکھلا دیں جن میں سوءِ ظن کی راہ نکلتی ہو تب

بھی یہ شاذ کے درجے میں ہوگا۔ انھوں نے قلم اُٹھایا اور دعویٰ داغ دیا' لیکن یہ نہ سوچا کہ سچائی اور نرے زبانی جمع خرچ میں فرق ہے۔ جو علماء تعداد ازواج کی حمایت کر رہے ہیں انھیں سے اکثر و بیشتر کے تو خواب و خیال میں بھی دوسری یا تیسری شادی کا ارادہ نہ گذرا ہوگا نہ اپنے صاحب زادوں کے لئے انھوں نے کئی کئی بیویوں کی تجویز سوچ رکھی ہوگی پھر بھی یہ لغو الزام تراشا جائے کہ ان کے پیش نظر اسلام نہیں بلکہ اسلام سے فائدہ اُٹھانا ہے تو اسے کینہ پروری اور بغض و عناد کے علاوہ کیا کہیں گے۔

پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام سے فائدہ اُٹھاتا ہے تو شورش صاحب کی پیشانی پر بل کیوں آئے؟ غصہ تو اس وقت کیجئے جب استفادے میں چار سو بیس سے کام لیا جائے۔ جب چور دروازے کھولے جائیں۔ جب مسخ و تحریف کی جسارت کی جائے۔ لیکن تعدد ازدواج کی اجازت تو قرآن کی نصِ قطعی سے ثابت ہے۔ قرآن ہی استفادے کی اجازت دے رہا ہے تو ہمہ شما کو کیا حق ہے کہ دانت پیسے اور طرارہ دکھلائے۔

فرمایا گیا:۔

"جن پابندیوں کے ساتھ قرآن حکیم نے تعدد ازدواج کی اجازت بخشی ہے ہم اس سے انحراف کی جسارت ہی نہیں کر سکتے۔"

تو براہ کرم بیان فرمایا جائے کہ قرآن نے کیا پابندیاں عائد کی ہیں اور کون لوگ ان پابندیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک سے زیادہ شادیاں رچا رہے ہیں۔ قرآن صرف یہ ہدایت دیتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے والوں کو بیویوں کے مابین انصاف کرنا چاہئے۔ اگر حکومت وقت انصاف کے لئے اتنی ہی بیتاب ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنے والوں کا پیچھا کئے بغیر آرام کی نیند نہیں سو سکتی تو اس کا دائرۂ کار شادیوں کے بعد شروع ہوتا ہے نہ کہ شادیوں سے قبل۔ شادیوں کے بعد اگر ثابت ہو جائے کہ شوہر نے بیویوں کے مابین انصاف نہیں برتا تب وہ دخل دینے کی مجاز ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا انحصار محض تعدد ازدواج ہی پر نہیں۔ ایک ہی بیوی والا اگر بیوی سے ناانصافی کرے اور بیوی اسے عدالت میں ثابت کر دے تو اسلامی قوانین اس کی دادرسی کو موجود ہیں۔

واضح رہنا چاہئے کہ انصاف کی قرآنی ہدایت صرف تعداد ازواج ہی تک محدود نہیں رہی' وہ یکزوجگی میں بھی یہی ہدایت دیتا ہے۔ بس تعدد ازدواج کے ساتھ اس ہدایت کو ایسی ہی خصوصیت ہے جیسے فسوق و جدال کی ممانعت کو حج کے ساتھ۔ فسوق و جدال عام حالتوں میں بھی ممنوع ہی ہیں۔ اسی طرح انصاف کی تعلیم و ہدایت ایک بیوی والوں کے لئے بھی ہے اکیلی بیوی پر ظلم کرنے والا بھی اسی طرح مجرم ہے جس طرح ایک سے زائد بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنے والا۔ اگر قانون کو یہ اجازت دیدی جائے کہ وہ نکاح سے قبل ہی اطمینان حاصل کرے کہ فلاں شخص جو دوسری یا تیسری بیوی کرنے چلا ہے وہ انصاف کرے گا یا نہیں تو پھر اس اجازت کا دائرہ یک زوجگی تک وسیع کرنے میں کونسی شے حائل ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص شادی کرنے سے قبل قانون کو مطمئن کرے کہ آنے والی بیوی سے وہ انصاف کرے گا تب اسے اذنِ نکاح عطا ہو سکے ورنہ جس کے بارے میں یہ گمان کرنے کی وجہ موجود ہو کہ وہ شاید پورا انصاف نہ کر سکے اسے ایک بھی بیوی کی اجازت نہ ملنی چاہئے۔

ان تمام تفصیلات سے قطع نظر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تعداد ازدواج کی صورت میں جس انصاف کی ہدایت قرآن نے دی ہے اس کی نگرانی کا فرض حکومت اور ملکی قانون کو نہیں سونپا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ رسالت میں اس طرح کے قدغن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اب سنئے دَور کے مجتہدین اگر اپنی رحمدلی اور دردمندی کا سارا مظاہرہ قرآن ہی کے خلاف کرنے بیٹھ جائیں تو بتائیے بیچارے علماء کا اس میں کیا قصور ہے۔

"جو لوگ نماز روزہ' حج زکوٰۃ کے برابر تعدد ازدواج کو درجہ دیتے اور سنتِ نبویؐ کا نام دیکر لینے لئے راہیں تلاش کرتے ہیں وہ ہمارے نزدیک اسلام کے دوست نہیں' بلکہ شرعی رعایتوں کے باب میں استحصالی قوتوں کے مالک ہیں۔"

الزام وہی کا بالکل روسی انداز اردو انسائیکلوپیڈیا نے جو گل افشانی اسلام کے خلاف کی ہے وہ بھی کچھ اسی انداز کی ہے کہ اسلام استحصالی قوتوں کا مالک ہے وغیرہ۔ ہم نہیں جانتے اس طرح کی لفاظیاں حقائق کی بارگاہ میں کیا وقعت رکھتی ہیں۔

بتایا جائے وہ کون لوگ ہیں اور کہاں ہیں جنھوں نے تعداد ازواج کو فرائض کا درجہ دیا۔ کس مسخرے نے یہ کہا کہ جس طرح نماز روزہ ہر مسلمان پر فرض ہیں اور ان کا تارک گناہگار ہے اسی طرح ایک سے زیادہ بیویاں کرنا بھی فرائض میں داخل ہے اور جو ایک بیوی پر قناعت کرے گا گناہگار ہوگا۔

اسی طرح اُن لوگوں کا اتا پتا بتایا جائے جنھوں نے نکاح ثانی وثالث فرماتے ہوئے سنت نبویؐ کا حوالہ دیا ہو ــــ حالانکہ اگر حوالہ دیا جائے تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

تعدد ازواج کے سلسلہ میں علمائے اسلام کا بار بار زبان کھولنا جس شخص کے نزدیک یہ معنی رکھتا ہو کہ تعدد ازدواج کو نماز روزوں کے برابر درجہ دیا جا رہا ہے اس کے فہم و ذکاء قابل رحم ہیں۔ اسے سمجھایا جائے کہ جناب عالی! قرآن کُل کا کُل کلام الٰہی ہے۔ اس میں جو مختلف احکام بیان ہوئے ہیں ان میں ذاتی طور پر تو فرقِ مراتب ضرور ہے، لیکن ارشاد ربانی ہونے کی حیثیت میں وہ سب یکساں ہیں اور جس طرح صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کے احکام پر مشتمل آیات واجب الاحترام ہیں۔ اسی طرح قرآن کی ہر ہر آیت واجب الاحترام ہے جا ہے اس میں صوم و صلوٰۃ سے کم ضروری احکام بیان کئے گئے ہوں۔ علمائے اسلام کا فرض ہے کہ ہر آیت کو غلط افکار و اجتہادات کی دست برد سے محفوظ رکھنے کی سعی کریں اسی فرض کو وہ ادا کر رہے ہیں۔

"اور ہم ابھی بزرگوں سے عرض پرداز ہیں کہ جو چیز وہ اپنی بیٹیوں کے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کی بیٹیوں کے تعلق میں زوجیت کا جزو ہو کر کیونکر جائز ہو جاتی ہے؟"

ان فقروں میں شورش صاحب کا ذہن نمایاں ہو کر سامنے آگیا۔ کیا وہ کھلے طور پر قرآن کا معارضہ نہیں کر رہے ؟ کیا ان کے سوالیہ فقرے کا صاف طور پر یہی منشا نہیں ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کا جواز ہونا ہی نہیں چاہئے؟ کتنی معصومیت سے چند سطر پہلے انھوں نے کہا تھا کہ قرآن کی دی ہوئی تعدد ازدواج کی اجازت سے انحراف کی جسارت ہم کر ہی نہیں سکتے، لیکن یہ محض سخن آرائی تھی۔ وہی ٹکنک تھی جو منکرین حدیث استعمال کرتے ہیں۔ فی الحقیقت ان کے قلب کی آواز یہی ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں کسی حال میں جائز ہونی ہی نہیں چاہئیں۔ اگر ہم غلط کہتے ہیں تو زبان و بیان کا کوئی ماہر بتائے کہ ان کے مذکورہ الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

رہی قرآن کی اجازتِ صریحہ کے خلاف ان کی وہ دلیل عقلی جو ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے تو اس کا جواب سنیئے کہ اسلامی قوانین میں خود بھی پسند ناپسند کا لحاظ آخری ممکن حد تک رکھا گیا ہے۔ کیا اسلام نے یہ نہیں کہا کہ نکاح کے لئے لڑکی کے اولیاء اور خود لڑکی کی اجازت لازمی ہے۔ اگر لڑکی انکار کرے تو نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔

شورش صاحب اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں گویا جب بھی کوئی شخص ایک بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری لڑکی کو نکاح ثانی کے لئے منتخب کرے گا تو اب یہ دوسری لڑکی اور اس کے اولیاء مجبور ہوں گے کہ اس شخص کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں چاہے دل سے ایسا کرنا پسند ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ یہ سراسر خلاف واقعہ ہے۔ جو شخص بھی اپنی لڑکی سوت پر بیاہتا ہے وہ اپنی مرضی اور پسند ہی سے ایسا کرتا ہے اور خود یہ لڑکی بھی اس پر راضی ہوتی ہے ورنہ وہ راضی نہ ہو تو نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر کسی کو کیا حق ہے کہ اس رضامندی کے سودے پر واویلا مچائے اور چونکہ وہ خود اپنی بیٹی سوت پر دینا پسند نہیں کرتا اسلئے خواہش کرے کہ دنیا میں کوئی بھی باپ اپنی بیٹی سوت پر نہ دے۔ پسند اور ناپسند کا معاملہ مختلف حالات، ضروریات اور منفرد رجحانات پر ہوا کرتا ہے۔ تعدد ازدواج کو

سمجھئے۔ یک زوجگی ہی کے معاملات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جس شخص سے نعیم اپنی بیٹی بیاہنا پسند نہیں کرتا اسی شخص سے ارشاد بخوشی اپنی بیٹی بیاہ دیتا ہے۔ آنجناب کی بیٹی حسین ہے، سلیقہ مند ہے، تعلیم یافتہ ہے، آپ یقیناً چاہیں گے کہ اس کا نکاح کسی تعلیم یافتہ، معزز لڑکے سے ہو۔ آپ کا چاہنا بجا ہے، لیکن شمیم کی لڑکی بدشکل ہے، بے سلیقہ ہے، اچھا رشتہ ملنے کی کوئی توقع نہیں عمر نکلی جا رہی ہے۔ اب ایک ایسے شخص کی منگنی آتی ہے جسکی ایک دو بیویاں موجود ہیں۔ یا وہ کنوارا ہی ہے مگر غیر معزز ہے۔ معمولی دکاندار ہے۔ مزدور ہے۔ کم پڑھا لکھا ہے۔ ایسا ہے کہ آنجناب اپنی مذکورہ بیٹی کے لئے اسے قیامت تک پسند نہیں کر سکتے تو کیا یہ ہانک لگانی بجا ہوگی کہ آپ کی طرح شمیم کو بھی اس شخص سے اپنی لڑکی نہ بیاہنی چاہیئے؟

غور فرمائیے۔ اسلام عام انسانوں اور تمام زمانوں کیلئے آیا ہے۔ اس کے ہر حکم اور اصول میں متعدد مسں منافع ہیں محض یہ بات کہ ہم اپنی بیٹیوں کو سوت پر دینا پسند نہیں کرتے اگر اس نتیجے پر پہنچانے کے لئے کافی ہوتی کہ کسی اور کے لئے بھی اپنی لڑکی سوت پر دینا جائز نہ ہو تو عالم الغیب والشہادہ اس صراحت کے ساتھ چار تک کی قطعی اجازت نہ دیتا۔ مخصوص حالات و مقتضیات ہی ہوتے ہیں جن کے تحت کوئی شخص اپنی بیٹی سوت پر بیاہتا ہے۔

پھر یہ بھی نوٹ کیجئے کہ سوت پر اپنی لڑکی بیاہنے کو شدت سے ناپسند کرنا کوئی ہمہ گیر فطری داعیہ نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق میں ہمارے اس معاشرے کا دخل ہے جس میں تعدد ازدواج کو بھیانک المیہ بنا دیا گیا ہے ورنہ عرب میں آج بھی اکثر لوگ اپنی بیٹیاں سوت پر خوشی سے دیتے ہیں اور اسے ذرا بھی المناک بات نہیں سمجھتے۔

اس بحث کے کچھ اور گوشے بھی ہیں لیکن صفحات کی تنگدامانی مزید گفتگو سے مانع ہے۔ فی الوقت اتنا ہی کافی ہوگا۔

لیکن اگر کوئی یہ پوچھے کہ امت مسلمہ کی موجودہ الجھنوں اور سماج کی زلف دراز کی گتھیوں کو سلجھانے کے سلسلہ میں اس اجتماع نے کس حد تک فکری رہنمائی کی ——؟ بے خدا نظام زندگی کو نظریات کی دنیا میں نہیں، بلکہ تلخ حقائق کے میدان میں مطلوبہ خدائی نظام کی طرف موڑنے کے لئے کونسی راہ کھولی جس پر چل پڑنے کی توقع عوام سے کی جا سکے اور نظامِ باطل سے یک قلم انقطاع کے ذریعہ کس طرح اخلاق و انسانیت کے اس قصر رفیع کی ایک دیوار بھی تعمیر ہو سکے گی، جس کے خوبصورت نقشے اور خاکے داعیانِ حق پیش فرماتے ہیں تو ہمیں اعتراف ہے کہ سوائے معذرت اور تاویل کے اس کا کوئی شافی جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم نہیں بتا سکتے کہ جس اقامتِ دین کا خواب جماعتِ اسلامی دکھلا رہی ہے وہ ہزارویں درجے میں بھی کس طرح پورا ہو سکتا ہے جب کہ ملکی سیاست سے مکمل احتراز کو جماعتی پالیسی قرار دیا گیا ہے۔

لیکن ٹھیریئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جلد بازی سے کام لے رہے ہوں۔ کہیں یہ مایوسی ہماری ہی کوتاہ فہمی کا ثمرہ تو نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ایک اچھی توجیہ بھی ممکن ہے۔ کھلی بات ہے کہ جماعت اسلامی ابھی ابتدائی تعمیر کے دور میں ہے عوامی سطح پر اس کے فکر کی مقبولیت تو درکنار اس کا کماحقہٗ تعارف بھی نہیں ہوا ہے۔ ابھی اسے نہ صرف اپنا تعارف کرانا ہے، بلکہ ذہنی تربیت اور کردار سازی کا پِتّا مار کام عرق ریزی کے ساتھ کرنا ہے۔ ابھی یہی بہت ہے کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں عوام کے قلوب میں تجسس اور اعتناء پیدا کر دے ذہنی تربیت پائے ہوئے پختہ کاروں کی ایک معتد بہ جماعت کے بغیر سیاست حاضرہ کی جنگ گاہ میں کود پڑنا شاید مفید کم اور مضر زیادہ ہو۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ مسلسل جد و جہد کے بعد جب اس کا پیغام، اس کا نصب العین، اس کا طرزِ فکر نہ صرف متعارف ہو جائے گا بلکہ امت مسلمہ کے معتد بہ افراد اسے سینہ سے لگا لیں گے اس وقت عملی سیاست کی طرف کوئی جچا تلا قدم اُٹھایا جائے گا۔ اس وقت یہ ثابت کرنے کا موقع ملے گا کہ خوبصورت نظریات کو اینٹ اور پتھر کی ٹھوس دنیا پر کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے، دینی اخلاقی کیونکہ ایک صالح انقلاب کی طرف پیش رفت کی قوت و اہلیت مہیا کر سکتے ہیں اور مسلمانوں ہی کا نہیں پورے ملک کا سماج کیسے مطلوبہ اصلاح کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے ہمیں یقین ہے کہ جماعت اسلامی کے ارباب حل و عقد ہم جیسے بے بضاعتوں سے کہیں زیادہ فہم و فراست رکھتے ہیں وہ خود ہی سمجھتے ہیں کہ صرف وعظ و خطابت اور تحریر و تبلیغ سے اقامتِ دین نہیں ہو سکتی جب تک میدانِ عمل کی کڑیاں نہ جھیلی جائیں اور توقع ہے کہ مناسب موقع آنے پر وہ نظام باطل سے مکمل کنارہ کشی اور سیاست سے بے تعلقی کی پالیسی کو کسی ایجابی پروگرام میں تبدیل فرمائیں گے۔ دعا کیجئے آپ بھی اور ہم بھی کہ اللہ! حق پرستوں کی مدد فرما اور باطل کا سر نیچا کر دے۔ اللھم انا نستعینک و نتوکل علیک

تذکارِ مطلوب

ارادہ تو یہی تھا کہ اس عنوان کے تحت ہم والد رحمۃ اللہ کے خصوصی واقعات و کوائف کافی عرصہ تک ہدیۂ ناظرین کرتے رہیں گے، لیکن یہ ارادہ شاید پورا نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اس کی تفصیل میں جانے سے بہتر ہے کہ ماہ گذشتہ کی ادھوری بات پوری کر دی جائے۔

رحلت کے سلسلہ میں اب کچھ زیادہ کہنا باقی نہیں۔ اتوار ۷ ار جولائی ۱۹۶۰ء کی شام کو انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اللہ کا شکر ہے کہ محبین و اعزا کی کثرتِ تعداد کے باوجود ماتم و عزا میں کوئی غیر شرعی کیفیت پیدا نہیں ہوئی عرصہ ہوا انھوں نے بطور وصیت فرما لیا تھا کہ مجھے شبیر احمد کے برابر دفن کرنا .... علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ والد صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ انکی قبر اس جگہ ہے جہاں اب قریشی صاحب کا کالج تعمیر ہو رہا ہے۔ اس وقت اس کالج کا کوئی تصور بھی نہیں تھا، بلکہ لوگوں کی خواہش تھی کہ اس جگہ دار العلوم تعمیر ہو۔ بعد میں جب حالات کے انقلاب نے دار العلوم کے عوض اس جگہ

تعلیم کے ماڈرن کالج کی تعمیر طے کر دی تو والد صاحب نے اپنی وصیت بدل دی اور فرمایا کہ مجھے تو کہیں گورِ غریباں میں دفن کر دینا۔

بڑے شہروں میں، خصوصاً کراچی اور بمبئی جیسے شہروں میں آج کل ایسا قبرستان عنقا ہی سمجھنا چاہئے جس پر "گورِ غریباں" کے الفاظ اپنے پورے مفہوم کیساتھ منطبق ہو سکیں، لیکن اللہ کو ان کی یہ خواہش بھی پوری کرانی ہی تھی کہ گورِ غریباں میسر آجائے۔ ارادہ کیا گیا تھا کہ شہروں کے اُس دستورِ عام کے مطابق جو تمدنی مجبوریوں کا پیدا کردہ ہے ان کا جنازہ ایمبولینس میں لیجایا جائے اور ساتھ جانے والوں کے لئے بھی گاڑیوں کا انتظام کیا جائے، لیکن اللہ کو طریقۂ مسنونہ ہی سے شرف یاب کرنا تھا، معلوم ہوا کہ مجائے پختہ سڑکوں کے اگر پیر کالونی کے دامن والی خشک ندی کے راستے جایا جائے تو قبرستان بجائے میلوں کے صرف دس بارہ منٹ کے فاصلہ پر ہے۔

پس پھر تو یہی راستہ اختیار کیا گیا اور اللہ کا شکر ہے کہ قبر کے لئے جگہ بھی حسب دلخواہ مل گئی۔

غالب نے خوب ہی کہا ہے:۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں

لیکن قبر میں لاشہ اُتارتے ہوئے اس شعر سے کہیں زیادہ پُر اثر، سبق آموز اور دل و روح پر چھا جانے والی قرآن کی وہ آیت ہے جو اگرچہ بہت سادہ ہے، لیکن ایسا ساحرانہ دروبست اور ایسی گیرائی اپنے اندر لئے ہوئے ہے کہ قلم میں صلاحیت نہیں جو اس کے سوز و اثر کا بیان کر سکے

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ○

اسی زمین (مٹی) سے ہم نے تمھیں پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیا اور اسی سے پھر ایکبار تمھیں نکالا جائیگا

كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذِى الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ

عمدہ کتابیں

مسلم شریف مع ترجمہ و شرح

فرزدہ ہو کہ احادیث صحیحہ کی مشہور کتاب مسلم شریف کا اردو ترجمہ اور ساتھ ہی امام نووی کی شہرہ آفاق شرح کا بھی ترجمہ آگیا ہے۔ عربی متن بھی ساتھ ہے۔ چھ جلدوں میں مکمل مجلد کا ہدیہ اڑتالیس روپے

کوئی جلد الگ نہ مل سکے گی

امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی

نام ہی کہہ رہا ہے کہ کتاب لائق مطالعہ ہے۔ ذہانت و ذکاوت کے مجسمے حضرت امام اعظمؒ کی سیاسی زندگی کے حالات مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے گوہر ریز قلم سے پانچسو سے زائد صفحات۔ مجلد بارہ روپے۔

عظیم تاریخ اسلام

از اکبر شاہ نجیب آبادی

تین ضخیم جلدوں میں مکمل یہ مشہور زمانہ تاریخ تعارف کی محتاج نہیں۔ پاکستان میں عمدہ کاغذ اور روشن طباعت و کتابت کے ساتھ چھپی ہے۔ قیمت فی سیٹ مکمل و مجلد چھتیس ۳۶ روپے۔

امام ابن تیمیہؒ

افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن عمری کی معرکۃ الآراء کتاب۔ امام العارفین شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے علم و فضل، عزیمت و حمیت اور مجددانہ کارناموں کا سیر حاصل تذکرہ، جس پر ماہ نامہ تجلی میں تبصرہ ہوا ہے۔ قیمت مجلد دس روپے۔ مجلد اعلیٰ گیارہ روپے

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی سے متعلق بہترین محققانہ اور سیر حاصل مقالات کا بیش بہا مجموعہ۔ اس کتاب کا نہ پڑھنا اپنی زریں تاریخ کے ایک اہم باب سے ناواقف رہنا ہے جو بہت بڑی محرومی ہے۔

قیمت مجلد چار روپے

کتاب زندگی

امام بخاری کی الادب المفرد کا اردو ترجمہ بہترین اخلاقی تعلیمات پر مشتمل احادیث کا مفید ترین مجموعہ، جس کے جامع امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

سنن دارمی شریف

حدیث کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ جو ۳۴۰۶ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ ہدیہ مجلد آٹھ روپے

مسند امام اعظم (مع ترجمہ و فوائد)

امام ابو حنیفہؒ کا مرتب فرمودہ احادیث کا مجموعہ جسمیں مولانا عبد الرشید نعمانی کا بہترین معلومات افزا مقدمہ بھی ہے۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

صحابیات

ان برگزیدہ خواتین کے حالات جنہوں نے اللہ کے آخری رسول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا

قیمت مجلد چھ روپے

سفینۃ الاولیاء

ادارہ شکوہ کی تالیف جسمیں رسول اللہؐ صحابہؓ ائمہؒ، اولیاءؒ، ازواج النبیؐ اور اسلام کی مشہور نیک خواتین کے حالات ہیں، قیمت پونے سات روپے

التکشف

مولانا اشرف علیؒ کی اس کتاب کا پورا نام التکشف عن مہمات التصوف ہے۔ تصوف اور اس کی جزئیات پر بڑی مبسوط کتاب ہے مشکل مسائل اور دقیق نکات کی توضیح و تسہیل، علوم و معارف کا گنجینہ تازہ بہترین ایڈیشن۔ مجلد دس روپے بارہ آنے

آئینہ حقیقت نما

مؤرخ اسلام مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی معرکۃ الآراء تالیف، ہندو اور مغربی مؤرخین، مسلم فاتحین پر جو متعصبانہ الزامات لگاتے رہے ہیں ان کے محققانہ، مدلل اور دندان شکن جوابات۔ عجیب کتاب ہے

مجلد بارہ روپے

مستقل عنوان **فتاویٰ زندقیہ** از مُلّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

ابوالاعلیٰ یعنی خدا کا بیٹا

سوال:- از سید صدیق احمد - حیدرآباد دکن۔

اپنے ایک قریبی رشتہ دار کو میں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب پڑھنے کے لئے دی لیکن انھوں نے اس کتاب کے مطالعہ سے انکار کیا پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ جب تک ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنا نام تبدیل نہیں کرتے میں ان کی کتابیں نہیں پڑھوں گا۔

میں نے وجہ دریافت فرمائی تو انھوں نے کہا کہ ابوالاعلیٰ کا مطلب ہے "خدا کا بیٹا"

کیا ان صاحب کا یہ خیال صحیح ہے؟

جواب:-

ایڈیٹر تجلی کا قاعدہ ہے کہ جب کسی سوال کا جواب نہیں بن آتا ہے تو اسے میرے سر مارتے ہیں۔ "ابوالاعلیٰ" نام کے متعلق پہلے بھی ایک مرتبہ ان کے پاس استفسار آیا تھا۔ اس کا جواب تو انھوں نے تجلی کے خاص نمبر ۱۹۵۶ء میں دیدیا تھا۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب "ابو" کے معنی "باپ" ہوا کرتے تھے۔ اب سن ۵۹ء میں ابو کے معنی بیٹا ہونے لگے تو انکی سٹی گم ہوگئی کہ اس سے کیسے نمٹیں۔ ناچار آپ کے استفسار میرے حوالے کر دیا ہے۔ میں نے توجہ دلائی۔

"حضرت خدا تو ساتویں آسمان سے بھی اوپر رہتا ہے"

"تو پھر؟"

"میں نے عربی صرف پہلے آسمان تک پڑھی ہے۔ کیسے جواب دوں گا۔"

انھوں نے پیشانی پر تین بل ڈالے۔ ان کی عادت ہے کہ منطق پہ بس نہیں چلتا تو رعب ڈال کے کام نکالتے ہیں۔

"بکواس مت کرو۔ ڈاک نمبر کے لئے تمھیں کتنی سوالوں کے جواب لکھنے ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے متعدد خطوط میری طرف بڑھا دیئے اور چلتے بنے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عذر معذرت کی گنجائش نہیں، جھک مارو اور لکھو۔

مجبوراً مجھے منشی پردانہ الدین کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ آسمان سے اُوپر اُوپر کی عربی انھوں نے پڑھ رکھی ہے۔ ہم اور وہ کبھی کلاس فیلو رہے تھے۔ مدرسہ خیر المدارس میں پڑھتے تھے تو مسلسل پانچ سال تک فیل ہوتے۔ تب ہم نے سمجھوتہ کر لیا کہ ذمہ داریاں تقسیم کر لی جائیں۔ آسمان سے نیچے نیچے کی عربی میں پڑھ لوں اور اوپر اوپر کی وہ گھول کے پئیں۔ اس ترکیب سے ہم چھٹے سال پاس ہوگئے تھے۔

مگر دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اندر معاملہ گڑبڑ نظر آیا۔ منشی صاحب کی اہلیہ بڑے طرارے سے فرما رہی تھیں۔

"تمھارے تو دماغ میں بھس بھر گیا ہے"

جواب میں منشی جی دہاڑ رہے تھے:-

"بکو مت۔ تم سب جاہل ہو۔ الکم جاہل مطلق"

اتنے میں منشی صاحب کے صاحبزادے [illegible] باہر سے

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ وہ مجھ سے خاصے بے تکلف تھے۔

"ارے آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلئے۔" انہوں نے کہا۔ میں نے ان کی توجہ اندر سے آنے والے مکالمے کی طرف دلائی۔ ان کے چہرے پر دفعتاً شرمندگی اور غصے کے ملے جلے آثار ظاہر ہوئے۔

"اوہ! آج پھر ابا میاں کو دورہ پڑا ہے۔" وہ بڑبڑائے

"دورہ؟"

"جی ہاں۔ کیا بتاؤں۔ وہ۔۔۔۔ مگر اس وقت آپ جائیے پھر کسی وقت صورتِ حال عرض کروں گا۔"

میں لوٹ آیا۔ بہت دنوں سے منشی صاحب کے یہاں جانا نہیں ہو سکا تھا اس لئے اندازہ نہیں کر سکا کہ "دورے" کی کیا نوعیت ہوگی۔ شام کو تمیز میاں ملے تو انھیں گھر کھینچ لایا اور چائے والے بلا کے پوچھا کہ اب بتاؤ صاحبزادے دورے کا کیا قصہ تھا؟

"عجیب قصہ ہے" وہ بولے "رونا بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔ کئی مہینوں سے ابا میاں عجیب طرح کی باتیں کرنے لگے ہیں۔"

"وہی تو میں بھی پوچھتا ہوں۔ کل کیا بات تھی جس پر تمھاری والدہ بگڑ رہی تھیں۔"

"یہ بات تھی کہ چند روز ہوئے ایک پلنگ ٹوٹ گیا تھا۔ والدہ نے ان سے کہا کہ پلنگ ٹھیک کرا دیجئے اس پر اچانک وہ کہنے لگے کہ عزیز کی ماں پلنگ مت کہا کرو۔ پلنگ فارسی میں کتے کو کہتے ہیں۔ ناپاک جانور کا نام زبان پر لانا ٹھیک نہیں۔ عزیز بول پڑا کہ ابا میاں پلنگ تو چیتے کو کہتے ہیں اور اس میں پے پہ زبر ہے۔ انھیں غصہ آگیا کہ خبیث ہماری بات کاٹتا ہے۔ عزیز بولا کہ ابا میاں آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ سچ بولنے میں کبھی نہ چوکنا۔ کہنے لگے کہ فرمایا تھا سن سینتالیس سے پہلے۔ وہ زمانہ اور تھا غلامی کی باتیں آزادی کے زمانے میں حجت نہیں ہو سکتیں۔ عزیز [illegible] ابا میاں اسکول میں تو میری عمر گیارہ ہی سال [illegible] سن سینتالیس کو تیرہ سال ہو گئے۔ اب تو ابا میاں کو جلال آگیا۔ زور سے چانٹا رسید کیا اور کہنے لگے کہ کمبخت! باپ کے منھ آتا ہے۔ والدہ نے بیچ بچاؤ کیا اور ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے پوچھنے لگیں کہ پلنگ کی بجائے کیا کہا کریں۔ جو آپ کہیں گے وہی کہوں گی۔ اس پر فرمانے لگے کہ چارپائی کہا کرو۔ بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن پرسوں والدہ نے چارپائی کہا تو کہنے لگے کہ عزیز کی ماں۔ چارپائی اور چوپائے میں کوئی فرق نہیں کھاٹ کہا کرو۔ والدہ نے جل بھن کے اسے بھی مان لیا۔ مگر آج ان کے منھ سے کھاٹ نکلا تو کہنے لگے کہ کھاٹ کے لفظ سے کاٹھ کا اُلو یاد آتا ہے۔ کچھ اور کہا کرو۔ آپ خود سوچئے۔ اس پر والدہ کو غصہ نہ آتا تو کیا ہوتا خلافِ عادت ان کے منھ سے سخت الفاظ نکل گئے۔ شاید کوئی جملہ آپ نے بھی سنا ہو۔"

"جی ہاں سنا تو تھا" میں نے کہا "وہ آپ کے والد کو بشارت دے رہی تھیں کہ تمھارے دماغ میں بھس بھر گیا ہے۔"

"کیا کریں" وہ خجالت کے ساتھ بولے "مسلسل اس طرح کی باتیں سنتے سنتے وہ عاجز آگئی ہیں۔"

"مسلسل؟ ۔ یعنی اس سے قبل بھی۔۔۔؟"

"اے صاحب عرض تو کیا کئی مہینوں سے یہی دھندا چل رہا ہے۔ ایک دفعہ ممانی سعیدہ ہمارے یہاں آئی تھیں ان کے دو لڑکے ہیں۔ عبدالرحیم اور عبدالعزیز۔ ابا میاں ان دونوں سے ہمیشہ پیار کرتے رہے۔ بات بات میں کہا کرتے کہ رحیم ایسا پڑھنے کا شوقین ہے اور عزیز ایسا ذہین ہے وغیرہ۔ مگر اس دن ممانی جان نے کسی بات پر جو کہا کہ بیٹے رحیم ایسا مت کرو تو وہ اک دم بھڑک گئے کہ سعیدہ تم بھی کافر تمھارا میاں بھی کافر۔ ممانی بیچاری اس غیر متوقع فقرے پر دم بخود رہ گئیں۔ وہ خفگی کے انداز میں کہتے رہے۔ منھ کیا تکتی ہو رحیم اور عزیز خدا کے نام ہیں۔ کیا تم میاں بیوی اپنے بیٹوں کو خدا کے نام سے پکارتے ہو۔ اس پر ممانی نے ڈرتے ڈرتے کہدیا کہ آپ بھی تو اسی طرح پکارتے رہتے ہیں۔ جھلا کے فرمایا کہ ہاں میں بھی اتنا جاہل تھا اب توبہ کر کے مسلمان ہوا ہوں تم بھی خبردار

اکبرہ الصلوٰۃ کیا۔ جانی غریب تجیب ہو رہیں گر گئے
دن ابھی تک بڑا ابامیاں جی اور امول سعید میں خوب جنگ
بھی اب تک جھوٹ جھٹ ہے

"کمال ہے میں جو بڑا با۔"

"اچھا ایک دن گوشت پکے تھے۔ ابامیاں نے پوچھا کیا پکا ہے۔ والدہ نے کہدیا کوفتے۔ فرمانے لگے عزیزی ماں! کوفتے مت کہا کرو اس سے کوفت ہوتی ہے۔ والدہ نے پوچھا پھر کیا کہا کریں۔ کہنے لگے کرۃ اللحم کہا کرو۔"

"کرۃ اللحم" میں چونکا۔

"جی ہاں۔ والدہ بیچاری دنگ رہ گئیں۔ کہنے لگیں کہ مجھ سے تو عربی نہیں بولی جاتی۔ فرمایا کرۃ اللحم کا مطلب ہے گوشت کی گیند۔ چلو گوشت کے لڈو کہہ لیا کرو۔"

"ویری نانسس" میں اچھل پڑا "بخدا اکڈ آسیٹ ڈیا۔"

"مضحکہ نہ اڑائیے" تمیز میاں نے افسردگی سے کہا۔ "میں انھیں بہت سمجھاتا ہوں مگر۔۔۔"

"کیا مگر۔ میاں تم انھیں سمجھاؤ نبوت کا دعویٰ کریں۔ قادیان میں نبی ہو سکتا ہے تو دیوبند میں کیوں نہیں ہو سکتا۔"

"چھوڑیئے۔"

وہ چلے گئے۔ اب ظاہر ہے منشی جی سے فتووں میں مدد لینے کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ توکل بخدا اپنے ہی علم پر بھروسہ کرتا ہوں۔ چل مرے خامے بسم اللہ۔

عرض یہ ہے کہ آپ سے کہا کس مسخرے نے تھا کہ مولانا مودودی کی کتابیں گھانس دانے کی طرح بانٹتے پھریں۔ ابھی آپ منشی جی کی اہلیہ کی زبانی سُن ہی چکے ہیں کہ بعض دماغوں میں بھس بھرا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو مولانا مودودی کی کتابیں دینے سے بہتر یہ ہے کہ آپ کسی دھوبی سے ایک گدھا مانگ لیں اور صبح ہی صبح اسے دو توسے خمیرہ مروارید کھلایا کریں۔ خوب یاد رکھئے جتنے قسم کے انسان اللہ نے پیدا کئے ہیں اتنی ہی قسم کی کتابیں بھی انسانوں نے پیدا کی ہیں۔ اگر ہر قسم کا انسان مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ سکتا تو مثنوی زہر عشق اور کرامات الاولیاء وغیرہ کے مصنف تو خودکشی کر لیتے۔ بابا اور دوکو بھی

بخشیے دو۔ ابوالاعلیٰ کے معنی خدا کا باپ ہوں یا اونچا مصلا اس میں کیا بگڑتا ہے؟

اجتہاد کے دو رخ

سوال :-

اے جناب ملا جی! آپ کی بڑی عنایت ہو گی اگر ایک مسئلہ میں علمائے کرام کے فتوے حاصل کر کے بھیج دیں گے۔ ہوا یہ کہ میرے ایک دوست بے ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ جارج دے کر جان چھوٹی۔ مگر یہ کئی برس [illegible] اب ان صاحب پر نیکی کا دور آیا۔ پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اور گناہوں کے کفارے تو کتب سے معلوم ہیں مگر وہ جو بے ٹکٹ سفر کیا تھا اس کا شرعاً کیا کفارہ ہو یہ نہیں چل رہا ہے وہ بہت بے چین ہیں آپ علماء سے جواب باصواب حاصل کر کے ان کی مشکل حل کریں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب :-

ہم نے آپ کا سوال چھپوا کے متواتر بڑے علماء کے پاس ڈاک سے روانہ کیا تھا مگر سب لفافے بیرنگ ہو کر واپس آ گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ٹکٹوں کے لئے میرے پاس پیسے کچھ کم تھے۔ ہر لفافے پر ایک پیسے کا ٹکٹ کم لگانا پڑا۔ علماء صاحبان ایسے کفایت شعار نکلے کہ کسی ایک نے بھی تو نہیں چھڑایا۔

اب ظاہر ہے آپ مجھے تو علماء تسلیم کرنے سے رہے۔ تاہم بزرگوں نے کہا ہے:-

حلوہ اگر بہم نہ رسد گڑ غنیمت است

گڑ تو میٹھا ہو ہی جائے گا۔ نہ بھی ہو تو گالی اپنے متعلق کو دیجئے۔ بندہ تو جواب صادر کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوتا ہے۔

کچھ دن پہلے میرے کانگریسی دوست مولوی سید ابو علی کی رائے صاف طور پر یہ تھی کہ ریلیں چونکہ قومی ہیں اس لئے ان میں بے ٹکٹ سفر کرنا غداری کے مرادف ہے جس کی دنیاوی سزا کم سے کم پھانسی ہونی چاہئے اور آخرت کی سزا تو ابد [illegible]

کتنی خوفناک ہے۔ ایسا شخص جہنم کے چودھویں طبق میں ستر ہزار برس جلے گا اور جب ستر ہزار میں دو چار دن باقی رہجائینگے تو عذاب کے فرشتوں سے گنتی میں گڑبڑ ہو جائے گی اور بعد بحث بسیار کے یہی طے پائے گا کہ پھر سے گنتی ہو۔ اس طرح سات بار ستر ستر ہزار برسوں کی سزا ملے گی۔ وغیر ذلک۔

لیکن اب انھوں نے رائے بدلدی ہے۔ انکا خیال ہے کہ سابقہ اجتہاد میں ان سے چوک ہوئی یہ فعل اتنا سنگین نہیں ہے کہ چارج دینے کے بعد بھی آخرت کی سزا فرض رہے۔ دلیل وہ اس واقعہ سے پکڑتے ہیں جو ابھی کچھ روز ہوئے لوک سبھا میں نائب وزیر ریلوے نے بتایا ہے۔ نائب وزیر ریلوے نے بتایا کہ انڈین نیشنل ٹریڈ یونین کانگریس کے ممبر جو بمبئی سے دہلی کے لئے سفر کر رہے تھے ان میں سے ۶۷ (ایک کم ستر) ممبروں نے ٹکٹ کے بغیر ہی سفر کیا اور انھیں کھنڈوا اور اٹارسی کے درمیان پکڑا گیا اور ان سے کرایہ کے ساتھ جرمانہ بھی وصول کیا گیا!

اس واقعہ کو بنیادِ اجتہاد بناتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ جو عمل کا صدور ایک سو فیصدی نیشنل جماعت کے کثیر اراکین محترم سے ہوگیا وہ نہ تو دنیاوی قانون کے لحاظ سے غداری کہلا سکتا ہے نہ آخرت میں اس کی اہمیت متوقع ہو سکتی ہے غداری چہ معنی۔ ملک اپنا، ریلیں اپنی، جماعت اپنی، ٹکٹ چیکر اپنا۔ رہی آخرت۔ تو عذاب آخرت والا اجتہاد بھی اسی بنیاد پر تھا کہ حدیثوں میں غدار کی سزا بہت سخت آئی ہے۔ جب غداری ہی ثابت نہیں تو سزا کاہیں کی!

اب یہ دونوں اجتہاد مولوی بیدار علی صاحب کے آپ کے سامنے ہیں۔ پہلے کو درست مانئے تو آپ کے دوست کو چاہئے جلد ان کی زندگی سے مزے کر جائیں مرنے کے بعد تو دوزخ ہی دوزخ ہے۔

اور اگر دوسرے کو مانتے ہیں تو صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔ یعنی سال کے سال بے ٹکٹ سفر کیجئے۔ دو چار میں ایک بار پکڑے جائیں تو چارج ادا کر دیجئے۔ سال بھر کے مجموعی حساب میں انشاء اللہ کافی فائدہ رہیگا۔ وھو المراد

سے کا کھلا جواب؟

سوال ـــ از نظیر احمد مغربی بنگال۔

مولانا صاحب! ہمارے یہاں پانچ چھ آدمیوں نے مل کر ایک انجمن بنائی تھی جس نے مدرسہ بنانے کے لئے کئی ہزار چندہ کیا اور پھر ایک کرایہ کے مکان میں مدرسہ قائم کر دیا اس میں بہت سے مدرس ملازم رکھے گئے، مگر ایک دو سال گذرنے پر یہاں کی بدنظمی اور خراب تعلیمی حالت کا اتنا چرچا ہوا کہ لوگوں نے اپنے بچوں کو پڑھوانا چھوڑ دیا اور اب یہاں شاید دس بیس لڑکوں سے زیادہ داخل نہیں ہیں۔ مگر یہ انجمن والے اب بھی ادھر ادھر جا کر ہزاروں روپیہ چندہ کرتے ہیں اور مشہور ہے کہ سب آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ ان میں دو صاحب حافظ اور ایک خطیب ہیں۔ مختلف مساجد میں نماز پڑھاتے ہیں، کیا ان لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا ٹھیک ہے؟ اگر ٹھیک ہے تو کیا بلا کراہت یا کراہت کے ساتھ؟

جواب ـــ آپ ابھی تک دو سو سال پہلے کی دنیا میں رہ رہے ہیں، کہاں کی کراہت اور کہاں کا فتویٰ۔ صحیح طریقہ یہ تھا کہ آپ بھی اس انجمن کے رکن بن جاتے اور کسی مسجد کی امامت سنبھال لیتے۔ پھر یہ الجھن ہی نہ رہتی کہ کس کے پیچھے نماز ٹھیک ہے اور کس کے پیچھے نہیں۔ ہم نے تو خود اس قسم کی ایک ترکیب سوچی ہے۔ نوعیت ذرا مختلف ہے مگر بنیادی فرق کچھ نہیں۔ سنا ہو گا ـــ اور نہ سنا ہو تو اب سن لیجئے کہ نئی دہلی کے آزاد بھارت میں ایک مقام ہے تریونڈرم۔ وہاں آپ کی انجمن سے بھی زیادہ شاندار ایک تعلیمی ادارہ یعنی کہ آیور وید کالج قائم ہے۔ جس کا مختصر حال یہ ہے کہ اس کی عمارت نو لاکھ اٹھارہ ہزار روپے میں تیار ہوئی ہے۔ ہماری ترقی پسند سرکار اسے اپنی نگرانی میں پینے دو لاکھ سالانہ صرف کر کے چلا رہی ہے اور پینتیس ۳۵ پروفیسر اس کی مقدس فضا میں علوم و فنون کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ لیکن اس سال طلباء کتنے داخل ہوئے ہیں ـــ تین لاکھ ـــ نہیں تین ہزار ـــ نہیں تین سو ـــ نہیں تیرہ ...... مگر تیرہ بھی زیادہ ہیں۔ یہ سن کر

آپ کو معلوم ہوگا کہ ریاست میں تین علما نے داخلہ لیا ہے کہ معقب جن کے اکیڈمک اعدود گیے جن سے کچھ ہوتے ہیں۔ مگر باہر لڑکے کے لئے گیارہ پروفیسر اور وہ پھر بھی فالتو ہیں۔ افواہ ہے کہ صوبائی حکومت گیارہ آدمیوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا رہی ہے۔ جو سال بھر تک اس نکتہ پر ریسرچ کرے گی کہ دو فالتو پروفیسروں کو کس طرح گیارہ لڑکوں پر تقسیم کیا جائے کہ عدل و مساوات کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور ہاتھ پیر بھی سلامت رہیں ایک جہاندیدہ نیتا نے وزارت کو مشورہ دیا تھا کہ کمیٹی کے گیارہ آدمیوں کو سال بھر تک فی کس چار سو روپے مہینہ ادا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ایک پروفیسر اور رکھ دیا جائے تاکہ فی لڑکا بارہ پروفیسر کا حساب پورا ہو جائے اور دو معزز پروفیسر تقسیم کے اشتر سے صاف بچ جائیں۔ لیکن دوسرے فلک رسیدہ نیتا نے کہا کہ پروفیسری کے بجٹ میں اب دھیلہ بھی باقی نہیں ہے لہذا مزید پروفیسر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تیسرے سرد و گرم چشیدہ نیتا نے فرمایا کہ اس کے دو سالوں اور دو بھانجوں کو بھی تحقیقاتی کمیٹی میں شامل کرنا ضروری ہے تاکہ تعداد پندرہ ہو جائے۔ پندرہ کا عدد سنسکرتی ودیا کی رو سے بہت مبارک سمجھا گیا ہے۔ چوتھے کمر خمیدہ نیتا نے ارشاد کیا کہ سترہ کا ہندسہ پندرہ سے بھی زیادہ سماجک سپھلتا کا حامل ہے۔ لہذا بہتر ہے دونوں بھتیجوں کو بھی شامل کر کے ۱۷ کا عدد پورا کر لیا جائے۔

اب خیال ہے کہ ایک کمیٹی یہ طے کرنے کے لئے بنائی جائے کہ کونسا عدد زیادہ مبارک ہے تاکہ اتنے ہی ممبروں پر مشتمل کمیٹی بنا کر دو فاضل پروفیسروں کی تقسیم کا معاملہ طے کیا جائے۔

ان اخباروں کو پڑھ کر میں نے ازراہ کرم ایک عریضہ وزارت کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس میں عرض کیا تھا کہ اے برگزیدہ نیتاؤ! کیوں نہ تم دو لڑکے اور ڈھونڈ کر داخل کر دو کہ ایک ان میں کا [illegible] سستے بتیس کا پہاڑہ پورا ہو جائے۔ لیکن جن کا کرنی بزرگ کو یہ عریضہ سپرد ڈاک کیا تھا انھوں نے لفافہ کو پتہ بدل کرا دیا بلکہ کو ارسال کر دیا اور وہ نامہ کا خط نہ جانے کہاں پہنچا اگر پندرہویں روز خاکسار کی طلبی سیٹھ مکھن لال کے یہاں ہو گئی جنہوں نے خفا ہو کر کہا کہ ملا! معلوم ہوا ہے کہ تم فرقہ وارانہ سرگرمیوں میں مبتلا ہو۔

"کہاں سرکار۔ کہیں بھی تو موقع نہیں ملتا۔" میں نے حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ہائیں۔ یعنی کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"بڑا مندہ چل رہا ہے سرکار۔ سب فرقے آمد و خرچ کے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہیں"۔

"خیر خیر" وہ بیزاری سے بولے "تمہیں تو بے تکی باتیں کہنے کی ہمیشہ سے عادت ہے۔ میں نے یہ تنبیہ کرنے کیلئے تمہیں بلایا ہے کہ حکومت کے معاملات میں اگر ٹانگ نہ اڑایا کرو۔"

"میں تو صوفی ہوں سرکار۔ حکومت کے معاملات سے مجھے کیا سروکار"۔

"پھر آیوروید کالج کے سلسلہ میں خط کیوں لکھا؟"

"صوفیوں کا کام خدمت خلق ہوتا ہے سرکار"......

"کیا سرکار سرکار لگائی......"

"کچھ نہیں سرکار میرا مطلب تھا کہ پروفیسروں کی بانٹ کے سلسلہ میں جو الجھن پیدا ہو گئی ہے اس کو دور کرنے میں فدوی بھی سرکار کی مدد کرے۔"

"کیوں مدد کرے، تم اپنے کام سے کام رکھو"۔

"مجھے آیوروید کا شوق اٹھا ہے سرکار۔ داخلہ دلوا دیجئے"

"دلوا دیں گے پار سال کو۔ اس سال کمیٹی کی ریسرچ ہو لینے دو۔"

"میں کمیٹی کی بھی مدد کر دوں گا سرکار۔ اسے بتاؤں گا کہ پروفیسر کا اچار کس طرح پڑتا ہے۔"

انھوں نے قہرناک نظروں سے مجھے گھورا......

مگر لاحول ولا قوۃ۔ ان تفصیلات کا استفسار سے کیا تعلق۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جناب سائل صاحب تو مذکورہ کمیٹی میں حصہ لیں اور خادم آیوروید کالج میں داخلہ لینے کی سعی کرے گا داخلہ نہ ملا تو کمیٹی کی رکنیت میں کوشاں ہو گا۔

رہی نماز کی بات تو جواب یہ ہے کہ نماز تو ہر حالت میں ہو جاتی ہے حتی کہ بلا وضو بھی ہو جاتی ہے۔ جسے یقین نہ آئے فدوی سے مل کر دیکھ لے۔ فدوی بغیر وضو پڑھ کر دکھلائے گا اور وہ ہو جائے گی۔ نہ ہو تو گردن مار دیجئے گا

کمیٹیاں بناؤ!

سوال :-

اے ملا صاحب! ایک خبر شائع ہوئی ہے

"حکومت یو۔ پی نے گیارہ ضلعوں میں شراب بندی قانون کی کامیابی کا جائزہ لینے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کی رپورٹ یہ ہے کہ یو۔ پی میں شراب نوشی کا رجحان بڑھ رہا ہے شراب بندی کے علاقوں میں ٹنکچر جنجر تیار ہوتا تھا۔ اب اس میں تین سو فیصدی کا اضافہ ہو گیا ہے کہ یو۔ پی کے مزید علاقوں میں شراب پہ پابندی نہ لگائی جائے"۔

جواب :-

ایک کمیٹی اور بنانی چاہئے جو یہ جائزہ لے کہ مذکورہ کمیٹی کا پیش کردہ جائزہ کس حد تک صحت پر مبنی ہے پھر ایک کمیٹی اور اس کمیٹی کے جائزے کی جانچ پرکھ کے لئے ترتیب دینی چاہئے۔ اسی طرح اوپر تلے کئی درجن کمیٹیاں بنانی چاہئیں اور پھر ایک جنرل کمیٹی یہ تحقیق کرنے کے لئے ترتیب دینی چاہئے کہ ان تمام کمیٹیوں کے لائق ممبروں نے کون سی شراب کتنی کتنی پی۔ کن کن اوقات میں پی۔ کن کن ظروف میں پی۔

آپ کہیں گے ملا پاگل ہو گیا ہے۔ سوال کیا تھا جواب کیا دے رہا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ ملا پاگل سہی مگر ان لوگوں سے زیادہ نہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ قانون کی توپوں سے ہر قلعہ سر کیا جا سکتا ہے۔ شراب بندی کے قانون کا نتیجہ امریکہ میں بھی بھارت سے کچھ مختلف نہیں نکلا۔ میں سمجھتا ہوں یہ شراب بندی قسم کی باتیں محض مصنوعی تکلفات ہیں جنھیں خواہ مخواہ بہت اہمیت دے دی گئی۔ گیا جاتا ہے۔ ورنہ یہ دور آرٹ اور کلچر کا دور ہے ثقافت اور فنون لطیفہ کا دور ہے۔ شراب بند ہو گئی تو سمجھئے سارے فنون لطیفہ ختم ہوئے۔ بڑے آرٹسٹ کی پہچان اور عظمت ہی نے یہ لکھی ہے کہ شراب نہ ملے تو پھر دل بجھے۔ کچھ ہے بغیر نشے کے آرٹ ادھورا رہتا ہے۔ شراب کے ساتھ اگر چشم میگوں کی مستی بھی شامل ہو جائے تو آرٹ کی بلندی ساتویں آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ پیسہ، شراب اور عورت۔ یہی ہے ہمارے عہد زریں کا وہ مثلث جسے تمام فنون لطیفہ کا نچوڑ کہنا چاہئے۔ ملا زندہ صحبت باقی!

باب الصحت

موسم سرما کا نہایت طاقتور ناشتہ

از حکیم محمد عظیم زبیری۔ امروہہ ضلع مراد آباد

موسم سرما شروع ہو چکا ہے، یہ موسم بگڑی تندرستی کو بنانے اور جنسی امراض کے علاج کیلئے نہایت موزوں ہے، یہ کاروباری اکساؤ نہیں ہے بلکہ زندہ حقیقت ہے کہ جو لوگ جاڑوں کے موسم میں طاقتور ناشتوں، مقوی دواؤں اور غذاؤں کے ذریعہ اپنے بدن میں خون اور قوت پیدا کر لیتے ہیں وہ سال بھر تک زندگی کا صحیح لطف حاصل کرتے ہیں اور بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ جو لوگ پیسہ کا لالچ کرتے ہیں اور جاڑوں میں نہ کوئی صحت بخش دوا کھاتے ہیں اور نہ مقوی غذائیں ہی استعمال کرتے ہیں ان کا جسم جلد کمزور پڑ جاتا ہے اور جوانی کی عمر میں ہی بڑھاپے کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

مردوں کے لئے توس، مکھن اور مقوی پھلوں اور میووں کے علاوہ طاقتور ناشتہ یہ ہے کہ ایک یا دو انڈوں کی زردی لیکر اچھی طرح پھینٹ لیں اور پھر اس میں ایک بڑا چمچہ خالص شہد ملاکر دل کھالیں بعد کو نیم گرم دودھ یا زیادہ دودھ کی چاء پی لیں، دودھ کو شہد اور انڈے کے مرکب میں بھی ملا سکتے ہیں۔ کمزور ہاضمہ والے اور بوڑھے لوگ نیم برشت انڈے کی زردی نمک اور سیاہ مرچ چھڑک کر کھائیں بعد کو چاء پی لیں۔ جو لوگ انڈا نہیں کھا سکتے یا جنکو قبض کی دائمی شکایت رہتی ہے وہ ایک چھٹانک عمدہ قسم کی کھجوریں لیکر گٹھلیاں دور کرنے کے بعد پاؤ بھر دودھ میں پکائیں۔ گاڑھا ہو جانے پر استعمال کریں، یہ رات کو سوتے وقت بھی کھا سکتے ہیں۔ مقوی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ قبض کشا بھی ہے۔

غریب لوگوں کے لئے مقوی کم خرچ ناشتہ یہ ہے کہ باجرہ کی روٹی کا ملیدہ گڑ کے ساتھ کرکے دودھ اور گھی ملاکر کھائیں۔ جو لوگ ایسا ناشتہ کرنا چاہیں جو مقوی گردہ، مقوی مثانہ اور مقوی اعصاب بھی ہو اور خوش ذائقہ بھی۔ کمر کو مضبوط بنانے اور بڑھاپے میں بدن میں چستی اور توانائی پیدا کرنے والا بھی ہو تو وہ ہمارے یہاں سے "لبوب جدایدہ" منگا کر استعمال کریں۔ یہ موسم سرما کا نہایت طاقتور ناشتہ ہے۔ قوت بخش میووں اور مقوی مفردات کا خوش ذائقہ مرکب ہے۔ ۱۲ تولہ کا پیکنگ پانچ روپے۔ مع محصول ساڑھے چھ روپے۔

صحت کسی بھی سبب سے خراب ہو گئی ہو اگر آپ اسے سنوارنا چاہتے ہیں۔ یا جوانی اور صحت کو برقرار رکھنے کے خواہشمند ہیں تو "محافظ شباب" مفت منگا کر پڑھئے۔ یہ بازاری لغو لٹریچر نہیں ہے اسمیں حسن، جوانی اور صحت کو برقرار رکھنے۔ نیز بگڑی تندرستی کو سنوارنے کے سنہری اصول لکھے ہیں۔

اوپر لکھا پتہ کافی ہے۔ مشورہ کے لئے جوابی خط لکھئے یا ٹکٹ لفافہ میں رکھئے۔ فقط۔

"چراغ راہ" کا سالنامہ ۶۶ء

"چراغ راہ" اپنے نمبروں کے لئے اتنی شہرت حاصل کر چکا ہے کہ اب اس کے کسی نمبر کے تفصیلی تعارف کی احتیاج نہیں۔ نثر و نظم کے بہترین جواہر پارے جمع کرنا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس سالنامے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک درجن مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں۔

مکتبہ تجلی باوجود دشواریوں کے چراغ راہ کے نمبران کی افادیت ہی کی وجہ سے مہیا کرتا ہے۔

شائقین حاصل کرنے میں عجلت فرمائیں

قیمت ڈیڑھ روپیہ

چراغ راہ کا اسلامی قانون نمبر

بہترین مقالات نفیس مضامین اور تحقیقی و تاریخی مباحث کا وہ گنجینہ جو آپ اپنا جواب ہے۔ اشتہار میں اسکی رفعت و افادیت کا بیان ممکن ہی نہیں۔ چند لکھنے والوں کے نام ذیل میں دیئے جاتے ہیں جن سے آپ کچھ اندازہ فرماسکیں گے۔ صرف ہند و پاک ہی کے نہیں دیگر ممالک کے متعدد ماہرین علماء نے بھی اسے اپنے فکر پاروں سے آراستہ کیا ہے بعض سلف کے بھی بہترین جواہر پارے شامل کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صبحی محمصانی	الاستاذ محمد ابو زہرہ
ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہید	مولانا مجیب اللہ ندوی
ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا	ابن خلدونؒ
ڈاکٹر محمد حمید اللہ	مفتی عمیم الاحسان
مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	شاہ ولی اللہؒ
مولانا ابوالحسن علی ندوی	ڈاکٹر جارج وائٹ کراس اسپٹین
مولانا عبدالماجد دریابادی	سر الفریڈ ڈیننگ
مولانا امین احسن اصلاحی	ڈیوڈ ڈی۔ سانتی للان
مولانا عبدالغفار حسن	پروفیسر سی اے البنو

ڈاکٹر اقبال کی تحریر کا عکس بھی ہے۔ نقشے اور چارٹ بھی منسلک ہیں۔ تجلی سائز کے ۴۳۲ صفحات پر مشتمل دو ضخیم جلد دیکھنے کا یہ نمبر یقیناً معرکۃ الآراء کہلانے کا مستحق ہے اسی لئے اسے پاکستان سے فراہم کرنے میں وقت اٹھانی گئی ہے۔ مکمل کی قیمت صرف آٹھ روپے رجسٹری سے طلب فرمانے والے ڈاک خرچ ملا کر دس روپے ارسال فرمائیں)

"تجلی کا" خلافت نمبر

اس نمبر نے جتنی مقبولیت حاصل کی وہ لائق صد ہزار شکر ہے۔ پرانے قارئین تو اسے ملاحظہ فرما چکے ہیں، لیکن نئے حضرات تجربہ و مطالعہ ہیں۔ انھیں اپنی ذخیرہ میں حاصل کر لینا چاہئے۔ یہ اپنے جملہ مضامین خصوصاً مدیر تجلی کے مبسوط مضمون "عثمان غنیؓ" کی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ نہ صرف پڑھا جائے بلکہ محفوظ رکھا جائے

قیمت ایک روپیہ

"تجلی کا" خاص نمبر ۵۷ء

جماعت اسلامی کے متعلق تفصیلی بحثیں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعض فرمودات پر سیر حاصل نقد، نذر و نیاز، عرس "فاتحہ" اور سماع موتیٰ وغیرہ کا مبصرانہ جائزہ۔ قارئین کو اس شہرہ آفاق نمبر میں شروع سے آخر تک دلچسپ و مفید مباحث ملیں گے

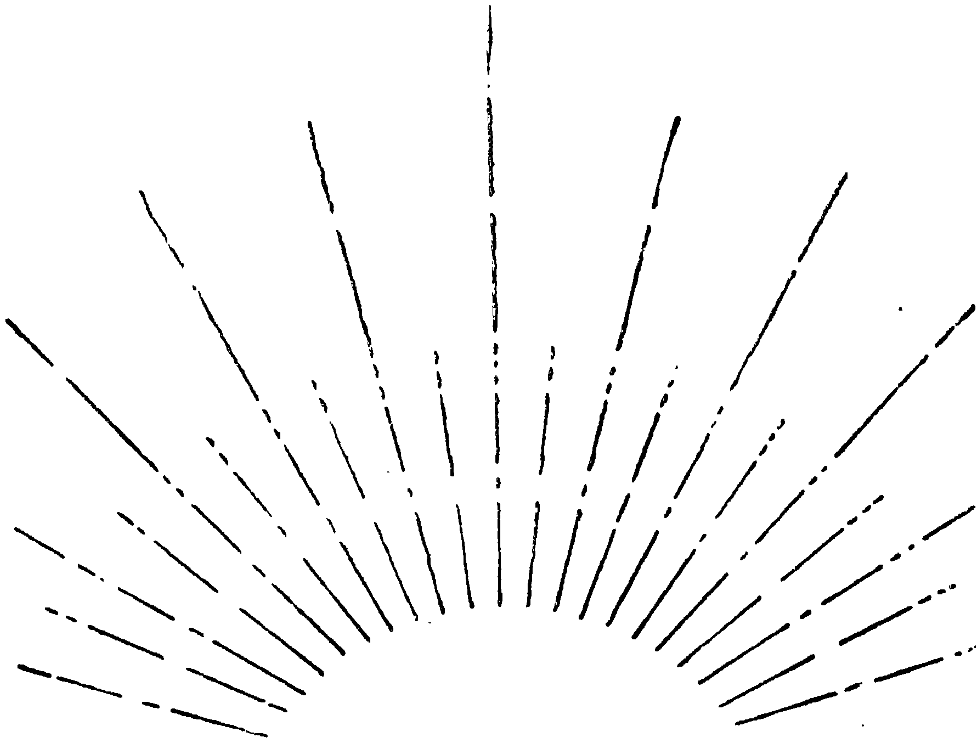
قیمت ڈیڑھ روپیہ

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

11 (11)



ماہنامہ تجلّی دیوبند



ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

8 As.

عُمدہ کتابیں

مسلم شریف مع ترجمہ و شرح مژدہ ہو کہ احادیث صحیحہ کی مشہور کتاب مسلم شریف کا اُردو ترجمہ اور ساتھ ہی امام نووی کی شہرہ آفاق شرح کا بھی ترجمہ آگیا ہے۔ عربی متن بھی ساتھ ہے۔ چھ جلدوں میں مکمل۔ مجلد کا ہدیہ اڑتالیس ۴۸ روپے۔
کوئی جلد الگ نہ مل سکے گی۔

امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی نام ہی کہہ رہا ہے کہ کتاب لائق مطالعہ ہے۔ ذہانت و ذکاوت کے مجسمے حضرت امام اعظمؒ کی سیاسی زندگی کے حالات مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے گوہر ریز قلم سے پانچسو سے زائد صفحات۔ قیمت مجلّد بارہ روپے۔

عظیم تاریخ اسلام از اکبر شاہ نجیب آبادی۔ تین ضخیم جلدوں میں مکمل یہ مشہور زمانہ تاریخ تعارف کی محتاج نہیں۔ پاکستان میں عمدہ کاغذ اور روشن طباعت و کتابت کے ساتھ چھپی ہے۔
قیمت فی سیٹ مکمل و مجلد چھتیس ۳۶ روپے۔

امام ابن تیمیہؒ افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن عمری کی معرکۃ الآراء کتاب۔ امام العارفین شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے علم و فضل، عزیمت و ہمت اور مجددانہ کارناموں کا سیر حاصل تذکرہ جس پر تاریخ ستائیس سو کے مجلس میں تبصرہ ہوا ہے۔ قیمت مجلد دس روپے۔ مجلد اعلیٰ گیارہ روپے۔

تذکرہ مجدد الف ثانی امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ سے متعلق بہترین محققانہ اور سیر حاصل مقالات کا بیش بہا مجموعہ۔ اس کتاب کا نہ پڑھنا اپنی زرّیں تاریخ کے ایک اہم باب سے ناواقف رہنا ہے، جو بہت بڑی محرومی ہے۔
قیمت مجلد چار روپے

کتاب زندگی امام بخاری کی الادب المفرد کا اُردو ترجمہ۔ بہترین اخلاقی تعلیمات پر مشتمل احادیث کا مفید ترین مجموعہ، جس کے جامع امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

سنن دارمی شریف حدیث کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ جو ۳۴۵۶ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ ہدیہ مجلد آٹھ روپے۔

مسند امام اعظمؒ (مع ترجمہ و فوائد) امام ابوحنیفہؒ کا مرتب فرمودہ احادیث کا مجموعہ جس میں مولانا عبد الرشید نعمانی کا بہترین معلومات افزا مقدمہ بھی ہے۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

صحابیات ان برگزیدہ خواتین کے حالات جنھوں نے اللہ کے آخری رسولؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

سفینۃ الاولیاء دارا شکوہ کی تالیف جس میں رسول اللہؐ، صحابہؓ، ائمہؒ، اولیاءؒ، ازواج النبیؐ اور اسلام کی مشہور نیک خواتین کے حالات ہیں۔ پونے سات روپے

التکشف مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اس کتاب کا پورا نام التکشف عن مہمات التصوف ہے۔ تصوف اور اس کی جزئیات پر بڑی مبسوط کتاب ہے، مشکل مسائل اور دقیق نکات کی توضیح و تسہیل، علوم و معارف کا گنجینہ، تازہ بہترین ایڈیشن۔ مجلد دس روپے بارہ آنے۔

آئینہ حقیقت نما مؤرخ اسلام مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی معرکۃ الآراء تالیف، ہندو اور مغربی مؤرخین مسلم فاتحین پر جو متعصبانہ الزامات لگاتے رہے ہیں ان کے محققانہ، مدلل اور دنداں شکن جوابات عجیب کتاب ہے۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔

امامت عظمیٰ:۔ دو روپے دس آنے ● ہمارا شہنشاہی:۔ دو روپے دس آنے ● تاریخ قرآن:۔ دو روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت چھ روپے۔ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۵ شلنگ
بشکل پوسٹل آرڈر



فہرست مضامین مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۱ء

اشد ضروری

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپکی خریداری ختم ہے یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں

اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں، خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ وی پی چھ روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا، منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام و مکمل پتہ ہمیں بھیجیں سالہ جاری ہو جاتے گا۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)



پاکستان کا پتہ:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸ مینا بازار
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "کوہ نور" پریس دہلی سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

عٓہ

انسانی عزائم کی ضعیف البنیانی کا کیا ٹھکانا۔ ہم نے اعلان کیا تھا کہ ڈاک نمبر کے بعد تبصرہ نمبر نکالیں گے، لیکن نمبر کی بجائے یہ معمولی شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے یہ تو اللہ جلّ شانہٗ وعمّ نوالہٗ کا فضل و احسان ہے کہ تجلّی کے معمولی شماروں کو بھی اس کے محبین غیر معمولی ہی وقعت دیتے ہیں اور اس کا اپنے متعینہ وقت سے کچھ مؤخر ہو جانا ان کے اندر اکتاہٹ اور بیزاری کے عوض طلب و اشتیاق کے اضافہ کا موجب ہوتا ہے، لیکن اس سے ہماری بیچارگی و نارسائی کا عذر مہیا نہیں ہوتا۔ والد رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد سے ان کے بعض متوسلین برابر عاجز کو خطوط لکھ رہے تھے کہ چند روز کے لئے آجاؤ تاکہ تمھاری زبان سے کچھ سن لیں۔ عاجز اپنی مصروفیتوں کے باوجود ان کی پُر اخلاص دعوت کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا اور جواب دے رہا تھا کہ وقت نکال کر حاضری کی کوشش کرے گا۔ آخر کار کئی ماہ بعد پچھلے مہینے اس وعدے کا ایفا کیا گیا اور ۶ ردسمبر کو اس ارادے سے عازم سفر ہوا کہ پانچ چھ یوم میں واپسی ہو جائے گی، لیکن مشہور بات ہے کہ جانا اپنے اختیار میں ہے لیکن لوٹنا میزبان کے۔ باوجود کوشش کے ۱۶ دن سے پہلے واپسی نہ ہو سکی۔ یعنی ۲۲ ردسمبر کو دیوبند آنا ہوا۔ اب اسکے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ جلدی سے جلدی رسالہ مکمل کر کے پریس بھیجدیا جائے۔ عام طور پر خاکسار سفر میں بھی کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے لیکن اس بار اس طرح کی مشغولیتیں رہیں کہ قرطاس و قلم کا پڑوس تک نصیب نہ ہو سکا۔ اب پرچہ جیسا کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ چند روز لیٹ ہوا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پہلے بھی آپ اسطرح کی تاخیروں کو معاف کرتے رہے ہیں اب کی بھی ضرور معاف کریں گے۔ اپنے ارادوں کی کمزوری کے پیشِ نظر آئندہ کے لئے ہم فی الوقت کسی بھی پروگرام کا اعلان نہیں کرتے۔ بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اوقات پر کنٹرول کی سعی کریں گے اور جس وقت بھی جو نمبر بن آئے گا نکال دیں گے۔

خیال تھا کہ ڈاک نمبر نکال کر ہم جمع شدہ استفسارات کے معتد بہ حصّے سے عہدہ برآ ہو جائیں گے۔ لیکن ثابت ہوا یہ خیالِ خام تھا۔ انبار تقریباً جوں کا توں ہے اور بار بار معذرتیں کرنے کے بعد اب معذرت کرتے بھی حجاب آنے لگا ہے۔ ممکن ہو سکا تو جلد ہی پھر ایک ڈاک نمبر نکال ڈالینگے مگر یہ وعدہ نہیں ہے محض سرسری ارادہ ہے۔ تبصرے کی کتابیں الگ ایک مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ ضمیر کہتا ہے کہ مکمل مطالعہ کے بعد ہی تبصرہ کرنا چاہئے اور تبصرہ بھی سیر حاصل ہو نہ کہ مجمل اور طائرانہ۔ مگر تبصرہ طلب کتب و رسائل کا ڈھیر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ورق اُلٹو اور رسمی سا تبصرہ اُڑا دو۔ تبصرہ خواہ دوستوں کے خطوط بھی اسی کے متقاضی ہیں کہ جلدی کی جائے۔ اب کوئی ہمیں بتلائے کہ کیا کریں۔ کتابیں پڑھنے کا کافی وقت ملتا تو کچھ کہنا سننا نہیں تھا۔ نہیں ملتا اس لئے اسیرِ کشمکش ہیں۔ ناظرین پسند کریں تو ہم بھی اکثر اور جریدوں کی طرح کتابیں اُلٹ پلٹ کر چلتا سا تبصرہ کر دیا کریں۔ اس بارے میں قارئین کی رائے عالیہ کا انتظار کیا جائے گا۔

اگلا پروگرام

ابھی ان لفظوں کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ رامپور سے بہن کی شدید علالت کا تار ملا اور عاجز کو تمام کام یونہی چھوڑ کر روانہ ہو جانا پڑا۔ اس طرح مزید پانچ چھ یوم کی تاخیر تجلی کے نامۂ اعمال میں فزوں ہو گئی۔ اب توقع نہیں کہ ۱۶-۱۷ جنوری سے پہلے یہ شمارہ آپ تک پہنچ سکے۔

جب یہی شمارہ آپ تک اتنی دیر میں پہنچے گا تو اس سے اگلے شمارے کا بروقت پہنچنا عملاً ممکن نہیں ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تاخیر و تعویق کا یہ سلسلہ مہینوں تک چلتا رہے اس لئے بگڑے ہوئے نظم کو سنبھالنے کی واحد صورت یہی ہے کہ اگلا پرچہ ملتوی کر کے مارچ میں دو ماہی پرچہ نکالا جائے۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ یک ماہی ناغہ تجلی کے پُرشوق ناظرین پر نہایت گراں گذرتا ہے۔ لیکن مشیت کے آگے ہم اور وہ اُس تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جو متلاطم موجوں کے رحم و کرم پر بہا چلا جا رہا ہو۔ کس کا شکوہ اور کیسی فریاد۔ ہر ماہ کی تاخیر سے تو بہتر یہی ہے کہ ایک ماہ صبر کر لیا جائے۔

قارئین نوٹ فرمالیں کہ **فروری ۱۹۶۱ء کا تجلی شائع نہیں ہوگا**، بلکہ فروری و مارچ کا مشترکہ شمارہ انشاء اللہ یکم مارچ ۱۹۶۱ء کو پیش کیا جائے گا۔ ہمیشہ کی طرح ہماری ابکی بھی یہی کوشش ہوگی کہ مشترکہ شمارے کے ذریعہ اس یک ماہی خلاء کی تلافی کر دی جائے۔

وما التوفیق الا باللہ۔

خِلافَت وصَحابیت

ڈاکٹر زبید احمد (پی۔ ایچ۔ ڈی)

۱۔ لفظ خلیفہ سے متعلق لغوی بحث

خلفاء جمع ہے، خلیفہ کی، اس لفظ کی دو جمعیں آتی ہیں ایک تو یہی لفظ خلفاء، اور دوسری جمع خلائف ہے۔ قرآن پاک میں دونوں جمعوں کا ایک ہی مفہوم استعمال ہوا ہے۔ فارسی اور اردو میں صرف خلفاء مستعمل ہے۔ غالباً عربی میں بھی اب خلائف استعمال نہیں ہوتا۔ لفظ خلیفہ، مشتق ہے خَلَفَ یَخْلُفُ (باب نصر ینصر) سے اس کے دو معنی ہیں ایک تو کسی کے پیچھے آنا۔ جانشین، قائم مقام ہونا۔ مثلاً خلف الصدیق رسول اللہ یعنی حضرت صدیق رسول مقبول کے پیچھے آئے یعنی اُن کے قائمقام یا نائب ہوئے۔ دوسرے معنی یہ کہ کسی کو اپنا جانشین یعنے خلیفہ بنایا۔ مثلاً خلف رسول اللہ ابا بکر لہ یعنی رسول مقبول ﷺ نے ابوبکر رضؓ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ پہلے معنی کی مثال قرآن سے حضرت موسٰی علیہ السلام کا یہ قول ہے واخلفنی فی القوم (یعنی اے ہارون قوم میں میرا خلیفہ ہو جا) دوسرے معنی کی مثال، بمنزلہ ہارون، والی حدیث میں حضرت علیؓ کے یہ الفاظ ہیں۔ اتخلفنی فی النساء والصبیان ؟ (کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں اپنا خلیفہ بناتے ہیں) انہی دو مختلف معنوں کے لحاظ سے علماء لغت میں لفظ خلیفہ کے صیغے کی بابت اختلاف ہے بعض کے نزدیک یہ اسم مفعول ہے بروزن فعیل بمعنے مخلوف یا بمعنے مستخلف (بفتح لام) جیسے ذبیح بمعنے مذبوح یا قتیل بمعنے مقتول ہے۔ امام شوکانی نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ "یجوزان یکون بمعنے مخلوف" (یعنے جائز ہے کہ یہ لفظ خلیفہ بمعنے مخلوف ہو) لفظ مخلوف سے ظاہر ہے کہ خلف یخلف کے معنی ہیں خلیفہ بنانے کے۔ المصباح المنیر مصنفہ ابن علی المقری میں ہے "ویجوزان یکون بمعنی فاعل لانہ خلف من قبلہ ویجوزان یکون مفعولاً لان اللہ تعالیٰ جعلہ خلیفۃ" (یعنی لفظ خلیفہ اسم فاعل کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے پیش رو کے پیچھے آنے والا ہے اور اسم مفعول بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے خلیفہ بنایا) منہاج السنۃ میں ابن تیمیہ نے بعض کا یہ قول بیان کیا ہے کہ "الخلیفۃ ھو المستخلف کما یقال خلیفۃ الرسول قد استخلفہ الرسول" (یعنی خلیفہ بمعنے مستخلف بفتح لام ہے۔ خلیفۃ الرسول وہ ہے جسے رسول مقبول ﷺ نے خلیفہ بنایا ہو) اور بعض کے نزدیک اسم فاعل ہے بمعنے خالف کے جیسے علیم ہے بمعنے عالم کے۔ حرف "ہا" بہر صورت یا تو مبالغہ کے لئے ہے یا اسمیت کے لئے۔ ہمارے نزدیک اسے اسم مفعول کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ خلیفہ بنانے والا خلیفہ کو نامزد کرتا ہے اگر خلیفہ کو بمعنے خالف (پیچھے آنے والا) لیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ خود پیش رو کا خلیفہ ہو گیا۔ قرآن پاک میں دو جگہ لفظ خلیفہ استعمال ہوا ہے وہاں فعل جعل، (بنانا) سے کام لیا گیا ہے۔ ایک تو حضرت آدم کے قصے میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ (ہم زمین میں ایک خلیفہ بنانے

لہ یہ مثال توضیح مطلب کے لئے راقم الحروف نے اپنی طرف سے دی ہے۔ ورنہ منجد میں یہ مثال ہے خلفہ ربہ فی قومہ ای جعلہ خلیفۃ علیہم ..... لہ بعض اسے باب تفعیل سے جانتے ہیں۔

بنانے والے ہیں) دوسری جگہ حضرت داؤد علیہ السلام کو ارشاد ہوتا ہے کہ انا جعلناک خلیفۃ (ہم نے تجھ کو زمین پر خلیفہ بنایا) لفظ خلیفہ کے ان دونوں موقعہ استعمال سے ظاہر ہے کہ خلیفہ بنایا ہی جاتا ہے کوئی شخص خود بخود خلیفہ نہیں ہوتا۔ خلیفہ بنانے کے مفہوم کو استخلاف سے بھی ادا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کی ایک ہی آیت میں اس کے دو صیغے مستعمل ہوئے ہیں۔ اور وہ آیت یہ ہے وعد اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم......... واللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کئے وعدہ کیا ہے کہ اُن کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح کہ پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا) یہاں خدا فاعل یعنی خلیفہ بنانے والا ہے اور 'ھم' اور 'الذین' مفعول یعنی خلیفہ ہیں۔ ان مثالوں سے لفظ خلیفہ کا اسم مفعول ہونا ظاہر ہے اور جس طرح مقتول کے لئے قاتل یا حاکم کے لئے محکوم ہونا ضروری ہے اسی طرح خلیفہ کے لئے خالف (یعنی خلیفہ بنانے والا) ہونا چاہیئے۔ پیری مریدی میں بھی پیر اپنا خلیفہ مقرر کرتا ہے۔ کوئی مرید خود بخود پیر کا خلیفہ نہیں ہو جاتا (اور یہ بھی ہوتا ہے کہ پیر یا شیخ کی وفات کے بعد خود مُرید اپنے پیر بھائیوں میں سے کسی اہل شخصیت کو "خلیفہ" یعنی پیر کا جانشین چُن لیتے ہیں)۔
اس بحث سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خلفاء راشدین خود بخود خلیفہ نہیں بن گئے۔ بلکہ اشارۃً وتلویحاً ان کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے خلیفہ بنایا ہے یا کم از کم یوں کہا جائے کہ خلیفۃ الرسول یعنی حضرت صدیق رضؓ کو رسول مقبولؐ نے حضرت فاروق رضؓ کو حضرت صدیق رضؓ نے اور حضرت ذوالنورین و حضرت مرتضیٰ[1] کو حضرت فاروق رضؓ کی مقرر کردہ کمیٹی نے خلیفہ نامزد کیا تھا اور نامزدگی کے بعد امت نے نبوی ارشادات وتلویحات کی روشنی میں ان کی خلافت پر اجماع کر لیا تھا۔ راشدین رشد یا رشاد سے متعلق ہے یہ دونوں لفظ قرآن میں آئے ہیں اور اسم فاعل بصیغۂ جمع راشدون بھی۔ جس کے معنی ہدایت یافتہ اور برحق کے ہیں۔ چونکہ ایک حدیث میں خلفائے رسولؐ کی صفت راشدین آئی ہے نیز معاندین کے خلفاء ثلاثہ کو غاصب کہنے کی وجہ سے ان کو لفظ راشدین کے ساتھ موصوف کرنے کا التزام کیا گیا۔ انگریزی میں راشدین کے لئے عموماً آرتھوڈکس استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے اصلی معنی تو ہیں راسخ العقائد یا برحق کے اس کے مقابلے کا لفظ ہے ہیٹروڈاکس یعنی ملحد لیکن استعمالاً اس لفظ کے ساتھ ذم کا پہلو یعنے کٹر پنے کا مفہوم شامل ہو گیا ہے اس لئے اس ذم کے پہلو سے بچنے کے لئے پروفیسر سرطامس آرنلڈ آنجہانی نے "رائٹ لی ڈائریکٹیڈ" کی اصطلاح جاری کی جو راشدین کا صحیح ترجمہ ہے۔ اب محتاط مسلمان مصنفین یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

حضرت صدیق کو خلیفۃ الرسول کہا جاتا تھا جب ان کے بعد حضرت فاروق رضؓ خلیفہ ہوئے تو شروع شروع میں تو وہ خلیفہ... خلیفۂ الرسول کہے جانے لگے۔ مگر ایک تو یہ لقب خاصہ طویل تھا اور دوسرے ایک قاصد نے باہر سے آکر حضرت عمرؓ کی بابت دریافت کیا کہ امیر المؤمنین کہاں ہیں تو یہ ترکیب سب کو اس قدر پسند آئی کہ اس وقت سے امیر المؤمنین کا رواج ہو گیا۔ تحریر و تقریر میں تو یہی دو لفظ استعمال ہوتے تھے۔ البتہ مؤرخین نے خلفاء راشدین کے لئے بالترتیب خلیفۂ اول، دوم، سوم، و چہارم ہی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

۲۔ خلافت

یہ رسالت ونبوت کی نیابت و قائم مقامی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں نبی کریمؐ کے بعد سب سے بڑا منصب خلیفہ ہی کا ہے۔ رسول مقبولؐ کی دو حیثیتیں تھیں ایک تو تشریعی اور دوسری تنفیذی۔ آپ بحکم وحی متلو و وحی غیر متلو صاحب شریعت تھے۔ یہ آپ کی تشریعی حیثیت تھی۔ آپ اپنی امت کو شریعت کا پابند رکھ کر ان کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے متکفل و کفیل تھے۔ یہ آپ کی تنفیذی شان تھی۔ خلفاء راشدین تنفیذی حیثیت سے تو جناب رسالت مآبؐ کے ہر طرح نائب مناب اور قائم مقام تھے۔ لیکن جہاں تک آپ کی تشریعی حیثیت کا تعلق ہے وہ اسی حد تک آپ کے خلیفہ تھے کہ وہ قرآن کے علاوہ سنت کے بھی پابند تھے اور جہاں قرآن وسنت خاموش تھے وہاں ان کو اپنی رائے سے یا مشورہ سے اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا۔ ایسی صورت میں خلفاء کا فیصلہ ماننا ضروری ہے۔ فرائض خلافت کا دائرہ بہت وسیع ہے مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقامت دین خلیفہ کا خاص

[1] حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ ارشاد قلم کا سہو ہے جیسا کہ ہر تاریخ داں پر واضح ہے (تجلی)

فرض ہے۔

۳۔ **امامت** خلیفہ وامام یا خلافت وامامت فنی اصطلاح کی حیثیت سے دونوں ایک ہیں۔ مورخین زیادہ تر لفظ خلیفہ وخلافت استعمال کرتے ہیں چنانچہ ابن خلدون کہتا ہے کہ الخلافۃ نیابۃ فی حفظ الدین وسیاسۃ الدنیا (خلافت حفظ دین وسیاست دنیا میں نبوت کی نیابت ہے) اور ابوالحسن ماوردی اسی مضمون کو یوں ادا کرتا ہے الامامۃ موضوعۃ فی حراسۃ الدنیا وسیاسۃ الدنیا (امامت حفاظت دین اور سیاست دنیا کے لئے بنائی گئی ہے) شرح مواقف میں ہے کہ "الامامۃ ریاسۃ عامۃ فی امر الدنیا والاخرۃ" سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع میں حضرت ابوبکرؓ نے یہ حدیث بیان کی تھی کہ الائمۃ من قریش۔ یہاں ائمہ سے مراد خلفاء ہی ہیں۔ لیکن خلفائے راشدین کو استعمالاً خلفاء کہا جاتا ہے۔ ائمہ نہیں کہا جاتا۔ شیعہ حضرات حضرت علی کو تو خلیفہ بلافصل کہتے ہیں مگر بقیہ ائمہ کے لئے لفظ خلیفہ استعمال نہیں کرتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خلیفہ کے لئے سیاسی تسلط واقتدار ہونا ضروری ہے اور یہ تسلط واقتدار دوازدہ ائمہ میں سے صرف حضرت علی کو حاصل تھا لہذا وہ تو خلیفہ کہے جانے کے مستحق تھے۔ لیکن بقیہ ائمہ کو چونکہ یہ بات حاصل نہ تھی اس لئے ان کو خلیفہ نہیں کہا جاتا۔ غرض شیعہ حضرات بجائے خلیفہ کے امام کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سنیوں کے نزدیک خلفائے راشدین چار ہیں۔ اور شیعوں کے نزدیک امام بارہ ہیں۔ جن میں سے چونکہ بجز حضرت علیؓ کے کسی اور کو سیاسی اقتدار حاصل نہ تھا اس لئے حضرت علی رضؓ کو ابوالائمہ اور خلیفہ بلافصل مانتے ہیں اور بقیہ ائمہ محض دینی پیشوا ہیں۔ کسی اسلامی علم کے ماہر کو بھی لغوی معنے کے لحاظ سے عموماً امام کہا جاتا ہے جیسے امام ابوحنیفہؒ امام غزالیؒ اور امام رازیؒ وغیرہ!

شرائط خلافت وامامت اس بارے میں سنیوں اور شیعوں کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ ہم پہلے سنیوں کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نصب خلیفہ کے لئے اجماع امت کافی ہے۔ ہاں اگر کسی کے بارے میں نبوی اشارات وتلویحات بھی موجود ہوں تو نورٌ علیٰ نور کا مصداق ہے۔ خلیفہ مرد بالغ، عاقل، عالم، فقیہ اور متقی ہو اور صاحب امر یعنی حکمرانی کی صلاحیت وقوت رکھتا ہو اور باجماع اُمت منتخب ہوا ہو۔ اجماع سے مراد امت کے ہر فرد کا اجماع ہونا نہیں اور ایسا عملاً ہو بھی نہیں سکتا۔ بلکہ اُمت کے ارباب حل وعقد اور افراد ذی اثر کا اجماع مراد ہے۔ حدیث "الائمۃ من قریش" کی رُو سے قرشیت بھی شرط خلافت ہو سکتی ہے مگر بعض مستند علماء نے اس حدیث کی بابت لکھا ہے کہ آں حضرت صلعم نے قرشیت کو شرط کے طور پر نہیں بلکہ بطریق پیش گوئی فرمایا ہے کہ قریش سے ائمہ ہونگے۔ چنانچہ تاریخ سے اس پیش گوئی کی صداقت ثابت ہے۔ سنیوں کے نزدیک امام کا ظاہر بھی ہونا ضروری ہے۔ ورنہ امام کا ظاہر ہو کر قیامت تک غائب ہو جانے کی افادیت کو عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی۔

حضرت علی رضؓ اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے نزدیک انعقاد خلافت اجماع ہی سے ہوتا ہے۔ یہ دونوں روایتیں نص صریح کی بحث میں پیش ہونگی۔

مخالفین خلفاء ثلاثہ کے نزدیک امامت کی تین شرطیں ہیں ایک تو یہ کہ نصب امام منصوص بہ نص صریح ہے یعنی نصب امام سے متعلق خدا ورسول کا صاف حکم ہونا چاہئیے۔ دوسرے عصمت امام، تیسرے افضلیت امام ہم ان تینوں شرائط پر مختصراً جدا جدا بحث کرتے ہیں۔

نصب امام کا منصوص بہ نص صریح ہونا مخالفین کے نزدیک امام کا نصب کرنا خدا پر واجب ہے اور اس لئے وہ منصوص بہ نص صریح ہے۔ اس بات سے قطع نظر کر کوئی چیز ذات واجب الوجود پر کیونکر واجب ہو سکتی ہے قرآن پاک یا حدیث صحیح میں کہیں حکم صریح کسی کو امام یا خلیفہ بنانے کے لئے نہیں پایا جاتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلفائے راشدین کا نصب امت کے انتخاب سے ہوا۔ اگر خدا امام کو نصب فرماتا تو وحی متلو یعنی قرآن اور وحی غیر متلو یعنی حدیث میں کہیں

[illegible] اہل سنت کے نزدیک حضرت صدیق رضؓ کی خلافت کی بابت [illegible] تصریحات پائے جاتے [illegible] حضرت علی کی خلافت بلا فصل کے لئے تو کوئی نص خفی بھی نہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع میں جب خلافت [illegible] پیش کئے گئے تو باوجود عہد نبوی سے قریب ترین اور اہم ترین زمانہ ہونے کے کسی نے یہ نہیں کہا کہ خدا [illegible] پہلے سے فلاں کو خلیفہ بنائے جانے کا حکم دے رکھا ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ آں حضرت صلعم کی وفات سے کچھ پہلے حضرت [illegible] حضرت علیؓ سے کہا کہ آؤ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر خلافت کے لئے حکم حاصل کریں تو آپ نے کہا کہ میں نہیں جاؤں گا کیونکہ اگر رسول اللہؐ نے انکار فرما دیا تو پھر کبھی بھی خلافت نہیں ملے گی۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ حضرت علی رضؓ کی خلافت منصوص نہ تھی۔ دوسرے جب حضرت علی نے حضرت صدیق [illegible] بیعت کرنے میں کچھ دیر کی تو آپ نے اعتذاراً یہ شکایت کی کہ آپ نے ہم کو مشورے میں شریک نہیں کیا۔ [illegible] حق تھا۔ اگر [illegible] ان دونوں روایت کی صحت سے انکار کریں تو ہم علی مرتضیٰ کے اس والانامے کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت معاویہ کے نام لکھا تھا۔ اور جو نہج البلاغۃ میں درج ہے۔ ابتدائی حصہ یہ ہے :۔

اما بعد فان بیعتی یا معاویہ لزمتک وانت بالشام فانہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی ما بایعوھم علیہ فلم یکن للشاھد ان یختار ولا للغائب ان ینکر وانما الشوریٰ للمھاجرین والانصار فان اجتمعوا علی رجل وسموہ اماما کان ذالک للہ رضی

جس طرح لوگوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان رضؓ سے بیعت کی اسی طرح مجھ سے بھی بیعت کی۔ اب تجھ پر میری بیعت لازم ہوگئی گو کہ تو شام میں ہے جب نہ حاضر کو کچھ اختیار اور نہ غیر حاضر کو کچھ انکار ہو سکتا ہے مشورے کا حق صرف مہاجرین و انصار کو حاصل ہے۔ اگر انھوں نے کسی پر اجماع کیا اور اسی کا نام امام رکھا تو وہ اللہ کو پسند ہے۔

امام حسن نے جو صلح نامہ لکھا تھا۔ وہ مختصراً یہ ہے :۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذا ما صالح علیہ الحسن بن علی ومعاویۃ بن ابی سفیان صالحہ ان یسلم الیہ ولایۃ امر المسلمین علی ان یعمل فیھم بکتاب اللہ تعالیٰ وسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسیرۃ الخلفاء الصالحین ولیس لمعاویۃ ان یعھد الی احد من بعدہ بل یکون الامر من بعد شوریٰ بین المسلمین

تخیمناً حضرت حسن نے حضرت معاویہ سے اس بات پر مصالحت کی ہے کہ حضرت حسن خلافت چھوڑ دیں اس شرط پر کہ معاویہ مسلمانوں میں کتاب و سنت رسول اللہؐ اور سیرۃ خلفائے صالحین کی سیرت کے مطابق عمل پیرا ہوں اور اپنے بعد حضرت معاویہ کسی کو ولی عہد نہیں بنائیں گے بلکہ یہ معاملہ مسلمانوں کے مشورے سے طے ہوگا

ان دونوں عبارتوں سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت علی اور حضرت حسن رضؓ کے نزدیک بھی نصب امام منصوص بہ نص صریح نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے مشورے پر منحصر ہے۔ علاوہ بریں اگر امامت منصوص ہوتی تو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اول حضرت اسمٰعیل کو امام بنا کر بعد میں ان کو اس عہدۂ جلیلہ سے محروم نہ کرتے اور اُن کی جگہ حضرت موسیٰ کاظم کو نصب نہ فرماتے۔ یہی بنا ہے تو شیعوں کے دو اہم فرقوں (اثنا عشریہ و سبعیہ (اسماعیلیہ) میں سخت قسم کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہی قسم کا اختلاف اسمٰعیلیوں میں بھی آگے چل کر پیدا ہو گیا۔ مستنصر مصر کے خلیفہ فاطمی کے دو بیٹے نزار اور مستعلی تھے۔ آغا خانیوں نے نزار کو اور بوہروں نے مستعلی کو امام سمجھا۔ نصب امام کے لئے قرآنی نص صراحتاً تو کجا تلویحاً بھی ہماری نظر سے نہیں گذری۔ البتہ سورۃ رحمان کی ان آیتوں مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان فبای الاء ربکما تکذبان یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان .... سے متعلق کہیں یہ دیکھا تھا [illegible] سے حضرت علی رضؓ اور حضرت فاطمۃ الزہرا، برزخ سے رسول مقبولؐ۔ لؤلؤ سے حضرت امام حسن اور مرجان سے حضرت امام حسین مراد ہیں۔ ہم اس باطنی طرز تفسیر کی بابت کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ البتہ قارئین کرام کے مذاق سلیم اور ذوق دینی کے حوالہ کرتے ہیں

ہاں نص صریح کے طور پر کئی حدیثیں بیان کی جاتی ہیں ان میں سے چند اہم کو مع تنقید کے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

ا۔ پہلی حدیث تو وہ ہے جو حدیث غدیر خم کے نام سے مشہور ہے۔ آں حضرت صلعم نے بمقام غدیر خم صحابہ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا

یامعشر المسلمین الست اولی بکم من انفسکم قالوا بلی فقال ـ من کنت مولاہ فعلی مولاہ ـ الخ

اے گروہ مسلمین کیا میں تمہارے نزدیک تمہاری جانوں سے بہتر نہیں ہوں، سب نے عرض کیا کہ ہاں تو آپ نے فرمایا کہ میں جس کا مولیٰ ہوں اس کا علی بھی مولا ہے۔ اے خدا جو علیؓ سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر۔

اس حدیث کی شان نزول یہ ہے کہ آں حضرت صلعم نے حجۃ الوداع سے واپسی پر بمقام خم (جہاں ایک تالاب بھی تھا جسکی وجہ سے وہ مقام غدیر خم کے نام سے مشہور ہے) صحابہ کو جمع کرکے ایک مختصر سا خطبہ دیا جس کے آخری فقرے کے یہ الفاظ ہیں۔ بخاری میں ہے کہ اسی زمانے میں حضرت علیؓ یمن بھیجے گئے تھے۔ آپ نے وہاں سے واپس ہو کر حج میں شرکت کی تھی۔ یمن میں آپ نے اپنے اختیار سے ایک ایسا کام کیا تھا جسے بعض ہمراہیوں نے ناپسند کیا۔ ان میں سے ایک نے رسول مقبولؐ سے شکایت بھی کردی تو آپ نے یہ فرمایا کہ علیؓ کو اس سے زیادہ کا حق حاصل تھا۔ عجب نہیں ہے کہ اس قسم کے شکوک کے رفع کرنے کے لئے آپ نے یہ حدیث غدیر خم فرمائی ہو۔ یہ شان نزول مخالفین کے نزدیک مقبول نہ ہو تو نہ سہی۔ لیکن اس حدیث سے کسی طرح حضرت علیؓ کا خلیفہ بلا فصل ہونا ثابت نہیں۔ اس حدیث میں لفظ "مولیٰ" قابل لحاظ ہے عربی میں اس لفظ کے کئی معنے آتے ہیں۔ مثلاً آقا۔ آزاد کردہ غلام، چچا زاد بھائی اور محبوب دوست وغیرہ یہاں یہ لفظ محبوب و دوست ہی کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی آپ نے فرمایا کہ میں جس کا محبوب ہوں اسی کا علی بھی محبوب ہے اگر من کنت مولاہ فعلی کی جگہ من کنت اولی بہ فعلی اولیٰ "یہ ہوتا تو البتہ یہ مطلب ہوتا کہ جس طرح میں تم سے بہتر ہوں اسی طرح علی تم سے بہتر ہیں اور اس صورت میں حضرت علی کی برتری و فوقیت سب صحابہ پر ثابت ہوتی۔ جہاں تک حُب علی کا تعلق ہے سنیوں کا عقیدہ ہے کہ رسول مقبولؐ اور حضرت علیؓ دونوں کی محبت لازم ملزوم ہے۔ یعنی جو آں حضرت صلعم سے محبت نہیں کرتا وہ علیؓ سے بھی محبت نہیں کرتا اور بالعکس۔

علاوہ بریں مخالفین صحابہ کہتے ہیں کہ بارگاہ ایزدی سے حضرت علیؓ کو خلیفہ و وصی مقرر کرنے کا حکم کئی بار آچکا تھا مگر رسول مقبولؐ صحابہ کے خوف سے ایسا نہ کرسکے۔ آخر جب آیت یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک ...... الخ (اے رسول تیرے رب نے جو تجھ پر نازل کیا ہے اسے لوگوں کو پہنچادے اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے حق رسالت ادا نہیں کیا) تو رسول مقبولؐ نے صحابہ کے مجمع عام میں یہ ارشاد فرمایا تھا۔ جواباً عرض ہے کہ باوجود بارگاہ ایزدی سے بار بار تاکید آنے کے آپ نے صراحۃً یہ نہیں فرمایا کہ اے لوگو ہم نے علی کو اپنا وصی اور خلیفہ بنادیا ہے بلکہ ایسے الفاظ فرمائے جس سے حضرت علی کی خلافت بلا فصل کسی طرح ثابت نہیں ہوتی۔ اگر وفات سے کافی پہلے علانیہ طور پر حضرت علی کو خلیفہ یا وصی بنادیا جاتا اور سب سے عہد و پیمان لے لیا جاتا تو کسی کو مجال دمزدنی نہ ہوتی۔ آپ نے آخری زمانہ میں ایسا فرمایا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ کا اندازہ کس قدر غلط نکلا کہ آپ کی وفات کے بعد بلکہ اسی روز آپ کے فرمان کو آپ کے جانثار، وفادار اور اطاعت گذار صحابہ نے پس پشت ڈال دیا، اس بدگمانی کے لئے تاریخ و سیر اور درایت و روایت کی رو سے ذرہ برابر گنجائش نہیں نکلتی۔

دوسری حدیث ـ نص صریح کے طور پر یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اے علی کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ میرے نزدیک تمہارا وہی درجہ ہے جو حضرت موسیٰ کے نزدیک حضرت ہارون کا تھا۔ البتہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس حدیث کی شان نزول یہ ہے کہ جب رسول مقبول صلعم نے غزوۂ تبوک کا تہیہ فرمایا تو حضرت علی کو مدینہ منورہ میں عورتوں اور بچوں کی حفاظت و نگرانی کے لئے اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ پھر

بعض منافقین نے طعن و تشنیع سے (جو ہمیشہ ہر موقع کے منتظر رہتے تھے) حضرت علی کو ناگوار گذرا اور رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کا (نگران) خلیفہ بنا کر چھوڑ رہے جاتے ہیں۔ تو آپ اس پر آپ نے یہ فرمایا تھا کہ تیرا مرتبہ میرے نزدیک وہی ہے جو ہارون کا تھا موسیٰ کے نزدیک (جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر توریت لینے تشریف لے گئے تو اپنے زمانۂ غیبت میں حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ بناگئے تھے) یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ حضرت ہارون اور حضرت علی میں وجہ شبہ کیا ہے۔ نبوت تو ہو نہیں سکتی۔ کہ خود رسول مقبول ؐ نے اسی وقت ہی فرمایا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اب صرف دو وجوہ شبہ رہ جاتی ہیں ایک تو یہ کہ جس طرح حضرت ہارون حضرت موسیٰ ؑ کے قریبی رشتہ دار یعنی بھائی تھے اسی طرح حضرت علی رسول اللہؐ کے بھائی تھے مگر اس میں بھی یہ فرق تھا کہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ ؑ کے اخیافی بھائی تھے اور حضرت علی آں حضرتؐ کے چچا زاد بھائی۔ دوسری وجہ شبہ جو پہلی وجہ شبہ سے قوی تر اور صحیح تر ہے یہ ہے کہ جس طرح حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں اُن کے خلیفہ ہوئے۔ اسی طرح رسول مقبول ؐ نے حضرت علی کو غزوۂ تبوک تشریف لے جانے کے وقت اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ ظاہر ہے کہ اس عارضی خلافت سے خلافت کبریٰ پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی قائم مقامی تو کئی صحابہ کو ملی تھی۔ مثلاً جب پہلا حج اسلام میں ہوا تو حضرت صدیق ؓ نے رسول اللہ کی قائم مقامی کی اور آپ نے آخری ایام علالت میں آپ کے حکم سے رسول اللہؐ کی جگہ نماز جماعت کی امامت کی۔ علاوہ بریں اگر اس حدیث سے حضرت علی کی خلافت کبریٰ کا ثبوت ملتا ہے تو یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ آپ خلیفہ بلا فصل ہوں گے۔ کیا آپ کبھی مسند آرائے خلافت نہیں ہوئے؟

تیسری حدیث یہ ہے کہ آں حضرتؐ نے فتح خیبر کے لئے فرمایا کہ علم میں اُسے دوں گا جسے اللہ اور اللہ کا رسول دوست رکھتا ہے۔ اتنے میں حضرت علی آگئے تو آپ نے ان کو یہ علَم دیا۔ یہ حدیث بھی صحیح ضرور ہے مگر اس سے حضرت علی کی نہ افضلیت ثابت ہے اور نہ خلافت بلا فصل۔ رسول مقبول ؐ نے اس سے بہت زیادہ حضرت صدیق کے بارے میں فرمایا ہے کہ جیسا کہ آگے چل کر اُن کے فضائل میں ذکر آئے گا۔ چونکہ حضرت علی رضؓ شجاعت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اس لئے یہ شرف اُن کو بخشا جانا فطری امر تھا۔

مذکورہ بالا احادیث کے علاوہ کئی حدیثیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں صرف دو ایسی ہیں جو سنیوں کی کتب میں مروی و منقول ہیں بقیہ سب بالاتفاق سنیوں کے نزدیک موضوع ہیں مثلاً یہ حدیث[1] کہ علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے۔ یا یہ حدیث[2] کہ جو شخص آدم کا علم، نوح کا تقویٰ، ابراہیم کا علم اور موسیٰ کی سخت گیری دیکھنا چاہے وہ علی کی طرف دیکھے یا یہ حدیث[3] کہ میرے اہل بیت سفینہ نوح کی طرح ہیں جو اس میں سوار ہو گیا نجات پاگیا۔ یا حدیث طیر یعنے آپ کی خدمت میں پرندے کا گوشت پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ بارخدایا ایسے شخص کو بھیج دے جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہو تاکہ میں اس کے ساتھ یہ گوشت کھاؤں۔ اتنے میں حضرت علی آگئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے ساتھ گوشت تناول فرمایا۔ غرض یہ سب حدیثیں سنیوں کے نزدیک موضوع ہیں اور علاوہ موضوع ہونے کے معقول بھی نہیں۔ رہ گئیں وہ دو حدیثیں جو سنیوں کی کتب میں مروی و منقول ہیں۔ ان میں سے ایک تو حدیث انا مدینۃ العلوم والی ہے (یعنی آپ نے فرمایا کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازے) بخاری کے نزدیک یہ حدیث منکر ہے اور ابن جوزی نے اسے موضوع لکھا ہے۔ دوسری حدیث، حدیث ثقلین ہے جس میں ایک ثقل یقیناً صحیح ہے دوسرا ثقل نہ صحیح ہے نہ قرین قیاس۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک کتاب اللہ اور دوسری اپنی عترت۔ دونوں سے اعتصام و استمساک کرو۔ صغانی لاہوری[*] مصنف مشارق الانوار نے اپنی کتاب عباب میں لکھا ہے کہ حدیث خلفت ثقلین کتاب اللہ و عترتی بہ تبدیل الفاظ کئی صورتوں سے مروی ہے (لانتہے قولہ) کتاب اللہ کے ساتھ لفظ عترتی۔ عقل سلیم کے نزدیک کسی طرح جوڑ نہیں کھاتا۔ اسی مضمون کی

---

[*] ادارۂ اسلامیات کراچی کے کتب خانے میں حال ہی میں عباب کے ایک حصے کا فوٹو آیا ہے اسکے مطالعہ کے دوران میں میں یہ اطلاع مولانا عبدالحلیم حسنی ناظم شعبہ عربی و فارسی پنجاب لیاقت کتاب خانہ کی نظر سے گذری۔ انھوں نے ازراہ کرم یہ اطلاع مجھے عنایت کی۔

حدیث ... علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء ... منقول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی اطاعت کے ... جس کا اتباع فرض ہے۔ لہٰذا جس طرح اطاعت اللہ کے دوش بدوش اطاعت الرسول ہے۔ ٹھیک اسی طرح کتاب اللہ کے ساتھ ... عطف ذکر عترتی کا۔ علاوہ بریں لفظ کتاب غیر ذی روح ہے اور عترت ذی روح۔ غیر ذی روح کے ساتھ ذی روح ایک حکم میں کیسے ... ہو سکتا ہے۔ ذی روح کے ساتھ ذی روح ہی آنا چاہیئے۔ جیسے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ اطاعت کرو کتاب کی اور رسول کی۔ اسی طرح کتاب میں فعل اتباع کا مفعول یا ذی روح یا غیر ذی روح۔ اگر صرف عطف کے ساتھ دو ... ہیں تو دونوں یا تو ذی روح ہیں یا غیر ذی روح۔ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ حدیث ثقلین کا لفظ 'عترتی' کے ساتھ حدیث صحیح علیکم بسنتی وسنت الخلفاء الراشدین کے ساتھ متصادم ہے۔ بلکہ کالنجوم والی حدیث سے بھی جو شیعوں کے نزدیک بھی صحیح ہے۔ جیسا کہ ... حدیث کے متعلق یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ لاکھوں حدیثوں میں صرف دس ہزار صحیح ہیں اور بقیہ میں اکثر و بیشتر موضوع محققین نے وضع حدیث کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں مختصر یہ کہ جس شخص نے چاہا اپنے خیال و عقیدے کی تائید میں حدیثیں وضع کر ڈالیں۔ سب سے پہلے جس نے حدیث وضع کی وہ عبداللہ ابن سبا تھا جو منافقانہ طور پر یہودیت کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے اور اس کے ہم خیال لوگوں نے بے شمار حدیثیں جناب ... اور حضرت علی مرتضیٰ اور عترت رسول کی شان میں وضع کیں۔ ان احادیث موضوعہ میں جو حدیثیں ایسی تھیں جو اہل السنۃ کے عقائد سے نہیں ٹکراتی تھیں تو غیر محتاط محدثین اور مصنفین ان کو روایت کرنے لگے۔ مگر سُنی عقائد سے ٹکرائیں یا نہ ٹکرائیں محدثین ناقدین نے ان کو موضوع ہی سمجھا۔ مثلاً آنحضرت صلعم کی شان میں بہت سی احادیث کتب میلاد میں مروی و منقول ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر موضوع ہیں ... حضرت علی کی شان میں کئی حدیثیں سنی علماء نقل و روایت کرتے ہیں مگر ہیں وہ درحقیقت موضوع۔ چنانچہ حدیث نجوم والی حدیث کو عام طور پر سنیوں نے قبول کر رکھا ہے مگر درحقیقت جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے وہ مُنکر ہے یا موضوع۔ اسی طرح حدیث ثقلین میں عترتی کا ٹکڑا موضوع معلوم ہوتا ہے اس کی جگہ لفظ 'سنتی' صحیح ہے۔

اس حدیث ثقلین کی ایک شکل وہ ہے جس کی بابت ابن تیمیہ اپنی کتاب منہاج السنۃ میں فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم میں الخطبۃ غدیر خم کے آخری الفاظ یہ ہیں۔ وانا تارک فیکم الثقلین اولھما کتاب اللہ فیہ الھدیٰ والنور۔ فخذ وکتاب اللہ واستمسکو بہ واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی (یعنی میں دو بھاری چیزیں تم میں چھوڑتا ہوں ایک خدا کی کتاب جس میں ہدایت ہے اور نور ہے پس خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں) اس حدیث سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اصل چیز قرآن پاک ہے جس سے متمسک ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ استمساک کا حکم اہل بیت کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ ارشاد ہوتا ہے کہ میرے اہل بیت کا خیال رکھنا۔ اس حدیث سے ہمارے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب نہیں ہو سکتا یہاں غیر ذی روح اور ذی روح دونوں ساتھ لائے گئے ہیں کیونکہ دونوں کے لئے حکم جدا جدا ہے۔ ایک کے لئے اخذ و استمساک کا اور دوسرے کے لئے یاد رکھنے کا۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس روایت میں اہل بیت کا لفظ ہے جس سے آنحضرت کی ازواج مطہرہ کا مراد ہونا صحیح ہے۔ صحیح مسلم میں اسی مضمون کی دوسری حدیث ہے اور وہ یہ وقد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ (میں نے تم میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا تو تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ اور وہ کتاب اللہ ہے) اس سے معلوم ہوا کہ اصل اعتصام واستمساک کے لائق تو صرف کتاب اللہ ہے اور کتاب اللہ کے بعد رتبہ سنت نبوی کا ہے کیونکہ کتاب میں ... ہے کہ اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی۔ اور یہ کہ رسول کی ذات میں مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ازواج رسول ہی "اہل بیت" کا حقیقی اور مقدم مصداق ہیں باقی جسے بھی شامل کیجئے یہ محمول مجازاً ہوگا ...

دوسری شرط امامت عصمت

[illegible] کے نزدیک دوسری شرط امام اس کا معصوم ہونا ہے مگر اہل سنت کے نزدیک بجز انبیاء و رسل کے اور کوئی معصوم نہیں۔ ان کی عصمت [illegible] یہ ہے کہ عصمت ایک بات اختلافی ہے۔ عقلِ سلیم یہ تسلیم کرنے سے ابا کرتی ہے کہ ائمہ بھی انبیاء کی طرح معصوم ہوں اور عصمت جو کمال انبیاء کا خاصہ ہے وہ ائمہ کو حاصل نہیں کیونکہ نبی بہرحال نبی ہے اور امتی بہرحال امتی۔ عصمتِ انبیاء قرآن پاک سے ثابت ہے مگر عصمتِ ائمہ قرآن پاک سے کہیں ثابت ہوتی حدیث سے بھی ثابت نہیں۔ بلکہ برعکس اس کے کتب مخالفین میں ایسی باتیں ملتی ہیں جن سے ائمہ کا غیر معصوم ہونا ظاہر ہے۔ مثلاً :-

(الف) نہج البلاغہ میں حضرت علی کا قول ہے :- لابدّ للناس امام برو فاجر الخ یعنی آدمیوں کے لئے نیک یا فاجر امام کا ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی حکومت میں مومن عمل کرے اور کافر فائدہ اٹھائے اور پیادہ منزل مقصود کو پہنچ جائے اور راستے پُرامن ہوں اور قوی سے ضعیف کا حق لیا جاسکے۔ تا اینکہ نیک آدمی آرام کی زندگانی بسر کریں اور فاجر کے شر سے چھٹکارا ملے۔ دیکھئے یہاں امام کیلئے "بر" اور فاجر کے لفظ استعمال ہوتے ہیں یعنے بالفاظ دیگر امام فاجر بھی ہوسکتا ہے چہ جائیکہ وہ معصوم ہو!

(ب) کافی کلینی میں درج ہے کہ جناب مرتضیٰ اپنے احباب سے فرمایا کرتے تھے :- لاتکفوا عن مقالة بحق و مشورة بعدل فانی لستُ امِنًا ان اخطی ..... (یعنی تم سچ بات کہنے اور منصفانہ مشورہ دینے سے باز نہ رہو کیونکہ میں خطا کرنے سے محفوظ نہیں ہوں) اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم ہوتے تو آخری الفاظ نہ فرماتے۔

(ج) جب حضرت امام حسن نے حضرت معاویہ کو خلافت سونپ کر مصالحت کر لی تو یہ بات حضرت امام حسین کو اس قدر بری معلوم ہوئی کہ آپ نے فرمایا :- لو جزّ انفی لکان احب الی مما فعله اخی (یعنی میری ناک کا کٹ جانا میرے لئے بھائی کے اس فعل سے زیادہ بہتر تھا) اس سے ظاہر ہے کہ امام حسین کے نزدیک امام حسن کا یہ فعل صد درجہ مذموم و قبیح تھا! حضرت حسین کے ان لفظوں سے امام حسن کا معصوم ہونا محلِ نظر ہو جاتا ہے اور ان کی عصمت ثابت نہیں ہوتی۔

(د) حضرت علی رض کی خلافت کے زمانے میں کہیں سے شہد خالص کے مشکیزے آکر بیت المال میں رکھے گئے۔ حضرت امام حسین کو شہد کی ضرورت ہوئی تو آپ نے قنبر کے ذریعہ ایک رطل شہد منگوا کر خرچ کر لیا۔ جب حضرت علی رض کو معلوم ہوا تو وہ حضرت حسین پر سخت ناراض ہوئے اور یہ فرمایا کہ اگر میں نے یہ نہ دیکھا ہوتا کہ رسول مقبول صلعم تیرے چہرے کو چوما ہے تو میں تجھے مارتا۔ حضرت امام حسین نے ہر چند کہا کہ آخر ہمارا بھی تو اس میں حصہ ہے مگر آپ نے یہی فرمایا کہ تقسیم سے پہلے کسی خاص شخص کا کوئی حصہ نہیں۔ پھر آپ نے اپنے پاس سے دام دے کر خالص شہد بازار سے منگوایا اور بیت المال میں جمع کیا۔ حضرت امام حسین کا یہ فعل معصومیت کے حدود سے باہر تھا۔ اگر آپ معصوم ہوتے تو آپ ہرگز ایسا نہ کرتے۔

(ہ) صحیفہ کاملہ میں حضرت امام سجاد کا یہ قول نقل ہے کہ قد ملك الشيطان عنانی فی سوء الظن وضعف اليقين وانی اشكو سوء مجاورته وطاعة نفسی له ..... (یعنی بدگمانی و ضعف یقین میں میری عنان پر شیطان کا تسلط ہوگیا ہے۔ میں اس کی شکایت کرتا ہوں کہ وہ میرا برا پڑوسی ہے اور میرا نفس اس کی اطاعت کرتا ہے) یہ کیفیت عصمت کے خلاف ہے۔

افضلیت امام

مخالفین کے نزدیک تیسری شرط امامت یہ ہے کہ امام سب سے افضل ہو۔ یہ شرط اہل سنت کے نزدیک اس قدر قابل اعتراض اور نا ممکن نہیں جس قدر پہلی ۲ شرطیں ہیں۔ اگر امام سب سے افضل ہو تو ... [illegible] کی افضلیت کو کوئی [illegible] ہو سکتی ہے۔ اس کا علم تو صرف علام الغیوب ہی کو ہے۔ افضلیت نص صریح سے ہی

معلوم ہو سکتی ہے مگر جب حضرت علی ہی کی خلافت بلا فصل کی بابت جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا کہ کوئی نص صریح بلکہ نص خفی بھی نہیں ہے تو دوسرے ائمہ کی اماموں کی بابت تو نص کہاں سے ہوگی۔ اہل سنت کے نزدیک نصب امام اہل حل و عقد کے مشورے اور اجماع امت سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جس کی امامت پر اجماع ہو جائے وہ امام ہو جائے ضروری نہیں کہ وہ سب سے افضل ہو۔ شیخین کی افضلیت تو اہل سنت میں مسلم و متفق علیہ ہے۔ مگر حضرت ذوالنورین کی افضلیت بعض کے نزدیک مشکوک ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ یہ افضلیت بہمہ وجوہ نہیں ہے بلکہ اسلام کی خدمات کے لحاظ سے ہے ورنہ ایک خلیفہ دوسرے سے کسی خاص صفت میں بڑھا ہوا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ سب صحابہ میں ابوبکر رحیم ترین، حضرت فاروق رضی اللہ عنہ عادل ترین، حضرت ذوالنورین غنی ترین اور حضرت علی مرتضےٰ سب سے بہتر قاضی ہیں۔ یا ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عثمان سے خدا اور فرشتے بھی شرماتے ہیں یا حضرت عمرؓ کی بابت مروی ہے کہ کئی مواقعہ پر وحی ان کی رائے کے مطابق نازل ہوئی۔

خلافت صدیقی کی بابت نصوص خفیہ

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اہل سنت کے نزدیک خلافت منصوص بہ نص صریح نہیں ہے البتہ نصوص خفیہ جن سے مراد الہامی و نبوی اشارات و تلویحات میں قرآن و حدیث میں ضرور پائی جاتی ہیں ہم انہیں سے ایسی چند کو بیان کرتے ہیں جن سے مخالفین بھی مشکل ہی سے انکار کر سکتے ہیں۔ سب سے موزوں سورۂ نور کی یہ آیت ہے:-

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو خلیفہ بنائے گا زمین میں جیسا کہ خلیفہ بنایا تھا ان لوگوں کو جو اُن سے پہلے تھے اور اُن کے لئے ان کے دین کو جو اس نے (خدا نے) اُن کے لئے پسند کیا ہے۔ قوی بنادے گا۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں 'منکم' سے وہی جماعت مراد ہے جو نزول آیت کے وقت موجود تھی۔ چنانچہ اس جماعت میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیق رضؓ، حضرت فاروق رضؓ، حضرت ذوالنورین اور حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کو خلیفہ بنا کر اپنا وعدہ پورا کیا۔ ان چاروں خلفاء کی خلافتیں تاریخ سے ہر طرح ثابت ہیں اور کسی کو انکار کرنے کی مجال بھی نہیں۔ لہٰذا خلفاء راشدین کی خلافتیں اس آیت کریمہ سے تلویحاً منصوص ہیں۔ اگر ان چاروں خلفاء کو اس آیت کا مصداق قرار نہ دیں تو نعوذ باللہ یہ مطلب ہوا کہ جس کو خدا نے خلیفہ بنانا نہ چاہا تھا وہ خلیفہ ہو گئے۔ البتہ مخالفین کے عقیدہ بدا کی رو سے یہ ممکن ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ حضرت علی و حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہی کو خلیفہ بنانے کا تھا۔ مگر بعد میں کسی وجہ سے ارادہ بدل کر حضرت علیؓ سے پہلے خلفاء ثلاثہ کو خلیفہ بنا دیا۔ اس خیال کی رکاکت محتاج تردید نہیں۔

دوسری نص خفی بلحاظ سنت۔ ہم یہاں ایک ایسی سنت یا حدیث بیان کرتے ہیں جو تاریخی واقعہ ہے جس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنی علالت کے آخری ایام میں حضرت صدیق رضؓ کو نماز جماعت کی امامت کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے کئی وقتوں کی نمازیں پڑھائیں۔ چونکہ جماعت سے نماز پڑھنے کی تاکید رہی ہے اور مسجد نبوی میں نماز جماعت پڑھنے کا بہت زیادہ ثواب ہے یقیناً حضرت علیؓ نے حضرت صدیق کی امامت میں نمازیں ضرور پڑھی ہوں گی ورنہ نعوذ باللہ آپ پر مسجد نبوی میں نماز باجماعت نہ پڑھنے کا شبہ عائد ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے علاوہ حضرت صدیق کو پہلے حج الاسلام کا امیر بنایا جانا بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس حج میں حضرت علی کو بے شک نقیب بنایا گیا مگر نقیب امیر کے ماتحت ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں منصب ایک درجے کے نہیں ہو سکتے

ان حدیثوں کے علاوہ کئی صحیح حدیثیں ہیں جن سے خلفاء اربعہ کا یکے بعد دیگرے خلیفہ ہونا ثابت ہے لیکن چونکہ وہ حدیثیں مخالفین کے نزدیک وقیع حجت نہیں ہیں۔ اس لئے ان کو یہاں بیان نہیں کیا جاتا نماز جماعت کا امام اور پہلے حج الاسلام کا امیر بنانے والی حدیث کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تاریخی واقعہ بھی ہیں اس لئے ان دونوں میں نص خفی ہونے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

افضلیت حضرت صدیق رض

اگرچہ اہل سنت اور ارباب محبت کے نزدیک افضلیت شرط امامت نہیں ہے مگر جیسا کہ اوپر لکھا گیا خلفائے راشدین سب صحابہ سے افضل ہیں اور ان میں سب سے افضل حضرت صدیق ہیں۔ یہاں ہم حضرت صدیق کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن و حدیث سے اشارۃً وتلویحاً حضرت صدیق رض کے مستحق خلافت الرسول ہونے کا مزید ثبوت پایا جاتا ہے۔ پہلے ہم متعلقہ آیات بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه واعد لهم جنت تجري تحتها الانهار

اور مہاجرین و انصار میں سب سے پہلے ایمان والے، اور وہ لوگ جنھوں نے اُن کی عمدگی کے ساتھ پیروی کی۔ اُن سب سے اللہ تعالیٰ خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ نے بہشتیں تیار کر رکھی ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں۔

یہ مسلّم ہے کہ خواتین میں حضرت خدیجہ، غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ، نابالغوں میں حضرت علی رض۔ اور بالغ مردوں میں حضرت صدیق سب سے پہلے ایمان لائے۔ چونکہ حضرت علی رض ایسی حالت میں ایمان لائے تھے کہ آپ کی عمر صرف دس سال کی تھی اور آپ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں پرورش پا رہے تھے لہٰذا خدمتِ دین کے لئے آپ کا ایمان لانا اس قدر اہم نہ تھا جس قدر ابوبکر رض جیسی، ہمسا تجربہ کار ذی حیثیت ہستی کا جسے طفولیت سے آن حضرت ؐ کی رفاقت کا شرف حاصل تھا اور جو آپ کے اخلاق وعادات و افتادِ طبع سے شروع زمانہ ہی سے اچھی طرح واقف تھا۔ پس مردوں میں اسبق السابقین الاولین ہونے کے لحاظ سے آپ کی افضلیت پر یہ آیت کریمہ روشن دلیل ہے۔ جس سے مخالفین کو بھی انکار نہیں ہونا چاہیئے۔ شیعی علامہ طبرسی نے اپنی تفسیر مجمع البیان میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے حضرت خدیجہ ایمان لائیں اور پھر ابوبکر رض (انتہی) علامہ نے حضرت زید اور حضرت علی رض کے نام اس ذیل میں نہیں شامل کئے۔

۲:۔ محمد رسول الله والذين معه الخ میں 'معہ' سے حضرت صدیق کی طرف 'اشداء' سے حضرت فاروق رض کی طرف 'رحماء' سے حضرت ذوالنورین کی طرف اور 'رکعاً سجداً' سے حضرت علی کی طرف اشارہ ہے۔ اگر ان انفرادی اشارات کو تسلیم بھی نہ کیا جائے تو بھی ظاہر ہے کہ خلفائے راشدین سے زیادہ کون ان اوصاف کا مستحق ہو سکتا ہے۔

۳:۔ آیت استخلاف جو پہلے گزر چکی ہے خلفائے راشدین پر کس قدر منطبق ہے۔

۴:۔ آیت ثانی اثنين اذ هما في الغار سے حضرت صدیق رض کی علوِ شان پر مزید روشنی پڑتی ہے اسی آیت کی وجہ سے فارسی اور اردو میں یارِ غار ایک محاورہ ہو گیا جس سے یارِ صادق مراد ہوتا ہے۔ حضرت صدیق رض کا بمقتضائے آیت ہذا۔ رسول مقبول ؐ کا رفیق غار ہونا مُسلّم الثبوت ہے۔

۵:۔ آیت والذي جاء بالحق وصدق به میں حق لانے والے سے مراد جناب رسالت مآب اور تصدیق کرنے والے سے مراد حضرت صدیق ہیں علامہ طبرسی نے بھی اپنی تفسیر میں 'صدّق' کا فاعل حضرت ابوبکر رض ہی کو قرار دیا ہے۔

۶:۔ مجمع البیان میں علامہ طبرسی نے یہ روایت نقل کی ہے۔ وقال ان زبیر ان الاية وسيجنبها الاتقى الذي نزلت في ابي بكر لانه اشترى المماليك الذين اسلموا مثل بلال وعامر وغيرهما واعتقهم .... (یعنی ابن زبیر نے

کہ آیت وسیجنبہا الاتقیٰ ابوبکرؓ کی شان میں اتری کہ وہ مسلمان غلاموں کو خرید کر کے آزاد کر دیتے تھے جیسے بلالؓ و عامرؓ وغیرہ۔
ان آیتوں کے علاوہ اور کئی آیتیں ہیں جو مہاجرین و انصار اور عام صحابہ کی شان میں نازل ہوئیں ان سب سے آپ کے فضائل ظاہر و باہر ہیں۔

رہ گئیں حدیثیں۔ وہ بھی کئی ہیں۔ چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ رسول مقبول ﷺ نے پہلے حج الاسلام میں آپ کو امیر حج بنایا۔ اور اپنی علالت کے آخری زمانے میں نماز پڑھانے کا منصب آپ کے سپرد کیا۔

۲۔ ابوداؤد سے ایک طویل حدیث مروی ہے کہ جس کے آخر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری جانب مبعوث کیا تو تم سب نے میری تکذیب کی اور صرف ابوبکرؓ نے میری تصدیق کی اور جان و مال سے مدد کی۔

۳۔ عمرو بن عاص سے مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپ نے فرمایا کہ عائشہؓ پھر دریافت ہوا کہ مردوں میں کون تو جواب ملا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ۔

۴۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں کسی سے ابوبکرؓ اور ان کے لڑکے عبدالرحمٰن کو بلواؤں اور ابوبکرؓ کو خلیفہ بنا دوں۔ مبادا کوئی کہنے والا کچھ کہے۔ پھر میں نے سوچا کہ خدا بھی کسی اور کو خلیفہ نہیں بنائے گا اور مسلمان بھی نہ مانیں گے۔

۵۔ حضرت جبیرؓ سے مروی ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئی تو آپ نے اُسے واپس آنے کا حکم دیا وہ بولی کہ اگر میں آئی اور آپ بوجہ وفات پا جانے کے نہ ملے تو کیا کروں گی تو آپ نے فرمایا کہ تب ابوبکرؓ کے پاس جانا۔

۶۔ حدیث ہے لو کان اللہ تعالیٰ سماہ صاحبا الخ آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ کو میرا صاحب نہ کہا ہوتا تو میں اُسے اپنا خلیل بنا لیتا۔ لیکن وہ میرا اسلامی بھائی ہے۔

۷۔ وفات کے قریب رسول مقبول ﷺ نے مسجد نبوی میں سب کے دروازے بند کرا دیئے تھے بجز دروازہ ابوبکرؓ کے۔

کتب مخالفین سے اقتدار صحابہ کی ماموریت

بحار مجلسی کی جلد اول میں ہے کہ جناب صدوق نے بہ چند واسطہ امام صادق رضؓ سے روایت کی ہے کہ قال الرسول ما وجدتم فی الکتاب الخ خلاصہ یہ ہے کہ جو کتاب و سنت میں ہے اس سے تم مفر نہیں اور جو کتاب و سنت میں نہ پاؤ تو پھر میرے اصحاب کی اقتدا کرو۔ تم میں میرے اصحاب کی مثال ایسی ہے جیسی ستاروں کی۔ جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ اور اختلاف صحابہ تمہارے لئے رحمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ کے اصحاب کون ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میرے اہل بیت۔ (انتہیٰ) راقم الحروف کہتا ہے چونکہ اصحاب کا لفظ کوئی چیستاں نہ تھا کہ مخاطبین رسول اللہ ﷺ سے اس کے معنی دریافت کرتے لہٰذا آخری سوال و جواب بداہۃً الحاقی ہے۔

۸۔ آیات بینات میں ہے کہ امام علی الرضا سے اس قول نبی کی بابت کہ اصحابی کالنجوم باقتدا یتم اہتدیتم دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے۔

آیات بینات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں شمس کی طرح ہوں۔ علیؓ قمر کی طرح اور میرے اصحاب ستاروں کی طرح۔ جس کا بھی اقتدا کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔

جامع الاخبار میں یہ حدیث مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو مجھے گالی دے اُسے قتل کر ڈالو۔ جو میرے اصحاب کو گالی دے اُسے کوڑے لگاؤ

ہم اس روایت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ (تجلی)

کتب مخالفین سے حضرت صدیق کے خصائل

۱:۔ تفسیر امام حسین عسکری میں ایک طویل عبارت ہے جس کے آخر میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ابو بکر رضؓ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بمنزلہ میرے گوش وچشم کے بنایا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:۔ جعلک منّی بمنزلة السمع والبصر والراس من الجسد بمنزلة الروح من البدن

۲:۔ ابن میثم بحرانی نے نہج البلاغة کی شرح کبیر میں حضرت علی رضؓ کے ایک خط کا اقتباس دیا ہے جس میں حضرت علی رضؓ نے شیخین کے لئے فرمایا ہے:۔ ان مکانهما فی الاسلام العظیم وان المصاب لهما فی الاسلام لجرح شدید رحمهما الله وجزاهما باحسن ما عملا (یعنی ان دونوں کا مقام اسلام میں بلند ہے اسلام میں ان کو جو ایذائیں پہنچیں وہ سخت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن دونوں پر رحم فرمائے اور جو کچھ انھوں نے کیا ہے اس کا اچھا بدلہ دے۔

۳:۔ کشف الغمہ میں ہے کہ کسی نے امام سے تلوار کے نقش ونگار کرنے (حلیة السیف) کی بابت پوچھا تو آپ نے جواب دیا کہ "جائز ہے ابو بکر صدیق رضؓ نے اپنی تلوار کو چاندی سے منقش کیا تھا" راوی نے کہا کہ کیا آپ بھی صدیق کہتے ہیں تو آپ نے اپنی جگہ سے اچھل کر فرمایا کہ "ہاں صدیق، ہاں صدیق جس نے ان کو صدیق نہیں کہا اللہ تعالیٰ اس کے قول کو دنیا وآخرت میں سچا نہ کرے"۔

۴:۔ علامہ طبرسی نے کتاب احتجاج میں امام محمد باقر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لست بمنکر فضل ابی بکر ولست بمنکر فضل عمر ولکن ابا بـــــــــکر افضل من عمر یعنی میں نہ فضیلت ابو بکر کا منکر ہوں نہ فضیلت عمر کا۔ البتہ ابو بکر رضؓ عمر رضؓ سے افضل ہیں۔

۵:۔ حضرت علی رضؓ سے مروی ہے کہ کنا مع النبی صلعم علی جبل حراء یعنی ہم رسول اللہ صلعم کے ہمراہ جبل حراء پر تھے کہ یکایک پہاڑ کو حرکت ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ قرار پکڑ کہ تجھ پر سوائے نبی، صدیق، اور شہید کے کوئی نہیں ہے۔

۶:۔ آیات بیّنات میں ہے کہ قال ابو عبد الله فی حقهما امامان عادلان قاسطان کانا علی الحق وماتا علیه فعلیهما رحمة الله یوم القیٰمة (یعنی امام جعفر صادق نے شیخین کے بارے میں فرمایا کہ وہ دونوں مُنصف اور عادل امام تھے۔ زندہ رہے حق پر اور مرے حق پر۔ ان پر روز قیامت خدا کی رحمت ہو)

کتب مخالفین سے خلافت ثلاثہ کے برحق ہونے کا ثبوت

۱:۔ ایک تو حضرت علی کا وہی خط جو آپ نے حضرت معاویہ کے نام لکھا۔

۲:۔ دوسرے حضرت امام حسن کا صلح نامہ۔ ہم اوپر ان دونوں کو ضمنی عنوان ۵ کی ذیل میں نقل کر آئے ہیں۔ اُن پر پھر نظر ڈال لی جائے۔ حضرت علی رضؓ کے قول سے ظاہر ہے کہ جو امام مہاجرین وانصار کے مشورے سے منتخب ہوگا وہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوگا۔ اور چونکہ خلفائے ثلاثہ کا انتخاب مشورہ مہاجرین وانصار ہوا لہذا وہ عند اللہ مقبول ہیں۔ امام حسن رضؓ نے ایک تو خلفاء کو صالحین کہا ہے اور دوسرے ان کی سیرت کی پابندی کو ایسا ہی ضروری سمجھا ہے جیسا کہ قرآن وسنّت کی پابندی کو۔

۳:۔ حضرت علی رضؓ کا وہ خطبہ ہے جو آپ نے حضرت ذو النورین کی شہادت کے بعد لوگوں کے آپ سے بیعت کی خواہش کرنے پر دیا تھا۔ یہ خطبہ بھی نہج البلاغہ میں شامل ہے اس کے مندرجہ ذیل الفاظ قابل لحاظ ہیں۔ وان ترکتمونی فانا کاحدکم ولعلی اسمعکم واطوعکم لمن ولیتموہ امرکم وانا لکم وزیرا خیر لکم منی امیراً (یعنی اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تم میں سے ایک کے مانند ہوں جس کو تم اپنا امیر بناؤ اس کی شاید میں تم سے زیادہ اطاعت وفرمانبرداری کروں اور میرا تمہارے لئے وزیر ہونا تمہارے لئے اس سے بہتر ہے کہ میں تمہارا امیر بنوں) گویا

آپ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح میرا خلفائے ثلاثہ کا وزیر [illegible] خلیفہ کا وزیر رہنا [illegible] زیادہ اچھا ہوگا۔ نیز اس خطبے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نصب امام نص [illegible] کے مشورے سے [illegible]

۱۴۔ کلینی نے کتاب الحجہ میں لکھا ہے فان خلافت الاصحاب الثلاثۃ [illegible] ...... یعنی اصحاب ثلاثہ کی خلافت ظاہری خلافت تھی اور حضرت علی رضہ کی خلافت باطنی۔

۱۵۔ حضرت علی رضہ نے خوارج کے سامنے جو تقریر فرمائی تھی اور جو نہج البلاغہ میں منقول ہے [illegible]

سیہلک فی صنفان مفرط یذھب بہ الحب الی غیر الحق ومفرط یذھب بہ البغض الی غیر الحق وخیر الناس فی النمط الاوسط والزموا السواد الاعظم فان ید اللہ علی الجماعۃ وایاکم والفرقۃ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب

ہلاک ہو جائیں گے میرے بارے میں دو گروہ۔ ایک تو وہ گروہ جو میری محبت میں افراط کرتا ہے اور اس لئے وہ حق پر نہیں ہے دوسرا گروہ وہ جو میری محبت میں تفریط کرتا ہے اور اس لئے بغض حق سے دور کر دیتا ہے۔ بہترین گروہ وہ ہے جو میانہ رو ہے پس تم سواد اعظم کو لازم پکڑو کیونکہ خدا کا ہاتھ جماعت پر ہے اور تفرقے سے بچو کیونکہ جو جماعت سے دور ہو جاتا ہے وہ شیطان کا شکار بن جاتا ہے جس طرح کہ جو بھیڑ بکری گلے سے دور ہو جاتی ہے تو وہ بھیڑیے کا شکار ہو جاتی ہے) اس خطبے سے ظاہر ہے کہ خلفائے ثلاثہ کی خلافت سے جو اجماع امت سے قائم ہوئی تھی انکار کرنے والے کی حیثیت اس بھیڑ بکری کی سی ہے جو گلے سے دور ہو کر بھیڑیے کا شکار ہو جائے۔ نیز یہ کہ وہ لوگ جو حضرت علی رضہ کی محبت میں غلو کرتے ہیں اور وہ لوگ جو حضرت علی رضہ سے بغض رکھتے ہیں۔ غرض دونوں قسم کے لوگ ہلاک ہونگے۔

۱۶۔ حضرت فاروق رضہ نے جب مہم روم اور مہم فارس پر جانے کے بارے میں حضرت علی رضہ سے مشورہ کیا تو حضرت علی نے دونوں موقعوں پر جو تقریریں فرمائیں وہ نہج البلاغہ میں درج ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے کس خلوص اور محبت سے حضرت فاروق کو دار الخلافہ چھوڑنے سے روکا ہے۔ حضرت علی رضہ حضرت عمر رضہ کو خلیفہ برحق جانتے تھے تب ہی تو آپ نے مخلصانہ نصیحت سے انکی مدد کی

اہل بیت. عترت و آل کا مفہوم و مصداق

اہل بیت کے دو مفہوم ہیں ایک تو ازواج مطہرہ جیسا کہ آیت تطہیر سے ثابت ہے۔ اور دوسرے مفہوم میں اہل بیت کے ساتھ عترت بھی شامل ہیں جیسا کہ رسول مقبول صلعم نے حضرت علی حضرت فاطمہ اور حسنین کو ایک کملی میں لے کر دعا مانگی تھی کہ خدایا یہ بھی میرے اہل بیت میں ہیں ان کو بھی گندگی سے دور کر دے۔ یعنی آپ کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ ازواج مطہرہ تو اہل بیت میں داخل ہیں ہی۔ ان کی تو تطہیر فرمائے گا ہی۔ یہ چاروں بھی میرے اہل بیت میں داخل ہیں ان کی بھی تطہیر فرما یہی وجہ ہے کہ جب ام المومنین ام سلمہ نے کملی میں آنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ انکِ علی خیر یعنی تم تو مصداق آیہ قرآنی اہل بیت میں داخل ہو ہی۔ لہٰذا تمہیں ان کے ساتھ کملی میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ عترت کے معنی ہیں خاندان رشتہ دار، شاخ، آل اولاد۔ یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا ہے لفظ آل قرآن میں اتباع کے مفہوم میں مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً آل فرعون سے مراد قرآن پاک میں اس کے رشتہ دار نہیں ہیں بلکہ وہ سب مراد ہیں جو اس کے طرفدار اور حامی ہیں۔ نماز میں جو درود شریف پڑھا جاتا ہے، اس میں آل ابراہیم سے مراد و آل محمد سے مراد ان کے اتباع ہیں نہ کہ ان کے محض رشتہ دار۔ اگر لفظ "اصحاب" کہا جاتا تو آپ کی عترت نکل جاتی۔ اس لئے ایسا جامع لفظ استعمال ہوا ہے جو صحابہ اور عترت دونوں کو شامل ہے۔ قرآن پاک کی آیت ہے: یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً وسبحوہ بکرۃً واصیلا ھو الذی یصلی علیکم وملائکتہ لیخرجکم من الظلمات الی النور وکان بالمومنین رحیما اے ایمان والو اللہ کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کرو

وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور فرشتے بھی۔ تاکہ تم کو وہ اندھیر
سے روشنی کی طرف نکالے۔ وہ ایمان والوں پر بڑا رحم کرنے والا ہے

اس آیت سے ظاہر ہے کہ خدا مسلم مخاطبین یعنی صحابہ پر درود (رحمت) بھیجتا ہے جنمیں عترت رسول بھی شامل ہیں۔ لہٰذا اس آیت کا اقتضا ہے کہ نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں آل سے مراد سب کے سب مسلمین و مومنین مراد ہوں۔

اس ذیل میں المودۃ فی القربیٰ سے متعلق جو عام طور پر غلط فہمی ہے اور جسکی بنا پر آل رسول کی محبت کو اجر نبوت کہا جاتا ہے۔ اُسے ہم دُور کرنا چاہتے ہیں۔ آیت یہ ہے: قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ ....
(اے رسول کفار سے) کہدے کہ میں اس پر (یعنی کار تبلیغ پر) سوائے مودت فی القربیٰ کے اور کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا) یہاں بحث طلب یہ ہے کہ قربیٰ سے کس کے قربی مراد ہیں خود رسول اللہ کے یا کفار کے۔ مخاطبین کہ پہلی صورت میں یہ معنے ہوئے کہ میں جو تبلیغ کا کام کر رہا ہوں، اس کا اجر میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم میری آل و اولاد سے محبت رکھنا یعنی ان کا ہر طرح خیال رکھنا۔ تو یہ مفہوم ان سب آیتوں کے خلاف ہے جن میں پیغمبران سابق نے بھی مخاطبین سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے بلکہ کہا ہے کہ اجر تو خدا پر ہے اور اسی طرح رسول مقبول نے بھی کئی بار فرمایا ہے۔ اب اگر اس آیت کے یہ معنی لئے جائیں کہ رسول مقبول نے مخاطبین سے یہ چاہا کہ میرے رشتہ داروں سے محبت رکھو تو یہ تو ایک بڑے زبردست اجر کی استدعا ہوگئی۔ بالفاظ دیگر یہ معنے ہوئے کہ مجھے تو اپنے لئے کچھ نہیں چاہیئے۔ البتہ تم میرے رشتہ داروں کی خدمت کرتے رہو۔ لہٰذا یہ مفہوم کسی طرح جائز نہیں۔ مفسرین نے اس نقص سے بچنے کیلئے دوسرے معنی پیش کئے ہیں۔ اُن میں دل لگتا مفہوم یہ ہے (یعنی ایسا مفہوم ہے کہ اس پر کسی قسم کا اعتراض عائد نہیں ہوتا) کہ آپ نے فرمایا کہ میرے اس کام کا اجر یہی ہے کہ تم اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور صلہ رحمی کا پورا خیال رکھو قرآن پاک میں ذوی القربیٰ کی صلہ رحمی پر خاص طور سے بہت سی آیتوں میں زور دیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص لوجہ اللہ کسی کو پڑھا اور یہ کہے کہ اگر تم امتحان میں پاس ہو جاؤ گے یا یہ کہے کہ اگر تم نماز کے پابند ہو جاؤ گے تو میں سمجھوں گا مجھے اجر مل گیا۔ دیکھئے دونوں ... مطالب میں کس قدر فرق ہے۔

قصہ قرطاس

مسئلہ خلافت کے سلسلے میں مباحث مندرجہ بالا کے علاوہ تین چار امور حد درجہ متنازع فیہ ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کے متعلق مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے قصۂ قرطاس کو لیتے ہیں۔

وفات سے تین چار روز پہلے رسول مقبول نے بعالم شدت مرض اپنے اردگرد بیٹھنے والے صحابہ کو فرمایا کہ کاغذ لاؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھا دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو سکو۔ حضرت عمر نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ رسول مقبول کو مرض کی شدت ہے اور ہمارے پاس قرآن موجود ہے جو ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے۔ آپ کو اس حالت میں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ اس پر حاضرین میں کچھ اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ تعمیل کی جائے۔ بعض نے کہا کہ خود آپ سے دریافت کر لیا جائے۔ جب صحابہ نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو۔ میں جس مقام پر اب ہوں وہ اس سے بہتر ہے کہ جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔ اہل سنت اور مخالفین خلفائے راشدین کے درمیان یہ واقعہ ایک بڑا معرکہ آرا موضوع بن گیا ہے۔ شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ جناب رسالت مآب حضرت علی کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے۔ مولانا شبلی نے الفاروق میں لکھا ہے کہ یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے مگر پہلے راوی سب طرق میں حضرت عبداللہ ابن عباس کے سوا اور کوئی نہیں۔ ان کی عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی نیز یہ کہ خود ابن عباس اس موقع پر موجود نہیں تھے اور یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے یہ واقعہ کس سے سنا۔ غرض یا تو یہ واقعہ سرے ہی سے غلط ہے اور اگر صحیح ہے تو اس کی صحیح اور اطمینان بخش توجیہ

یہ بھی ممکن ہے کہ آں حضرت کو اس وقت سخت تکلیف تھی اور یہ معلوم تھا کہ شریعت نے مستقل قانون کا حکم باقی نہ رہا تھا۔ قرآن پاک میں آیت
الیوم اکملت لکم دینکم... نازل ہو چکی تھی۔ اس لئے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔ اگر کوئی ضروری حکم ہوتا
تو آں حضرت کو کسی کے روکنے سے کیونکر رک سکتے تھے۔ ورنہ نعوذ باللہ عدم تبلیغ کی فروگزاشت کا ارتکاب ہوتا۔ اسی واقعہ کے تین چار روز بعد
تک آپ زندہ رہے۔ اس وقت نہ سہی بعد میں لکھوا دیتے۔ اس قضیے کے بعد آپ نے صحابہ کو تین وصیتیں زبانی فرمائیں۔ جو ضروری بات
آپ کاغذ پر لکھوانا چاہتے تھے، ہیں ممکن ہے کہ وہ ان تین وصیتوں میں شامل ہو۔ علاوہ بریں اس کے بعد آپ نے مجمع عام میں جو ایک
مختصر سا خطبہ بھی دیا تھا۔ اس میں ظاہر کر سکتے تھے۔ سب سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ آپ حضرت صدیق کی خلافت کا حکم لکھانا
چاہتے ہوں[1] جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آپ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا حکم لکھانا چاہتے تھے پھر آپ نے یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا
کہ حضرت صدیق کی خلافت کے سوا کسی اور کی خلافت کو نہ خدا منظور کرے گا اور نہ سلمان ہی راضی ہوں گے۔ اور مسلمانوں کا اجماع صحیح ہی
واقع ہوگا۔

جناب رسول کی نعش مبارک چھوڑ کر ابوبکر و عمر کا سقیفہ چلا جانا

مخالفین کا ایک بڑا اعتراض یہ کہ رسول مقبول کے انتقال فرماتے ہی

لوگوں کو خلافت کی پڑ گئی اور نعش مبارک کو بے گور و کفن چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گئے۔ چنانچہ اسی مضمون کے چند اشعار مثنوی رومی
میں الحاق کر دیئے گئے۔ جس کو پڑھ کر سخت روحانی صدمہ ہوتا تھا اللہ تعالیٰ حضرت حکیم الامۃ کی روح پر فتوح پر ہمیشہ رحمت و برکت
کے امطار و انوار نازل فرماتا ہے کہ انھوں نے ثابت کیا کہ یہ اشعار الحاقی ہیں۔ پروفیسر نکلسن نے حال ہی میں مثنوی رومی کی، مخطوطات
قدیمہ کی مدد سے جو تدوین کی ہے بحمد للہ اس میں بھی یہ اشعار نہیں ہیں[2]

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس قضیے کے پیدا کرنے کی ذمہ داری شیخین پر عائد نہیں ہوتی۔ وہ تو نعش مطہر کے پاس حاضر تھے
کہ اطلاع ملی کہ سقیفے میں بڑا اجتماع ہو رہا ہے (اور جو در حقیقت کیا دھرا منافقین کا تھا) جس میں خلافت کا مسئلہ پیش ہے۔ کسی پیغمبر
یا بادشاہ کی جانشینی کا سوال اہم مہمات سے ہے لہٰذا اس کا طے ہونا ضروری تھا۔ اگر انصار میں سے کوئی خلیفہ مقرر ہو جاتا تو ائمۃ من قریش
کے خلاف ہونے کے علاوہ قریش انصار کی قیادت اور سربراہی کسی طرح گوارا نہ کرتے اور اگر انصار و مہاجرین دونوں جماعتوں میں سے ایک
ایک خلیفہ مقرر ہوتا تو ایک میان میں دو تلواریں کس طرح سمائیں۔ علاوہ بریں اس مسئلہ کے طے ہو جانے میں زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹہ
صرف ہوئے ہونگے۔ پھر یہ سب لوگ واپس پہنچ گئے۔ رسول مقبول کا وصال پیر کو دوپہر ڈھلے کے بعد ہوا اور تدفین ہوئی منگل اور
بدھ کی درمیانی شام کو یعنی وفات سے ۲۸ یا ۲۹ گھنٹوں کے بعد۔ ظاہر ہے اس مدت میں حضرات اہل بیت بھی متصل و متواتر نعش
مبارک کے پاس بیٹھے نہ رہے ہونگے حوائج ضروریہ علاوہ نماز پنجگانہ کی ادائے گی ضرور تھی۔ جب حضرات اہل بیت بھی حوائج ضروریہ
اور ادائیگی نماز پنجگانہ کے لئے نعش مبارک سے جدا ہوئے تو شیخین کا ایک اہم مہمات سوال کو طے کرنے کے لئے کچھ دیر کے لئے وہاں سے
چلے جانا کس طرح قابل اعتراض ہے۔ تھوڑی سی غیر حاضری کے بعد یہ صحابہ آخر تک تجہیز و تکفین میں شامل رہے۔ آگے چل کر اپنے
موقع پر ذکر آئے گا کہ خود حضرت علی بھی جسد مبارک کو چھوڑ کر اگلے روز یعنی منگل کے جلسۂ عام میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے
تشریف لے گئے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت صدیق کی روایت کردہ حدیث کے مطابق حجرۂ عائشہ میں قبر کھودی گئی۔ قبر کھودنے
ہی سے بگڑی ہوئی ذہنیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ خلفاء ثلاثہ کو مطعون کرنے کے لئے اہل بغض و عداوت نے کیسے کیسے جھوٹ
گھڑے ہیں، روایتیں گھڑی ہیں اور الحاق اور جعل سازی کی ہے (تجلی)

---

[1] یہ قیاس بھی ہمارے نزدیک پہلے ہی قیاس کی طرح بے حقیقت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (تجلی)

لئے وہ نام پیش کئے گئے تو حضرت فاروق رضؓ کی پیش کردہ اس تجویز پر عمل کیا گیا کہ دونوں کو بلا لیا جائے جو پہلے آجائے اس سے قبر کھدوالی جائے۔

حضرت علیؓ نے حضرت صدیقؓ سے بیعت کب کی

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے چھ ماہ بعد یعنی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی وفات کے بعد حضرت صدیق رضؓ سے بیعت کی۔ اس خیال کا ماخذ بخاری شریف کی ایک طویل حدیث ہے۔ اس کا خلاصہ یہ کہ حضرت فاطمہ کے انتقال کے بعد حضرت علی نے حضرت صدیق کو بلا کر کہا کہ آپ کے فضل کو اور جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے اسے ہم جانتے ہیں اور جو چیز (خلافت) اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشی ہے اس میں ہم آپ کی ریس نہیں کرتے۔ لیکن ہاں آپ نے خلافت کا معاملہ خود ہی طے کر لیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے ہم بھی اس میں اپنا حصہ سمجھتے تھے یہ سُن کر حضرت صدیق رضؓ نے بچشم پرُنم معذرۃً کچھ کہا تو علی رضؓ نے فرمایا کہ آپ رات کے وقت تشریف لائیں میں بیعت کر لوں گا چنانچہ اسی روز آپ نے بیعت کر لی۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے چھ ماہ بعد بیعت کی۔ مگر درایۃً اس روایت پر یہ اعتراض ہے کہ چھ ماہ تک بیعت نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جو ایک طرف حضرت علیؓ کی شان سے بہت بعید ہے کہ آپ جیسی تقدس مآب، بہترین خیر خواہ اسلام و مسلمین ہستی باقاعدہ منتخب شدہ خلیفہ سے بیعت نہ کرے دوسری طرف حضرت صدیق بلکہ عامۃ المسلمین اسے گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ چھ ماہ تک حضرت علی کی سی اہم شخصیت کو ان کی بیعت سے انکار رہا اور روایۃً دو تین حدیثیں ہیں جو اگرچہ بخاری و مسلم میں مروی نہیں ہیں۔ مگر وہ انہی دونوں کے شرائط پر ہیں انھیں حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور سیوطی نے تاریخ الخلفاء اور ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں بیان کیا ہے ایک روایت تو یہ ہے کہ جب واقعہ سقیفہ کے دوسرے روز عام جلسے میں حضرت صدیق نے ایک مختصر سا خطبہ دیا اور کہا کہ میں خلافت کا خواہاں نہ تھا۔ میری مرضی کے خلاف اتنے بڑے کام کا طوق میری گردن میں ڈالدیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ تو حاضرین نے اسے خموشی سے سُنا۔ البتہ علی و زبیر نے کہا کہ ہم کو اس بات پر برہمی تھی کہ مشورے کے وقت ہمیں نظر انداز کیا گیا ورنہ ہم میں بلا شبہ رسول اللہؐ کے بعد امارت کے مستحق ابوبکر ہی ہیں وہ صاحب غار اور ثانی اثنین ہیں ہم اُن کے شرف و عظمت سے واقف ہیں۔ رسول مقبولؐ نے نماز کی امامت کا حکم اپنی عین حیات ہی میں دیا تھا۔ انتہیٰ۔ ابوبکرؓ نے منبر پر چڑھ کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور حضرت علی رضؓ کو نہ پا کر اُن کی بابت پوچھا تو انصار ان کو بلا لائے۔ حضرت صدیق نے کہا کہ آپ رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی اور داماد ہو کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ تو حضرت علی نے کہا کہ ملامت نہ کیجئے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت صدیق رضؓ سے بیعت کر لی۔ (انتہیٰ) یہ حدیث بھی صحیحین کے شرائط کے مطابق ہے۔ ابن کثیر نے ان حدیثوں کو بیان کر کے حدیث بخاری کے ساتھ اس طرح تطبیق دی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت صدیق رضؓ سے دوبار بیعت کی۔ پہلی بار تو واقعہ سقیفہ کے دوسرے روز۔ اسے بیعت عام کہا جاتا ہے دوسری بار حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے انتقال کے بعد چھ ماہ تک پبلک سے غائب اور خلیفۃ الرسول کے تعاون سے باز رہنے کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے بیعت کی اور وہ بیعت رضا ہے۔

قصۂ فدک

یہ قصہ بھی فریقین کے درمیان بڑا معرکۃ الآراء بن گیا ہے۔ باغ فدک کی آمدنی کو رسول مقبولؐ نے اپنے اہل و عیال کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ جو بچتا وہ یتامیٰ، مساکین، ابن السبیل وغیرہ پر خرچ فرماتے تھے۔ جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو میراث کا مسئلہ پیش ہوا جس کے حضرت عباس رضؓ، و حضرت علی رضؓ۔ و امہات المومنین اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ دعویدار تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا حضرت فاطمہ خود تشریف لے گئیں یا قاصد بھیجا۔ حدیث بخاری سے تو دوسری

لہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان نے برہان کے فروری ۱۹۵۶ء کے نمبر میں "صدیق اکبر سے حضرت علیؓ" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ یہ بحث اسی سے ماخوذ ہے۔

صریت ثابت ہوتی ہے ۔ دعوے کے جواب میں حضرت صدیق نے فرمایا کہ رسول مقبول ﷺ کے سب اعزہ واقارب کو میں اپنے اعزہ واقارب سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ چونکہ خود رسول مقبول ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ "ہم انبیاء کا گروہ کوئی چیز وراثت میں نہیں چھوڑتے جو چیز ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے " اس لئے میں اس جائداد کو کیونکر تقسیم کرسکتا ہوں البتہ رسول مقبول ﷺ کی زندگی میں اہل بیت کو جس قدر فائدہ پہنچتا تھا وہ اب بھی پہنچتا رہے گا۔ یہ جواب دینے کے بعد حدیث بخاری میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ فوجدت ولم تتکلم حتی ماتت مخالفین نے اس کے یہ معنی لئے ہیں کہ حضرت فاطمہ اس قدر غصے ہوئیں کہ ابوبکرؓ سے کبھی نہیں بولیں یہاں تک کہ انتقال فرما گئیں ۔ ہماری گزارش ہے کہ اگر حضرت فاطمہ حضرت صدیقؓ کے اس معقول اور مطابق شریعت جواب پر اس قدر ناراض ہوئیں کہ انھوں نے حضرت صدیق سے بولنا ترک کردیا تو نعوذ باللہ خاک بدہم خاتون جنت کے اعلیٰ کردار پر حرف آتا ہے ۔ فرض کیجئے کہ اس چودھویں صدی میں بھی جبکہ دینداری کی حالت ناگفتہ بہ ہے اگر کسی پرہیزگار پاکباز پابند شریعت خاتون کا باپ کچھ جائداد چھوڑ کر مرجائے ۔ اور اپنے کسی مخلص اور صادق القول دوست کے سامنے جائداد کے ایک حصے کو وقف کردے جس کا اس کی بیٹی کو علم نہ ہو۔ اور وہ دوست متوفی کی بیٹی سے کہے کہ فلاں جائداد کو تو تمہارا متوفی باپ میرے سامنے وقف کرگیا ہے ۔ تو قارئین کرام ذرا سوچیں کہ اس خاتون پر کیا اثر ہوگا کیا وہ بحذبہ کہ یہ اس حصہ جائداد کو وقف نہ ہونے دے گی یا خدا رسول ﷺ کی خوشنودی کے لئے اپنے والد متوفی کے حکم کی تعمیل کرنے میں اپنی سعادت دارین سمجھے گی ۔ اگر وہ خاتون درحقیقت پرہیزگار ۔ پابند شریعت فی سبیل اللہ بے دریغ خرچ کرنے والی ہے تو وہ ہرگز ہرگز چون وچرا نہ کرے گی تو کیا رسول مقبول ﷺ کی صاحبزادی سیدۃ النساء خاتون جنت جو سائلوں کو سارا کھانا کھلا کر دو تین روز تک متواتر روزے رکھتی تھیں اپنے پدر بزرگوار فداہ روحی کی حدیث مبارک کو سن کر تعمیل حکم میں اپنے دل میں ذرہ برابر ملال لاتیں ۔ معاذاللہ وحاشا وکلا۔ بلکہ آپ خوش ہوئی ہونگی کہ بحمداللہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایسا شخص مسند آرائے خلافت ہوا ہے جو رسول مقبول ﷺ کے حکم کی سرمو بھی خلاف ورزی نہیں کرتا ۔ اگر خلیفۃ الرسول وہ جائداد اپنی اولاد کو دیدیتے یا اپنے ذاتی تصرف میں لاتے تو ضرور ملال کی بات تھی ۔ آپ نے تو یہ فرمایا کہ جو کچھ رسول مقبول ﷺ کے زمانے میں ملتا تھا وہ اب بھی ملتا رہے گا البتہ اس کی ملکیت اب بیت المال کی طرف منتقل ہوگئی ہے اگر یہ توجیہہ صحیح اور تسکین بخش ہے تو وَجَدَتْ کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے سوال کرنے کی غلطی کا احساس کیا اور پھر آپ نے اس بارے میں کبھی کسی قسم کی گفتگو نہیں کی (یہ مفہوم ہے راقم متکلم کا) جناب ثناء اللہ پانی پتی السیف المسلول میں لکھتے ہیں :۔ "وجدت لفظیست مشترک درچند معنے ۔ بمعنے غَضِبَتْ (غصے ہوئیں) ندمت (نادم ہوئیں) واغتمت (رنج کیا) آمدہ کذافی نہایۃ الجزری ۔ اینجا راوی وَجَدَتْ را بمعنی ندمت یا اغتمت استعمال کردہ وبعضے رواۃ کہ روایت حدیث بمعنے کردند وَجَدَتْ را بمعنے غضبت فہمیدہ ہمان قسم یاد داشتہ ومعنی این حدیث درحقیقت آنست کہ چون فاطمہ جواب ابوبکر شنید وباستماع حدیث پیغمبر دریافت کرد کہ سوال میراث خلاف شریعت واقع شدہ ندامت کشید ۔ یا غمگین شد کہ این فعل چرا از من ظہور شد ۔ علاوہ بریں حدیث صحیح ہے کہ مسلمان کو دوسرے مسلمان سے دو تین روز سے زیادہ مدت تک سلام و گفتگو ترک نہیں کرنا چاہئیے ۔ حضرت فاطمہ کا عمل خلاف حدیث کیونکر ہوسکتا تھا ۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ فدک کے بارے میں حضرت صدیق کا جو عمل درآمد تھا وہ حضرت حسین کے زمانۂ خلافت تک جاری رہا ۔ یعنی خاتون جنت کے نہ شوہر محترم نے بلحاظ خلافت نے اس میں کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ کی ۔ البتہ اموی عہد میں اس کی خلاف ورزی کی گئی مگر جب حضرت عمر بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تو انھوں نے پھر سابقہ عمل درآمد بحال کردیا شیعی عالم فاضل ابن میثم بحرانی نے نہج البلاغہ کی شرح مسمی بمصباح السالکین میں ایک طویل روایت بیان کی ہے ۔ اُس کا خلاصہ ہم بیان کرتے ہیں ۔ اس سے اس مسئلہ متنازعہ فیہا پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ "ابوبکرؓ نے جب حضرت فاطمہ کا کلام سنا تو کہا کہ اے عورتوں میں سب سے بہتر عورت ، اور باپوں میں سب سے بہتر باپ کی

جو مال رسول مقبولؐ کے پاس تھا وہ صدقہ اور مسکین وغیرہ چیزیں تو حضرت علی رضؓ کو دے دی ہیں۔ رسول مقبولؐ کو یہ فرماتے ہوئے میں نے سنا ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت سونا چاندی اور زمین اور جائداد میں کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑتے۔ ہم تو ایمان، علم و حکمت اور سنّت وراثت میں چھوڑتے ہیں۔ اس پر حضرت فاطمہ نے کہا کہ رسول اللہؐ نے وہ باغ مجھے ہبہ کر دیا تھا۔ ابوبکر رضؓ نے کہا کہ اس کا کون گواہ ہے تو علی اور ام ایمن نے گواہی دی۔ پھر عمر اور عبدالرحمٰن نے گواہی دی کہ رسول اللہؐ اس کی آمدنی تقسیم فرمایا کرتے تھے مجھے ابوبکر نے کہا کہ تم سب نے سچ کہا۔ اور یہ اس طرح کہ پدر بزرگوار کی چیز آپ ہی کی ہے۔ رسول مقبولؐ فدک کی آمدنی سے آپ کی خوراک کا انتظام کر کے جو بچتا تھا لے کے تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ اور جو کچھ خدا کی راہ میں دے دیا کرتے تھے۔ اور میں آپ سے عہد کرتا ہوں کہ میں بھی ایسا ہی کرتا رہوں گا۔ اس پر حضرت فاطمہ راضی ہو گئیں اور عہد کروا لیا (فرضیت بذالک واخذ العہد علیہ) ابوبکر فدک کی آمدنی سے بقدر کفایت حاجت آپ کو دیتے رہے اور پھر خلفائے ثلاثہ بھی ایسا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ معاویہؓ کے زمانے میں امام حسنؓ کے بعد تیسرا حصہ مروان کو ملتا رہا اور خود مروان کے زمانۂ خلافت میں ساری جائداد خالصہ ہو گئی۔ تا اینکہ عمر ابن عبدالعزیز نے جائداد پھر اولادِ فاطمہ کو لوٹا دی۔ جس پر شیعہ تو کہتے ہیں کہ یہ پہلا غصب کردہ مال ہے جو اس نے لوٹایا اور اہل سنّت کہتے ہیں اس نے خالصہ کر کے ان کو بخش دیا۔ انتہی۔ اس روایت سے حضرت فاطمہ کا حضرت صدیق کے فیصلے سے راضی ہو جانا ظاہر ہے۔

حضرت علی کا خلفائے ثلاثہ کے ساتھ تعامل و تعاون

حضرت علیؓ کے تعلقات خلفائے ثلاثہ کے ساتھ حد درجہ مخلصانہ اور ہمدردانہ تھے۔ آپ نے ان کے ساتھ ہر طرح تعامل کیا۔ جب حضرت فاروق رضؓ نے فارس و روم کی مہموں پر جانے کے بارے میں حضرت علی رضؓ سے مشورہ کیا۔ تو آپ نے از راہِ صدق و صفا مہموں پر جانے کی مخالفت کی اس کا ذکر نہج البلاغت کے دو خطبوں میں موجود ہے۔ حضرت عمر رضؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر علی رضؓ نہ ہوتے تو عمر رضؓ ہلاک ہو جاتا۔ حضرت علی رضؓ نے حضرت عثمان کے فتنۂ شہادت میں آپ کی ہر طرح مدد کی۔ اور پھر اپنی عدم موجودگی میں اپنے صاحبزادوں کو مدافعت کے لئے مقرر کیا۔ حضرت علی رضؓ نے حضرت فاروق رضؓ کی درخواست پر اپنی صاحبزادی ام کلثوم کا نکاح کر دیا۔ اہل سنّت کے نزدیک تو یہ امر مسلّم ہے کہ ام کلثوم حضرت فاطمہ رضؓ کے بطن سے تھیں اور مخالفین متقدمین بھی تقریباً ایسا ہی سمجھتے ہیں البتہ متاخرین نے اس سے انکار کیا ہے مگر یہ انکار بدیں وجوہ غلط ہے۔

۱۔ کتاب کافی کلینی میں حضرت امام جعفر سے یہ روایت منقول ہے کہ ھو اول فرج غصبت منا (یعنی این اول فرجے است که از ما غصب شده) لفظ 'منا' سے ظاہر ہے کہ وہ حضرت فاطمہ کے بطن سے تھیں۔ اگر وہ بطن فاطمہ سے نہ ہوتیں تو 'منا' نہ کہا جاتا کیونکہ شیعہ حضرات کو حضرت فاطمہ ہی کی اولاد سے لگاؤ ہے۔

۲۔ نور اللہ شستری نے کتاب مجالس المومنین میں اس نکاح کا بدیں الفاظ اقرار کیا ہے، نبی دختر بعثمان داد و ولی دختر بعمر فرستاد۔

۳۔ مصائب النواصب میں لکھا ہے کہ محدثین کا اقرار ہے کہ یہ نکاح بجبر و اکراہ ہوا۔

۴۔ کتاب المؤقت میں ہے ان عمر لما خطب ام کلثوم واعتذر علی بصغرھا فقال عمر مالی حاجۃ الی النساء لکن ابتغی الوسیلۃ الی محمد وھو یقول کل سبب ونسب ینقطع بالموت الا سببی ونسبی فزوجھا علی ایاہ بمھر اربعین الف درھم فاتی ذالک کلہ عمر وھی ابنتہ اربع سنین وعمر ستین سنین فاحسبھا عمر الی جنبہ فرفع میزرھا ومسح یدہ علی راسھا وحجرھا فرمت بیدھا وکادت ان تلطمہ وقالت لولا انک امیر المومنین للطمت علی ضرک فقال عمر دعوھا فانھا ھاشمیۃ۔ (یعنی جب عمر رضؓ نے ام کلثوم کی خواستگاری کی اور علی رضؓ نے صغر سن کا عذر کیا تو عمر رضؓ نے کہا کہ مجھے عورتوں کی طرف کوئی رغبت

ہوں اپنے میں تو رسول مقبول ؐ کا وسیلہ یعنی رشتہ چاہتا ہوں۔ رسول مقبول ...
سبب و نسب منقطع ہو جاتے ہیں تو علی رضؓ نے چالیس ہزار درہم مہر پر نکاح کر دیا۔ عمر رضؓ نے ... ام کلثوم ...
اور عمر رضؓ ساٹھ سال کے۔ جب عمر رضؓ نے ام کلثوم کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور اس کا ازار اٹھایا ...
کھینچی تو ام کلثوم نے ہاتھ اٹھایا اور قریب تھا کہ عمر رضؓ کے منہ پر چانٹا مارے مگر بولی کہ اگر تو امیر المومنین نہ ہوتا ...
کہ بلکہ اسے چھوڑ دو کہ وہ ہاشمی ہے) اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ ام کلثوم حضرت فاطمہ کے بطن سے تھیں ورنہ رسول مقبول ؐ تک
سلسلۂ رشتہ داری کیونکر ہو سکتی تھی۔ دوسری بات اس سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ ام کلثوم باوجود صغر سنی کے حضرت عمر رضؓ کو امیر المومنین جانتی
تھیں۔ واقعہ کی اس شرمناک تفصیل پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے (اور اس قسم کی شرمناک تفصیل انہی کو زیب دیتی ہے جو محبت اہل بیت کے دعویدار ہیں۔ مترجم)

اس موقع پر ایک روایت یاد آتی ہے جو مولانا شبلی نے سیرۃ النعمان میں بیان کی ہے وہ یہ کہ امام ابو حنیفہ کے ایک شیعی دوست نے
آپ سے اپنی لڑکی کے لئے ایک مناسب بر تلاش کرنے کی ضرورت فرمائش کر رکھی تھی۔ ایک دن امام صاحب نے اپنے دوست سے کہا کہ ایک
شخص میری نظر میں ہے جو شکیل تندرست اور مال دار ہے اور وہ شادی کرنے کے لئے تیار ہے مگر ہے یہودی۔ یہ سن کر وہ دوست سخت
برہم ہوئے اور بولے کہ آپ میری لڑکی کے لئے ایک یہودی بر پیش کرتے ہیں آپ نے جواب دیا کہ کیا مضائقہ ہے آخر حضرت علی رضؓ نے بھی
تو اپنی لڑکی ایک یہودی (یعنی عمر رضؓ) کو بیاہ دی تھی۔ یہ سن کر وہ نادم و تائب ہوئے۔

حضرت صدیق رضؓ اور حضرت علی رضؓ

اہل سنت کے عقیدے کے مطابق افضل الصحابہ حضرت صدیق رضؓ پھر حضرت فاروق رضؓ پھر حضرت ذوالنورین اور پھر حضرت علی مرتضیٰ ہیں۔ شاہ ولی اللہ
کہتے ہیں کہ افضلیت سے مراد افضلیت بہمہ وجوہ نہیں ہے بلکہ اسلامی خدمات صرف وجہ افضلیت ہیں یعنی سب صحابہ اور ان چاروں میں
سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمتیں حضرت صدیق رضؓ سے ظہور پذیر ہوئیں آپ نے سب سے پہلے نبوت کی تصدیق کی۔
آپ نے دوران قیام مکہ میں طرح طرح کی تکلیفیں اور ایذائیں اٹھائیں۔ مگر کسی طرح رسول مقبول ؐ کی مدد کرنے سے نہ رکے۔ آپ
کی کوشش سے شروع میں چالیس کے قریب لوگ ایمان لائے۔ آپ نے کئی مسلمان غلاموں کو خرید کے آزاد کیا۔ ہجرت کے موقعہ پر آپ اول
سے آخر تک رسول مقبول ؐ کی خدمت میں حاضر رہے۔ قرآن پاک میں آپ کو صاحب (الرسول) کہا گیا۔ اسی ہجرت میں حضرت صدیق رضؓ کی
زوجہ مکرمہ اسماء اور صاحبزادے عبد الرحمٰن کی خدمات محتاج بیان نہیں۔ حضرت عبد الرحمٰن باوجود دشمنوں کی سخت نگرانی کے غار ثور
تک طعام پہنچاتے رہے کوئی شک نہیں کہ حضرت علی کا یہ کارنامہ بھی بڑا زبردست ہے کہ آپ وقت ہجرت صبح تک رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے بستر پر سوتے رہے مگر معاملہ کی یہ نزاکت ملحوظ رہنی چاہیئے کہ وہ صرف ایک رات یا چند گھنٹوں کا نازک و پرخطر معاملہ تھا
اور ہجرت میں حضرت ابو بکر صدیق کی رفاقت مسلسل شبانہ روز کے خطروں کا معاملہ تھا اور حضور ؐ کی رفاقت کے لئے صدیق رضؓ نے اپنے
پورے گھرانے کو خطرات میں مبتلا کر دیا۔ حضرت صدیق رضؓ ہمیشہ مالی مدد دیتے رہے۔ حضرت علی رضؓ مالی مدد دینے کے لائق نہ تھے۔ خود جناب رسالت
مآب نے اعتراف فرمایا ہے کہ مجھ پر صحبت و مال کے لحاظ سے ابو بکر کا سب سے زیادہ احسان ہے۔ آپ رسول مقبول ؐ کی محبوب ترین زوجہ مطہرہ کے والد
ماجد تھے۔ آپ کو رسول اللہ ؐ نے اپنے حین حیات نماز کی امامت کا شرف بخشا۔ پہلے حج الاسلام کے امیر بنائے گئے۔ رسول مقبول ؐ کی وفات پر
باجماع اہل حل و عقد آپ خلیفۃ الرسول مقرر ہوئے۔ زمانہ خلافت کے دو کارنامے خاص طور پر نمایاں ہیں ایک تو اہل ردت کا استیصال،
دوسرا کارنامہ قرآن کو جمع کرنا۔ انتقال فرمانے پر حجرۂ عائشہ میں حضور ؐ کے قریب دفن ہوئے۔ یہ سعادت بجز فاروق رضؓ کے کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی
حضرت علی رضؓ کے ذاتی فضائل بہت ہیں وہ رسول مقبول ؐ کے چچا زاد بھائی۔ آپ کی عزیز ترین دختر کے شوہر مکرم۔ شجاعت و فصاحت

کی بے نظیر تدبر، فاتح عجم، صاحب ذکا انسان تھے، عابد و زاہد متقی و خدا ترس [illegible] خلفاء راشدین کے
حالات پڑھ کر جس رائے پر پہنچے ہیں اُن میں سے صرف ایک مستشرق کی رائے یہاں درج کی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہم جب پیغمبر پر ایمان لانے والوں میں ابوبکر و عمر رض جیسے تجربہ کار اور ہوشمند لوگ دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ پیغمبر اپنے مشن میں اپنے نزدیک سچے تھے نہ اُن کے دماغ میں خلل تھا اور نہ دھوکا اور فریب تھا۔ بالفاظ دیگر آں حضرت صلعم کی صداقت کی دلیل مستشرقین کے نزدیک شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کا آپ پر دل و جان سے ایمان لانا ہے۔ حضرت علی رض کی بابت عام یورپی مورخین کی رائے یہ ہے کہ وہ بحیثیت خلیفہ ہونے کے ناکام رہے۔

تاریخ عرب کا مشہور مصنف پروفیسر ہٹی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ خلیفہ اول کا انتخاب عرب دستور کے مطابق ہوا۔ اگر رسول م بیٹا بھی چھوڑتے تو بھی مسئلہ حل نہ ہوتا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: پیغمبر نے نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔ ایک لڑکی زوجہ علی رض زندہ رہی۔ مگر عرب میں سرداری و سربراہی موروثی چیز نہ تھی۔ بلکہ قبائلی رسم و رواج کے مطابق انتخابی چیز تھی۔ لہٰذا اگر پیغمبر کے لڑکے پیچھے نہ بھی مرجاتے تب بھی مسئلہ حل نہ ہوتا۔ پروفیسر نکلسن تاریخ ادبیات عرب میں لکھتا ہے کہ پیغمبر م نے کوئی بیٹا نہیں چھوڑا۔ یہ اس قدر اہم بات نہ تھی جس قدر یہ بات کہ آپ نے اپنا جانشین مقرر کرنے میں تغافل یا انکار کیا۔ ایک طرف عرب موروثی جانشینی سے ناواقف تھے اور دوسری طرف عترت رسول کے آسمانی حق خلافت کا عقیدہ ہنوز پیدا نہیں ہوا تھا۔ عرب کے عمل درآمد کے مطابق مسلمانوں کو اپنا سربراہ منتخب کرنا چاہیے۔ تمام صحابہ میں صرف تین شخص ایسے تھے جو خلیفہ ہو سکتے تھے۔ ایک ابوبکر جن کی صاحبزادی پیغمبر کی محبوبہ ہوتی تھی۔ دوسرے عمر رض تیسرے علی رض جو ابوطالب کے لڑکے اور حضرت فاطمہ کے شوہر تھے اور جو پیغمبر کے ساتھ خونی و ازدواجی دونوں قسم کے رشتے رکھتے تھے۔ ابوبکر رض کو پیغمبر م کی نبوت کی سچی دل سے تصدیق کرنے پر 'صدیق' کا خطاب مل چکا تھا آگے چل کر حضرت علی رض کی بابت لکھا ہے کہ اُن میں حکمرانی کے اوصاف مانند قوت فیصلہ اور دور بینی کے سوا سب خوبیاں تھیں وہ ایک بہادر جنگجو، مشیر دانا۔ دوست صادق اور دشمن فیاض تھے!

اہل سنت حضرت علی رض کے سب فضائل و اوصاف کو دل سے مانتے ہیں اور حضرت علی رض کے اس مشہور قول پر کہ هلك فيّ رجلان محب غال و مبغض قال ...... (مجھ میں دو طرح کے آدمی ہلاک ہوئے ایک تو وہ جو میری محبت میں غلو کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو کینہ اور بغض رکھنے والے ہیں) پر عمل پیرا ہیں۔ اور یہ حضرت علی رض ہی کی ذات بابرکات کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ عترت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ نہ ہم مخالفین خلفائے راشدین کی طرح ان کی محبت میں غلو کرتے ہیں اور نہ نواصب و خوارج کی طرح معاذ اللہ ان کو برا بھلا کہتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ع گر فرق مراتب نکنی زندیقی

دُرِ نجف



مزید تفصیلات ٹائٹل کے کسی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

جسے صرف مریض ہی آنکھوں والے نہیں، بلکہ صحت مند آنکھوں والے بھی استعمال فرماتے ہیں۔ کیونکہ یہ بینائی کو گھٹنے نہیں دیتا۔ اپنے یہاں کے ایجنٹ سے خریدیئے۔ اس میں ڈاک خرچ کی بچت ہوگی۔ نہ ملے تو براہ راست نیچے لکھے ہوئے پتہ سے طلب کیجئے۔

تین شیشی یکجا منگانے پر ڈاک خرچ معاف

دار الفیض رحمانی دیوبند (یو۔پی)

مختلف شہروں میں ہمارے ایجنٹ

محمد علی صاحب لکھنوی تاجر عطر متصل مسجد مچھلی کمان۔ پوسٹ جوبلی حیدر آباد دکن ● سلطان احمد خاں جنرل کیپ میکر ۱۰۶ مسجد عرب لائن۔ بمبئی ۸ ● افضل جنرل اسٹور کتاب گھر ہنمکنڈہ ورنگل دکن ● مفید عام دواخانہ پکھی۔ رام گڑھوا چمپارن ● حافظ غلام رسول عربیہ مدرسہ دبیر چکلی۔ بلڈانہ ● عبد الحمید عزیزی ۱۴۵ ایکسچینج چندر سین اسٹریٹ کلکتہ ● سید محمد یونس صاحب رحمانی جل کوڑہ۔ مونگیر (بہار) ● بابا اینڈ کمپنی۔ سدی پیٹھ۔ میدک (آندھرا پردیش) ● محمد تمیم الاسلام معرفت محکمہ سنی دینیات۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ ● سید عبد الغفار صاحب منیجر جمہور لائبریری مومن پورہ گل برگہ دکن ● حکیم حافظ مختار احمد صاحب۔ ڈاکخانہ نرور شیوپوری۔ گوالیار ● عثمانیہ بکڈپو ۱۸۱ لور چیت پور روڈ کلکتہ ● محمد معین الدین کرانہ مرچنٹ۔ بچھبیر۔ مونگیر (بہار) ● ڈاکٹر مہدی حسن صاحب بصری۔ ہومیوکیمسٹ۔ لکھمینیہ بازار (بہار) ● مولانا امام الدین تاجر عطر۔ پکی مسجد اکولہ۔ برار ● محمد نعمان صدیقی صاحب۔ کوسیارہ۔ پلاموں۔ (بہار) ● محمد امیر الدین خاں۔ بریاتو۔ رانچی (بہار) ● منیجر آزاد بکڈپو۔ نزد بس اسٹینڈ ہندوپور (آندھرا پردیش) ● مولوی سرفراز خاں۔ معرفت ایس۔ ایس قیوم اسٹیشن بازار۔ تانڈور۔ حیدر آباد دکن ● مولوی بشیر احمد۔ ایجنسی ہمدرد دواخانہ مئو [illegible] اعظم گڈھ ● حاجی رحمت اللہ صاحب جنرل مرچنٹ چوک سلطانپور (یو۔پی) ● حکیم اسٹریٹ۔ پرانا بس اسٹینڈ۔ مالیگاؤں۔ ناسک ● سمیع الدین رشیدی کتب خانہ۔ چترا۔ ہزاری باغ (بہار) ● عبد العزیز شیخ نظام اسٹور۔ جمہوریہ بازار۔ بردوان۔ بنگال ● نور الاسلام۔ ایکس ڈرافٹ مین۔ میونسپل آفس۔ مونگیر۔ (بہار) ● غلام حسین محمد بھائی گھی والا۔ محلہ ڈوگرا واڑ۔ بھروچ (گجرات) ● ایچ۔ این۔ اینڈ سنز اسپورٹس گوڈس ڈیلر۔ نظام آباد دکن ● شہاب الدین تہا گجرات کرانہ اسٹور 3-8-1-33 نزد باکلیا میل۔ میتھی پور روڈ۔ احمد آباد ۸ ● حاجی افسر محمد مظہر ہینڈلوم شارٹنگ و بیڈشیٹ مرچنٹ۔ پینٹ پور۔ سیتا پور (یو۔پی) ● راجہ مولی اینڈ سنز جنرل مرچنٹ۔ سرپور۔ کاغذ نگر دسی ریلوے ● محمد کپور۔ محلہ ٹیلا میدان روڈ مظفر پور (بہار) ● ندیم بکڈپو سیوہارہ بجنور

مستقل عنوان

مسجد سے میخانے تک

از مُلّا ابنُ العرب مکّی

بات کئی مہینے کی ہو گئی مگر مزا آج بھی پورا دیگی اگست میں، یعنی اب سے چار ماہ پہلے اتر پردیش کا وزیر اعلیٰ کون تھا یہ راز اہل سیاست جانیں۔ ت وی تو اتنا ہی جانتا ہے کہ ہر صوبے کی قسمت میں ایک نہ ایک وزیر اعلیٰ ہر آئینہ لکھا ہوا ہے اور ہم جیسے عوام کالانعام کو اس سے زیادہ کسی بات سے دلچسپی نہیں کہ آٹے دال کا بھاؤ جو کل تھا وہی آج ہے، بلکہ انڈا مرغی کی قیمتوں میں آل انڈیا پیمانے پر اضافہ ہو گیا ہے۔

تو اگست میں وزیر اعلیٰ اُتر پردیش نے یوتھ سیمنار (آگرہ) کے طلباء اور نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"اے دیش کے نونہالو! لڑکیوں کا پیچھا کرنا چھوڑ دو اور اپنے کردار کے لئے کوئی شریفانہ ضابطہ قبول کرو۔"

یہ سُنتے ہی ایک ہونہار طالب علم نے دوسری ہونہار طالبہ کو اتنی صفائی سے آنکھ ماری تھی کہ وزیر اعلیٰ کے فرشتوں تک کو خبر نہ ہو سکی تھی اور ایک شاعر قسم کے نوجوان نے تو پہلو میں کھڑی ہوئی مس سلیم کے بازو میں چٹکی لے کر یہاں تک کہہ دیا تھا:۔

پچھلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

مس سلیم کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ لہرائی تھی اور اس نے پاس کھڑی ہوئی شیلا سے تمسخر کے انداز میں کہا تھا:۔

"سُن لیا تو پنڈت جی کیا فرما رہے ہیں۔"

شیلا نے اپنے گلنار ہونٹوں پر نفرت کا خم پیدا کرتے ہوئے جواب دیا تھا — "کریک ہے!"

وزیر اعلیٰ نے مزید فرمایا تھا:۔

"لڑکیوں کا تعاقب ایک بھیانک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس میں انحطاط کی بجائے روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔"

یہ سُنتے ہی جنتا کالج کے ہونہار اسٹوڈینٹ دوآرکا ناتھ کو کچھ یاد آ گیا تھا اس نے پاس بیٹھے ہوئے دلیپ سے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا:۔

"ابے ہاں وہ کل کیا رہا؟"

"تقریر سنو۔ پھر بتاؤں گا۔"

"ابے سُن لی تقریر۔ ایسی تقریریں میں دن میں ایک درجن کر دوں۔ بتا نا کیا رہا تھا؟"

"یار کام بنتے بنتے بگڑ گیا" دلیپ نے کہا "کرشنا روڈ پہ میں نے اسے جا لیا تھا۔ کہنے لگی آپ کی تعریف؟ میں نے کہا

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا
تم کو حسیں بنایا مجھ کو جواں بنایا

وہ مسکرا کے بولی۔ آپ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ پھر عرض کیا کہ آئیے سن لائٹ کیفے میں کچھ پی لیں۔ وہ قدرے تامل کے بعد راضی ہو گئی۔ ہم کیفے پہنچے۔ ایک دوسرے کے نام پوچھے۔ وہ شانتی کالج میں پڑھتی ہے۔ نلنی نام ہے — ہے نا پیارا نام؟"

دلیپ جواب کے انتظار میں ٹھیر گیا۔ دو آر کا جلدی سے بولا:۔

"ابے ہاں نام تو پیارا ہے مگر پھر ہوا کیا؟"

"ہوا یہ کہ اچانک ایک ایسا نوجوان وہاں آگیا جسے دیکھ کر نلنی چونک گئی اور پھر میرے پاس سے اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ وہ بولا۔ "ہیلو نلنی! تم یہاں؟"

نلنی نے گھمن سے کچھ جواب دیا جسے میں نہ سن سکا اور پھر وہ دونوں فیملی روم میں گھس گئے۔ وہاں سے بار بار ان کے قہقہوں کی آواز آتی رہی۔ میں انتظار کرتا رہا۔ نصف گھنٹے بعد وہ نکلے۔ پورچ میں ایک شاندار کار کھڑی تھی۔ دونوں اس میں بیٹھ یہ جا وہ جا۔

"ابے بیٹا تو بدھو ہی رہا۔ کم سے کم اگلی ملاقات کے لئے تو اپائنٹمنٹ کر لیا ہوتا۔"

"کہاں سے کر لیتا۔ موقع کب ملا۔ خیر جائے گی کہاں۔ شانتی کالج دور نہیں ہے۔"

اتنے میں وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی مقدس آواز پھر ابھری۔ وہ قلب و روح کی تمام پاکیزگی کو الفاظ میں سمیٹتے ہوئے دلگداز لہجے میں فرما رہے تھے:۔

"جب سے پردہ سسٹم ختم ہوا جنسی انارکی کا بازار بھی زور پکڑ گیا ہے اور طلباء نے خواتین کی آزادی کے نئے تجربات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔"

"اس پر رام لال نے ہرلیش چندر کے کان میں کہا:۔

"سنا ایڈیٹ! شری مان کیا فرما رہے ہیں۔"

ہرلیش بڑا شرمیلا خالص برہمچاری قسم کا لڑکا تھا۔ لڑکے اسے بھگت جی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ پچھلے دو سالوں میں اسے ایک بھی عشق کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ عشق تو پھر عشق ہے وہ احمق تو رومان تک کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ لڑکیاں اسے مولوی صاحب کہتیں۔ جھنجھوڑتیں، طعنے دیتیں مگر اس کے زہد کی برف کسی طرح نہ پگھلتی۔ ایک مرتبہ پانچ چھ لڑکیوں نے پروگرام بنا کے اسے جوبلی پارک میں گھیر لیا تھا۔ کسی نے کتابیں چھینیں، کسی نے پہلو میں چٹکی لی، کسی نے سر میں مالش شروع کر دی۔ وہ عاجز آ کے کہنے لگا:۔

"تم آخر مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

سب نے قہقہہ اڑایا۔ پھر مس ناز لہرا کے کہنے لگیں:۔

"سن رہی ہو بہنو۔ مولوی صاحب پوچھ رہے ہیں ہم ان سے کیا چاہتے ہیں۔"

فوراً ہی پھر ایک قہقہہ لگا۔ گویا ہرلیش کا پوچھنا ایسا ہی لطیفہ تھا کہ اس پر جی بھر کے ہنسا جائے۔

"بتا دو نا بیچارے کو ہم کیا چاہتے ہیں۔" مس ونملا نے فلمی انداز میں فرمایا:۔

"مفت کیسے بتا دیں" سوشیل بولی "مولوی صاحب پکچر دکھانے کا وعدہ کریں تو ضرور بتا دیا جائے گا۔"

"ویری گڈ، یہی میں بھی کہنے والی تھی۔"

"وعدے سے کام نہیں چلے گا" ونملا بولی "ٹکٹوں کا پیمنٹ ابھی ہوگا۔"

"ہاں ہاں تو مولوی صاحب کو کب انکار ہے"۔ یہ کہتے کہتے مس نازو نے ہرلیش کی جیبوں پر حملہ کر دیا۔

ہرلیش بیچارا سچ مچ بیچارا ہو کر رہ گیا تھا۔ کون کیا کہہ رہا ہے یہ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو ایک عجیب طرح کی وارفتگی میں گم تھا جس کے دھارے میں اس کے اعصاب ایک نئی برقی کیفیت کا احساس کر رہے تھے۔ ایک ایسی کیفیت جس سے اس کے احساسات پہلے کبھی روشناس نہیں ہوئے تھے جب وہ کبھی کبھی ماں کے سینے سے لپٹا تھا تو اس طرح کی کیفیت اسے محسوس نہ ہوئی تھی۔ پھر جوان بہن کے نرم و گداز ہاتھ بھی بارہا اس کے ہاتھ میں آئے تھے اور ان ہاتھوں کو انتہائی محبت ساتھ اس نے دبایا بھی تھا۔ ابھی کچھ روز پہلے گھر سے یہاں آتے وقت بہن نے اپنا رخسار بھی اس کے سینے پر رکھ دیا تھا اور اس کا ایک بازو بھی اس کی کمر کے گرد حمائل ہو گیا تھا، لیکن کوئی سنسنی کوئی چونکاہٹ، کوئی نئی کیفیت باطن میں نہیں کسمسائی تھی لیکن آج ان شریر لڑکیوں کے دست و بازو کا لمس اور اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے مس ناز کے سانسوں کی باس اور جسم کے

مختلف حصوں کی رگڑ ایک جو یدکیفیت کی جنم داتا بن گئی تھی۔ جیسے برف پگھل رہی ہو، جیسے نس نس میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ جیسے احساس کا قافلہ کسی نئی وادی میں داخل ہو رہا ہو۔

تو یہ تھا ہرش۔ رام نے پھر کہا۔

"ابے سُنا نہیں، وزیر اعلیٰ نے کیا فرمایا۔"

"سُن لیا۔ تمھیں سبق لینا چاہیئے۔"

"ابے دا۔ سمجھا بھی کیا کہہ گئے ؟"

"خوب سمجھا۔ طلباء نے خواتین کی آزادی کے نئے تجربات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"تو یہ تم جیسے برہمچاریوں سے کہا ہے یا ہم سے ؟۔ ہم تو نت نئے تجربوں میں آگے آگے ہیں !"

"اسی کا نام تو جنسی انارکی ہے۔"

"تیرا دماغ خراب ہے۔ ایسے یہ جو لونڈیاں میک اپ کرتے کرتے مری جا رہی ہیں تو کیا یہ اس لئے ہے کہ ہم سب رام کے بھگت بن جائیں۔"

"نہیں تو کیا اس لئے ہے کہ بدمعاشیاں پھیلائیں !"

"ڈفر ! پرانی اصطلاحوں میں بات مت کرو۔ رومان اور بدماشی میں فرق ہے۔"

"ہوگا۔ مگر نتیجہ یکساں ہے۔ خبر ہے مس پرمیلا پر کیا گذری ؟"

"کچھ نہیں گذری فقط ایک بچے کی ماں بن گئی۔"

"تو اس کی تمھاری نظر میں کچھ اہمیت نہیں ؟"

"کیسی اہمیت۔ ہر سانس دنیا میں ہزاروں عورتیں ماں بنتی ہیں۔ پرمیلا ہی نے کونسا اچنبھا کیا۔"

"بدتمیز کہیں کے۔ پرمیلا تو کنواری ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ عورتیں بہرحال بچے ہی جننے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔"

"لعنت ہے تم پر۔ مجھ سے بات مت کرو !"

"تم مولویوں کا یہی طریقہ ہے جب جواب نہیں بنتا تو نخرے دکھلاتے ہو۔"

کئی لڑکوں نے قہقہہ اڑایا۔ کئی لڑکیاں بھی ان کی شریک ہوگئیں۔ بیچارے وزیر اعلیٰ تو وعظ و پند کے موتی لُٹا رہے تھے مگر ان کے فرشتے اُچک اُچک کر دیکھ رہے تھے کہ طلباء کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ اسی موقع پر وزیر اعظم پنڈت نہرو کے فرشتے بھی سیاہ ابھر کے یہیں پہنچے۔ وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ محض ایک صوبے کا وزیر پردہ سسٹم کی تائید میں بولے جبکہ پورے ملک کا وزیر اعظم پردہ سسٹم کو ایک لعنت 'ایک جہالت' ایک لغویت تصور کرتا ہے۔

"کیوں جناب یہ کیا ؟" وزیر اعظم کے فرشتوں نے وزیر یو پی کے فرشتوں سے اعتراضاً کہا۔ موخر الذکر نے مسکرا کر جواب دیا :-

"کچھ نہیں محض تکلف !"

"یعنی کہ محض تکلف کیا ؟"

"بس یہی کہ تکلف !"

"وہی تو ہم پوچھتے ہیں تکلف کس چڑیا کا نام ہے ؟"

"خفا نہ ہوجئے آپ تو وزیر اعظم کے فرشتے ہیں۔ وہ اتنے مقبول ہیں کہ اگلے الیکشن کے لئے انھیں کسی ایکٹنگ کی ضرورت نہیں۔ مگر ہم تو ٹھہرے محض صوبائی وزیر کے فرشتے صوبائی وزیر اگر وقتاً فوقتاً خود کو پوز نہ کریں تو عاقبت کی تباہی سے کون بچائے گا۔"

"اوہ یہ بات ہے" وزیر اعظم کے فرشتوں نے مسکرا کر کہا "تب تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر دیکھئے ایسا نہ ہو کہ ایکٹنگ ہی ایکٹنگ میں اُس نئے سوشلسٹ سماج کو نقصان پہنچ جائے جس کی تخلیق وزیر اعظم کر رہے ہیں۔"

"کمال کرتے ہیں آپ" وزیر یو پی کے فرشتوں نے ٹھٹا لگایا "اجی جناب کہیں ہاتھ کرنے سے مردے جیتے ہیں ..... م مگر یہ مثال تو فِٹ نہ ہوئی ... خیر مثالوں پر لعنت بھیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تلوار چل جاتی ہے تقریریں نہیں چلتیں۔"

"کیا بات ہوئی" وزیر اعظم کے فرشتوں نے تیوری پہ بل ڈال کے کہا۔

"ارررر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔"

"جو کچھ کہنا ہے پارلیمانی زبان میں کہو ۔ یہ شاعری کہاں سے سیکھی۔"

وزیر یو پی کے فرشتے کچھ فخر کچھ حیا سے دوہرے ہو گئے پھر شرمیلے لہجے میں کہنے لگے :۔

"معاف کیجئے گا ہمارے وزیر یو پی شاعر بھی ہیں۔"

"اچھا ۔ ۔ ماشاء اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ م مگر شاعری اور وزارت میں کیا ربط ہے؟"

"جی ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ یہ ہم سکریٹری صاحب سے پوچھ کے بتائیں گے ۔"

پھر سیمنار ختم ہو گیا ۔ اگلی شام کو طلباء کی ایک ٹولی ۔ جس میں پانچ لڑکے تھے اور سات لڑکیاں ۔ بلدرنگ کی گلپوش پہاڑیوں کی طرف پکنک کے لئے جارہی تھی ۔ زبانوں پر یہ سدا بہار نغمہ تھا :۔

نشے میں چور شہر سے دُور ٹولی ہے دل والوں کی
ملّا پنڈت بکتے ہیں مت مانو ان سالوں کی

بلدرنگ کی گلپوش پہاڑیوں کا سماں ناقابلِ بیان ہے ۔ یہاں کنج کنج میں حسن و عشق اُگتے ہیں، رومان لہلہاتا ہے، روحانیت جنم لیتی ہے اور ملا ابن العرب کی کبھی کبھی اُکڑوں بیٹھ کر یہاں اپنے ملک، اپنے سماج، اپنی سنسکرتی، اپنے علم الاخلاق، اپنے کلچر، اپنی ثقافت، اپنے لیڈران کرام کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر غور کرتا ہے ۔ لیکن جب بہت سارے مسئلے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ریشہ دھاگا بن جاتے ہیں تو گولڈ فلیکس کا سگریٹ جلا کر اُفق کے اُس پار تکتا ہے جہاں دُور بہت دُور حسن و عشق کی پریاں ملہار گا رہی ہیں ۔ ملہار میں کبھی کبھی قوالی کے سُر مل جاتے ہیں تو کانوں سے معدے تک چاندی سی پگھلتی چلی جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ فاتحہ دلائی ہوئی پلاؤ کی گرم گرم قاب آسمان سے اُتر آئے ۔ ملّا کو صوفی سرشار علی نے قسم کھا کے بتایا ہے کہ انھوں نے ایک فلم میں اپنی آنکھوں سے گرم گرم تازہ کھانے اچانک اُترتے دیکھے ہیں ۔ اگر یہ درست ہے تو کیا حسن و عشق کی پریاں جو بڑی فراخدلی سے کبھی کبھی گذری ہو گئیں کہ پلاؤ کی ایک پلیٹ تک نہیں بھیج سکتیں؟ تف ہے ایسی پریوں پر ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادیب و شاعر اُفق کے اُس پار جھانکنے کی بجائے فلمی دنیا میں رم گئے ہیں جہاں اُس پار کے عوض اسی پار حسن و عشق کی پریاں بہ آسانی میسر آجاتی ہیں اور فاتحہ کا ایک ریکارڈ سَو برس تک یکساں کام دیتا ہے ۔

مذاق نہیں ۔ خواجہ بدیع الزماں نے یہی ترکیب ایجاد کی ہے کہ فاتحہ کا ریکارڈ بھروا لیا ہے ۔ وہ رجوعات کی ریل پیل سے تھک گئے تھے ۔ اب جو بھی فاتحہ پڑھوانے آتا ہے اسے پانچ روپے فی گھنٹہ کے حساب سے ریکارڈ دیدیتے ہیں ۔ وہ ایسا کرتا ہے کہ پلاؤ زردے قورمے وغیرہ کی جتنی دیگیں پکنی ہوتیں سب پکوا کے برابر برابر رکھدیں اور ریکارڈ چڑھا دیا ۔ ایک دفعہ میں سارا کام پورا ۔ البتہ مُرغ پلاؤ کے بارے میں خواجہ صاحب کا کہنا ہے کہ اگرچہ اس میں ثواب کشید کرنے کی صلاحیت ہر دوسرے پلاؤ سے زیادہ ہوتی ہے لیکن ذرا مشکل سے کشید کرتا ہے لہذا اس کی دیگ سے تین پلیٹ ملبہ خواجہ صاحب کے سامنے آنا چاہیئے تاکہ بہ نفس نفیس فاتحہ پڑھیں اور ثواب اس میں جذب ہو جیساکہ حق ہے جذب ہونے کا ۔

آپ کہیں گے یوں تو بہت سے دو کاندار فاتحہ کے ریکارڈ بھروا لیں گے پھر خواجہ صاحب کو کون پوچھے گا ۔ تو جناب عالی، موصوف کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں ۔ جب ریکارڈ دیتے ہیں تو اس پر ایک دعا بھی پھونکتے ہیں ۔ اس دعا کے بغیر ریکارڈ کے فرشتے بھی فاتحہ کا ثواب کھانوں میں منتقل نہیں کر سکتے ۔ یہ دعا ہر کوئی کہاں سے لائے گا ۔ موصوف کا کہنا ہے کہ یہ سینہ بسینہ انھیں پہنچی ہے اور پوری دنیائے اسلام میں صرف انھی کے شیوخ اس کے رازداں گذرے ہیں ۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشآء ۔

۲۷ر دسمبر ۶۰ء	ہزار ہزار افسوس ۔ گذشتہ مہینہ کی ۱۶ر تاریخ کو ظالم موت کے بیدرد

[ہم نے] ایک ایسی عظیم شخصیت ہم سے چھین لی جس کے ماتم میں فلک بھر کو دہاڑیں مار مار کر رونا چاہیئے۔ واحسرتا کتنا شاندار انسان تھا۔ کتنا بڑا فنکار کتنی انمول صلاحیتوں کا مالک۔ جانتے ہیں آپ کون تھا؟

ماسٹر کالے خاں عرف بھورا استاد تکیہ والا۔

میرا اپنا کوئی اخبار رسالہ ہوتا تو جی بھر کے اس کے مناقب لکھتا اور تصویریں چھاپتا۔ ایڈیٹر تجلی سے عرض کیا کہ تجلی میں مرحوم کی تصویر چھاپ دیجئے گناہ ثواب میرے ذمے۔ مگر ان کی دہابیت ایسی معروضات پر کب کان دھرتی ہے۔ ماتھے پر گیارہ شکنیں بنا کر کہنے لگے:۔

"آل انڈیا ریڈیو والوں سے مراسلت کرو۔ وہ ضرور تمہاری مدد کریں گے۔"

"وہاں بھی دال نہیں گلی" میں نے منہ لٹکا کے جواب دیا" لالہ دیپکی نندن سے ذکر کیا تھا وہ کہنے لگے کہ سرکاری لسٹ پر ماسٹر کالے خاں کا نام نہیں ہے پھر کیونکر انھیں فنکار مانا جا سکتا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں۔ محلے بھر کے لونڈوں کو جمع کر کے سینہ پیٹو۔ گدھے کہیں کے۔"

مولوی ندرت اللہ نے مشورہ دیا تھا کہ ماسٹر کالے کے انتقال پُر ملال کی المناک خبر جمعیتہ العلماء کو بھیجدو وہ اجلاس اجمین میں تعزیتی قرارداد پاس کر دے گی اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت و ایصالِ ثواب کا اہتمام بھی کرے گی مجھ پر غم والم کا بھوت اس بُری طرح سوار تھا کہ آٹھ دن مسلسل سوتا رہا اور اجمین کا اجلاس ختم ہو گیا۔ اب سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ تجلی ہی پر اکتفا کروں اور خاص خاص مناقب دل تھام کے لکھ دوں۔

مرحوم کی عمر نوے سال تھی۔ میاں کی توڑی اور کھامج کے اس درجہ ماہر تھے کہ چشمِ فلک نے سو سال سے ان کی نظیر نہیں دیکھی۔ موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ کھانسی بھی اُٹھتی تو یہ معلوم ہوتا کہ طبلے پہ تھاپ پڑ رہی ہے۔ دمے میں انتقال ہوا ہے۔ ان کے خاص شاگرد میاں چمن اور پیلے لال آخری دنوں میں انھی کے پاس تھے ان کا کہنا ہے کہ کھانسی کے آخری تین دورے تو بڑے ہی معرکۃ الآرا ثابت ہوئے۔ ہر دورے میں کم سے کم تین نئے راگوں کے تال سُر دے گئے۔ اِدھر انکو دورا پڑتا اِدھر یہ شاگردِ رشید ہارمونیم اور طبلہ سنبھال لیتے۔ وہ کھانس رہے ہیں یہ سُر کشید کر رہے ہیں۔

طبلہ و موسیقی کے علاوہ ایک اور فن بھی تھا جس کے وہ ماہرِ خاص تھے۔ دس سال پہلے کی بات ہے جب عاجز بھی ان کے جوتے سیدھے کرتا تھا۔ ایک دن باہر کے کچھ فنکار آئے تھے۔ بحث چل رہی تھی کہ میاں کی توڑی میں کھیرو کا جوڑ لگانے والا استاد آج دنیا میں کوئی نہیں۔ خیال تھا کہ یہ جوڑ لگ ہی نہیں سکتا۔ بعض کہتے تھے کہ لگ تو سکتا ہے مگر مشکل ضرور ہے۔ میرے استاد یعنی ماسٹر کالے فرماتے تھے کہ ایک نہ ایک دن یہ جوڑ میں لگا کے دکھلاؤں گا۔ بات آئی گئی ہو ئی۔ مجھ پر جنوں سوار ہوا کہ کسی طرح یہ جوڑ میں لگاؤں۔ ریاض تو عرصے سے کر ہی رہا تھا۔ اب تو راتوں کا سونا بھی ترک کر دیا۔ بیوی جل کے میکے چلی گئی۔ محلّے والوں نے واویلا مچائی۔ یہانتک کہ مکان چھوڑنا پڑا۔ جنونِ شوق بُری بلا ہے میں نے کسی مصیبت کی پروا نہیں کی اور خواجہ بیداغ علی کی درگاہ کے عقب میں ایک جھونپڑی ڈال لی۔ یہاں سکون ہی سکون تھا۔ جی بھر کے ریاض کیا۔ کئی ساز توڑے مگر حاصل کچھ بھی نہیں۔ میاں کی توڑی اور کھیرو دونوں ایسے خبیث راگ ہیں کہ ایک کو بلاؤ تو دوسرا افق کے اُس پار بھاگ جاتا ہے۔ تنگ آ کے درگاہ کی عقبی دیوار میں تھوڑا سا سوراخ کیا اور گھنٹوں گھنٹوں اس سے ہونٹ لگا کے دعائیں کیں کہ اے پیر دستگیر! میری مدد کیجئے۔ زندگی کا ایک ہی حاصل ہے جسے آپ خوب جانتے ہیں۔ توجہ ہو جائے تو گوہرِ مقصود حاصل ہو۔ مدد۔ المدد۔ اَل المدد!

دن یونہی گذرتے گئے۔ خدا کا کرنا یوں کہ ایک دن فرطِ یاس میں سر ڈھلکائے بیٹھا تھا کہ ایک بھینس بُری طرح بھاگتی نظر آئی۔ پیچھے پیچھے اس کا مالک موٹا سا ڈنڈا لئے دوڑ رہا تھا۔ وہ شاید اسے واپس لانے کی تگ ودو میں تھا۔

ایک بار قریب پہنچا تو الّا اللہ کرکے ڈنڈا اس کی کمر پہ رسید کردیا۔ بھینس رُکی تو نہیں مگر زور سے اڑائی۔ بس پوچھئے یہ اڑاہٹ کیسی سحر انگیز نکلی۔ ایسا لگا جیسے عاجز کا لاشعور میں ہنڈا جل گیا ہو، جیسے ذہن کی گرہ کھل گئی ہو۔ واقعی اس ناگہانی اڑاہٹ میں میاں کی تو ڑی اور کستیر کا جوڑ صاف نظر آگیا تھا۔ جس درمیانی کڑی کی تلاش میں پھر رہا چھوڑ رہے یہاں پڑے تھے وہی کڑی بھینس کے لاہوتی نغمے نے برملا عطا کردی۔ اب جو ہاں دو نیم اٹھا کے انگلیاں چلاتا ہوں تو بیڑا پار ہوتا چلا گیا۔

کیا کہوں استاد نے کتنی شاباشی دی۔ تِل کے لڈو اور گڑ کے سیوں کھلائے۔ جلیبی کا شیرہ چٹایا۔ اپنا دو خاص حقّہ پلایا جس کی فرشی کا پانی ان کے پردادے کا ڈالا ہوا تھا پھر وہ مجھ سے بے حد بے تکلف ہو گئے۔ اپنے ماضی کے وہ خاص واقعات سناتے جو بمنزلۂ راز تھے۔ ان سے پتا چلا کہ وہ صرف طبلہ و سارنگی ہی کے ماہر نہیں بلکہ رقص کے بھی اسپیشلسٹ ہیں اور اس سے بڑھ کر وہ ایک اور فن کے ایکسپرٹ ہیں جس کا اصطلاحی نام تو عاجز کو معلوم نہیں۔ مگر اپنے مفاد و ثمرات کے اعتبار سے اسے "ثقافت" کہہ سکتے ہیں یعنی لڑکیوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ "لڑکیوں" کا لفظ میں نے توسعاً بولا ہے اُنکے بیان کے مطابق متعدد شادی شدہ مہلائیں بھی آرٹ نگہ خاطر ان کی خدمت میں باریاب ہوئی تھیں اور مدتوں تک فیضیاب ہوتی رہی تھیں۔ جوانی میں انھوں نے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ تین بیویوں کے علاوہ چار کل کار لڑکیاں ان کے طنبورے وغیرہ کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ دو پاؤں دبانے دو سر میں مالش کرنے دو میٹھی میٹھی باتیں کرنے اور دو دل بہلانے کے لئے وقف تھیں۔ پھر کیا تھا کلا مندر تھا وغیرہ وغیرہ۔

استاد کالے خاں کے شاگرد ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ بالے خاں۔ یہ استاد جھینگر۔ یہ چمیلی بائی۔ یہ پھلجھڑی لکھنؤ والی۔ یہ سب اسی مرکزِ فیض کے تو پروردہ ہیں۔ شہرہ آفاق طبلچی جناب آفتاب بخش اور بین الاقوامی شہرت کے ستار نواز جناب چاند خاں اور آل ایشیا سطح کے رقاص جناب چھکن میاں استاد کالے ہی کے تو شاگرد ہیں۔ عاجز ان کے تمام شاگردوں سے امید رکھتا ہے کہ وہ استاد کی قائم کردہ شاندار روایات کو نہ صرف قائم رکھیں گے بلکہ دن چوگنی اور رات اٹھوگنی ترقی عطا فرمائیں گے۔

ناظرین شاید خفا ہو رہے ہوں گے کہ بھلا تجلّی کے صفحات میں اس ماتم کا کیا موقع تھا۔ تو فدوی عرض کرتا ہے کہ موقع کیوں نہیں تھا۔ ابھی پاکستان کے ریڈیو ڈیپارٹمنٹ نے اپنے پندرہ روزہ جریدے کی ۷ نومبر والی اشاعت میں ایک ایسے ہی بڑے استادِ فن کی مفصل تعزیت چھاپی ہے اور ٹائٹل ہی پر تصویر بھی دی ہے۔ تو کیا انھی کے استاد استاد تھے ہمارے استاد استاد نہیں؟

ملا زندہ صحبت باقی

تجلّی کی ڈاک

اہل حدیث دوستوں کی کرم فرمائیاں

ہر فرد اور ہر گروہ کو حق حاصل ہے کہ اپنے مذہب و مسلک کی تبلیغ کرے، لیکن اس حق کی کچھ حدیں ہیں۔ کچھ شروط و قیود ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس حق کو اندھے کی لاٹھی کی طرح استعمال کیا جائے۔

جمع شدہ ڈاک کے انبار میں متعدد ایسے خطوط نکلے ہیں جن میں بعض اہل حدیث بزرگوں کے نشر فرمودہ الزامات و اعتراضات کا جواب مانگا گیا ہے۔ الزام دینا اور اعتراض کرنا کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ خلوص، احساسِ ذمہ داری اور متانت کے تقاضے پورے کئے جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ الزام و اعتراض کا طور طریق بڑا المناک ہے جس میں نہ خلوص کا رنگ و بو ہے نہ علمی متانت کا رکھ رکھاؤ۔ فقہ سے خصوصاً حنفی فقہ کے بارے میں جو رویّہ اختیار کیا گیا ہے وہ کھلے طور پر معاندانہ ہے جس کی رگ رگ میں تعصب، جہل اور تکبّر سمایا ہوا ہے۔ احناف کی متداول کتب ہدایہ، شرح وقایہ، دُرّ مختار وغیرہ کے جامعین و مصنفین کو بے عقل، گمراہ اور محرفینِ اسلام ٹھیرانا تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے نوبت یہانتک پہنچی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحؒ کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف ہی کو نہیں خود امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو راویِ ضعیف قرار دیا جا رہا ہے۔ تا بدیگراں چہ رسد!

ہم اس طرح کے تکلیف دہ مواد پر مشتمل سوال ناموں کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال کر صبر کر لیتے، کیونکہ ان کی خاطر خواہ جواب دہی کے لئے ناگزیر تھا کہ کتبی انداز کی لمبی گفتگو کی جائے تب عوام کو معلوم ہو کہ الزام و اعتراضات کی حقیقت کیا ہے اور کس طرح بعض فقہی مسائل کو ان کی جگہ سے اکھیڑ کر کم علم عوام کے سامنے لایا گیا ہے تاکہ ائمہ و فقہا کی ساکھ ختم کی جائے اور مسلکِ اہل حدیث کا راستہ صاف ہو۔

صفحات کی تنگ دامانی اور نوع بہ نوع ذمہ داریوں کے ہجوم میں ہمارے لئے ایسا کرنا بے حد دشوار تھا اور ہے۔ لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ ضرورت پڑنے پر خود کو صلح کُل پوز کرنے والے بزرگوں کی جراحت کاریاں کس منزل میں ہیں ایک نمونہ ضرور ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ یہ ایک طویل سوالنامہ سے نقل کیا جا رہا ہے:-

"محقق آف جماعت اہل حدیث مولانا الحاج عبد القادر صاحب حصاری سلمہ الباری کا ایک مضمون "خدمت ربّو" کے بارے میں صحیفہ میں شائع ہوا جسمیں حضرت صاحب نے راویوں پر تنقید کی۔ نمونے ملاحظہ فرمائیں۔ الف۔ یہ روایت بالکل ناقابلِ احتجاج ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے پہلے راوی قاضی ابو یوسف ہیں جن کے متعلق میزان الاعتدال مصری ج ۳ ص۳۲۱ تذکرۃ الحفاظ مطبوعہ دائرۃ المعارف ص۲۶۷ میں ہے کہ قال الفلاس صَدُوْقٌ کَثِیْرُ الغَلَطِ وَقَالَ البخَارِیُّ تَرَکُوْہُ کتاب الضعفاء۔ مطبوعہ انوار احمدی ص۳۸ میں ہے:- یَعْقُوْبُ بنُ اِبْرَاهیمَ القاضی سمع ابنَ السَّائبِ ترکہٗ یحییٰ و ابن مهدی وغیرهُمَا۔ یعنی کتب حدیث میں ان سے روایت نہیں لی۔ یہی وجہ ہے کہ کتب حدیث متداولہ میں

ان سے روایت نہیں لی گئی یہ متروک الحدیث ہیں جب یہ راوی ضعیف ہیں تو یہ روایت مخدوش ہے۔ دوسرے راوی امام ابوحنیفہؒ ہیں جنکے متعلق میزان الاعتدال مصری ج ۳ ص۲۳۷ میں ہے ضَعَّفَهُ النِّسَائِیُّ مِنْ جِهَةِ حِفْظِهٖ وَابْنُ عَدِیٍّ وَاٰخَرُوْنَ تمہید شرح مؤطا ج ۳ ص۲۷ میں حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں وَهُوَ سَیِّئُ الْحِفْظِ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِیْثِ۔ الفیہ عراقی مطبوعہ فاروقی کے حاشیہ ص۴۵ میں ہے کہ فَیَکُوْنُ قَادِحًا کَمَا نَسَبَ الذَّهَبِیُّ وَابْنُ عبد البرّ وابْنُ عَدِیٍّ وَالنَّسَائِیُّ وَالدَّارقطنی فی ابی حنیفۃ اِنَّهٗ ضَعِیْفٌ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهٖ۔ تخریج ہدایہ حافظ ابن حجرؒ فاروقی کے حاشیہ ص۹۳ میں ہے عَنْ اَبِیْ حَفْصٍ عمر بْنِ عَلِیٍّ قَالَ ابوحنیفۃ لَیْسَ بِحَافِظٍ مُضْطَرِبُ الْحَدِیْثِ ذَاهِبُ الحدیث۔ کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی مطبوعہ انوار احمدی ص۳۵ میں ہے ابوحنیفۃ لَیْسَ بِالْقَوِیِّ فِی الحدیث وَهُوَ کَثِیْرُ الْغَلَطِ وَالْخَطَاءِ عَلٰی قِلَّةِ رِوَایَتِهٖ۔ دراسات اللبیب مطبوعہ لاہور ص۱۳۳ میں ہے اَنَّ ابْنَ الْقَطَّانِ جَرَحَ الْحَدِیْثَ الْاَوَّلَ وَقَالَ عِلَّتُهٗ ضُعْفُ ابی حنیفۃ فِی الحدیث۔ سنن دارقطنی فاروقی ص۱۲۲ میں بھی امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ تخریج ہدایہ فاروقی کے حاشیہ ص۹۳ میں ہے کہ علی بن مدینی کے بیٹے عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ علی بن مدینی سے ابوحنیفہؒ کا حال پوچھا تو انھوں نے ان کو ضعیف بتایا اور کہا کہ پچاس حدیثوں میں انھوں نے خطا کی ہے۔ نیز مذکورہ کتاب میں ہے کہ ابوبکر بن داؤد نے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ نے کُل ڈیڑھ سو حدیثیں روایت کی ہیں جن میں سے نصف میں ان سے بھول واقع ہوئی ہے۔ دارقطنی ص۳۷۲ میں ہے کہ ابن ہشیمہ کہتے ہیں کہ میں نے یحیٰی بن معین سے سُنا کہ کَانَ الثَّوْرِیُّ یَعِیْبُ عَلٰی اَبِیْ حنیفۃ حدیثًا کَانَ یَرْوِیْهِ۔ امام بخاری نے کتاب الضعفاء میں فرمایا ہے سَکَتُوْا عَنْ رَاْیِهٖ وَحَدِیْثِهٖ۔ امام رازی نے رسالہ ترجیح شافعی میں لکھا ہے۔ کَانَ یَقْبَلُ الْمَجَاهِیْلَ وَالْمَقَاطِیْعَ وَالْمَرَاسِیْلَ۔

جب اتنے محدثین نے جرح کی ہے اور جرح بھی مفسر ہے تو امام ابوحنیفہؒ علمِ حدیث میں ضعیف ثابت ہوئے۔ باقی آپ کا تقوی اور فقاہت اور شہرت علیحدہ امور ہیں، یہاں حدیث کی رو سے محدثین کا فیصلہ لیا جائے گا کہ وہ ضعیف ہیں یہی وجہ ہے کہ کتب متداولہ میں ان سے روایات ثابت نہیں۔ حالانکہ دیگر ائمہ امام شافعیؒ امام احمدؒ وغیرہ سے بکثرت حدیثیں کتب متداولہ میں ہیں خصوصًا امام مالکؒ کی تو مؤطا شہرہ آفاق کتاب ہے جب اس روایت اہل حرب کے دو راوی ضعیف ہیں تو یہ روایت قرآن کی قطعی النبوت آیات اور احادیث صحیحہ کے مقابلہ میں بالکل ناقابل قبول ہے۔" (صحیفہ اہلحدیث ص۱۸)

اس اقتباس کو کئی بار پڑھیئے اور انصاف کیجئے کہ علوم دینیہ سے بے بہرہ عوام پر اس طرح کی گل افشانیاں کیا اثر ڈالنے والی ہیں۔ ہمارے اہل حدیث دوستوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان پر توہین ائمہ کا الزام عائد کیا جائے تو وہ کانوں پہ ہاتھ دھر کے کہتے ہیں کہ معاذ اللہ ہم کیوں ائمہ کی توہین کرتے، ہم تو انھیں ایسا اور ویسا مانتے ہیں، لیکن ان میں کے متعدد غیر ذمہ دار افراد — بلکہ بعض حالتوں میں ذمہ دار افراد بھی اس طرح کی خامہ فرسائیاں کر گذرتے ہیں کہ علم و متانت کے ماتھے پر پسینہ آجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص امام اعظم کے کسی اجتہاد، کسی فکری و قیاسی فیصلے یا عقلی دعوے پر سنجیدگی کے ساتھ اعتراض کرے تو یہ فعل قابل برداشت ہے۔ امام اعظمؒ نبی نہیں تھے۔ غیر انبیاء کے فکر و نظر میں کہیں

نہیں خامی ہو سکتی ہے۔ ان پر نقد جرم نہیں۔ اگر کوئی شخص نافہمی کی بنا پر ایک صحیح چیز کو غلط سمجھتے ہوئے معترض ہوا ہے تب بھی مجرم نہیں گردانا جائے گا۔ کیونکہ امت کے کسی فرد کی ذہنی غلامی اور اندھی تقلید شریعت نے جائز قرار نہیں دی۔ لہٰذا فکر و اجتہاد میں ابوحنیفہؒ سے شرافت و متانت کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بھولا سا منھ بنا کر یہ کہدینا کہ فلاں حدیث اس لئے ناقابل اعتبار ہے کہ اس کے راوی ابوحنیفہؒ ہیں، گستاخانہ جہالت ہے جسے علمی متانت چھو کر بھی نہیں گذری۔ اس کا تو کھلا مطلب ہے کہ امام اعظمؒ یا تو دروغ گو تھے یا لاپروا اور غیر ذمہ دار۔

مغالطہ اندوزی کا یہ طریقہ کتنا اچھا ہے کہ ایک ہی سانس میں یہ بھی فرمایا جا رہا ہے:۔

"باقی آپ کا تقویٰ اور فقاہت اور شہرت علیحدہ اُمور ہیں"

گویا وہ شخص متقی اور معتبر معنوں میں فقیہ بھی کہلا سکتا ہے جو تقوے سے اس حد تک بیگانہ ہو کہ حدیث رسول نقل کرنے میں ذمہ دارانہ حزم و احتیاط نہ برتے تحقیق سے کام نہ لے —— —— فن کارو! تقویٰ کس چڑیا کا نام ہے اگر ابوحنیفہؒ کی روایت فرمودہ حدیثیں بھی قابلِ اعتماد نہیں تفقہ کس بلا کو کہتے ہیں اگر وہ بنیاد ہی ناقابلِ اعتبار ٹھیر گئی جس کے اعتماد کی ضمانت کے بغیر شریعت ہر اجتہاد و قیاس کو دیوار پر دے مارتی ہے۔ ابوحنیفہؒ اگر حدیث ہی کی روایت میں غیر معتمد قرار پا گئے تو ان کے قصرِ تفقہ کا ایک ستون اور ایک اینٹ بھی سوءِ ظن کی مار سے نہیں بچ سکتی۔

بارِ الٰہا! آج وہ وقت بھی آگیا کہ چند ہوائی شہادتوں کا سہارا لے کر لوگ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ثقاہت و عدالت کو مجروح کریں اور ہمیں ان کی یاوہ گوئیوں پر کلیجہ تھام لینا پڑے وہ ابوحنیفہؒ جن کے علم و فہم کا زرنگار دامن کم و بیش بارہ سو برس سے تقریباً دو تہائی امت نے تھام رکھا ہے — جن کے علم و فضل، زہد و ورع اور دیانت و عدالت کا طرۂ افتخار آسمان سے باتیں کر رہا ہے، جو اپنے مناقب کی نظیر نہیں رکھتے، جن کی برابری بخاری و مسلم جیسے بزرگ بھی نہیں کر سکتے، جن کے شاگردوں کے شاگرد امتِ مسلمہ کا کھن اور آسمانِ اعتماد کے چاند تارے سمجھے گئے ہیں اور جن کی عظمت و منزلت جریدۂ عالم پر نقشِ دوام بن کر ثبت ہے انھی کو آج وہ مدعیانِ علم "راوی ضعیف" باور کرانے چلے ہیں کہ جن کے علم و فہم اور ورع و تقوے کو ابوحنیفہؒ کے مرتبۂ و مقام سے وہ نسبت بھی نہیں جو تیل کے چراغ کو بجلی کے قمقمے سے ہوتی ہے۔

تلخ نوائی معاف! عوام کی جہالت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی یہ بدترین مثال ہے کہ اہل حدیث بزرگ نے خود اپنے معتمد اکابر کے فیصلوں اور اصولوں کو پس پشت ڈال کر تحقیرِ ابوحنیفہؒ میں اُن بے حیثیت شواہد سے کام لیا جن کی بوالفضولی ہر متبحر عالم جانتا ہے۔ عوام دھوکا کھا جائیں گے کہ واقعی موصوف نے اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کہا، بلکہ بعض سلف کے فرمودات نقل کئے ہیں۔ ان کا کیا قصور ہے اگر ائمۂ فن ہی نے ابوحنیفہؒ کو ضعیف قرار دیا ہو!

بتائیے کیا یہ عوامی تأثر ابوحنیفہؒ کی تحقیر و مذمت کے دائرے میں نہیں آتا؟ پھر بھی دعویٰ یہی ہے کہ ہم ابوحنیفہؒ کے فضل و مرتبت کے منکر نہیں ان کے خلاف بدگمانیاں پھیلانا نہیں چاہتے۔

راسخین فی العلم کو خوب معلوم ہے کہ جتنی جرحیں عبدالقادر صاحب حصاری نے امام ابوحنیفہ کی قدح میں نقل کی ہیں ان سب کو علمائے فن، محققین اور متبحرین نے ٹھیکرے سے زیادہ حیثیت نہیں دی ہے اور خود اہل حدیث کے ذمہ دار اور خداترس علماء نے ان جرحوں کو ابوحنیفہؒ کے ناقابل اعتبار ہونے کی کافی دلیل نہیں مانا ہے۔

ان جرحوں کے دُور از کار اور لایعنی ہونے کو پورے طور پر تو ہم یہاں ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ جن عوام سے واسطہ ہے وہ بیچارے علمِ حدیث کی ابجد تک سے واقف نہیں۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جرح مبہم اور جرح مفسر کسے کہتے ہیں۔ تعدیل کا کیا معیار ہے۔ ضعف کی کتنی قسمیں ہیں، راویوں کے کیا مدارج ہیں وغیر ذلک

تو انھیں دس بیس صفحات میں کیسے پورا علم حدیث پڑھا کر سمجھایا جاسکتا ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تعدیل و توثیق کے مقابلہ میں یہ جرحیں اُس مٹھی بھر غلاظت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں جیسے بحرِ ذخار میں ملا دیا جائے ایک مٹھی غلاظت سے اگر سمندر ناپاک نہیں ہوجاتا تو پھر ایسی چند خارج از بحث جرحیں تعدیل کے اُس سمندر کو کیسے متاثر کرسکتی ہیں جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں صدیوں سے موجیں مار رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک موجزن رہے گا۔

بقدرِ گنجائش ہم چند باتیں کہتے ہیں:۔

آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ ہم احناف کے کسی عالم نے یہ شوشہ چھیڑا ہو کہ امام بخاری ناقابلِ اعتبار ہیں اس لئے ہم ان کی روایتیں نہیں مانتے۔ حالانکہ اگر یہی حرکت کی جائے جو حصاری بزرگ کر رہے ہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ امام مسلم جیسے عظیم الشان محدث نے جن کی صحیح مسلم کو بخاری کے بعد سب سے بڑا مقام حاصل ہے (بلکہ بعض تو بخاری پر بھی مسلم ہی کو فوقیت دیتے ہیں) امام بخاری سے ایک روایت بھی لینی پسند نہیں کی اور عملاً انھیں متروک ٹھیرایا۔ اور امام ابو زرعہ نے ان کی روایت سے پرہیز کیا اور امام ابو حاتم نے ان کی روایت نہیں لی اور متروک الحدیث قرار دیا اور ابن حزم جیسے بزرگ نے جن پر اہلحدیث حضرات تکیہ کرتے ہیں ان کی ایک روایت کے راوی عیسیٰ بن سعید کو مجہول قرار دے کر روایت کو جھوٹا بتایا اور بعض ائمۂ فن نے ان کی بعض روایات پر ایسی سخت تنقیدیں کیں کہ ان کے غالی معتقدین تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

اسی طرح احناف نے بخاری کے استاد ابن المدینی کو بھی ضعیف نہیں کہا، حالانکہ امام احمد جیسے بزرگ نے انھیں متروک الحدیث ٹھیرایا تھا۔ ابراہیم حربی نے بھی اسی کی تائید کی تھی۔ عقیلی نے بھی ان کا نام ضعیف راویوں کی فہرست میں دیا ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں انکی روایت نہیں لی اور امام احمد نے تو ان کی ایک روایت کو جھوٹ تک کہدیا۔

اسی طرح اور کتنے ہی راوی ہیں کہ جن کی ثقاہت و عدالت علمائے اہل سنت کے مابین متفق علیہ ہوچکی۔ لیکن یہی حصاری صاحب والی چال چلی جائے تو ان سب کے بارے میں ناقابل اعتماد ہونے کا فیصلہ بہ آسانی دیا جاسکتا ہے۔

لیکن ذمہ دار علماء ایسی اوچھی حرکتیں نہیں کیا کرتے۔

سب سے پہلے تو یہ بنیادی اصول سمجھ لینا چاہئے جس پر اصول حدیث کے علما متفق ہیں کہ مشہورِ زمانہ ائمہ و علماء کا معاملہ اُن دیگر راویانِ حدیث جیسا نہیں جن کی ثقاہت و عدالت جاننے کے لئے منفرد گواہیوں کی ضرورت ہو۔ مثلاً امام شافعی، امام مالک، امام بخاری، امام مسلم، عبداللہ بن المبارک وغیرہم اُن ہستیوں میں ہیں جن کی جلالتِ شان، حق پژوہی، دیانت و تقویٰ اور قائدانہ حیثیت زمانے بھر میں مشہور و معروف ہوچکی اب اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کی ثقاہت و عدالت کا فیصلہ کرنے کے لئے ائمہ جرح و تعدیل کے ارشادات ڈھونڈے جائیں۔ اگر ان کی توثیق میں صریح اقوال موجود نہ ہوں تو کوئی پروا نہیں یا کچھ لوگوں نے عناد و تعصب یا غلط فہمی یا بے خبری کے باعث ان کی عدالت و ثقاہت کو مجروح کیا ہو تو شمہ برابر مضائقہ نہیں۔ یہ اہل عقل و عدل کے نزدیک عادل و ثقہ ہی رہینگے

جب مذکورہ علماء و ائمہ کا معاملہ یہ ہو تو اُس بلند مرتبہ امامِ زمانہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ثقاہت و عدالت میں کیا گفتگو رہ جاتی ہے جس کے علم و فضل، زہد و ورع، استقامت، للہیت، حزم و احتیاط، فراست، تبحر اور اخلاص و تقویٰ کو کروڑوں کروڑ انسانوں نے مذکورہ علماء سے بمراتب اعلیٰ اور برتر مانا ہو جیسے متعدد پہلوؤں سے ان تمام پر افضلیت حاصل ہے اور جس کی امامت و عظمت پر دنیا بھر متفق ہے۔

اگر صرف اتنی سی بات کسی امام کی ثقاہت و عدالت مجروح کرنے کے لئے کافی ہو کہ سینکڑوں ہزاروں موثقین و معدلین کے مقابلہ میں معدودے چند حضرات نے اس کے حق میں غلط فہم

کا اظہار ادا سے کر دیا ہے تو دنیا میں کونسا بڑا آدمی ہے جو ثقہ باقی رہ جائے۔ یوں تو کل کلاں کو یہ بھی فرما دیا جائے گا کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ایک پورا گروہ کا گروہ خاک بدہنِ گستاخ 'غاصب' طامع' ظالم اور دشمنِ دین قرار دیتا ہے۔ لہذا ان کی ثقاہت و عدالت ناقابلِ اعتبار رہے۔

آپ اپنی دنیا میں نظر ڈال کے دیکھئے۔ کتنے کتنے بڑے بڑے علماء واتقیاء ہیں جن کے بارے میں بعض علماء نے اختلافِ عقیدہ کے باعث' بعض نے غلط فہمیوں کے ناطے بعض نے بے خبری کی وجہ سے جرح و قدح میں زبان کھولی ہے تو کیا اس سے ان علماء واتقیا کی ثقاہت واقعی ختم ہو گئی؟

اس اصول سے گذر کر جزئیات میں آیئے تو سب سے پہلے یحییٰ بن معین کا قول سامنے آئے گا۔ یحییٰ بن معین کون ہیں؟ امام بخاری کے وہ استاد جنھیں خود اہل حدیث حضرات امام الجرح والتعدیل تسلیم کرتے ہیں۔ انکا فرمودہ کسی حنفی نے نہیں، بلکہ ایک اہل حدیث بزرگ مولٰنا شمس الحق نے نقل کیا ہے:-

قال یحییٰ بن معین اصحابنا یفرطون فی ابی حنیفة واصحابه۔ (تعلیق مغنی)	یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ ہمارے اصحاب یعنی محدثین امام ابوحنیفہ اور اصحابِ ابوحنیفہ کے بارہ میں زیادتی کرتے ہیں۔

اور یہی یحییٰ بن معین فرماتے ہیں:-

انه ثقة ما سمعت احداً ضعفه (الانتقاء)	وہ امام ابوحنیفہؒ ثقہ ہیں۔ میں نے کسی کو انھیں ضعیف قرار دیتے ہوئے نہیں سنا۔

پہلے مقولے سے ثابت ہوا کہ امام اعظمؒ کے خلاف ناروا سلوک اور زیادتیاں محدثین کے یہاں ابتداء سے ہی ظہور میں آگئی تھیں۔ ابن معین خود امام و محدث ہیں اور اہل حدیث علماً انھیں متعنت بھی مانتے ہیں (یعنی رائے ظاہر کرنے میں نہایت محتاط اور کسی کے عیب یا خامی کی گرفت میں سخت گیر واقع ہوا ہو)

جب اپنے اصحاب یعنی محدثین کے بارے میں خود انھی کا اعتراف سامنے آگیا تو کسی نمونے اور مثال کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی ہم تمثیلاً امام بخاری کا نام لیتے ہیں جن کا زہد و ورع مثالی چیز ہے۔ انھوں نے بخاری میں حنفی مسلک کے بارے میں جو رویّہ اختیار کیا ہے وہ اہل نظر کو چونکا دینے والا ہے۔ دل ودماغ میں جاگزیں سوءِ ظن کے نتیجے میں حنفیہ کے ساتھ انکا سلوک جارحانہ ہے اور اسی ذہنی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ حنفی مسلک کو پوری طرح سمجھے بغیر وہ اعتراضات کرتے چلے جاتے ہیں۔

جب بخاریؒ جیسا امام' ابوحنیفہؒ کے بارے میں زیادتی سے نہ بچ سکا تو کسی اور مثال کی کیا ضرورت۔

دوسرے مقولے سے ثابت ہوا کہ زیادتی اور جانبداری کے باوجود یحییٰ بن معین کے زمانے تک محدثین اور جرح و تعدیل کرنے والے ائمہ اس حد تک نہ پہنچے تھے کہ ابوحنیفہؒ کو "ضعیف" کہہ گذریں۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو اُن بعد کے لوگوں کی تضعیف و جرح کا کیا وزن ہو سکتا ہے جنھیں فقہی اختلاف کی رو میں ابوحنیفہؒ سے ناروا معاندت پیدا ہو گئی اور حنفی طرزِ فکر کی گیرائی سے گھبرا کر انھوں نے یہ چابک دستی کی کہ ابوحنیفہؒ ہی کو غیر معتمد ٹھیرانا شروع کر دیا تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

اور سُنئے۔ یہی ابن معین فرماتے ہیں:-

کان ابوحنیفة ثقة لا یحدث بالحدیث الا بما یحفظه ولا یحدث بما لا یحفظ۔ (تہذیب التہذیب۔ طبقات الحفاظ)	ابوحنیفہؒ ثقہ ہیں جو حدیث انھیں یاد ہوتی ہے وہی بیان کرتے ہیں اور جو یاد نہیں ہوتی اسے بیان نہیں کرتے۔

+ + + +

امام بخاری اور امام ابوداؤد کے شیخ علی بن جعد جوہری جو بہت بڑے حافظِ حدیث تھے' کہتے ہیں:-

ابوحنیفة اذا جاء بالحدیث جاء به مثل السدر۔ (جامع مسانید الامام الاعظم)

ابوحنیفہؒ حدیث بیان کرتے ہیں تو وہ موتی جیسی آب و تاب رکھتی ہے۔

امام ابوسفیان ثوریؒ کی شہادت ہے :-

یاخذ بما صح عنده من الاحادیث التی کان یحملها الثقات وبالآخر من فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (الانتقاء)

ابوحنیفہؒ وہی روایات لیتے ہیں جو ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور جنھیں ثقات روایت کرتے چلے آتے ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فعل ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ اہلِ حدیث کے یہاں بھی خوب معتمد ہیں ان کی تہذیب التہذیب جلد ۱۰ دیکھئے :-

قال محمد بن سعد العوفی سمعت ابن معین یقول کان ابوحنیفة ثقة لا یحدث بالحدیث الا بما یحفظه ولا یحدث بما لا یحفظه وقال صالح بن محمد الاسدی عن ابن معین کان ابوحنیفة ثقة فی الحدیث وقال ابو وهب محمد بن مزاحم سمعت ابن المبارك یقول افقه الناس ابوحنیفة ما رایت فی الفقه مثله وقال ایضا لولا ان الله تعالی اغاثنی بابی حنیفة وسفیان کنت کسائر الناس۔

محمد بن سعد العوفی کہتے ہیں کہ میں نے ابن معین کو یہ کہتے سنا ہے کہ ابوحنیفہ ثقہ تھے صرف وہی حدیث بیان فرماتے تھے جو انکو محفوظ ہو اور جو اچھی طرح محفوظ نہ ہو نہیں بیان کرتے تھے اور صالح بن محمد الاسدی نے ابن معین ہی کا یہ ارشاد بیان کیا کہ ابوحنیفہؒ حدیث میں ثقہ ہیں اور ابو وہب محمد بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ ابن المبارک (امیر المومنین فی الحدیث) کو کہتے سنا کہ ابوحنیفہ سب سے بڑھکر فقیہ ہیں فقہ میں میں نے ان کا مثل نہیں دیکھا۔ نیز انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ ابوحنیفہؒ اور سفیانؒ کے ذریعہ میری مدد نہ فرماتا تو میں بھی عام آدمیوں کی طرح کا ایک آدمی ہوتا۔

نیز

یروی عن ابی یوسف قال بینما انا امشی مع ابی حنیفة اذ سمعت رجلا یقول لرجل هذا ابوحنیفة لا ینام اللیل فقال ابوحنیفة لا یتحدث عنی بما لا افعل وکان یحیی اللیل یعنی بعد ذلک۔

ابو یوسف سے مروی ہے کہ ایکدن ہم ابوحنیفہؒ کے ساتھ چلے جا رہے تھے اچانک ہم نے ایک شخص کو یہ کہتے سنا کہ یہ ہیں ابوحنیفہ جو رات بھر سوتے نہیں (گویا عبادت میں شب بیدار رہتے ہیں) یہ سُنکر ابوحنیفہ نے ہم سے فرمایا کہ جو کچھ میں نہیں کرتا وہ میرے بارے میں بیان نہیں ہونا چاہئے۔ اسکے بعد آپ نے مستقلاً شب بیداری کو معمول بنالیا۔

+ + + +

+ + + +

+ + + +

نیز

وقال ابن ابی داؤد عن نصر بن علی سمعت ابن داؤد یعنی الخریبی یقول الناس فی ابی حنیفة حاسد و جاهل۔

اور ابن ابی داؤد نصر بن علی سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ابن داؤد کو یہ کہتے سنا کہ لوگ ابوحنیفہؒ کے بارے میں حاسد اور جاہل ہیں۔

اگر وہ تمام جرحیں جنھیں حصاری صاحب نے جمع فرمایا ہے کسی بھی درجے میں قابلِ لحاظ تھیں تو حصاری صاحب مشرح فرمائیں کہ کیوں حافظ ابن حجر نے ان کی طرف نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا۔ کیوں انھوں نے امام ابوحنیفہؒ کی ثقاہت نقل کی۔۔۔ اور ضعف کو نظر انداز کر گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بے بنیاد جرحیں ابن حجر کے نزدیک پرِکاہ کی برابر بھی وقعت نہ رکھتی تھیں ورنہ وہ انھیں نقل کئے بغیر نہ رہتے اور حصاری صاحب کی طرح ابوحنیفہؒ کو ضرور راوئ ضعیف کہہ گذرتے۔ نہیں کہا تو معلوم ہوا کہ ابوحنیفہ کی ثقاہت ان کے نزدیک غیر مختلف فیہ ہے۔

امام شعرانی یہ واضح کرنے کے بعد کہ ابوحنیفہ وغیرہ کے بارے میں جو کچھ میں کہوں گا وہ محض حسن عقیدت میں نہیں کہوں گا" بلکہ تحقیق و تفحص کے بعد کہوں گا ـــ اپنی المیزان الکبریٰ میں فرماتے ہیں۔ (اختصار کی غرض سے متن حذف کرتا ہوں صرف ترجمہ پیش خدمت ہے)

" اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا کہ مجھے

[ابوحنیفہ] کے تین مسندوں کا ان کے صحیح نسخوں سے مطالعہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان نسخوں پر حفاظ حدیث کی قلمی تحریریں تھیں جن میں آخری صاحب حافظ دمیاطی ہیں۔ مطالعہ سے ثابت ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ صرف انھیں برگزیدہ تابعین سے حدیثیں روایت کرتے ہیں جو اپنے زمانے کے منتخب ترین، عادل اور ثقہ حضرات تھے اور جو حدیث کی صراحت کے مطابق خیر القرون کے لوگ تھے جیسے اسود، علقمہ، عطاء، مجاہد، مکحول اور حسن بصری جیسے معززین۔ پس ابوحنیفہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جتنے راوی ہیں سب ثقہ، نیک نام اور صالحین ہیں۔ ان میں کوئی ایسا نہیں جو جھوٹا ہو یا اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی گئی ہو اور اے میرے بھائی! ان کی عدالت و اعتماد کیلئے تمھیں یہی کافی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ جیسے شخص نے اپنی شدتِ احتیاط اور حزم و تقویٰ کے باوجود اور امت محمدیہ کا خاص خیال رکھنے کے باوصف ان حضرات کو اس مقصد کے لئے چن لیا ہے کہ ان سے اپنے دینی احکام اخذ کریں۔"

آگے فرماتے ہیں:۔

"امام ابوحنیفہؒ کے تینوں مسندوں میں جو بھی حدیث ہم نے پائی صحیح پائی۔" (المیزان الکبریٰ جلد اوّل صفحہ ۶۴ و ۶۵)

یہ چند آراء ہوئیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ابوحنیفہؒ کا پایہ روایتِ حدیث میں کیا تھا جسے بے حیثیت جرحوں کی بنیاد پر ضعیف کہنے کی جسارت کی جا رہی ہے۔ کتاب کی تصنیف پیش نظر ہو تو تعدیل و توثیق پر مشتمل فرمودات سلف کا انبار لگایا جا سکتا ہے۔ امام اعظمؒ تو بڑی چیز ہیں انکے شاگردوں کا یہ حال ہے کہ امت کی امت ان کی عدالت و ثقاہت میں رطب اللسان ہے۔

حصاری صاحب کے پیش فرمودہ شواہد پر بھی کچھ عرض کر دیں۔

ان کی ناواقفیت یا پھر غلط بیانی کا یہ حال ہے کہ جتنی جرحیں انھوں نے نقل کیں ان کے بارے میں فرما دیا کہ ہر جرح مفسّر ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے ہی شیخ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کی ابکار المنن دیکھ لیتے تو معلوم ہو جاتا کہ ابن عدی اور دارقطنی اور نسائی کی جو جرحیں انھوں نے پیش فرمائی ہیں وہ مفسّر نہیں مبہم ہیں۔۔۔ وہ مبہم جو مردود قرار دی جاتی ہیں۔

ابن عبد البر کا جو مقولہ سیئ الحفظ عند اهل الحديث نقل کیا گیا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ خود ابن عبد البر امام اعظمؒ پر جرح نہیں فرما رہے، بلکہ اہلِ حدیث کا خیال نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک امام موصوف سیئ الحفظ (خراب حافظے والے) تھے۔ لیکن اس نقل میں بھی از راہ بشریت ابن عبد البر سے تسامح ہوا۔ نہیں ہوا تو اہل حدیث حضرات ابن عبد البر کے زمانے تک کا کوئی ایک محدث بتائیں جس نے امام اعظم کو سیئ الحفظ کہا ہو۔ ہمیں یقین ہے وہ نہ بتا سکیں گے ــــ اور بفرض محال وہ بتا بھی دیں تو اس سے کوئی حاصل نہ ہوگا، کیونکہ محدثِ شہیر امام الجرح والتعدیل ابن معین خود بتا چکے ہیں کہ ہم محدثین امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے حق میں زیادتی کے مرتکب ہیں۔ ان سے ابن معین کا جو قول بیان کیا گیا ہے کہ ثوری ابوحنیفہ پر حدیث کے سلسلہ میں عیب لگایا کرتے تھے تو خود ابن معین کی رائے اور سفیان ثوری کی رائے ابھی ہم نقل کر چکے۔ ثوری کی طرف منسوب بات اگر صحیح بھی ہو تو اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ اختلاف مسلک کی بناء پر انھوں نے کسی موقع پر امام اعظم کے خلاف لب کشائی کر دی ہو گی، ورنہ ان کی ثقاہت و عدالت کے منکر نہ تھے۔

کیا خوب دلیل ضعف دی گئی ہے :۔

"یہی وجہ ہے کہ کتب متداولہ میں ان سے روایات ثابت نہیں، حالانکہ دیگر ائمہ امام شافعیؒ و امام احمدؒ وغیرہ سے بکثرت حدیثیں کتب متداولہ میں ہیں۔"

بکثرت تو در کنار آپ بخاری و مسلم میں ایک ہی روایت امام شافعیؒ سے دکھلا دیجئے۔ اگر نہیں دکھلا سکتے تو پھر امام شافعیؒ کو بھی کم سے کم امام بخاریؒ و مسلمؒ کے نزدیک ضعیف

قرار دیدیجئے۔

پھر جس موطا امام مالکؒ کو آپ خصوصیت سے شہرۂ آفاق بتا رہے ہیں خبر ہے آپ کو کہ امام مالک کے شاگردِ رشید امام شافعیؒ نے یہ کہنے کے باوجود کہ "موطا امام مالک سے زیادہ صحیح کتاب آسمان کے نیچے کوئی نہیں" امام مالک کے رد میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں دعویٰ کیا ہے کہ ان کے بہت سے مسائل احادیثِ صریحہ کے خلاف ہیں۔

مشہور محدث لیث بن سعدؒ فرمایا کرتے تھے "امام مالکؒ نے ستر مسئلوں میں حدیث کی مخالفت کی"۔

حاصل گذارش یہ ہے کہ جو طریقہ امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف قرار دینے کا اہل حدیث بزرگ نے اختیار فرمایا ہے اس طریقے سے تو سیکڑوں ثقہ اور متفق علیہ راوی چٹکی بجاتے ضعیف بنا دیئے جائیں گے۔ فتنۂ انکار حدیث کے دور میں یہ اچھا حربہ وہ منکرین حدیث کو دے رہے ہیں۔

سچ کہا ہے کسی نے "نادان دوست سے دانا دشمن اچھا"۔ حدیث رسولؐ کی تائید و نصرت کے جوش میں ــــ یا پھر یوں کہہ لیجئے اپنے مسلک کی تائید میں اماموں کے امام ابوحنیفہؒ کو "ضعیف" قرار دے کر اہل حدیث بزرگ خوش ہو رہے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے پوری ملتِ مسلمہ کا وقار خاک میں مل جاتا ہے۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ــــ یہ کہاوت کس نے نہیں سنی۔ تمھاری صاحب تخریج ہدایہ کے حاشیہ سے ابن مدینی کا قول نقل کرتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے پچاس حدیثوں میں خطا کی ہے۔ احناف تو اہل حدیث کے نزدیک اندھے مقلد ٹھیرے ماشاء اللہ اہل حدیث ہر چیز کو علیٰ وجہ البصیرت قبول فرماتے ہیں تو پچاس نہیں تو صرف پانچ ہی وہ حدیثیں سپردِ قلم فرما دیجئے جن میں ابوحنیفہ نے خطا کی ہے۔

نیز ابوبکر بن داؤد کے اس قول پر جو تمھاری صاحب لٹو ہوئے کہ ابوحنیفہ نے کل ڈیڑھ سو حدیثیں روایت کی ہیں جنہیں سے نصف میں (یعنی ۷۵ میں) ان سے بھول واقع ہوئی ہے تو اسے کور نگاہی کے سوا کیا کہیں گے جب کہ آثار و مسانید کے متعدد اول مجموعے اس ڈیڑھ سو کی تعداد کا منھ چڑا رہے ہیں۔ اچھا جناب ۷۵ نہیں آپ صرف پانچ حدیثیں متعین کر کے بتا دیں کہ ان میں ابوحنیفہؒ نے بھول کی۔ مقلدین کے پیچھے تالی پیٹنے والوں کو دوسروں کے کاندھے پر بندوق چلانا زیب نہیں دیتا۔ بصیرت کا دعویٰ ہے تو مرحومین کے مبہم مقولوں کی تفصیل پیش فرمایئے تاکہ ابوحنیفہؒ کے مقابلہ میں آپ کی حدیث دانی کا ڈنکا بجے۔ یوں بلا دلیل باتیں نقل کرنا تو اسی تقلید جامد میں داخل ہے جس کی آپ کو احناف سے شکایت ہے۔

گفتگو ختم۔ کچھ فکرے اور تھوتھلے لوگ ہر جماعت میں ہوتے ہیں۔ اہل حدیث بزرگوں کو چاہیئے کہ اس طرح کے لوگوں کو باندھ کے رکھیں اور ان کے منھ میں لگام دیں۔

ادھر کچھ دنوں سے ہم بعض متین و ذمہ دار اہل حدیث کو اتحاد و اتفاق کی اپیلیں کرتا دیکھ رہے ہیں۔ یہ لائق تحسین اقدام ہے۔ دل چیر کر دکھایا جا سکتا تو ہم دکھاتے کہ جس طرح اہل حدیث یا کسی بھی گروہ کی نیش زنی پر ہم کڑھتے ہیں اسی طرح اُن دیوبندیوں اور حنفیوں کی جراحت کاری بھی ہمارے لئے کم تکلیف دہ نہیں ہوتی جن کا وطیرہ انتہا پسندانہ ہے اور جنھیں دیوبندیت یا حنفیت کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنے میں بھی ہمیں تأمل نہیں کہ جب سے قبوری شریعت کے شرک زدہ مبتدعین نے حنفیت کی تسبیح گھمانی شروع کی ہے ہمیں اس لفظ ہی سے وحشت ہونے لگی ہے۔ بڑا ستم یہ ہے کہ دیوبندی حنفیت کے ڈانڈے بھی تصوف اور طریقت کے بعض میدانوں میں قبوری حنفیت ہی سے ملتے جا رہے ہیں۔ اور رہی سہی کسر اس لاشعوری اتحاد نے پوری کر دی ہے جو ان دونوں حنفیتوں کے مابین بعض شیعی اقدار کو سنیت کا جامہ پہنا دینے کے باب میں واقع ہوتا چلا گیا ہے۔

حاصل یہ کہ خطا تنہا اہلِ حدیث کی نہیں۔ مجرم نام نہاد دیوبندی بھی ہیں۔ فضول جھگڑے اب ختم ہو جانے چاہئیں۔ اسلام کو ہماری دھاچوکڑی میں سانس تک لینا مشکل ہو گیا ہے ۱۲۔

دنیا اور دین کی فلاح

اس مضمون کی دو قسطیں ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہیں۔ اتفاق سے دسمبر کا تجلی تیسری قسط سے محروم رہا۔ اب یہ پیش خدمت ہے اسی پر مضمون تمام ہو گیا ہے۔ (ادارہ)

مگر یہ جو سمجھ لیا گیا ہے کہ وسیلہ کسی بزرگ و مقرب بارگاہ کا ہوتا ہے اور اس بزرگ کو بارگاہ الہٰی میں وسیلہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے یا کم سے کم ان کے نام کو وسیلے کے طور سے استعمال کیا جاتا ہے اور اللہ تعالٰے سے کہا جاتا ہے کہ ہماری فلاں حاجت فلاں بزرگ کے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے پوری کر دے۔ یہ عجمی ذہنیت ہے جو اہل عجم کی عجمی فکر نے نکالی اور پھر کتنے اہل علم بھی اس کو مستحسن سمجھنے لگے۔ حالانکہ یہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس وسیلے کے متعلق بھی شفاعت ہی کی طرح لوگوں نے بارگاہ الہٰی کو امراء و وزراء و سلاطین کا دربار سمجھ لیا۔ جہاں بغیر کسی انسانی وسیلے کے رسائی خلاف ادب بلکہ ممنوع سمجھی جاتی ہے جس کے وجوہ وہی ہیں جنکو میں شفاعت کے بیان میں لکھ چکا ہوں۔ اور امراء و سلاطین کے دربار پر بارگاہ الہٰی کا قیاس جن اسباب کی بناء پر غلط اور گمراہ کن ہے ان اسباب کو بھی وہیں پر بیان کر چکا ہوں۔ ایک نظر اس بحث کو اس موقع پر بھی دیکھ لیا جائے۔ امراء و سلاطین کے دربار میں جو انسان وسیلہ اختیار کرتے ہیں وہ یہی سمجھ کر کہ میں خود اگر عرض حال کروں گا تو میری بات سنی نہیں جائے گی۔ میری باتوں پر یقین نہ آئے گا۔ میری توجہ نہ ہو گی۔ مجھ پر بادشاہ سلامت کو اس قدر رحم نہ آئے گا جس قدر رحم کا میں طالب ہوں اس لئے بادشاہ پر اثر ڈالنے کے لئے کسی مقرب بارگاہ کا ذریعۂ تقرب وہاں حاصل کیا جاتا ہے۔ کیا اللہ تعالٰے کے متعلق کوئی مسلمان یہ گمان کیا ہو وہم بھی کر سکتا ہے کہ بارگاہ الہٰی میں میری آواز نہیں پہونچ سکیگی۔ اللہ تعالٰے میری التجا نہیں سنیگا، وہ مجھ پر رحم نہیں کرے گا۔ اس لئے کسی بزرگ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیکر اللہ تعالٰے پر (نعوذ باللہ) اثر ڈالوں تاکہ اس اثر کے ماتحت وہ میری دعا سن لے اور میری مراد پوری کر دے۔

یہی حال "بحق" کا ہے۔ جو لوگ "بحق رسول کریم" کہکر دعا کرتے ہیں اکابر علماء نے صاف لکھا ہے کہ یہ بڑی گستاخی ہے۔ اللہ تعالٰی کا حق اس کے ہر بندے پر ہے، وہ نبی رسول ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اللہ تعالٰے پر کسی کا حق نہیں ہے کہ "بحق" کہکر دعا کی جائے کہ آپکا حق جو تجھ پر ہے اس کا خیال کر کے میری حاجت پوری کر دے شیخ سعدی کا شعر جو مشہور ہے ؎

الہٰی بحق بنی فاطمہ
کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ

محققین تو یہی لکھتے ہیں کہ یہ شعر الحاقی ہے یعنی شیخ سعدیؒ کی کتاب میں کسی نے یہ شعر بڑھا دیا ہے اور اگر شیخ سعدیؒ کا یہ شعر ہو بھی تو دینی عقائد و اعمال میں بے چارے شیخ سعدیؒ کی سند جاہلوں کے سوا اور کون پیش کر سکتا ہے۔ شیخ سعدیؒ بھی ایرانی تھے اور عجمی اثرات سے محفوظ نہ تھے بعض اتیں اور بھی ان کی تصنیفات میں ایسی ملتی ہیں جو شرعی نقطۂ نگاہ سے قابل اعتراض ہیں مثلاً وہ گلستاں میں ایک جگہ لکھتے ہیں "بر فراز بیکے پیغمبر علیہ السلام معتکف بودم"۔ حالانکہ شرعاً مسجد کے سوا کسی بزرگ کے مزار پر اعتکاف کرنا بدعت ہے۔ ہرگز جائز نہیں۔ بغرض شیخ سعدیؒ کا کوئی قول کوئی فعل دین میں سند نہیں ہے۔

طفیل یا تصدق یا صدقے وغیرہ کے الفاظ اگرچہ ہلکے ہیں اپنے لفظی معنی کے اعتبار سے مگر جس ذہنیت کے ماتحت کہے جاتے ہیں کہ "یا اللہ میری فلاں حاجت

بطفیل یا بتصدق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا اپنے رسول اپنے حبیب کے صدقے میں یا ان کے طفیل میں یا ان کے وسیلے سے پوری کردے" ان سب کلمات کا اصل مفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے ادعونی استجب لکم تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کر لوں گا۔ (مؤمن آیت ۶۰) أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ جب کوئی دعا کرنے والا مجھ سے دعا کرتا ہے، میں اس کی دعا قبول کر لیتا ہوں (بقرہ آیت ۱۸۶) وغیرہ آیات پر اسکو پورا بھروسا نہیں ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور بزرگ کا نام لیکر اللہ تعالےٰ پر زور ڈالنا چاہتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ یوں اگر میری دعا اللہ تعالےٰ نہیں سنیگا تو رسول کی محبت سے تو مجبور ہو کر سن لے گا۔ غرض اس قسم کے الفاظ کا دعاؤں میں استعمال کرنا چار باتوں کا حامل ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا ہے دعا قبول کرنے کا اس وعدہ پر پورا اعتماد نہیں ہے دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی بزرگ کے نام کا واسطہ دیکر دباؤ ڈالا جاتا ہے جو یقیناً سخت سے سخت گستاخی ہے۔ تیسری بات یہ کہ قرآن کریم نے بیسیوں دعائیں تعلیم فرمائی ہیں، کسی ایک دعا میں بھی بنبیک (اپنے نبی کے وسیلے سے) یا بانبیائک (اپنے نبیوں کے وسیلے سے) وغیرہ قسم کے الفاظ نہیں آئے ہیں نہ اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ تم جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہو تو جو دعا مانگو ان کے وسیلے سے دعا مانگو۔ چوتھی بات یہ کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی کبھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ نہیں فرمایا کہ جب دعا مانگا کرو تو میرے وسیلے یا میرے طفیل سے مانگا کرو۔ نہ خلفائے راشدین و مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہ معمول تھا کہ وہ جب کوئی دعا کرتے تھے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعا کیا کرتے تھے۔ اور ہمیں حکم ہے سابقون اولون مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کے اتباع کا۔ اسلئے جس کام کو وہ دینی حیثیت سے نہیں کرتے تھے ہمیں بھی نہیں کرنا چاہیئے۔

اسلئے اس قسم کے الفاظ دعاؤں میں ... معنوی خرابیوں اور گمراہ کن تصورات پر مشتمل ہونے کے علاوہ مستقل بدعت بھی ہے۔ وکل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔ حدیث صحیح ہے یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ تک پہونچانے والی ہے۔

بدعت

ظاہری طور سے ہر بدعت کا تقریباً یہی اصول ہے کہ جو لوگ ان بدعتوں کے خوگر ہیں ان کو ان میں بھلائی کے سوا کوئی خرابی محسوس نہیں ہوتی۔ یحسبون انھم یحسنون صنعا اور وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہم تو ایک کار خیر کر رہے ہیں۔ اپنے رسول کے ساتھ اس قدر گرویدگی رکھتے ہیں کہ اپنی جو دینی و دنیاوی کامیابی چاہتے ہیں ان کے وسیلے کے بغیر نہیں چاہتے۔ یہ تو رسول سے غایت محبت کی دلیل ہے، اس میں کونسی برائی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ درحقیقت ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ زین لھم الشیطن اعمالھم شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے سامنے آراستہ کر کے پیش کر دیا ہے جس کی وجہ سے برے اعمال کی برائی ان کو بھلائی معلوم ہو رہی ہے۔ اسی طرح اس فرقہ بندیوں کے زمانے میں جب کہ ایک امت محمدیہ متعدد فرقوں میں بٹ کر اپنے رسول سے اپنا رشتہ منقطع کر چکی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ اے رسول! جن لوگوں نے اپنے دین کو فرقے فرقے کر دیا اور خود ٹولیوں میں بٹ گئے۔ تم کو ان سے کسی چیز میں کوئی سروکار نہیں (انعام آیت ۱۶۰) یہ قرآنی پیشینگوئی لفظاً اور حرفاً حرفاً ایسی سچی اتری کہ ہر منصف نظر صاف دیکھ رہی ہے لیکن جنکی آنکھوں پر فرقہ بندی کا پردہ پڑا ہوا ہے وہ نہیں دیکھ سکتے۔ دیکھئے "دین" نام ہے عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات کے مجموعے کا۔ چاہئے تھا کہ جو لوگ رسول کی امت ہیں اور رسول جو کتاب لائے ہیں یعنی قرآن مجید اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ دین کے ہر مسئلے میں قرآن مجید کی ہدایت اور اپنے رسول کی تعلیم متعین کر دیکھتے اور صرف سنت نبوی اور صحابہ

مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی پیروی کرتے جو باہمی تعامل صحابہ میں پہلے انہیں کو اختیار کرتے، عقائد و عبادات میں خصوصی سے ساتھ کسی اضافے کو قبول نہ کرتے۔ کیونکہ اخلاق و معاملات کا تعلق باہمی معاشرت سے ہے۔ اس میں تنوع کا ہونا ضروری ہے۔ نئے نئے معاملے اور نئے نئے مواقع پیش آتے رہیں گے اس لئے اخلاق و معاملات میں قیاس و اجتہاد کی ضرورت پڑے گی۔ مگر عقائد و عبادات کا بلا واسطہ تعلق معاد آخرت سے ہے۔ اور آخرت میں متنوع ہوگا یا نہیں۔ اور اُس وقت وہاں متنوع ہو رہا ہے یا اس کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عقائد و عبادات میں قیاس و اجتہاد کر کے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ اور اسی کو بدعت کہا گیا۔

مگر فرقہ پرستی کا بُرا ہو کر زبان سے قرآن و حدیث و سنت نبوی و سنت صحابہ کا نام تو ہر فرقہ تقریباً لیتا ہے لیکن ہر فرقہ اپنے فرقے کے علماء کی تصنیفوں ہی پر ایمان رکھتا ہے۔ کوئی ہزار قرآن کی آیتیں پیش کرے یا حدیثیں لائے مگر ان کے فرقے کے علماء کے خلاف اگر وہ آیتیں و حدیثیں ہیں تو کبھی نہ مانیں گے بہیتں طرح کی تاویلیں کریں گے قرآن و حدیث میں تحریف معنوی سے بھی باز نہ آئیں گے مگر اپنی فرقہ پرستی پر قائم رہیں گے۔ اس طرح خود ہر فرقے نے اپنا رشتہ رسول کریم اور قرآن مجید دونوں سے منقطع کر لیا ہے۔

تو پھر وسیلہ ہے کیا؟

اب یہ سوال رہ گیا کہ وسیلہ کے معنی اگر ذریعۂ تقرب ہے تو تقرب حاصل کرنے کے ذرائع کیا کیا ہیں؟ اور اگر اس کے معنی نفس تقرب کے ہیں جب بھی بغیر کسی ذریعے کے تو تقرب حاصل ہو نہیں سکتا۔ بہر حال ہمیں ذرائع تقرب ہی کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے بغیر صحیح ذرائع معلوم کئے تقرب کا حاصل ہونا محال ہے تو پہلے اس کو بھی قرآن مجید ہی سے پوچھئے دیکھئے کیا جواب ملتا ہے؟

قرآن میں ایک جگہ تو مومنین کو حکم ہے وسیلہ یعنی تقرب یا ذرائع تقرب حاصل کرنے کا۔ (در سورۂ مائدہ) مگر پہلے اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم دے کر تقرب حاصل کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اس لئے کہ سب سے بڑا اور سب سے پہلا ذریعۂ تقرب "تقویٰ" یعنی اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کی نافرمانیوں سے بچنا ہی ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ○ (جاثیہ آیت ۱۹) اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (انفال آیت ۳۴) (اللہ متقیوں کا دوست ہے اور اللہ کے دوست متقی ہی لوگ ہوتے ہیں) یعنی غیر متقی کا نہ اللہ دوست ہو سکتا ہے نہ وہ اللہ کے دوست ہو سکتے ہیں۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ ○ (متقی لوگ ایک بہترین امن و امان کی جگہ میں ہونگے) قیامت کا میدان جو اضطراب و پریشان حالی و خوف و ہراس کا مرکز ہوگا وہاں صرف متقیوں ہی کو ایسی جگہ ملے گی جہاں وہ محشر کی ساری ہیبت ناکیوں سے ہر طرح محفوظ امن و سکون کی جگہ اطمینان سے ہونگے (دخان آیت ۵۱) پھر متقی ہی لوگ اللہ کے محبوب بھی ہیں۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ کئی جگہ ہے۔ اس لئے اصل اور مستقل تقرب بارگاہِ الٰہی کا ذریعہ تقویٰ ہی ہے۔ اسی لئے پہلے تقویٰ کا حکم دیا اس لئے کہ اس کے بغیر تقرب حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وسیلہ حاصل کرنے کا حکم فرمایا گیا۔ اور اس کے بعد آخری اور انتہائی ذریعۂ تقرب کو بتایا گیا اور وہ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ کا حکم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جان و مال دونوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ تقرب بارگاہِ الٰہی اور کس چیز سے حاصل ہو سکتا ہے؟ مگر جس کے دل میں تقویٰ یعنی اللہ کا ڈر ہوگا وہی جان و مال سے اللہ کی راہ میں ذوق و شوق کے ساتھ جہاد بھی کرے گا۔ تقویٰ اور جہاد میں فرق اسی قدر ہے کہ میدانِ جنگ کا جہاد ہر وقت نہیں ہوتا اور تقویٰ تو جان کے ساتھ ہے۔ روح جسم سے نکلے گی بھی تو تقوے کی سی دولت کو چھوڑ کر نہیں نکل سکتی۔ وہ اس سرمائے کو اپنے ساتھ لیکر جسم سے نکلے گی۔ مگر یہاں تو عام جہاد کا لفظ ہے

جان و مال کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ تاکہ صرف میدانِ جنگ ہی والا جہاد نہ مراد لیا جائے۔ بلکہ اللہ کی راہ میں جہاد سب سے پہلے اپنے نفس کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ پھر اپنے اہل و عیال کے ساتھ پھر پڑوسیوں اور اہل قرابت کے ساتھ پھر عام مسلمانوں کے ساتھ اور غیر مسلمین کے ساتھ' اہلِ وطن کے ساتھ اور باہر والوں کے ساتھ وہ جہاد زبان سے بھی ہوتا ہے اور قلم سے بھی۔ جہاں تیغ و تفنگ سے جہاد کی ضرورت پڑتی ہے وہاں تیغ و تفنگ سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے تقویٰ کی طرح جہاد بھی دراصل ہر مسلم کی جان کے ساتھ ہے۔ اوروں کے ساتھ نہیں تو اپنے نفس کے ساتھ ضرور روزانہ بلکہ دن بھر میں کئی کئی بار جہاد کی ضرورت پیش آسکتی ہے' تو معلوم ہوا کہ ذریعۂ تقرب بارگاہِ الٰہی سب سے پہلا اور اصل تقویٰ ہے اور آخری مکمل ترین ذریعۂ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اب دوسری آیت پر غور فرمایئے۔ اس میں یہ ارشاد ہے کہ یہ مشرکین ان میں کتنے ایسے ہیں کہ ایسے لوگوں کو پکارا کرتے ہیں جو خود بارگاہِ الٰہی کا تقرب حاصل کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے کہ کون زیادہ تقرب حاصل کرتا ہے۔ ہر مقرب دوسرے مقرب پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا وہ لوگ بھی دوسرے بندوں کی طرح اللہ کی رحمت ہی کے امیدوار رہتے تھے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہتے تھے۔ اللہ کا عذاب ڈرنے ہی کی چیز ہے۔ بعض لوگ جیسے یہود و نصاریٰ انبیاء علیہم السلام یا اپنے بڑے احبار و رہبان کو اپنی مصیبتوں میں پکارا کرتے تھے۔ آج مسلمانوں میں بھی ہزاروں ہیں جو مصیبتوں کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو' بڑے پیر صاحب اور خواجہ اجمیری رضی اللہ عنہما کو یا اپنے پیرانِ سلاسل کو پکارا کرتے ہیں کتنے ہیں جو خود انھیں بزرگوں کو صاحب قدرت و اختیار سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہر نزدیک و دور اور حاضر و غائب کی پکار سنتے ہیں اور حاجت روائی و مشکل کشائی کی طاقت رکھتے ہیں۔ چاہے ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہ ہو' مگر جو لوگ اوہام ہی کو یقین کا درجہ دیدیں اُن کو دلیل کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو قرآن مجید ہی کا اصول ہے کہ لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحییٰ من حیّ عن بینۃ ط تاکہ گمراہی و ضلالت کی موت جو مرے وہ دلائل کی روشنی میں مرے اور ہدایت کی زندگی جو پائے وہ دلیل کی روشنی میں پائے۔ قرآن مجید کسی کو بے دلیل بات مان لینے کے لئے نہیں کہتا ہے۔ مگر جن کے دین کا مرکز قرآن مجید نہیں ہے اُن کے پاس دینی سرمایہ اوہام کے سوا اور کیا ہوگا۔

اور کچھ لوگ اس قدر کھلی ہوئی مشرکانہ عقیدتمندی تو بزرگانِ دین سے نہیں رکھتے ہیں کہ ان کو مستقل طور سے حاجت روا و مشکل کشا سمجھنے لگیں۔ مگر ان بزرگوں کیمتعلق صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ہماری غائبانہ پکار کو سن لیتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ ہماری پکار کو ان تک پہنچا دیا کرتا ہے وہ ضرور ہماری پکار سنکر ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعائیں کریں گے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے وسیلے سے ہماری حاجت پوری کر دیگا۔ کس قدر بُری عقیدت کیسی ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی وسیلے کے ہماری پکار تو بزرگان دین کے کانوں تک پہنچا سکتا ہے' لیکن وہ بغیر کسی وسیلے کے ہماری حاجت نہیں پوری کر سکتا۔ یہ کونسی عقل کی بات ہوئی؟ اللہ تعالیٰ ہماری پکار ان بزرگوں تک پہلے پہنچا دے۔ اس کے بعد وہ بزرگانِ دین ہمارے لئے اللہ تعالےٰ سے سفارش کریں تو ان کی سفارش سے وہ ہماری حاجت پوری کردے۔ پہلی حاجت تو یہی ہے کہ ہماری آواز وہ بزرگوں تک پہنچا دے۔ اس حاجت کے لئے بھی تو کوئی وسیلہ چاہئے۔ جب اس کے لئے کوئی وسیلہ ضروری نہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرض ہے کہ جب بزرگان کو کوئی پکارے تو وہ بلا عذر اُس کو پکار کر بزرگانِ دین تک ہمیشہ پہنچا دیا کرے۔ معاذ اللہ من ذلک

دوسری آیت میں فرمایا جاتا ہے کہ تم جن لوگوں کو پکارا کرتے ہو وہ بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کے بندے تھے۔ اللہ ہی نے ان کو بزرگی دی تھی جس سے وہ بزرگ ہوئے وہ تو خود بارگاہِ الٰہی میں تقرب حاصل کیا کرتے تھے اور اس تقرب حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں

گے رہتے تھے۔ جس طرح ہر بندے پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کا امیدوار رہے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتا رہے، اسی طرح وہ بزرگانِ دین بھی یہانتک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار بھی رہے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہی رہے۔ اپنے لئے نہیں تو اپنی امت ہی کے لئے سہی، مگر اللہ کے عذاب سے بے خوف نہیں رہے۔ اللہ کا عذاب ایسی ہی چیز ہے جس سے ہر شخص ڈرے۔

اس آیت میں بھی بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ یعنی تقرب حاصل کرنے کے دو ذریعے بتائے گئے۔ ایک تو اللہ تعالےٰ کی رحمت کی امیدواری اور دوسری چیز اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہنا۔ اور اسی کا نام تو تقویٰ ہے پہلی آیت میں بھی اتقوا اللہ کہکر اللہ سے ڈرتے رہنے کے لئے فرمایا گیا تھا۔ اللہ سے ڈرنے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کے عذاب سے ڈرا جائے۔ ورنہ اللہ تعالےٰ کی ذات پاک تو ڈرنے کی چیز نہیں۔ وہ تو سب سے زیادہ محبت کرنے اور محبت رکھنے کا مستحق ہے۔ گرویدگی وشیفتگی کی حق دار ہے۔ البتہ اس کو ناراض کرنے سے اور اس کی نافرمانی سے ضرور ڈرا جائے۔ کیونکہ اس کی نافرمانی ہی سے انسان عذاب کا مستحق ہوتا ہے اور جب نافرمانی سے عذاب کا مستحق ہوگا تو فرمانبرداری سے اس کی رحمت کا ضرور مستحق ہوگا۔

مختصر یہ ہے کہ دونوں آیتوں پر غور کرنے سے صاف طور سے یہ مفہوم کھل گیا کہ بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ یعنی تقرب حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک تو اطاعت وفرماں برداری اور دوسرا نافرمانی وسرکشی سے بچنا۔ اطاعت وفرماں برداری کا پہلا اور اہم ترین حصہ ایمان ہے کہ ایمان کے بغیر کوئی اطاعت کوئی فرمانبرداری قبول نہیں ہو سکتی مگر وہ ایمان کس طرح کا ایمان ہو؟ اس کو بھی سن لیجئے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ اور صحابۂ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے اہل کتاب اور اُمیّین یعنی غیر اہل کتاب کفار کے متعلق کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ (جس طرح تم لوگ ایمان لائے ہو اسی طرح اگر وہ لوگ بھی ایمان لے آئیں تو بے شک وہ لوگ بھی راہ ہدایت پر آگئے) اس لئے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اگر اپنے ایمان کو وہ ٹکسالی اور مقبول ایمان بنانا چاہتا ہے تو اپنے ہر عقیدہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عقیدے کے مطابق بنالے۔ ایک بال برابر بھی فرق معلوم ہو تو اس فرق کو باقی نہ رکھے۔ شاید وہی بال برابر کا فرق اس کے ایمان کو نامقبول بنادے جس عقیدے کی جتنی تفصیل قرآن مجید میں ہے اس سے زیادہ تفصیل کی کرید نہ کرے۔ جس عقیدے کو مجمل رکھا گیا ہے اس پر مجمل ہی عقیدہ رکھے۔ یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ عقیدہ نام ہے یقین کی گرہ باندھنے کا اور یقین قطعی ہی دلیل کی بنا پر حاصل ہوتا ہے اور قطعی دلیل قرآنی آیات سے بہتر کوئی بھی نہیں۔ اس کے بعد کوئی قطعی چیز اگر مسلمانوں کے لئے ہے تو وہ عمل متواتر ہے۔ یعنی پونے چودہ سو برس سے جس بات پر سارے مسلمانوں کا بلا اختلاف عقیدہ آرہا ہے اور اسی کے مطابق سب عمل کر رہے ہیں جزئیات وتفصیلات میں فرقہ بندی کی بدولت جو بدقسمتی سے امت کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے ہیں وہ جزئیات وتفصیلات عقیدے میں داخل نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک سب متفق ہیں، جن باتوں پر عہدِ صحابہؓ سے تواتر آرہا ہے بس وہی باتیں اسلامی عقیدے کی باتیں ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ وہ تواتر عہدِ صحابہ ہی میں ہونا چاہئے۔

عہد صحابہؓ کے بعد اگر کوئی بات پیدا ہوئی ہے اور اس کے بعد اس پر امت نے تواتر قائم کرلیا ہے تو یہ تواتر غلط ہے۔ اس کا ترک واجب ہے نہ کہ اتباع۔

البتہ کسی بات کے متعلق اگر کسی قوی دلیل سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس بات پر عمل درآمد تواتر کے ساتھ عہد صحابہ میں تھا، بعد کو رفتہ رفتہ مٹ گیا تو وہ اگر کسی قوی بلکہ قطعی دلیل سے ثابت ہو جائے تو عقیدے میں اصولاً داخل ہو سکتا ہے۔ مگر ایسی کوئی بات غالباً نہ ملے گی اور ملے گی بھی تو اس کا تعلق دینی عقیدے سے نہ ہوگا بلکہ واقعاتی عقیدے سے ہوگا۔

ایمان صحیح کے بعد اعمال صالحہ ہی ہیں جو بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ یعنی تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں مگر اعمال صالحہ کے لئے دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اعمال صالحہ اپنی ہیئت کذائی یعنی ظاہری شکل وصورت ادا کرنے کے طریقے کے اعتبار سے صحابہؓ کے عمل درآمد میں رہے ہوں۔ بطور خود بعد والوں نے جو اعمال ایجاد کرکے ان کو اعمال صالحہ کی فہرست میں درج کرلیا ہے، وہ قابل اعتبار نہیں۔ بلکہ ان سے احتیاط واجب ہے۔ کیونکہ وہ اعمال جو بعد کو ایجاد ہوئے ہیں اور معاد آخرت کے لئے کئے جاتے ہیں، بدعت قرار دیئے گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کل بدعۃ ضلالۃ ہر وہ نئی بات جو دین میں پیدا کی گئی گمراہی ہے۔ ایک مجمع میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی تو ایک شخص نے پوچھا کہ وان راٰھا الناس حسنا؟ اور اگر سب لوگ اس کو بہتر اور کار خیر سمجھیں؟ (تو کیا ایسی حالت میں بھی وہ گمراہی ہی ہوگی؟) تو آپ نے فرمایا وان راٰھا الناس حسنا۔ اگرچہ سارے لوگ اس کو بہتر اور کار خیر سمجھ لیں۔ اس لئے دین کے اندر کوئی نئی بات جو عہدِ صحابہؓ کے بعد پیدا ہوئی ہو یا عہد صحابہؓ کے آخری دور میں دوسروں نے پیدا کی ہو، ہزار وہ بہتر اور کار خیر معلوم ہو اسکو بدعت ہی سمجھنا چاہئے اور اس کے ترک ہی کو واجب جاننا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ عہد صحابہؓ میں خود صحابہؓ نے دین میں کوئی نئی بات نہیں پیدا کی۔ صحابہؓ سے بڑھ کر اتباع سنت کون کر سکتا تھا یا کر سکتا ہے۔ مگر صحابہؓ کے آخری دور ہی سے بدعتیں ایجاد ہونا شروع ہو گئی تھیں جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ کام صرف رضائے الٰہی حاصل کرنے کی نیت سے کیا جائے۔ اس کے سوا کوئی دوسری نیت نہ ہو۔ غرض بارگاہِ الٰہی میں تقرب حاصل کرنے کا پہلا ذریعہ تو ایمان صالح ہے اور دوسرا ذریعہ اعمال صالح ہیں اور بس۔ ان دو کے سوا تیسری کوئی چیز نہیں ہو سکتی جسکو اپنا وسیلہ یعنی ذریعۂ تقرب مصیبتوں اور پریشانیوں میں دعا کے وقت بنایا جا سکے۔

اعمال صالحہ بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک تو فرائض دوسرے نوافل۔ فرائض کے ذریعے بارگاہِ الٰہی میں تقرب حاصل کرنا تو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ قرآن مجید میں حکم ہے:۔ وَاسجد واقترب بارگاہِ ربّ العزت میں سجدہ گذار رہو اور اس سجدہ گذاری کے ذریعے تقرب حاصل کرتے رہو یہ حکم ہے اور حکم کا بجالانا فرض ہے۔

اور نوافل کے ذریعے تقرب مزید حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر ان میں بھی دو قسمیں ہیں۔ وہ سُنتیں جو مؤکدہ ہیں وہ بھی ہیں تو نوافل ہی۔ مگر ان کو بلا عذر بالکل ترک کر دینا ممنوع ہے۔ جیسے فجر کی سنت وغیرہ نمازیں۔ زکوٰۃ کے علاوہ کوئی مانگنے والا آیا یا کسی نادار کی ناداری معلوم ہوئی اور وہ حاجت مند اور پریشان ہے اور ہم دولت مند ہیں تو اگرچہ زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں مگر ہم پر لازم ہے کہ ہم مانگنے والے کو یا اس نادار حاجتمند کو اس کی ضرورت بھر کچھ دیں۔ قرآن مجید میں سچے مسلمانوں کی شان بتائی گئی ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ان کے مال میں مانگنے والوں کا اور ناداروں کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے۔ یہ آیت زکوٰۃ کے علاوہ داد ودہش کے متعلق ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق فرمایا گیا ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ مومنین کے مال میں ایک معین حق ہے سائلوں کا اور ناداروں کا۔ حق معلوم (مقرر معین حق) زکوٰۃ ہے اور غیر معین حق عام صدقات وخیرات۔ دونوں آیتوں میں جو اجر بتایا گیا ہے ان میں بھی نمایاں فرق ہے دیکھئے (ذاریات آیت ۲۰) اور (معارج آیت ۲۵)

غرض فرائض کے علاوہ نوافل تاکیدی بھی ایسے ہیں
جو ادا نہ کرنے پر موجب باز پرس ہو سکتے ہیں۔ اسلئے فرائض
کے بعد ان کی ذمہ داری کی اہمیت بھی کافی ہے۔ مگر یہ فرائض
سے زیادہ ذریعۂ تقرب ہوتے ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ تقرب ان نوافل کے ذریعے حاصل
ہوتا ہے جو تاکیدی نہیں ہیں۔ مگر محض رضائے الٰہی حاصل
کرنے کی نیت سے اپنی دلی رغبت سے ادا کئے جائیں اور انکی
اہمیت بالکل ظاہر ہے۔

البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کشمکش کے وقت کسی فریضے
کا ادا کر لینا، کسی گناہ کبیرہ سے محض ہیبت کے ڈر سے بچ جانا بھی
غایت تقرب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ غرض نیت، اخلاص، نوعیت
ادا اور مواقع و ماحول کی وجہ سے بعض وقت کوئی معمولی سا کارِ خیر
بھی زیادہ سے زیادہ تقرب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہی حال اشخاص کا
ہے کہ کوئی کارِ خیر ایسا ہو سکتا ہے جو ایک کے لئے معمولی درجے کے
تقرب کا باعث ہو اور دوسرے کے لئے بہت زیادہ تقرب کا
موجب بن جاتا ہے۔

آخر میں ہم صحیح مسلم سے ایک روایت پیش کرتے ہیں جس سے
نفس وسیلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور
وہ اللہ تعالیٰ کے نیکوکار بندے جن کا ذکر اس روایت
میں ہے، وسیلے کے کیا معنی سمجھتے تھے؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمی کہیں سفر
میں جا رہے تھے کہ ان کو بارش و طوفان سے سابقہ پڑ گیا۔ تو یہ
تینوں ایک پہاڑ کے کھوہ میں جا چھپے کہ اچانک ایک بڑا چٹان
لڑھکتا اوپر سے آیا اور اس کھوہ کے دہانے پر آ کے جم گیا۔
اس طرح کہ کسی طرف سے نکلنے کی راہ نہ رہی۔ تو ان میں سے کسی نے
اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ یاد کرو اپنا کوئی عمل جسکو تم نے
خالص طور سے اللہ تعالیٰ کے لئے کیا ہو۔ اس کے وسیلے سے
اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرو۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ
تم سے اس مصیبت کو دور کر دے۔ تو ان میں سے ایک نے کہا۔
کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میرے باپ ماں بہت بوڑھے تھے اور
میرے بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں دن بھر اونٹنی
چرایا کرتا تھا، شام کو گھر آتا دودھ دوہتا اور پہلے اپنے ماں باپ کو
پلاتا۔ ایک دن مجھے دیر ہو گئی ایک درخت کے نیچے سو رہنے
کے سبب سے دیر سے رات کو گھر پہنچا تو میں نے باپ ماں کو سوتا پایا
غرض میں حسبِ معمول دودھ دوہ چکا تو میں دودھ کا برتن
لے کر باپ ماں کے سرہانے پہنچا، مگر ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا
اور یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ باپ ماں سے پہلے اپنے بچوں کو
سیراب کر دوں (میں ماں باپ کے سرہانے کھڑا تھا
ان کے خود سے جاگ اٹھنے کے انتظار میں) اور میرے
بچے میرے قدموں کے پاس دودھ کے لئے تڑپ رہے
تھے۔ مگر میں اسی طرح (باپ ماں کے جاگ اٹھنے کے انتظار
میں) کھڑا رہا، یہانتک کہ صبح ہو گئی۔ تو اے میرے رب
اگر تو سمجھتا ہے کہ میں نے یہ محض تیری رضا طلبی کے لئے کیا
تھا تو کم سے کم اتنا تو اس غار کے منہ کو کھول دے کہ ہمیں
آسمان نظر آئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اتنا اس چٹان کو ہٹا
دیا کہ آسمان نظر آنے لگا۔

دوسرے نے کہا کہ اے میرے اللہ! تو جانتا ہے کہ
میرے ایک چچیری بہن تھی، جس سے میں بے حد محبت کرتا
تھا۔ جیسی محبت (خواہشِ نفسانی کے ماتحت) مرد عورتوں
سے ہوا کرتی ہے۔ اور میں برابر اس کو اپنی طرف بلاتا تھا
مگر وہ انکار کرتی رہی اس وقت تک کہ میں اس کے پاس
سو اشرفیاں بھیجوں۔ تو میں نے کوشش کی یہاں تک کہ سو
اشرفیاں جمع کر لیں اور ان کو لے کر اس کے پاس گیا۔ تو
جب اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھا تو اس نے کہا کہ
اے اللہ کے بندے! اللہ سے ڈر اور اس مہر کو نہ توڑ مگر اس کا
حق حاصل کر کے۔ تو میں (ڈر گیا) اور اس کے پاس سے اٹھ
گیا۔ تو اگر سمجھتا ہے کہ میں نے ایسا محض (تجھ سے ڈر کر) تیری رضا
طلبی کے لئے کیا تھا تو کچھ اور کشادگی پیدا کر دے۔ چنانچہ فوراً وہ
چٹان کچھ اور ہٹ گیا اور تھوڑی اور کشادگی پیدا ہو گئی۔

اس کے بعد تیسرے نے کہا کہ اے میرے اللہ! تو جانتا ہے

کہ میں نے ایک شخص کو نوکر رکھ لیا تھا سولہ رطل چاول پر تو جب وہ اپنا کام کر چکا تو اس نے اپنی مزدوری مانگی۔ میں نے اسکو وہ سولہ رطل اس کے سامنے پیش کر دیئے۔ مگر اس نے نہ لئے اور چلا گیا تو میں اس سے کاشتکاری کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میں نے اس سے گائے بیل خریدلئے اور چرواہے نوکر رکھ لئے تو بہت دنوں کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اللہ سے ڈرو اور میرا حق مجھ کو دے دو، تم میرے حق کے متعلق مجھ پر ظلم نہ کرو میں نے اس سے کہا کہ جاؤ ان گایوں کی طرف اور ان کے چرواہوں کے پاس اور سب لے لو۔ اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور مجھ سے ٹھٹھا نہ کرو۔ میں نے کہا کہ میں تجھ سے ٹھٹھا نہیں کر رہا ہوں۔ لے لو ان گایوں کو اور ان کے چرواہوں کو۔ تو وہ لے کر چلا گیا۔ تو اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ سب محض تیری رضا طلبی کے لئے کیا تھا تو جتنا بھر در بند رہ گیا ہے اس کو بھی کھولدے تو اللہ تعالیٰ نے چٹان کو ہٹا دیا اور غار کا منہ پورا کھولدیا (صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۵۳ مطبع علمی دہلی) دیکھئے اگر بزرگوں کا وسیلہ پیش کرنا صحیح ہوتا تو ان تینوں بزرگوں میں سے کوئی تو اپنے نبی کا یا اگلے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کا وسیلہ پیش کرتا۔ ہر ایک نے صرف اپنے ایک نیک عمل ہی کا وسیلہ اسی لئے پیش کیا کہ وہ جانتے تھے کہ بارگاہِ الٰہی میں اعمال صالحہ کے سوا اور کوئی وسیلہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔

یہ روایت صاف بتا رہی ہے کہ اعمال صالحہ جو خالصۃً لوجہ اللہ کئے جائیں وہی بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ یعنی ذریعۂ تقرب ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمم سابقہ میں سے کسی زمانے کا یہ واقعہ اسی لئے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیان فرمایا تاکہ مسلمانوں کو وَابْتَغُوا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ کے معنے معلوم ہو جائیں۔

وسیلہ یعنی تقرب تو ہر مسلمان کو بارگاہِ الٰہی میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرتے ہی رہنا چاہئے۔ کیونکہ ایک مسلمان کا نصب العین اور مقصدِ زندگی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو بارگاہِ الٰہی میں زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل ہو۔ مگر حاجت کے وقت مصیبت کے وقت دعاؤں کے وقت اور التجاؤں کے وقت اگر کچھ نفل نمازیں پڑھ کر یا کچھ روزے رکھ کر یا کچھ محض فی سبیل اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کی نیت سے کچھ خیرات کر کے یا کسی کارِ خیر میں خرچ کر کے اسی کارِ خیر کو بارگاہِ الٰہی میں ذریعۂ تقرب قرار دے کر دعا کرے تو چونکہ یہ دعا تقرب مزید حاصل کر کے مانگی گئی ہے اس لئے اس کے مقبول ہونے کی زیادہ امید کی جاسکتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایک کارِ خیر کی رشوت دی جارہی ہے یا ڈالی لگائی جا رہی ہے اس لئے اب اللہ تعالیٰ ضرور اس دعا کو سن لیگا۔ کیونکہ جو کارِ خیر بھی آپ کریں اس سے اللہ تعالیٰ کو آپ نے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا ہے ہیں۔ بلکہ اس کارِ خیر کا ثواب بھی آپ ہی کو ملے گا۔ آپ کی دعاء اس کارِ خیر کے وسیلے سے قبولیت کے قابل ہو گئی۔ قبول ہو گئی فبہا۔ ورنہ وہ دعا بھی آپ کی ایک عبادت ہی تھی۔ آپ عبادت کے ثواب سے تو محروم نہ رہے ؎

جو میں چاہوں، کیا کرے وہ وہی
میرا بندہ ہوا خدا نہ ہوا

اس لئے اس کی توقع رکھنا کہ جو کچھ ہم چاہیں وہی ہوتا رہے اور اللہ تعالیٰ کو دعاؤں کے ذریعے مسخر کر کے اپنا ہر کام اُس سے نکلوالیا کریں۔ ایک گمراہ کن خیال ہے۔ بندہ وہی ہے جو بہر حال مالک کی رضا پر راضی رہے۔ دعا کرنا بھی ایک شانِ بندگی ہے۔ دعا ضرور کرے۔ مگر یہ سمجھ کر نہیں کہ اللہ پر دعا قبول کرنا واجب ہے۔ اور اگر دعا قبول نہ ہو تو سمجھے کہ اس دعا کے قبول نہ ہونے ہی میں میری بھلائی ہے اس لئے اللہ کی رحمت سے مایوس و غمگین نہ ہو۔

نقد و تبصرہ

مستقل عنوان

کھرے کھوٹے

سوز و ساز مجموعۂ کلام جناب فاروق بانسپاری۔ چھوٹے ۱۴۰ صفحات کے اس مجموعے میں پروفیسر محمد نصیر اللہ انصاری ایم۔ اے کا ساڑھے چار صفحات پر مستقل "تعارف" پڑھکر ہمیں بدگمانی ہوئی تھی کہ شاعر کے حق میں مبالغہ آمیز مدح کا پہلو اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن جب اس گرانقدر مجموعے کو از اول تا آخر پڑھا تو ماننا پڑا کہ بدگمانی بیجا تھی اور فاروق صاحب یقیناً اس توصیف کے مستحق ہیں جو کی گئی۔ میرا تاثر تو یہ ہے کہ اسلام پسند شعراء میں آج شاید ایک بھی شاعر من حیث المجموع ان جیسا نہیں ہے۔ صحت مند اور پاکیزہ خیالات کو شعر کا مرصّع لباس پہنانے میں ان کا فن بڑا چست بہت پُرکار اور بے حد سلیقہ مند ہے۔ وہ نظم کا دریا سے رواں ہیں جس کی ہر موج گوہر بکف ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بجا نشیب فرازِ رہِ وفا لیکن ÷ مجھے ہے حکم سفر لا الٰہ الا اللہ

مفکّرانِ دیارِ مغرب تمہاری حکمت پہ آفریں ہے
دوا کی قسمیں تو بڑھ رہی ہیں مرض میں لیکن کمی نہیں ہے

مرض نواز عقائد کے یہ شفا خانے ÷ یہ سینہ چاک جوانوں کی کارگاہِ رفو
جو خود ہیں شاملِ تحریک حربِ لات و منات ÷ وہ کیا بتائیں گے اسرارِ لاشریک لہٗ

ایک دھبہ ہی جبیں پر وہ نشان سجدہ ÷ جو تری شب کیلئے بن نہ سکا ماہِ تمام

"مجاہد" کے بارے میں

پھنس جاتی ہے جب نا ؤ کبھی اسکی بھنور میں ÷ گرداب کے سینے سے ابھرتے ہیں کنارے

عورت کے متعلق

قائم جو رہے وضع پہ اپنی تو ہمہ خیر ÷ بڑھ جائے اگر حد سے تو سرتا بقدم شر
احساس کے پہلو میں بہر رنگ نمایاں ÷ تحقیق کے میداں میں مگر فہم سے باہر
توجیہ کا طلب گار ہے وہ جام یہی ہے ÷ لے جا کہ مرا آخری انعام یہی ہے

کتاب جمہوریت کا پہلا بصیرت افزا یہی سبق ہے
جو چار سچے کہیں وہ باطل جو پانچ جھوٹے کہیں وہ حق ہے

بجا یہ شکوۂ دشواریِ راہِ وفا لیکن ÷ محبت صرف مشکل ہی نہیں مشکل کشا بھی ہے

یہ اشعار مختلف نظموں کے ہیں۔ پوری نظم پڑھئے تو ان کا لطف بڑھ جائے گا۔ مجموعے میں چند غزلوں کے علاوہ سب نظمیں ہی نظمیں ہیں۔ ان چند غزلوں میں بھی نظم ہی کا رنگ و بو ہے۔ حاصلِ تبصرہ یہ کہ اس مجموعے کی اشاعت نے اسلام پسند ادب میں بڑا وقیع اضافہ کیا ہے۔ ویسے داغ تو چاند میں بھی ہیں۔ خوردہ گیر نظریں کہیں اونچ نیچ نکال لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

صراطِ عہدِ حاضر بال سے باریک ہے ساتھی
سنبھل کر چل کہ یہ رستہ بہت تاریک ہے ساتھی

"رستہ" یہاں ہمارے وجدان کو بھلا نہیں لگا۔ "جادہ" ہوتا تو کیا حرج تھا۔ بقیہ الفاظ کا مزاج اسی کا طالب ہے۔

تیرے فارابی و سینا کی غلط فہمی سے
کھا گیا مردِ مسلماں کو تصوف کا جذام

تصوف اور فارابی و سینا کا کیا جوڑ۔ یہ حضرات تو متکلمین میں سے تھے۔ زیادہ سے زیادہ حکیم و فلسفی کہہ لیجئے۔

روبروئے قاہرانِ بد نہاد
زندگی ابن علیؓ کا اجتہاد

اس مجموعے میں متعدد جگہ ابن علیؓ یعنی حضرت حسینؓ کا ذکر آیا ہے۔ ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ اس باب میں شاعر کے تصورات عوامی تصورات سے ممتاز نہیں لیکن کہنا یہ ہے کہ مذکورہ شعر کا دوسرا مصرعہ مجمل رہا۔ جس سیاق وسباق میں یہ آیا ہے وہاں اچھے اور برے دونوں ہی معنی نکالے جا سکتے ہیں۔

یہ حقیقت روز روشن کی طرح تابندہ ہے
مٹ گیا دورِ یزیدی ابن حیدرؓ زندہ ہے

محض شاعرانہ بلند پروازی جسے حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہاں مگر نکتہ یہ ہو کہ حضرت حسینؓ شہید ہوئے تھے اور شہیدوں کو مردہ نہ کہنا چاہیئے تو بے شک ماننا پڑے گا کہ "ابن حیدر زندہ ہے"! ـــ تاہم دورِ یزیدی کی طرح دورِ خلافتِ راشدہ بھی تو شاید مٹ ہی چکا ہے اُکُلُ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

قیمت دو روپے "کتاب محل، دال منڈی بنارس" سے مل سکتی ہے۔

نعیم العطا فی حدیث المجتبیٰ

پانچویں صدی ہجری میں ایک بزرگ گذرے ہیں حضرت قاضی عیاض اندلسی رحمۃ اللہ علیہ مسلک کے اعتبار سے مالکی تھے۔ علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی کے بھی اچھے عارف سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں سے بعض مقبول بھی ہوئیں۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ان کی مشہور ترین کتاب ہے اور اسی کا ترجمہ اس وقت پیش نظر ہے۔ مترجم ہیں جناب منشی حکیم سید غلام معین الدین جن اہل علم کے مطالعہ سے عربی الشفاء گذری ہوں ان کے لئے تو یہ توضیح غیر ضروری ہی ہوگی کہ فاضل مترجم رضاخانی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ شفاء جیسی کتاب کا ترجمہ پیش کرنے کی ہمت کوئی بریلوی ہی کر سکتا ہے۔ بریلوی حضرات کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ عظمت مرتبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف وثنا جس قدر باعث اجر و ثواب ہے اسی قدر خطرناک اور مفسدہ انگیز بھی ہے اگر روایات کی جانچ پرکھ سے آنکھیں بند کر کے توسنِ عقیدت کو بے لگام چھوڑ دیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ نئی نسلوں کو حدیث سے بدگمانی اور پھر انکار تک لے جانے والے مختلف عوامل میں سے بہت بڑا عامل حامیانِ حدیث کی یہ بے دانشی اور جذباتی گم گشتگی بھی ہے جس کے بہاؤ میں وہ علم وفن، فہم ودانش اور ناگزیر عصری تقاضوں کا قطعاً لحاظ نہیں کرتے۔ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم تھے۔ مسالک راہ طریقت تھے۔ عاشق رسول تھے۔ لائق تکریم تھے۔ بالکل بجا لیکن ان کی اور ان جیسے بہت سے علمائے سلف کی شہرت وعظمت کا اگر بھرم رکھنا ہے تو بھول کے بھی انکی اُن تصنیفات کا اردو ترجمہ نہیں کرنا چاہیئے جن میں انہوں نے علمی احتیاط، فنی عدل اور منطقی حزم کا دامن چھوڑ کر قلم کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔

قاضی عیاض اسی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ہم نے عاشقانِ رسول کے لئے لکھی ہے اُن لوگوں کیلئے نہیں لکھی جو بدنصیب محبت رسول سے بے بہرہ اور شانِ رسول سے منکر ہیں اس لئے اُن اشتباہات کے دفیعے کا اہتمام نہیں کیا جو عجیب وغریب روایات پڑھ کر اہل باطل کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو انتقال فرما چکے۔ ہم فاضل مترجم وناشر سے عرض کریں گے کہ جن لوگوں کے قلوب سے حدیث کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے وہ کافر نہیں ہیں مومن ہی ہیں۔ انھیں بھی ذات رسول سے عقیدت ہے۔ وہ بھی دین اسلام کی برتری پر یقین رکھتے ہیں۔ دوراز کار روایات سے ان کے ذہنوں میں بدگمانیاں اور شبہات پیدا ہونے کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ انھیں رسول اللہ سے عناد ہے اور وہ اہل باطل میں سے ہیں۔ اصل سبب یہ ہے کہ جب بے شمار ایسی روایات کی صحت وصداقت پر اصرار کیا جاتا ہے جنکا بطلان عقلی اعتبار سے ظاہر وباہر ہے۔ اور اس اصرار کا رشتہ متعدد بڑے بڑے علمائے سلف سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ یہ گمان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ حدیث کے معاملے میں علمائے اسلام نے عقل سلیم کے عوض اندھی عقیدت سے کام لیا ہے۔ ان بے چاروں کو

کیا معلوم کہ جن روایتوں سے وہ بدک رہے ہیں، وہ فی الحقیقت من گھڑت کہانیاں ہیں جنھیں یا تو چالاک منافقین نے اس لئے تصنیف کیا کہ صحیح احادیث کے ماءِ صافی میں خرافات و ہفوات کی غلاظت گھل مل جائے تاکہ لوگ اس کا ایک گھونٹ بھی پینا گوارا نہ کریں یا پھر ہوش باختہ عشاق یا کم عقل عالموں نے یہ سمجھکر انھیں اختراع کیا کہ اس طرح حبِّ رسول اور نصرتِ دین کا کارِ خیر انجام پائے گا۔

اب مثلاً ایک لمبی روایت بیان ہوئی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کچھ پیش گوئیاں منسوب کی گئی ہیں، ایک پیشنگوئی یہ بھی ہے کہ

"میری امت نہ بھوکی رہیگی نہ مغلوب ہوگی۔ (ص۱۲۱)

فرمائیے، کون صاحب عقل و نظر ہے جو اس پیش گوئی کو پڑھکر دو میں سے ایک مصیبت میں مبتلا نہ ہوگا۔ یا تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ حدیث کے راوی جھوٹے ہیں اور حدیث کو قبول کرنے والے عالم اس سے بھی بڑھکر بے عقل ہیں کہ انھیں ایک صریح البطلان کذب و افتراء کا ادراک نہ ہو سکا۔ اس بدگمانی کے بعد کیا گنجائش رہ جائے گی اس بات کی کہ وہ کسی بھی حدیث پر کماحقہ بھروسا کر سکے۔

یا پھر وہ یہ ماننے پر آمادہ ہوگا کہ نعوذ باللہ رسول اللہؐ کی پیش گوئیاں بھی نعرۂ مستانہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وائے افسوس فاضل مترجم کا کلیجہ بھی اس موقع پر دھک سے نہ ہوا کہ کیسی خلافِ واقعہ پیش گوئی رسول اللہؐ سے منسوب کر دی گئی ہے۔ کیا کج بحثی اور لاطائل توجیہ کے سوا اس کی کوئی قابلِ قبول تاویل ممکن ہو سکتی ہے؟

یا مثلاً ایک روایت بیان ہوئی کہ

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا میں نے زمین کے تمام مشارق و مغارب روند ڈالے میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر کسی مرد کو افضل نہیں پایا اور کسی باپ کے بیٹوں کو بنی ہاشم سے افضل نہ دیکھا" (ص۱۲۶)

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ مخلوقات سے افضل و برتر ہونا ایک طے شدہ حقیقت ہے جس میں کسی مومن کو کبھی کوئی شک نہیں ہوا۔ اس کے لئے قرآن اور احادیث صحیحہ میں اتنے صریح و محکم دلائل ہیں کہ ان سے بڑھ کر کسی دلیل کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسی روایتوں سے دلیل پکڑی جاتی ہے جو ذہنِ عام کو بدکانے والی اور عقل سلیم کو چرکہ لگانے والی ہیں۔ وہ جبرئیل جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہلی بار وحی لاتے وقت ہی معلوم ہو چکا تھا کہ محمد عربی اللہ کے سب سے بڑے پیغمبر اور افضل البشر ہیں انھیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ حضور کی افضلیت کا اذعان حاصل کرنے کے لئے مشارق و مغارب کو کھوندتے پھریں اور پھر حضورؐ کو یقین دلانے کی سعی فرمائیں۔

آخری فقرہ دیدنی ہے۔ مومنین کا سوادِ اعظم تو اس پر متفق ہے کہ ابو قحافہ کا بیٹا ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ کے بعد سب سے بڑا انسان ہے پھر خطاب کے بیٹے عمرؓ کا نمبر آتا ہے، پھر عثمانؓ پھر علیؓ۔ کا لیکن جبریل بتا رہے ہیں کہ بنو ہاشم سے افضل کوئی نہیں۔ کوئی بھی تاویل کر و لیقیناً وہ تاویل بارد ہوگی کیونکہ جبرئیل ایسی بات کبھی نہیں فرما سکتے جو ذہنوں میں نسل و خاندان کی برتری کا بیج بوئے جا رہے۔ فرطِ عقیدت میں مصنف اور مترجم سادہ حقیقتوں تک کو نظر انداز کر گئے۔ قرآن میں آتا ہے

اَلرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا — اللہ رحم والا ہے اسکی بابت باخبر لوگوں سے پوچھو

ایک صاحب "قاضی بکر بن علاء" کہتے ہیں کہ سوال کا حکم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مسئول و خبیر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں دوسروں نے کہا کہ سائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مسئول اللہ تعالیٰ۔ مذکورہ دونوں وجہوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی خبیر ہوتے ہیں"

فیصلہ فرمائیے دوسری وجہ سے رسول اللہ کیسے خبیر ٹھیرے وہ تو سائل ہیں اور اللہ مسئول۔ مسئول ہی خبیر ہوگا اسی سے سوال کا حکم ہے۔ کیا حاصل کہ سورج کی روشنی کے ثبوت میں دور از کار نکتہ سنجیاں کی جائیں جتنی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس معنی میں تو خبیر ہونا ظاہر ہی ہے کہ دین صحیح اور بے شمار مخفی

اشیاء کی آپ نے خبر دی لیکن یہ تأثر دینا کہ چونکہ اللہ کا بھی نام خبیر ہے اس لئے حضورؐ کا نام خبیر قرار دیئے جانے میں آپ کا مرتبہ بڑھ جاتا ہے توحید کے بلند تصور کو تاربیڈو کرنے کے مرادف ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک

اور سنئے " ذکر کرتے ہیں کہ خراسان کے ایک شہر میں ایک بچہ کو دیکھا کہ اس کے پہلو میں لا الٰہ الا اللہ اور دوسرے پہلو میں محمد رسول اللہ مکتوب تھا۔"

یہ نہلا ہوا۔ اب دہلا دیکھئے

" مؤرخین نے ذکر کیا ہے ہندوستان کے کسی شہر میں ایک سرخ گلاب کا پھول ہے اس پر سفید خط سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ مکتوب ہے ۔"

کاش قاضی عیاض کے متعدد مؤرخین یہ بھی لکھ جاتے " اور یہ سرخ گلاب یا تو بغداد میں ہے یا بریلی یا بدایوں میں۔"

خدا کے لئے انصاف فرمایئے۔ جو نئی نسلیں ہم مولویوں کی زبان سے سنتی ہیں کہ قاضی عیاض

"حدیث و تفسیر کے علاوہ فقہ، نحو، ادب، کلام عرب اور معقولات میں کامل دستگاہ رکھتے تھے" (ص)

اور پھر اُس ضعیف الاعتقادی، غلوئے جذبات اور ذہنی جمود کا مظاہرہ کرتی ہیں جس کے چند نمونے ابھی پیش ہوئے وہ کیا یہ نتیجہ نکالے بغیر رہ سکیں گی کہ اسلاف کا جمع فرمودہ سارا ہی ذخیرۂ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ جب معقولات میں کامل دستگاہ رکھنے والے سلف کی ضعیف الاعتقادی اور زود فریبی کا یہ عالم ہے تو دیگر ہی ائمۂ و محدثین کی معقولیت اور ثقہ کا کیا اعتبار۔

اللہ کے بندو۔ ایسی دیومالائی روایتیں تو وہ لائے جسکے پاس معقول و محکم روایات نہ ہوں۔ اہل ہنود اگر اپنے بندگوں کی منقبت میں ہر قسم کی روایتیں لاتے ہیں تو انکی تو مجبوری ہے کہ ان کے پاس فن روایت ہے ہی نہیں مگر اس قوم کی کج فکری و کم نگاہی کو کیا کہیں گے جو فرید و یکتا فن روایت کی سرمایہ دار ہونے کے باوجود کہانیوں سے دل بہلاتی ہو۔ تاریخ کو چھوڑیئے۔ ابھی ہمارے ہی اطراف میں شہرہ ہوا تھا کہ فلاں جگہ ایک درخت ہے جس کے ہر پتے پر کلمہ لکھا ہوا ہے۔ لوگ بھاگم بھاگ جانے لگے۔ ہم سے بھی کہا گیا کہ چلو قدرت کی کاریگری دیکھیں۔ ہم اس کے سوا کیا جواب دیتے کہ قدرت کی کاریگری تو ہر ذرے میں نظر آرہی ہے ہم " ابلہ گفت و دیوانہ باور کرد" کا مصداق بننے کو تیار نہیں ہیں۔

لوگوں نے بُرا مانا۔ بعض نے " وہابی" کہا۔ لیکن کچھ دنوں بعد حقیقت وہی نکلی جسے ہم اللہ کی دی ہوئی عقل سے دور بیٹھے سمجھ چکے تھے۔ پتوں پر کچھ ایسی نسیں اُبھری ہوئی تھیں کہ کسی الہامی شاعر نے انھیں خطِ طغرا میں کلمۂ طیبہ پڑھ لیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے خوفزدہ آدمی کو تاریکی میں نظر آنے والا ایک سفید وصبہ چور محسوس ہونے لگتا ہے اور پھر اُس کے ہاتھ پیر سر منھ سب ہویدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ الگنی پر ٹنگے ہوئے سفید تولئے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خوف ہی کی طرح محبت بھی ایک جذبہ ہے اور اس جذبہ میں وہم کے پر لگ جائیں تو ضعیف الاعتقادی کے عجیب عجیب مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ حقیقت منکشف ہو جانے کے بعد سب کو تنبیہ ہوگئی تو یہ کہیئے بے شمار لوگ ہیں جو یہی سمجھ رہے ہیں کہ کلمۂ طیبہ والا پیڑ ایک حقیقت ہے۔ اب انھی میں سے کسی صاحب کو تاریخ لکھنے کی سوجھ گئی تو کل کوئی اور قاضی عیاض ان کے حوالے سے "کلمۂ طیبہ والا پیڑ" کا عنوان جما دے گا۔

اور سنئے۔ حدیث بیان ہوئی۔

" قیامت کے دن ایک پکارنے والا کہے گا: " جس کا نام محمد ہے وہ کھڑا ہو جائے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی برکت سے جنت میں داخل ہو جائے۔"

اب نئی نسلوں کو کون بتائے کہ اس طرح کی روایتیں فن کی کسوٹی پر رانگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں اور ثقہ محدثین نے انھیں چھوا تک نہیں ہے۔ وہ تو یہی سوچیں گی کہ

یہ تعلیم خوب ہے۔ کروڑ دھرو نام رکھو محمدؐ جنت رزرو ہوئی۔ کسی من چلے کو اگر خیال آگیا کہ دیکھیں صحابہ میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنی اولادوں کے لئے اس سستی جنت کا انتظام کیا ہو۔ تو اسے بڑی مایوسی ہوگی کہ صحابہ کے یہاں اسکا کچھ بھی اہتمام نہیں۔ ہزاروں نام ہیں مگر محمد تقال ہی کا حال ہے۔ تب دو ہی صورتیں ہیں یا تو صحابہ ناسپاس و بے بہرہ۔ یا حدیث جھوٹی!

غلوئے عقیدت نے ذہنوں کا کتنا ستیاناس کیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سورۂ فتح میں نازل ہوا ہے

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ (پارہ ۲۶ رکوع ۹)	اے محمدؐ ہم نے تمہارے لئے صریح فیصلہ صادر کر دیا تاکہ اللہ تمہارے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرمائے اور تم پر اپنے احسانات مکمل کر دے۔

یہ آیات صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی تھیں اور اپنے الفاظ و معانی کے لحاظ سے بالکل صریح و محکم ہیں۔ قاضی عیاضؒ نے ایک جگہ صرف اتنا ٹکڑا نقل فرمایا ہے لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تأخر۔

فاضل مترجم نے اس کا ترجمہ یہ فرمایا ہے

"تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب آپ کے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ بخشدے۔"

ذرا غور فرمائیے اللہ نے کیا کہا تھا اور مترجم نے کیا معنی پیدا کئے۔ ہو سکتا ہے کسی سابق مفسر نے بھی یہی معنی پیدا کئے ہوں۔ آج کی طرح ماضی میں بھی ایسے عالموں کی کمی نہیں رہی ہے جن کی عقیدتِ رسولؐ مرضِ غلو کے مختلف اسٹیجوں سے گذر کر توہم اور ضعیف الاعتقادی کی منزل تک پہنچی اور انہوں نے ہر اس آیت کو جسمیں حضورؐ کی بشریت اور اللہ کے مقابلہ میں عجز کامل کی توضیح کی گئی تھی تاویل بارد کی خراد پر چڑھایا۔ معلوم نہیں مولانا رضا احمد خاں صاحب بریلوی نے کیا معنی کئے ہیں۔ بہرحال فاضل مترجم کے کئے ہوئے معنی آپ کے سامنے ہیں۔ زبان و ادب اور نحو و حرف اور سیاق و سباق سب کو نظر انداز کر کے اگر اسی طرح آیات کا ترجمہ کرنے کی کامل آزادی حامیان حدیث کو حاصل ہے تو پھر اہل قرآن پہ کس منھ سے اعتراض کیا جاتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ کیا کرتے ہیں کہ جوان کے نفس نے سکھایا وہی "ترجمہ قرآن" کے نام سے نشر کر دیا۔ غضب خدا کا آیت مذکورہ میں حضورؐ کے اگلوں پچھلوں کا ذکر کہاں ہے جو "لک" کے معنی زبردستی سببیت کے لئے جائیں۔ یہاں تو صریح طور پہ "ذنب" کی نسبت اس ضمیر خطاب کی طرف ہے جو بالیقین رسول اللہؐ کی طرف راجع ہے۔ اگلے پچھلے لوگوں کے گناہوں کا ذکر ہوتا تو من ذنبھم ہونا چاہئے تھا اور تقدم اور تاخر بھی بصیغۂ جمع آتے۔

مگر مریض ذکاوت کو ان قاعدے قانونوں کی کیا پروا۔ وہ تو خدا سے زیادہ مرتبہ شناس رسول ہونے کی دعویدار ہے اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی ہے کہ رسول اللہ کو بشر کہدیجئے تو نعوذ باللہ پڑھتی ہے۔

۷۱۶ صفحات کی اس ضخیم کتاب پر اگر تفصیلی نقد کیا جائے تو دفتر چاہیئے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

یقیناً قاضی عیاضؒ بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا عشق رسول بھی طے شدہ ہے۔ ان کی کتاب میں صحیح و ثقہ روایات بھی بہت ہیں لیکن جس طرح جھوٹا اسے ہی نہیں کہتے جو سو بار میں ۱۵ بار جھوٹ بولے بلکہ اسے بھی کہتے ہیں جو دس سچ کہے تو ایک جھوٹ ملا دے اسی طرح ناقابل اعتبار کتاب وہ ہی نہیں جس کا اکثر حصہ غیر معتبر ہو بلکہ وہ بھی ہے جس میں سو صحیح روایات کے ساتھ دو چار موضوع، ضعیف اور صریح البطلان روایتیں بھی ٹانک دی جائیں۔ اس لحاظ سے "الشفاء" کو ہم غیر معتبر کہیں گے اور فیصلہ دیجئے کہ اس کا اردو ترجمہ پیش کر کے مترجم و ناشر نے دین و ملت کی خدمت نہیں کی ہے بلکہ عصری ذہنیت کے سامنے حدیث اور علمائے سلف سے بدگمان کرنے والی ایک اور

دستاویز رکھدی ہے۔ عقیدت رسولؐ کو ذہنی تعیش کے طور پر استعمال کرنے والوں کے لئے یہ ایک نیا ساغر ہے جو قوائے عمل کے تعطل میں مزید جمود پیدا کرے گا۔ کم علموں اور جاہلوں کے لئے پیام طمانیت ہے کہ تم جو رسول اللہؐ کو دیوتا اور نیم خدا سمجھتے ہو وہ عین حقیقت ہے کیونکہ بیسیوں روایتوں کا مزاج یہی بتا رہا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ "الشفاء" تو خیر رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔ عام فہم زبان میں تو اُن صحیح تر احادیث کا مجموعہ بھی نہیں چھاپنا چاہیئے جو عصر حاضر کے مذاق و مزاج اور نئی نسلوں کی نفسیات میں مزید بگاڑ کا موجب ہوں۔ احکام و اوامر تو اپنی جگہ اٹل ہیں اس لئے ان سے صرف نظر ناممکن ہے چاہے زمانے کا مزاج کتنا ہی بگڑ جائے لیکن وہ معجزات و کرامات اور اوصاف و مناقب جو علم دین سے کچھ تعلق نہیں رکھتے اور درست و بجا ہونے کے باوجود ان کا چرچا نہ کرنا دین و ایمان میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتا ان کو عام فہم زبانوں میں نشر کرنے سے پہلے علماء کا یہ فرض ہے کہ عصر موجود کے مزاج و مذاق کو پیش نظر رکھکر انتخاب کی زحمت اٹھائیں کہ کونسی روایتیں ذہنوں کو دین سے قریب لائیں گی اور کونسی وسوسے اور شبہات پیدا کرنے کی موجب ہوں گی۔ حکیم نسخے میں صرف مرض اور دوا ہی کا لحاظ نہیں رکھتا مریض کے مزاج اور منفرد نظام جسمانی کی بھی رعایت رکھتا ہے۔ ایک ہی نسخہ زید کو جس مرض میں شفا دے گیا وہ اسی مرض میں طلحہ کو کوئی فائدہ نہیں دیتا اور بکر کو تو الٹا نقصان دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ حکیم نے مزاجوں کے فرق کو نہیں سمجھا۔ اسباب مرض پر نظر نہیں کی۔ ایک ہی مرض مختلف اسباب و عوامل سے پیدا ہوتا ہے۔ اصل حکمت اِن اسباب و عوامل کو سمجھنا اور پھر ان کے مناسب نسخہ تجویز کرنا ہے۔

گویا ہم معجزات و کرامات اور حیرت انگیز اوصاف و صفات کی حقیقت یا افادیت کے منکر نہیں۔ ہر دوا اپنی جگہ افادیت کی حامل ہے اور صحیح جگہ استعمال ہو جائے تو ضرور فائدہ کرتی ہے۔ لیکن جس دور میں ہم ہیں وہاں بے دینی و تشکیک کے امراض اُن اسباب و علل سے پیدا نہیں ہو رہے جن سے دورِ رسالت مآبؐ میں پیدا ہوئے تھے۔ نہ ان امراض کی ہیئت مجموعی وہ ہے جو عہدِ اُس دورِ مبارک میں تھی۔ نہ عوام کے سوچنے سمجھنے کے زاویئے وہ ہیں جو اس زمانے میں تھے۔ نہ مزاج و مذاق پہلا جیسا رہا ہے۔ تب کیا فائدہ ہوگا اس نسخے سے جو صدیوں پہلے استعمال ہو کر بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔ عطائیوں کی طرح کسی طبیب حاذق کی بیاض سے نسخہ نقل کر کے اناڑیوں کو پرچانا اور بات ہے۔ سچا حکیم وہ ہے جو اسباب مرض، مزاجِ مریض منازل مرض، حسب حال پرہیز اور موزوں دواؤں کے انتخاب میں سے کسی بھی شے کو نظر انداز نہ کرے۔

"الشفاء" اپنے مصنف کے نام پر خاصی بک جائے گی۔ لوگ پڑھ پڑھ کے جھومیں گے بھی، مترجم و ناشر کو دادِ تحسین سے بھی نوازنے والے کم نہ ہوں گے۔ لیکن اگر جوہری حقیقتوں کو ناپنے کا کوئی بیرومیٹر ہوتا تو وہ بتاتا کہ فالج زدہ قوائے عمل کی بے حسی کچھ اور بڑھ گئی اور شرک زدہ آئیڈیالوجی کا نشہ کچھ اور تیز ہو گیا۔

تبصرہ بہت سخت ہے حاشا کہ ہمیں قاضی عیاضؒ یا مترجم سے کوئی بیر نہیں لیکن اُس مظلوم دین کی بیکسی پر رونا آتا ہے جس کے روئے زیبا پر خود اس کے ماننے والے گرد کی تہیں چڑھائے چلے جاتے ہیں۔ مترجم نے کتاب کے تعارف میں متعدد اسلاف کے تعریفی اشعار نقل کئے ہیں ایک شعر میں یہ بھی ہے۔

"عیاضؒ کی کتاب دلوں کے زنگ دور کر دیتی ہے"۔

ہوگا کوئی زمانہ جب ایسی کتابوں سے زنگ دور ہوتے ہوں گے۔ فی زمانہ تو قسم کھا کے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے زنگوں میں اضافہ ہوگا کمی نہیں ہوگی۔ اُن اسلاف کی عزت بھی نئی نسلوں کی نگاہ میں مٹی ہوئی جن کے اسمائے گرامی رطب و یابس کے اِس مجموعے کی بے قید تعریف میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ لوگ سوچیں گے جو بزرگ پیتل سلے ہوئے سونے

گو نذرِ خالص تمنائیں ان کی ثروت نگاہی معلوم!

ترجم انشاء کے اعتبار سے تیسرے درجہ کا ہے لفظی مطابقت کے لحاظ سے دوسرے درجے کا۔ کتابت وطباعت معمولی ہے۔ کاغذ رف سائز چھوٹا ناول جیسا۔ قیمت چار روپے۔ ناشر ہے۔ ادارہ نعیمیہ رضویہ ہفت روزہ سوادِ اعظم موچی گیٹ۔ لاہور۔ جسے اسپرٹ ملا ہو آپ زمزم پینا پسند ہو وہ شوق سے منگائے اور پڑھنے کے بعد خود کو تولے کہ حبِ رسولؐ میں کتنا اضافہ ہوا ہے

تگ وتاز

مجموعہ کلام جناب ابوالمجاہد زاہد ● طابع وناشر نسیم
● ملنے کا پتہ: ادارہ ادبیات اُردو۔ لکھنؤ۔
● صفحات ۱۷۶ قیمت مجلد دو روپے

اسلام پسند حلقوں میں زاہد صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ اسلام پسند شعراء میں اگلی صف کے شاعر ہیں۔ ان کی پختہ کلامی اور مہارتِ فن مسلم ہے۔ اسلامی تصورات سے انکی وابستگی اور باطل افکار واعمال سے ان کی شدید بیزاری انکے فکر وفن کا وہ سرمایہ ہے جس پر بجا طور پر فخر وناز کیا جاسکتا ہے۔ اسلام پسند ادب ابھی جن ابتدائی منازل میں ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موصوف اس کے مرتبین میں سے ہیں۔

لیکن جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

ان کی یہی ممتاز پوزیشن ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام پر تبصرے کا معیار ذرا سخت کرنا پڑے گا راہ نماؤں اور پیشرووں کی لغزشیں بہت دوررس اور متعدی ہوتی ہیں اس لئے ان کا محاسبہ بھی جلدی اور بے لاگ ہونا چاہئے۔

پیش نظر مجموعے میں ۵۰ صفحات تک نظمیں ہیں اور اس کے بعد غزلیں۔ نظمیں کئی اعتبار سے بہت اچھی ہیں لیکن کچھ پہلو لائق گفتگو ہیں۔ سرسری نظر سے انتخاب کیا جائے تو اس مجموعے سے پسندیدہ اشعار کی لمبی فہرست مہیا کی جاسکتی ہے لیکن گہری نظر ڈالی جائے تو دامن انتخاب زیادہ وسیع نہ ہوگا چند عمدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

مومن ہیں نہ کافر ہیں مسلم ہیں نہ ملحد ہیں ؞ اس دور کے انساں ہیں بے شمع کے پروانے

مری ہنسی پہ نہ حیران ہو میرے صیاد ؞ ہنسی نہیں یہ ترقی پسند ماتم ہے

نئے افسانے کیا خوب ڈھونڈا ہے مقام اپنا ؞ خدا کی بندگی چھوڑی تو بن بیٹھا غلام اپنا

اب ہیں اپنے پاؤں اپنی بیڑیاں ؞ اجنبی زنجیر گل کر رہ گئی

غلط روی کا تمدن ہی نام کیا کہئے ؞ سحر کے بھیس میں رقصاں ہے شام کیا کہئے

شروع میں جناب ضیاء احمد بدایونی (ایم۔ اے) کا چھ صفحات کا پیش لفظ ہے جس میں انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنا فرض انجام دیا ہے۔ لیکن اُن کے اس فیصلے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ زاہد صاحب کے یہاں خالص اور پاکیزہ رنگ تغزل کی کمی نہیں۔" ہمارا خیال ہے کہ "تغزل" کا سایہ بھی زاہد صاحب کی غزلوں پر مشکل ہی سے پڑ سکا ہے۔ وہ چند اشعار جو اپنے قالب اور ضابطۂ فن کے اعتبار سے "غزل" کہلائے جائیں ضروری نہیں کہ "تغزل" کے بھی سرمایہ دار ہوں۔ ہمیں ان کی تمام غزلوں میں صرف ایک شعر مل سکا ہے جو بھرپور تغزل کا امین کہا جاسکتا ہے۔

اب کسکو تیری یاد کی لذت عطا کروں ؞ غم بھی ہے بے ثبات مسرت بھی بے ثبات

اس کے علاوہ بعض اور اشعار میں بھی درجہ بدرجہ تغزل کی نقش کاری ہے مثلاً

کچھ اس ادا سے اٹھی ہے نگاہ مستانہ ؞ مری بساط ہی کیا جھومتا ہے میخانہ

زبان طرز تکلم کو سوچتی ہی رہی ؞ ٹپک پڑا نگہ شوق سے اک افسانہ

لیکن یہ محض رسمی ورواتی انداز کے اشعار ہیں جن میں پامال مضامین ہی بیان ہوئے ہیں۔ سوز وگداز، رنگینی اور سرشاری جو تغزل کے عناصر ترکیبی میں سے ہیں ان میں نام کو نہیں۔ زاہد صاحب کی غزلیں حسنِ بیان، پاکیزہ خیالی، اسلام پسندی اور لفظی دروبست کے لحاظ سے معیاری ہونے کے باوجود تغزل کے جمالیاتی رنگ وبو اور لطیف سوز وگداز سے یکسر خالی ہیں۔ ان کے قالب اور لب ولہجے میں نظم کی روح کارفرما ہے۔

پیش لفظ کا پہلا جملہ ہے

"اسلام ایک چھا جانے والا ابر رحمت تھا جس نے برس کر تمام جل تھل بھر دیئے۔"

ہماری رائے میں ضیاء صاحب سے محاورے کے استعمال میں چوک ہوئی۔ کہنا چاہیئے تھا۔

"جل تھل ایک کر دیئے"

جل تھل بھر دینا محاورہ نہیں ہے۔

پیش لفظ کے بعد ایک پورا صفحہ "انتساب" کا دیا گیا ہے جس پر صرف یہ الفاظ درج ہیں

"کوثر جہاں کے نام"

ہم سمجھے تھے کہ کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور یہ وضاحت مل جائیگی کہ "کوثر جہاں" شاعر کی بیوی کا نام ہے۔ لیکن کہیں نہیں ملی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کوثر جہاں کون ہیں۔ کیوں ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ رومانٹک انتساب اس خشک اور سپاٹ طرزِ فکر سے ذرا بھی جوڑ نہیں کھاتا جو اس مجموعے کے مندرجات میں نمایاں ہے یہ اعتراض بھی اسپر وارد ہوتا ہے کہ تعلق کی صحیح نوعیت واضح کئے بغیر ایک خاتون سے (کوثر جہاں غالبًا کسی مرد کا نام تو نہیں ہو سکتا) گہرے تعلق کی اعلان کا جواز اُس شاعر کو کہاں سے ملا جو بات بات میں اسلامی اقدار و تصورات کا سبق دیتا ہے۔ اگر کوثر جہاں شاعر کی زوجہ ہیں تب بھی اس کی وضاحت ضروری تھی اور اس کے باوجود یہ انتساب کچھ سنجیدہ نہ مانا جاتا لیکن اگر زوجہ نہیں ہیں تب تو معاملہ کئی اعتبارسے لائق بحث ہو جاتا ہے۔ اس عقدے کی گرہ کشائی خود شاعر یا پھر مجموعے کے ناشر م۔ نسیم ہی کر سکتے ہیں۔ اسلام پسندی کا سوال پیش نظر نہ ہوتا تب تو یہ کوئی عقدہ نہ تھا لیکن بحالت موجودہ یہ کم سے کم راقم الحروف کیلئے اعجوبہ ہی ہے۔

شروع کے پانچ دعائیہ اشعار خلوص وسادگی کے مظہر ہیں لیکن ان کے طرزِ بیان میں ذرا بھی شعریت نہیں۔ انھیں پڑھکر ڈاکٹر اقبال کی وہ نظم یاد آجاتی ہے جس میں ایک بچے نے دعا مانگی ہے سادگی اور بے ساختگی بے شک خوبیاں ہیں لیکن انھیں پُرکاری کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے۔

نظموں کے بارے میں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں زور ہے۔ روانی ہے۔ جوش اور ہمہمہ ہے۔ ایسا رچاؤ ہے جو چابکدستی اور پختگی پر دلالت کرتا ہے لیکن مجموعی نقص ان کا یہ ہے کہ یہ اُسلوبِ ایمائیت اور لطافتِ بیان سے بڑی حد تک خالی ہیں جو شعر کو نثر سے جدا کرتی ہے۔ اکدم راست انداز۔ دو اور دو چار قسم کی صاف بیانی، کف دردہن صداقت۔ باطل سے نفرت بجا لیکن اظہارِ نفرت کو نمایاں قسم کے اشتعال اور بوجھل قسم کی حقیقت بیانی کا روپ دینے کے بعد اُس نزاکت و لطافت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں جس کے بغیر شاعری شاعری نہیں رہ جاتی۔ ابہام، اشاریت، اجمال، شاعری کی جان ہیں، استعارے اور کنائے اسے زندگی بخشتے ہیں، افسوس کہ یہ عناصر زاہد صاحب کی نظموں میں بہت کم پائے جاتے ہیں اور ان کا جوشِ حق پرستی رسمی تکلفات کے تمام حریری پردے چاک چاک کرتا نظر آتا ہے۔

جزوی نقص یہ ہے کہ وہ جگہ جگہ ایسے چٹیل، پُرخشونت اور کھردرے الفاظ نظم کر جاتے ہیں جن سے وجدان گھٹ کے رہ جاتا ہے۔ غالبًا وہ غیر شعوری طور پر بزعم خود نام نہاد ترقی پسندوں کے اسلوب گفتار سے متأثر ہو گئے ہیں

راہرو تیرگی میں بھٹکتے رہے، رہنما، نکی بھی لاج جاتی رہی
رات اکڑتی رہی رات بڑھتی رہی ہر طرف جال اپنا بچھاتی رہی

اس سے قطع نظر کہ "لاج جانا" یہاں خلاف محاورہ نظم ہوا ہے "رات اکڑتی رہی" کتنا ثقیل اور ناموزوں ہے۔ استعارے کے تمام اجزا متناسب ہونے چاہئیں۔ رات کی صفت "اکڑنا" کہاں ہوتی ہے۔

ذہن اقوام سے سانپوں کی بسانند آتی ہے

"بسانند" کا لفظ زاہد صاحب نے کئی جگہ استعمال کیا ہے مگر ہمارا ذوق کہتا ہے کہ یہ لفظ اپنی کثیفگری کے اعتبار سے صنفِ شاعری کا لفظ ہی نہیں۔

اے مہذب وحشیو! اے شہر کے بن مانسو!

"بن مانسو" کے کھردرے پن کو شعر کی زبان تو گوارہ نہیں کرتی یہ غیظ و نفرت کا غیر شاعرانہ مظاہرہ ہے۔

آدمیت کی ردا اوڑھے ہوئے بہروپیو!

یہ بھی شاعرانہ اندازِ خطاب نہیں

اے لکیروں کے فقیرو! اے نرے ٹٹ پونجیو!

ابھی تو عدہ ہو گئی۔ غیرت سے یہ مصرع لکھتے وقت زاہد صاحب کے مذاقِ شعری کو کیا ہو گیا تھا۔ "کیریوں کے فقیر" محاورہ بھی غلط باندھا ہے۔ جمع صرف فقیر کی درست تھی "کیر" کی نہیں

لاشۂ عصمت سے لے چمٹے ہوئے گدھ واسنو

بد سے بدتر خطاب دے جانے کی کے جوش میں زاہد صاحب نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ "گدھ" کی جمع تشدید کے ساتھ درست بھی ہوگی یا نہیں۔ صوتی خشونت مستزاد ہے۔ شاعر کا غصہ شائستگی اور رکھ رکھاؤ کو بدنما طور پر منہ چڑا رہا ہے۔

یہ تفکر لاغر و بیمار ! اخلاقی جذام

یہ غلامانہ روش ہے مرگ غیرت کا پیام

پہلا مصرعہ اسی غصے کا آئینہ دار ہے جس سے شعر کی روح کچلی جاتی ہے۔ دوسرے مصرع میں "پیام" بے محل ہے۔ غلامانہ روش مرگِ غیرت کی "علامت" ہوتی ہے نہ کہ پیام۔

چھوڑ دے ہاتھ مرا بوالہوس و شتر نمام

بندۂ حرص و ہوا دیوِ خیانت کے غلام

یہ شاعری ہے؟ الفاظ اگر کسی مسلمان تعلیم یافتہ لڑکی کے ہوتے تب بھی شعریت کش تھے لیکن یہ تو زاہد صاحب نے اُس ہندو بیوہ سے کہلوائے ہیں جو نارمل حالات میں بھی ایسی شرعی زبان نہیں بول سکتی۔ کجا کہ اسوقت جب اس کے دیور نے اُس پر ہاتھ ڈالدیا ہے اور وہ بیچاری چیخ پکار کر رہی ہے۔ یہ چیخ پکار قدرتاً "مادری" زبان کے انداز کی ہونی چاہیئے تھی۔ یہ نظم "اندھیر" مجموعی طور پر کافی اچھی ہے اور ایک سماجی حقیقت کی سبق آموز عکاسی کرتی ہے لیکن جب مکالمہ غیر فطری اور خود ساختہ انداز کا ہو تو نظم کی اثر یت خاک میں ملجاتی ہے۔

زبان و اصطلاح کی لغزشیں بھی نگٹ نازمیں جابجا ملتی ہیں

خدا کو ترس آیا اہلِ زمیں پر

یہ "رحمۃ للعالمین" کا مصرعہ ہے۔ شاعر نے کہا ہے کہ جب جہل و ضلالت حد سے بڑھ گئے تو اللہ کو اہلِ زمیں پر ترس آیا اور انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما دیا۔ خدا کی طرف "ترس" کی نسبت کرنا اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم کی غلط تطبیق ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں اس کی کوئی مثال کسی مستند ادیب کے یہاں نہیں ملیگی۔

قدرت پستی کے سینے میں احساس بلندی ہوتی ہے

اگر یہاں کتابت کی غلطی نہیں تو "ہوتی ہے" ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ کتابت کی غلطی ہے تو یقیناً "بوتی ہے" نظم کیا گیا ہوگا "احساس بونا" مضحکہ خیز ہے۔

دام ہوں پاس تو بکتا ہے جوانی کا سنگار

مول مل جاتے ہیں گلرنگ مہکتے رخسار

"مہکنا" رخساروں کی صفت نہیں۔ رخساروں میں زیادہ سے زیادہ ایک موہوم سی "خوشبو" تسلیم کی جاسکتی ہے۔ مہکتی تو زلفیں ہیں اور وہ بھی طبعاً نہیں بلکہ ہیر آئل کی مدد سے۔

مفلسی کی لیلائیں ——— سرخ جال تنتی ہیں

"تننا" لازم ہے متعدی نہیں۔ حالانکہ یہاں متعدی کی ضرورت تھی۔ "تانتی" ہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اگرچہ اس کی بھی صوتی ہیئت دلپذیر نہیں ہے تاہم مفہوم بن جاتا۔ بحالت موجودہ مفہوم ہی خبط ہوا۔

جنگ اپنے پر پرزے جس قدر جماتی ہے

محاورہ یا تو "پرزے نکالنا" ہے یا پھر "پر پرزے جمنا" — پر پرزے جمانا آج تک نظروں سے نہیں گذرا۔ ظاہر ہے محاورں میں اشتقاق نہیں ہوتا کہ "جمنا" سے "جمانا" نکال لیا جائے (تاہم اس تعریض پر ہمیں وثوق نہیں ہے!)

میز پر لیٹی گھڑی کے دل کی دھڑکن صدا

"میز پر لیٹی گھڑی" ٹھیک ترقی پسندانہ انداز ہے۔ اس کی تمثیل میں اگر یہ ترقی پسندانہ شعر پڑھ دیا جائے۔

دل دھڑکنے سے اچانک جو دھماکہ سا ہوا

میں یہ سمجھا کہیں کودا تو نہیں تیرا خیال

تو آپ کیا اعتراض کریں گے؟

اگر "میز پر رکھی گھڑی" کہدیا جاتا تو بات ایسی خندہ ریز نہ ہوتی

جوش پر ہے آج بھی تاریک جانوئی بہار

نئی تہذیب سے ہشیار یہ تاریک جالا ہے

ان دونوں مصرعوں میں اجے کو صرف "جلنے" پڑھنا پڑھتا ہے

ہمیں تسلیم کہ شعر میں حرف علت گر جانے کا جواز ہے لیکن اس جواز کا سہارا بالعموم مقامات پر عجز بیان کی دلیل بن جاتا ہے اور ہمارے خیال میں یہاں ایسا ہی ہوا ہے۔

کمنا کر جاگ تما تیرا بھی خواب بیدلوۂ برقرار

"کمنا کر جاگنا" بچوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ "دقار" جیسی پرشکوہ صفت کی بیداری کسی اور لفظ کی متقاضی تھی۔

پھول میں معصومی نکہت نہیں تو کچھ نہیں

"معصومی" حشو ہے۔ نکہت معصوم و غیر معصوم نہیں ہوا کرتی۔ اگر عصمت سے مراد پاکیزگی اور خوشبو لے لیں تب بھی کام نہیں چلتا کیونکہ نکہت تو خود خوشبو اور مہک کو کہتے ہیں۔ یہ پاکیزہ نہ رہے تو "نکہت غیر معصوم" نہیں بلکہ "بدبو" اور تعفن کہلاتی ہے۔

پھر یہ بھی محض اعتباری بات ہے کہ پھول میں خوشبو نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ بے خوشبو کا پھول بھی ایک معتد بہ قدر و قیمت رکھتا ہے بشرطیکہ رنگ دلکش ہو۔ خوشبو اس کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے لیکن صرف خوشبو ہی "پھول" کا سب کچھ نہیں۔

دل سے مان اللہ تعالیٰ کے سارے احکام

یہ ایک لوری کا مصرعہ ہے۔ کیا لوری جیسی ہلکی پھلکی چیز "تعالیٰ" اور "احکام" کا بوجھ برداشت کر سکتی ہے؟

ہو کے جواں باطل کی کھیتی کو کرنے برباد

یہ بھی اسی لوری کا مصرعہ ہے۔ شاعر بچے کے بستر پر خود ہی لیٹ گیا ہے ورنہ ابھی تک ایسے بچے نہیں پیدا ہوئے جو اس طرح کی لوریاں ہضم کر سکیں۔ نہ ایسی مائیں ظہور میں آئی ہیں جو اتنی وزن دار لوریاں گا سکیں!

ستم دوست مرے حق میں تو انعام بنے

"ستم ہائے دوست" کا محل تھا۔ دل اور ستم اور زخم جیسے الفاظ مفرد حالت میں تو واحد اور جمع دونوں استعمال ہو جاتے ہیں لیکن اضافت کی شکل میں واحد و جمع کا فرق ضروری ہوگا۔

زمین عشق کی تاثیر دنیا سے نرالی ہے
یہاں بوئے تبسم کو تو اگتی ہے فغاں اکثر

غالباً یہ زمینی شعر ہے۔ تبسم بونا اور فغاں اگنا اگر ترقی پسند شاعری سے شدت تاثر کا نتیجہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ "کو" نے اور بھی مسخرہ پیدا کر دیا۔ گیہوں بونا درست ہے تو تبسم بونا ہی درست ہونا چاہیے۔ "گیہوں کو بونا" کوئی نہیں بولتا۔

کر نہیں سکتا جنہیں بیدار شور انقلاب
وہ نہ شاید اٹھ سکیں سنکر صدائے صور بھی

مبالغہ کے حسن سے ہمیں انکار نہیں لیکن شعر جب ایک اسلام پسند شاعر کا ہو تو "صور" کا معاملہ محض زبان و بیان کا نہیں رہ جاتا عقیدے کے پہلو پر بھی نظر جاتی ہے۔ "صدائے صور" اسلامی عقائد کا ایک جز ہے۔ جب صور پھنکے گا تو مُردے جاگ اٹھیں گے آج کے بے حس نیندوں کی جامد غفلت سے مایوس ہو کر "صدائے صور" کی اثر انگیزی میں شک کرنا محتاط انداز فکر نہیں ہے۔

یہ کیا اندھیر کھاتہ ہے کہ زہراب تعصب سے
لبالب ساغر جمہور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

اس کے علاوہ کہ شعر کی نثر کی جائے تو "کیوں" قطعاً فالتو ہوگا "کھاتے" کا لفظ بے محل ہے۔ "اندھیر کھاتہ" بجائے خود صحیح ہونے کے باوجود متین اشعار میں نہیں کھپتا اس سے مضحکہ سا جھلکتا ہے۔

دیئے ہے دوسروں کی اور وہی غیر ونکے پیمانے
یہ دھوکا ہے کہ اپنا میکدہ آزاد ہے ساقی

استعاروں کے ہجوم میں اچانک "آزاد" کا صاف صریح لفظ مذاق شعری کو بدمزہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہاں براہِ راست ملک و وطن کا تذکرہ نہیں ہے کہ آزادی و غلامی کا قصہ چھڑے میکدے سے تشبیہ دی گئی تھی تو اسی کے مناسب لفظ لایا جاتا میکدے آزاد یا غلام نہیں کہلاتے۔

یہ بدلی یہ خنک جھونکے ہوا کے
گری ساغر میں توبہ ڈگمگا کے

اس پر شاعر نے نوٹ دیا ہے

"اب میں اس قسم کے اشعار کہنے سے پرہیز کرتا ہوں"

اگر یہی بات تھی تو اس کے شمول ہی کی کیا ضرورت تھی۔ آخر اپنے سارے ہی اشعار تو تنگ و تاز میں انھوں نے جمع نہیں کر دیئے انتخاب میں اسے بھی چھانٹ دیا ہوتا۔

خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ کہنا یہ ہے کہ ڈگمگانے کا لفظ انھوں نے موزوں استعمال نہیں کیا۔ "ڈگمگانا" قدموں کا فعل ہے جس طرح کہ دھڑکنا دل کا اور خیرہ ہو جانا نگاہ کا فعل ہے۔ یہ ترقی پسندوں ہی کیلئے چھوڑ دینا چاہیئے کہ شوقِ نادر بیانی میں جس فعل و صفت کو جس اسم سے چاہے جوڑ دیں۔ تو بہ کا ڈگمگا کے ساغر کے اندر گرنا بالکل ایسا تصور دیتا ہے جیسے توبہ کوئی لمبی سی چیز تھی جس کے پیر ڈگمگائے تو وہ حوض میں گر پڑی۔ اگر یہ ہمارے تصور کی خامی ہے تو ناہد صاحب ہمیں معاف فرما دیں۔

نکلو تو عزائم کی جلا کر شمعیں
مل جائے گا مٹی میں اندھیرے کا غبار

"اندھیرے کا غبار" محض قافیہ بندی ہے۔ اندھیرے کا طور کہہ سکتے تھے یا اور کچھ کہتے۔ "غبار" ہی کہنا تھا تو پھر "چھٹنے" کی بات کرنی چاہیئے تھی۔ غبار چھٹتا ہے مٹی میں نہیں ملتا۔ مٹی میں ملنا تو کسی کارآمد شے کے برباد ہونے کو کہتے ہیں۔ "محنت مٹی میں مل گئی۔" سب بولتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں بولتا کہ "شمع جلتے ہی اندھیرا مٹی میں مل گیا۔"

"شہید کربلا" کے عنوان سے بھی ایک نظم ہے۔ ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ کربلا کے حزنیے اور اس کے کرداروں کو شاعر نے اسی لگے بندھے زاویۂ نظر سے دیکھا ہے جس نے کبھی انیسؔ و دبیرؔ سے بے نقط مرثیے کہلوائے اور کبھی خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی طرف "حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ" جیسی دور از کار رباعیاں منسوب کرائیں لیکن اعتراض اس پر ہے کہ انھوں نے ایک اصولی شاعر ہونے کے باوجود دامنِ اعتدال کو مضبوط نہیں پکڑا ہے۔

علی کے گھر کا چراغ روشن زمانے میں جس کی روشنی ہے

یہ بڑا میں گرو لگانے سے زیادہ کیا ہے؟ شیعت کی تمام آئیڈیالوجی اس ایک مصرعے میں تمام و کمال سمٹ آئی ہے۔

مٹا دیا جس نے زورِ باطل دبا دیا جس نے شور و شر کو

حیرت ہے یہ کس دنیا کی باتیں ہیں۔ دشمنانِ یزید تو آج تک رو رہے ہیں کہ حضرت حسینؓ کو شہید کر کے یزیدیوں نے باطل ہی باطل کو اس حد تک فروغ دے ڈالا کہ حشر تک تلافی ممکن نہیں۔

یہ جرأت و عزم مومنانہ کہ دستِ فاسق پہ ہو گی نہ بیعت

یزید کو "فاسق" کہنا تو خیر فیشن ہے اس لئے اعتراض بے سود ہے۔ لیکن بیعت نہ کرنے کو بنیادِ تحسین بنانے والے شاعر اگر حضرت حسینؑ کی پیش فرمودہ "تیسری خواہش" پر بھی نظر ڈال لیتے تو بہتر ہوتا۔ انھیں علم نہیں کہ بیعت کی تاکید میں کتنی حدیثیں آئی ہیں اور اس صراحت کیساتھ آئی ہیں کہ خلیفہ چاہے فاسق و ظالم ہی کیوں نہ ہو۔

نہ لب پہ شکوہ نہ بل جبیں پر نہ اشک پلکوں پہ تھرتھرائے

معلوم ہوتا ہے شاعر نے "تاریخ کربلا" صرف افواہاً سنی ہے۔ خود بالاستیعاب نہیں پڑھی ورنہ انھیں خود حضرت حسینؑ ہی کے فرمودات صاف طور پر بتا دیتے کہ یہ مصرعہ کس قدر خلافِ واقعہ ہے۔

نہ بھائیوں بھانجوں بھتیجوں نہ اپنے بیٹوں کی موت کا غم

لیکن ہم حضرت حسینؑ کو ایسا سنگدل اور ما فوق الفطرت نہیں سمجھتے۔

وہ جسکی اک ضربِ لا الہ نے طلسم خانوں کو توڑ ڈالا

نری شاعری! معین کاشانی نے بھی لا الہ سے کھیل کیا تھا زاہد صاحب نے بھی ایک پینترے کا اضافہ کر دیا۔ یہ پوری نظم اپنے گریز کے اعتبار سے قابلِ تحسین ہے لیکن من حیث المجموع نظرِ ثانی کی مستحق۔

ظلم کی دھوپ سے آئین پگھل جاتے ہیں
جھوٹ کی آنچ میں دستور بدل جاتے ہیں

"دھوپ" کسی غیر معمولی حدت کا تصور نہیں دیتی اس لئے آئین جیسی ٹھوس چیز کا پگھلنا بھرپور استعارہ نہیں ہے۔ دھوپ کی جگہ "آگ" موزوں ہوتا مگر "آگ" نے نہیں "آگ میں" دوسرے مصرعہ میں "آنچ" کا استعارہ ناقص رہا۔ بدلنے کو آنچ سے کیا مناسبت ہے۔

زاہد صاحب کے یہاں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ و اقتدار کے لئے امید و خوش گمانی کا اتنا ہجوم ہے کہ اس نے ادعا اور چیلنج کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یاس سے دور رہنا اور امید سے

نولکانا بہت اچھی بات ہے لیکن اس کے بھی کچھ حدود ہیں بغیر حقیقی سہاروں کے غیر معمولی پُر اُمیدی اور خوش گمانی کا ڈنکے کی چوٹ اعلان خندۂ استہزا کو دعوت دیتا ہے معلوم نہیں کن مظاہر و اسباب نے موصوف کو اس قدر خوش گمان بنا دیا ہے۔

کوٹھیوں کی تمکنت پر خندہ زن ہیں جھونپڑے
زندگی کے راز دانوں میں ہے اب مزدور بھی

اگر امریکہ و انگلستان پیش نظر نہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کن مزدوروں کا ذکر ہے اور کہاں ہیں وہ جھونپڑے جنھیں کوٹھیوں کی تمکنت پر خندہ زنی کا شعور آگیا ہے شاعر نے نہیں سوچا کہ عصر حاضر کے مزدور کو زندگی کا راز داں کہہ کر اس نے "زندگی" کو کتنا حقیر بنا دیا ہے۔ امریکہ و انگلستان ہی کے مزدوروں کو لے لیجئے۔ اگر تیس چالیس روپے یومیہ کما کر عیش کرنا ہی "زندگی کی راز دانی" ہے تو "اسلام پسندی" میں آگ لگا دینی پڑے گی۔

تبصرہ سخت ہوگیا۔ کم لوگ ہیں جو اس بے رحمی کو تعمیری نقطۂ نظر سے ضروری خیال کریں گے۔ مگر تبصرہ نگار اپنے فرض سے مجبور ہے۔ حاصل تبصرہ یہ ہے کہ "تگ و تاز" کو کسی صاحب نظر کی چشم احتساب سے گذر کر شائع ہونا چاہیئے تھا زاہد صاحب ہی خود تنقیدی کی زحمت فرماتے تو زبان و بیان کی خامیاں دور ہو جاتیں۔ راہ راست بیانی اور اشتعال پذیری کا اسلوب جو ان کی تمام شاعری پر چھایا ہوا ہے آئندہ اس میں ترمیم ہونی چاہیئے۔ شاعری کا مزہ کھری کھری سنانے میں نہیں رکھ رکھاؤ اور شائستہ کلامی میں ہے۔ اسلام پسند شاعری کو کبھی قبولِ عام اور فنی وقعت حاصل نہ ہو سکیگی اگر اسلام پسند شاعروں نے شعریت اور فکر میں خوشگوار توازن و تناسب نہ پیدا کیا

سائنس اور ضابطۂ حیات

● از جناب اکرام الدین احمد (شعبۂ سائنس اسلامیہ کالج، الٰہ آباد) ● شائع کردہ: مکتبہ الحسنات، رامپور یوپی
صفحات ۱۵۰۔ کاغذ سفید، ٹائٹل دلکش قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

دینی و ملی لٹریچر کی نشر و اشاعت کے معاملہ میں مکتبۂ الحسنات ہند و پاک میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے یہ دیکھ کر اس کی شائع کردہ کتابیں صوری و معنوی محاسن کے لحاظ سے لائق صد تحسین ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

پیش نظر کتاب اپنے فنکارانہ تبصرے کے لئے تو کسی ایسے ہی تبصرہ نگار کی محتاج ہے جو سائنس میں اچھی نظر رکھتا ہو۔ ہم جیسے نابلد اس پر کیا تبصرہ کریں گے۔ تاہم جو مرکزی خیال اس کتاب کی تصنیف میں کام کر رہا ہے اس سے بفضل تعالیٰ ہمیں بھی مَس ہے اس لئے اطمینان ہے کہ تبصرہ کور دانہ نہیں ہوگا۔

سائنسی نکات و نظریات سے ناواقف ہونے کے باوجود ہمیں اذعانِ کامل رہا ہے کہ سائنس کی روز افزوں ترقیوں کو مذہبی فکر کی مرعوبیت اور پسپائی دراصل نتیجہ ہے ہم اہل مذہب کی کوتاہ فکری کم علمی اور باطل کی چمک دمک سے خیرگی کا ورنہ حقیقت یہ نہیں ہے کہ واقعتہً سائنس نے مذہب کی علمی و فکری بنیادیں ہلا کے رکھدی ہوں اور اس طرح کے انکشافات سے دنیا کو بہرہ ور کیا ہو جن کے آگے مذہب کا چراغ نہ جل سکتا ہو مذہب ــ فطری اور سچا مذہب ــ اٹل ہے۔ سائنس جتنا آگے بڑھے گی مذہب کی صداقت اتنی ہی مؤکد ہوتی جائیگی سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں ــ تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ سائنسی نظریات مظاہر فطرت ہی کے ظہور و وقوع کا عکس اور ترجمان ہیں۔ وہ مظاہر فطرت سے جنگ نہیں کرتے بلکہ اُن کا تتبع اور پیروی کرتے ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ فطرت اور مظاہر فطرت کے خالق ہی نے جس مذہب کی تخلیق و تنزیل کی ہو وہ سائنس کے ہاتھوں عضو معطل ہو کر رہ جائے۔ اکرام الدین صاحب کی پیش نظر کتاب اسی حقیقت کو شرح و بسط کے ساتھ واضح کرتی ہے۔ انھوں نے سائنٹفک انداز میں ثابت کیا ہے کہ دہریت، مادہ پرستی اور لامذہبیت منکرین کی اپنی دماغی کجی اور ذہنی سادہ روی کا نتیجہ ہے ورنہ سائنس کے اصولوں سے کسی درجہ میں مذہبی زاویۂ فکر کی تردید نہیں ہوتی بلکہ وہ اصول تو پکار پکار کے کہہ رہے ہیں۔

کہیں مذہب کے خلاف بطور پروپیگنڈے کے استعمال کرنا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے۔ ہم مذہب کے دشمن نہیں بلکہ اس کے مصدق و مؤید ہیں۔ ہمیں صحیح طور پر استعمال کرو تو مذہب کے اعتقادات و اذعانات میں استحکام ہی پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

مصنف کی ٹکنیک بڑی دلچسپ ہے۔ خشک موضوع کو انھوں نے ایسے دلکش دروبست کے ساتھ پیش کیا ہے کہ طبیعت ذرا نہیں الجھتی بلکہ ہر سطر اگلی سطر پڑھنے کی پُرشوق دعوت دیتی ہے۔ اُنھوں نے سائنس کی ٹھوس معلومات مہیا کی ہیں لیکن ایسی دلچسپ ترتیب کے ساتھ کہ ذہن انبساط حاصل کرتا ہے۔ انہوں نے ہنرمندانہ تدریج کے ساتھ قاری کو اُس منزلِ مطلوب تک پہنچایا ہے جہاں پہنچکر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ انسانوں کی مکمل صلاح و فلاح کے لئے بہترین نظام زندگی بنانے کا استحقاق اور قدرت و اہلیت سوائے اس ذات کے جس کے کسی کو نہیں جسے ہر ہر شے کی حقیقت معلوم ہے۔ یہ کتاب وضاحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ حقیقی فلاح پر مشتمل نظام زندگی ترتیب دینے کے لئے جن اصولی و بنیادی معلومات کی ضرورت ہے ان کا عشر عشیر بھی سائنس اب تک نہ پاسکی اور وہ خود معترف ہے کہ پوست کندہ حقائق کی دریافت میں ابھی وہ اُن گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکی ہے جہاں سے طلسم حیات کی گرہ کشائی کا آغاز ہوتا ہے۔

اپنے قریبی مقصد کے لحاظ سے یہ کتاب بڑی کامیاب ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ فاضل مصنف اسی پر بس نہ کریں بلکہ سائنس اور مذہبی افکار و اقدار کے تقابلی مطالعہ کا سلسلہ اور آگے بڑھائیں۔ مغربی تہذیب کے غلبے اور مادہ پرستانہ طرز فکر کی مقبولیت نے سائنسی ترقیات کو مذہب کے حق میں جو خواہ مخواہ ہوّا بنا دیا ہے اس کا استیصال جتنا بھی کیا جائے لائق تعریف ہے۔ اس انداز کی دقیع کتابیں مسلسل آنی چاہییں۔

تحریر کو اگر فاضل مصنف ذرا مانجھیں۔ یعنی شگفتگی اور رعنائی عطا فرمائیں تو مناسب ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ جب فنی و علمی اصطلاحوں سے واسطہ ہو تو عبارتوں کا بوجھل ہوجانا ناگزیر ہے لیکن اس کے بھی کچھ درجے ہیں۔ کوشش کیجائے تو مدارج کا فرق بہرحال کیا جاسکتا ہے۔

ہم کچھ عبارتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی نوک پلک اگلے ایڈیشن میں درست کرلینی چاہیئے۔

ص۱۲ پر —— " واضح رہے کہ یہ نظریہ ارتقا دہریت اور مادہ پرستی کی سنگ بنیاد ہے "

"کی" کے عوض "کا" ہونا چاہیئے۔

ص۱۸ —— " انسان کا طرز عمل اس کے پورے شعبۂ زندگی میں انفرادی ہو یا اجتماعی "

" شعبے " کا لفظ یہاں ٹھیک طور پر استعمال نہیں ہوا۔ " شعبہائے زندگی " ہونا چاہیئے

ص۲۵ —— " ہم صریحتًا دیکھ رہے ہیں "

" صریحتًا " غالبًا کتابت کی غلطی ہے۔

ص۳۸ " جس نے ان تمام چیزوں کو ان کی خاصیتوں کیساتھ ایک ضابطہ قانون کے تحت پیدا کی "

" یہاں بھی کتابت ہی کا ستم ہے " پیدا کیا " درست ہوگا

ص۵۲ —— " اور وہ ایک عارضی طور پر سوسائٹی کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھتے ہیں "

" ایک " زائد ہے

ص۶۶ " اس لئے معاشی و سیاسی مسائل کے کوئی نتیجہ خیز حل اب تک نہیں پیش کئے جاسکے "

" کوئی " بے محل ہے۔

ص۸۶ " روس اور امریکہ کی راکٹیری میں سبقت لیجانیکی غرض وفضائی معلومات میں اضافہ کرنا تو ایک ضمنی غرض معلوم پڑتی ہے اصلی غرض اپنی اپنی سیاست اور نظام ہائے زندگی کی فوقیت اور بڑائی کا سکہ جمانے کی معلوم پڑتی ہے "

" معلوم پڑتی ہے " نہایت گھٹیا زبان ہے۔ اس انداز کے جملے صرف ان پنجابیوں سے متوقع ہو سکتے ہیں جو عالم فاضل ہوجانے کے باوجود اپنے مخصوص لسانی رنگ و بو سے بالکلیہ

دستبردار نہیں ہوتے۔ ویسے یہ پوری عبارت ہی کچا پن لئے ہوئے ہے۔ نیز ایک اس نوع کی غیر جذباتی اور ٹھوس علمی کتاب میں اس انداز کا ریمارک ناموزوں سی بات ہے۔

ص۹۶ "اگر انسان کا حسن ختم ہو جائے . . . . "

"کا" کو ہم کتابت کی غلطی قرار دیتے لیکن آگے بھی حسن مذکر ہی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔

ص۱۰۱ـ "ان نظاموں کی بنیاد چند کیمیاوی اشیاء
اور ان کے آپس کے عمل و ردعمل کے نتیجے کے
طور پر چند کیمیاوی رد و بدل پر قائم ہے"

"چند" کا محل نہ تھا۔ "چند کیمیائی تبدیلیوں" کہہ سکتے تھے یا پھر "چند" حذف ہی کر دیا جاتا۔

ص۱۲۸ـــ "اس طرح پوری دنیا مختلف خدائی میں منقسم
ہو چکی ہے"

"خدائیوں" درست ہوگا۔

ص۱۳۰ـ " اسلئے پرہیزگاروں کو دوسرے لفظوں
میں اصول پرست بھی کہہ سکتے ہیں جبکا ضد عین
نفس پرست ہوگا"

"عین" کا یہاں کیا موقع تھا۔ پھر "نفس پرست" کی تذکیر کے لحاظ سے "ضد" کو مذکر لانا بھی لائق غور ہے۔

اسی صفحے پر ـــــ "انسانی فطرت میں پرہیزگاری اور بدپرہیزگاری دونوں"

یہ "بدپرہیزگاری" آج ہی دیکھا۔

ص۱۳۲ ـــ" انسان فطرتاً ان ہی ضابطوں اور قواعد
کی پابندی دل سے کرتا ہے جس کے مصنف
کے ساتھ اس کا تعلق عبودیت کا ہو"

فصاحت اس میں تھی کہ "ضابطوں اور قاعدوں" کہا جاتا یا پھر "ضوابط و قواعد" ـــــ لفظ "مصنف" بھی یہاں چست نہیں۔ ("جس" کتابت کی غلطی ہے۔ "جن" ہوگا)

ص۱۳۳ـ "جو کچھ زبان سے ادا کیا جائے اور اس کا اثر دل پر اتر جائے . . . "

"اثر اتارنا" معروف بات نہیں

ص۱۳۴ "یعنی اقامت الصلوٰۃ کے معنی اقامتِ دین کے ہوئے"

یہ بات مصنف نے جس سیاق میں کہی ہے ٹھیک ہی کہی ہو لیکن ٹھیک یہی بات منکرین حدیث آج بالکل اور رخ سے اور بری مقصد کے تحت کہہ رہے ہیں اس لئے احتیاط ضروری ہے۔ "اقامت الصلوٰۃ" کے مطلوب نتائج و ثمرات کچھ بھی ہوں لیکن انھیں اقامت الصلوٰۃ کے معنی نہیں کہا جا سکتا اسکے واحد معنی تو اسی نماز کو قائم کرنے کے ہیں جس کی ظاہری شکل و ہیئت سے عالم و جاہل، عقیل و غبی سب واقف ہیں۔ یہ بات کہ صحیح طور پر نماز پڑھنا اور اس کے ہر ہر جز کو عمل کی راہوں میں مشعل بنانا اقامت دین کے مرادف ہے کسی اور انداز میں کہنی چاہیئے۔

ص۱۳۵ـ" اور جن اصحاب خاص پر یہ کتابیں نازل کی
گئیں ہیں ان کو کردار کا قطعی بے داغ اور مادی
منفعت سے مستغنی دکھایا گیا ہے جسے قرآن
کی اصطلاح میں معصوم کہتے ہیں"

انبیاء کے لئے مذکورہ معنوں میں "معصوم" کی اصطلاح قرآن کے کس مقام سے لی گئی ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ فاضل مصنف سوچیں تو یہ فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ "عصمت" اور ہی شئے ہے اسکا مدار کردار اور مادی اغراض سے استغناء پر نہیں ہے۔ مستغنی اور بے داغ کردار کے لوگ غیر انبیاء میں بھی گذرے ہیں مگر وہ معصوم نہیں تھے "عصمت" کا تعلق دراصل اس خصوصی نگہبانی و نگرانی سے ہے جسے اللہ نے انبیاء کیساتھ مخصوص رکھا ہے۔ اسی لئے خود قرآن سے پتا چلتا ہے کہ بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء بھی اپنے بے داغ کردار اور زہد و استغناء کے باوجود کبھی کبھار لغزش کر گذرے جس پر اللہ نے گرفت کی اور کبھی سزا دی کبھی معاف کر دیا۔ معصوم وہ ان معنوں میں ہیں کہ ان کی کسی بھی لغزش کو اللہ نے یونہی نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ تنبیہ اور نشاندہی کی ہے اور اسی لئے ان کی پیش کردہ دینی تعلیمات اغلاط و اسقام کے شبہ سے بالاتر ہیں۔

ص۱۳۸ـ "جنت کی زندگی ان تمام عیش و عشرت کے

"ان" کی جگہ "اُس" ہونا چاہیئے۔ نیز "پر" بھی کم بلیغ ہے "بہ نسبت" ابلغ ہوتا۔

زبان وبیان کی ان جزوی لغزشوں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ کتاب کا پایہ گر گیا۔ سچ یہ ہے کہ کتاب اپنے موضوع پر لاجواب ہے اور اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھیں۔ سائنس اور مذہب دونوں کے بارے میں اس سے فکر ونظر کے صائب ومستقیم رخ کی رہنمائی ملتی ہے۔ ہم فاضل مصنف سے مزید ایسی ہی مفید ودقیع تصنیفات کی امید رکھیں گے۔

چراغ راہ کا اسلامی قانون نمبر

بہترین مقالات نفیس مضامین اور تحقیقی و تاریخی مباحث کا وہ گنجینہ جو آپ اپنا جواب ہے اشتہار میں اسکی رفعت و افادیت کا بیان ممکن ہی نہیں۔ چند لکھنے والوں کے نام ذیل میں دیئے جاتے ہیں جن سے آپ کچھ اندازہ فرما سکیں گے۔ صرف ہندو پاک ہی کے نہیں دیگر ممالک کے متعدد ماہرین سلف کے بھی بہترین جواہر پارے شامل کئے گئے ہیں۔ علماء نے بھی اسے اپنے فکر پاروں سے آراستہ کیا ہے۔ بعض

ڈاکٹر صبحی محمصانی — الاستاذ محمد ابوزہرہ
ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہیدؒ — مولانا مجیب اللہ ندوی
ڈاکٹر مصطفےٰ احمد زرقا — ابن خلدونؒ
ڈاکٹر محمد حمید اللہ — مفتی عمیم الاحسان
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی — شاہ ولی اللہؒ
مولانا ابوالحسن علی ندوی — ڈاکٹر جارج وائٹ کراس سٹین
مولانا عبدالماجد دریا بادی — سر الفریڈ ڈیننگ
مولانا امین احسن اصلاحی — ڈیوڈ۔ ڈی۔ سانتی لان
مولانا عبدالغفار حسن — پروفیسر سی۔ اے نالینو

نقشے اور چارٹ بھی منسلک ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کی تحریر کا عکس بھی ہے۔ تجلی سائز کے ۸۱۲ صفحات پر مشتمل دو ضخیم جلدوں کا یہ نمبر یقیناً معرکۃ الآراء کہلانے کا مستحق ہے اسی لئے اسے پاکستان سے فراہم کرنیکی دقت اٹھانی پڑی ہے۔ مکمل کی قیمت صرف آٹھ روپے (رجسٹری سے طلب فرمانے والے ڈاک خرچ ملا کر دس روپے ارسال فرمائیں)

"چراغ راہ" کا سالنامہ ۶۰ء

"چراغ راہ" اپنے نمبروں کیلئے اتنی شہرت حاصل کر چکا ہے کہ اب اس کے کسی نمبر کے تفصیلی تعارف کی احتیاج نہیں۔ نثر و نظم کے بہترین جواہر پارے جمع کرنا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس سالنامے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک درجن مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں۔

مکتبہ تجلی باوجود دشواریوں کے چراغ راہ کے نمبران کی افادیت ہی کی وجہ سے مہیا کرتا ہے شائقین حاصل کرنے میں عجلت فرمائیں۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

"تجلی" کا خلافت نمبر

اس نمبر نے جتنی مقبولیت حاصل کی وہ لائق صد ہزار شکر ہے۔ پرانے قارئین تو اسے ملاحظہ فرما چکے ہیں، لیکن نئے حضرات محروم مطالعہ ہیں۔ انھیں پہلی فرصت میں حاصل کر لینا چاہیے۔ یہ اپنے جملہ مضامین خصوصاً مدیر تجلی کے مبسوط مضمون "عثمانؓ" کی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ نہ صرف پڑھا جائے بلکہ محفوظ رکھا جائے۔

قیمت ایک روپیہ

"تجلی" کا خاص نمبر ۵۷ء

جماعت اسلامی کے متعلق تفصیلی بحثیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعض فرمودات پر سیر حاصل نقد۔ نذر و نیاز، عرس، فاتحہ اور سماع موتیٰ وغیرہ کا مبصرانہ جائزہ۔ قارئین کو اس شہرہ آفاق نمبر میں شروع سے آخر تک دلچسپ و مفید مباحث ملیں گے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

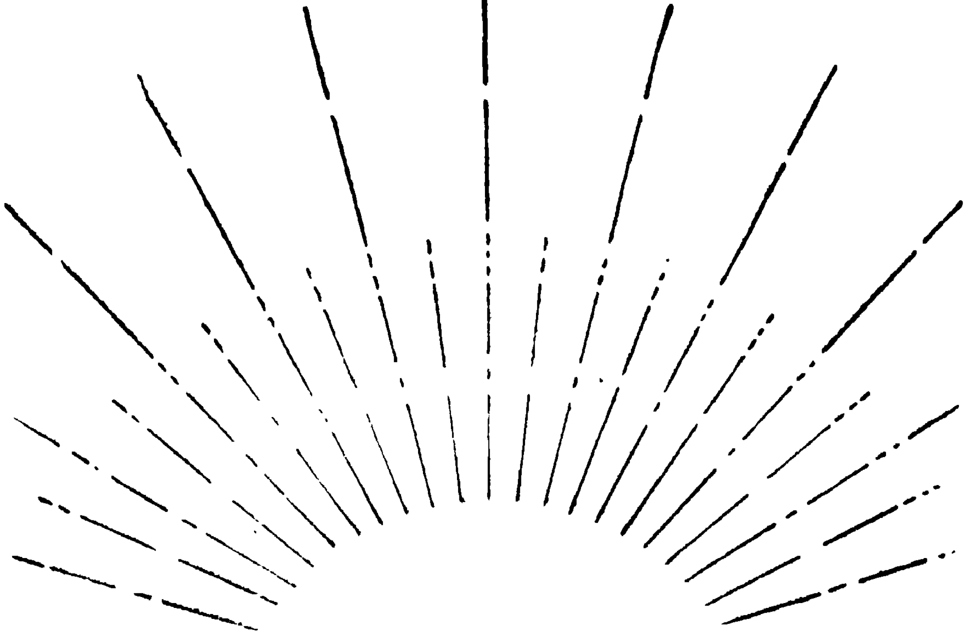
مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی:۔ سوا روپیہ ● سلاطین ہند کی علم پروری:۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

ماہنامہ

تجلی

دیوبند



ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

آٹھ آنے

Price As. -|8|-

چند جاذب نظر کتابیں!

سنن دارمی شریف حدیث کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ جو ۳۴۵۶ حدیثوں پر مشتمل ہے۔
ہدیہ مجلد آٹھ روپے

مسند امام اعظمؒ (مع ترجمہ و فوائد) امام ابوحنیفہؒ کا مرتّب فرمودہ احادیث کا مجموعہ جس میں مولانا عبدالرشید نعمانی کا بہترین معلومات افزا مقدمہ بھی ہے۔ مجلد آٹھ روپے

صحابیات ان برگزیدہ خواتین کے حالات جنھوں نے اللہ کے آخری رسول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نیاز فتحپوری کے قلم سے۔ قیمت مجلد چھ روپے

غنیۃ الطالبین عربی اُردو مع فتوح الغیب یہ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور زمانہ کتاب اب اُردو داں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ایک کالم میں عربی متن دوسرے کالم میں ترجمہ۔ دو ضخیم جلدوں میں مکمل تیس روپے۔

التکشّف مولانا اشرف علیؒ کی اس کتاب کا پورا نام:- التکشف عن مہمات التصوف ہے تصوف اور اس کی جزئیات پر بڑی مبسوط کتاب ہے۔ مشکل مسائل اور دقیق نکات کی توضیح و تسہیل۔ علوم و معارف کا گنجینہ۔ تازہ بہتر ایڈیشن۔ قیمت مجلد دس روپے بارہ آنے۔

آئینہ حقیقت نما مؤرخ اسلام مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی معرکۃ الآراء تالیف۔ ہندو اور مغربی مؤرخین مسلم فاتحین پر جو متعصبانہ الزامات لگاتے رہے ہیں ان کے محققانہ مدلل اور دنداں شکن جوابات۔ عجیب کتاب ہے۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔

سفینۃ الاولیاء دارا شکوہ کی تالیف۔ جس میں رسول اللہؐ صحابہؓ، ائمہ، اولیاء، ازواج النبیؐ اور اسلام کی مشہور نیک خواتین کے حالات ہیں۔ قیمت مجلد چھ روپے بارہ آنے۔

تازیانے انمول اقوال و روایات پر مشتمل عربی کی مشہور کتاب۔ المنبہات کا سلیس اُردو ترجمہ۔ مجلد تین روپے۔

فاروق اعظمؓ کے سرکاری خطوط کیا اس نام کے بعد بھی یہ کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ بیش بہا کتاب آپ کے مطالعہ کی بہترین چیز ہے۔ بڑی تقطیع کے ۶۷۲ صفحات نفیس طباعت۔ خطوط کی نقل مع ترجمہ۔
قیمت مجلد بارہ روپے۔ مجلد اعلیٰ چودہ روپے

مسلمان عورت مصر کے مشہور مصنف فرید وجدی کی عربی تصنیف المرءۃ المسلمۃ کا اُردو ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے۔ مقدمہ بھی مولانا آزاد ہی کا ہے۔
قیمت مجلد چار روپے

خطبات مدراس سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خطبات کا یہ مجموعہ جس قدر مقبول ہے محتاج بیان نہیں۔ قیمت تین روپے۔ مجلد چار روپے۔

وجد و سماع شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے عربی رسالے السماع والرقص کا اُردو ترجمہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے قلم سے۔ قیمت ۱۲

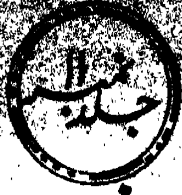
عثمانؓ صرف تاریخ کی روشنی میں مصر کے مشہور نقاد اور نامور محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ مولانا عبدالحمید نعمانی کے قلم سے۔ قیمت چھ روپے

علیؓ تاریخ اور سیاست کی روشنی میں یہ بھی طٰہٰ حسین ہی کی تالیف ہے اور مترجم بھی مولانا نعمانی ہی ہیں۔ قیمت مجلد ساڑھے سات روپے۔

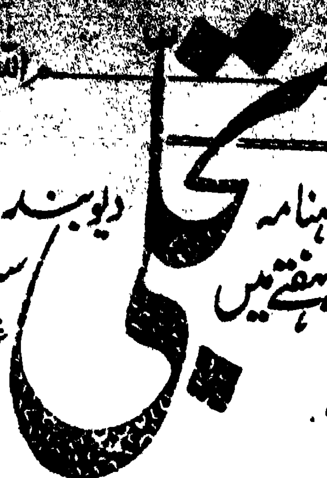
تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی معروف کتاب ہمعات کا سلیس شگفتہ ترجمہ۔
قیمت دو روپے بارہ آنے۔

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم







ماہنامہ تجلی دیوبند

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے۔

سالانہ قیمت چھ روپے فی پرچہ ۸/

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۵ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پہ آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں، خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ (وی پی چھ روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات: ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائے گا۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)



پاکستان کا پتہ جناب شیخ سلیم اللہ صاحب
۴ بی ۲/۵ ناظم آباد کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "کوہ نور" پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

دیکھ لیجئے۔ ہماری احتیاط کام آئی اور اس شرمندگی سے بچ گئے کہ ڈاک نمبر کا وعدہ ایفا نہ ہو سکا۔ آدمی کا ارادہ مشیتِ ایزدی کے آگے کیا وزن رکھتا ہے۔ ایک قریبی عزیز راقم الحروف کے حقیقی ماموں کی اچانک موت اور اس کے ظہور میں آنیوالی نازک الجھنوں سے ذہنی کرب و اضطراب کے علاوہ ہمیں جسمانی طور پر بھی بعض ایسے کاموں میں مصروف رکھا جن کا پہلے سے کوئی تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اِن مرحوم عزیز کے بارے میں یہاں تفصیل سے کچھ لکھیں، کیونکہ وہ ہمارے ہی عزیز نہیں تھے، بلکہ اپنے اونچے کردار اور قابلِ رشک ایمان و عمل کے تعلق سے اُس تمام اُمتِ مسلمہ کے عزیز تھے جو اپنی تمام تر زبوں حالی و انحطاط کے باوجود اہل اللہ کی محبت و عقیدت سے دامن کش نہیں ہوئی ہے۔ "اہل اللہ" کا لفظ بہت بھاری ہے ایک پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو "اہل اللہ" کی صف میں شمار کرنے پر کم ہی لوگ تیار ہوں گے، لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جبّہ و عمامہ سے بے نیاز اور شیوۂ ولایت و ارشاد سے خالی یہ اسکول ماسٹر اتنا عالی مقام اور رفیع المرتبہ تھا کہ آج کے کتنے ہی "اہل اللہ" اس پر رشک کر سکتے ہیں۔ ساٹھ سے کچھ اوپر کی عمر میں دنیا سے سدھارا ہے اور خدا کی قدرت ہے کہ جس تہجد کو آغاز جوانی سے معمول بنایا تھا اسی کی تیاری کرتے ہوئے آخر شب میں مرضِ موت کا شکار ہوا زندگی بھر کی تہجد گذاری اتنی مشکل نہیں ہے جتنا مشکل آج کے زمانے میں پوری زندگی کو اسلامی کردار و اقدار کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ معمولی سی بات ہے کہ اللہ کے اس بندے نے صاف طور پر افسرانِ بالا کو لکھ بھیجا تھا کہ یا تو نماز جمعہ کے لئے دو گھنٹے کی چھٹی منظور کی جائے ورنہ استعفا قبول ہو۔ یہ معمولی ہم مرحوم ہی کی نسبت سے کہہ رہے ہیں ورنہ آج کے عام مسلمانوں کی نسبت سے یہ معمولی نہیں

اس کے اسکول میں سرکاری لالٹین کے شیشے اگر اوقاتِ اسکول کے علاوہ کسی وقت ٹوٹ گئے ہیں تو اس نے کبھی ان کی قیمت وصول نہیں کی ہے۔ جب سوال کیا گیا کہ کیوں اپنی جیب سے ڈنڈ بھرتے ہو جبکہ قانون میں قیمت وصول کرنے کی نہ صرف گنجائش موجود ہے، بلکہ سبھی جگہ اس طرح کی تمام چیزوں میں پیسے وصول کرنا معمول بنا ہوا ہے۔ تو جواب ملا کہ بھائی ٹوٹی تو ہمارے ذاتی کام کے وقت ہے سرکار سے لینا کہاں کی دیانت ہوگی۔

اور یہ مت سمجھئے کہ سرکاری لالٹین کو وہ یونہی اپنے کام میں لے آتے تھے۔ نہیں اس کی بھی باقاعدہ اجازت لی تھی۔ یہاں اسکول کی بلڈنگ میں بجلی نہیں تھی اس لئے نائٹ اسکول کے لئے گیس کی لالٹین (پیٹرومیکس) ملی ہوئی تھی۔ آپ کہیں گے یہ کیا بچوں کی سی باتیں لے بیٹھا۔ عاجز جواب دے گا محترمی! یہی وہ بچوں کی سی باتیں ہیں جو اللہ اور رسول کی بارگاہ میں بہت بڑی وقعت رکھتی ہیں دجل و معصیت اور طغیان و خیانت میں گردن گردن تک دھنسے ہوئے اِس معاشرے میں یہی تو سب سے مشکل بات ہے کہ ہم روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں اپنے دین و ایمان کو گندگی کے چھینٹوں سے بچالے جائیں۔ یاد کرو اُس مبارک خاتون کا نام جس نے ماں سے کہا تھا کہ اب ہم پانی میں دودھ نہیں ملائیں گے ماں نے اس معصوم سی بات کو طفلانہ ناسمجھی خیال کرتے ہوئے ٹوکا تھا۔ پگلی! عمرؓ کہیں یہاں تو نہیں بیٹھا ہے کہ دیکھ لیگا۔ بیٹی بولی تھی۔ ماں وہ نہ دیکھیں مگر جب اعلان کرا دیا ہے کہ دودھ میں کوئی پانی نہ ملائے تو ہمیں زیبا نہیں کہ ڈھکے چھپے پانی ملائیں۔ یہ گفتگو حضرت عمرؓ کے کانوں میں بھی پہنچ گئی تھی اور نفسیاتِ انسانی کے اس بے مثال نباض نے اپنے بیٹے کی منگنی اس خاتون سے کر دی تھی۔ اور پھر یہی خاتون تھی جس نے عمر ابن عبد العزیزؒ

سپرد مٹی مٹی کو جم دیا تھا۔

توجس چیز نے ہمیں مرحوم کو "اہل اللہ" کی صف میں شمار کرنے پر آمادہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ چھوٹی سی آمدنی میں بھرے پُرے گھر کی کفالت کرتے ہوئے انھوں نے اس شخص کی سی زندگی گذاری جیسے بالشت بھر چوڑی دیوار پر چلتا ہو اور دیوار کے دونوں طرف گہرے کھنڈ ہوں۔ آج کل دین کی راہ پر چلنا شاید ایسی دیوار پر چلنے سے بھی زیادہ ہی مشکل ہے۔ پھر آدمی کا آخری وقت بھی اس کی آخرت کے بارے میں کچھ نہ کچھ اشارے ضرور دے سکتا ہے۔ خدا ان کی قبر کو نور سے بھر دے سارے کلمے نہایت اطمینان سے پڑھے۔ جوان بیٹی رو رہی تھی۔ فرمایا بیٹی! رونے کو بہت وقت پڑا ہے، اب تو لیسین پڑھو اور گواہ رہنا کہ میرا خاتمہ کلموں پر ہو رہا ہے۔

ذرا سوچو جس کے چار بے یار و مددگار بچے ہوں۔ دو لڑکے دو لڑکیاں۔ بڑی لڑکی ۱۵ سال کی اور بڑا لڑکا سولہ سال کا ان کی ماں سال گذشتہ مر چکی ہو۔ خدا کے سوا کوئی نہ ہو جس پر ان کمسنوں کی ذمہ داری ڈالی جا سکے۔ پردیس میں اچانک پیغامِ قضا آجائے۔ تو ایسے وقت میں کون ہوگا جو ہنستے کھیلتے "طمانیت اور صبر و قرار کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کر دے؟ صرف وہ جس کا قلب اللہ کی یاد سے مطمئن ہو۔ جو پوری طرح اپنے رب کی مرضی پر راضی، اپنے مالک کے انصاف پر قانع، اپنے پروردگار کی رضا میں خوش ہو۔

افسوس وقت اور صفحات میں زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ دل بہت کچھ کہنے پر آمادہ ہے۔ یہ ڈر بھی قلم کو پکڑتا ہے کہ ناظرین کہیں گے اپنے ماموں کا قصہ لے بیٹھا۔ یقین کیجئے یہ چند سطور بھی اس رشتے کی نسبت سے نہیں نکلی ہیں۔ اصلی رشتہ وہ ہے جو ہر دنیاوی رشتے سے بالا ہے اور جس میں ہم سب اہلِ ایمان مشترک ہیں۔ دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ مرحوم کو (نام محمد ہاشمؒ تھا) جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مجھ نحیف و زار کو اس کڑے امتحان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے جو یتیم و اسیر بچوں کی شکل میں اللہ نے ڈالا ہے۔ رزق تو اللہ کے ہاتھ ہے اور کس کی مجال ہے جو اللہ کی عطائے خاص کے بغیر کسی کو ایک حبہ دے سکے

ہمارے دسترخوان پر جو شخص کھاتا ہے وہ فی الحقیقت ہمارا نہیں بلکہ اپنا ہی کھاتا ہے بس یہ ضرور ہے کہ اللہ نے ہمیں ایک درمیانی واسطہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا رزق کے پہلو سے تو کچھ سوچنا ہی بیکار ہے کہ اس کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ ہاں دیگر جملہ امور فکر کے قابل ہیں۔ اللہ نے اپنے کلامِ پاک میں یتامیٰ کو جس قدر اہمیت دی ہے اور جتنی نازک ذمہ داریاں ان کے سرپرستوں پر ڈالی ہیں ان کا دیانت دارانہ نباہ اور تکمیل بس اللہ ہی کی عطا فرمودہ توفیقِ خاص سے ہو سکتی ہے۔ آپ حضرات میرے اور ان بچوں کے حق میں خصوصی دعا فرمائیں تو بڑا احسان ہو۔ اللہ ان لوگوں کو بہت پسند کرتا ہے جو اپنی ضروریات و حوائج کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔

اگلے شمارے میں

افسوس اس مرتبہ "حیات النبیؐ" کی قسط نہ آسکی انشاء اللہ اگلے شمارے میں آئے گی اور اسی کے ذیل میں آپ رسول اللہؐ کی "بشریت" پر بھی محکم تفصیلات ملاحظہ فرمائیں گے۔ بار بار اس عجوبے پر حیرت کرنے کو جی چاہتا ہے کہ رسول اللہؐ کی بشریت کے لئے قرآن کی متعدد صریح و محکم آیات کے باوجود بعض مسلمانوں کو آپؐ کے بشر کہنے اور ماننے میں نہ صرف لاج آتی ہے، بلکہ کہنے اور ماننے والوں کے پیچھے تالی بجانے کو پھرتے ہیں۔ بعض کاریگروں کو تو یہاں تک دیکھا کہ فرماتے ہیں:۔

> "چلو مان لیا قرآن کے ظاہری معنی کے اعتبار سے
> آپؐ بشر سہی مگر ہم جیسے ہرگز نہیں۔"

گویا یہ ترکی بترکی جواب ہے انما انا بشر مثلکم کا۔ اوّل تو یہی کاریگری کیا کم تھی کہ "ظاہری معنی" کا شوشہ چھوڑ کر من مانی نکتہ سنجیوں کی گنجائش نکال لی۔ اب موقع پڑنے پر وہ وہ باطنی معانی نکالے جائیں گے کہ عربی لغت کے بڑے بڑے ائمۂ سلف کو قبروں میں پسینہ آجائے گا۔ پھر "ہم جیسے ہرگز نہیں" کہہ کر براہِ راست اللہ میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ بھائی اللہ میاں نے بشر کے ساتھ خاص طور پر مثلکم (تم جیسا) کا جو اضافہ کیا ہے یہ کیا چیز ہے؟ تو جواب

... پیچھے لگانے کا۔ خیر بتانا یہ ہے کہ "حیات النبی" کی اس قسط میں شریعت پر بھی محکم توضیحات آرہی ہیں انشاء اللہ

عبرتناک! دفتر تجلّی میں حد سے زیادہ اخبارات و رسائل آتے ہیں۔ ان کی الٹ پلٹ سے آئے دن احقر کو اِس افسوسناک صورتِ حال کا نظارہ کرنے کی سعادت یا مصیبت نصیب ہوتی رہتی ہے کہ بعض اچھے اور معیاری جریدے تک دوسری جگہوں سے مضمون نقل کر کے حوالہ دبا جاتے ہیں۔ گویا مضمون نگار نے مضمون براہِ راست انھی کو بھیجا ہے۔ یہاں تک ستم ظریفی ہو رہی ہے کہ پورا مضمون ایک نیا طبعزاد عنوان دے کر نقل کر دیا۔ مثلاً تجلّی کے نیم مستقل عنوان "کیا ہم مسلمان ہیں؟" میں سے کوئی ٹکڑا نقل کیا اور عنوان دیدیا "نقوشِ ماضی!" یا "تجلّی کی ڈاک" سے کسی طویل جواب کا کچھ حصّہ یا پورا ہی جواب حوالہ کاٹ کر دیا اور عنوان اپنی طرف سے جما دیا۔ گویا میاں عامر عثمانی نے براہِ راست انھیں ارسال کیا تھا۔ ہم نام نہیں لینا چاہتے۔ بلا اجازت نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ماخذ کا حوالہ تک ہضم کر جانے والوں کو گریبان میں منھ ڈال کر سوچنا چاہئے یہ کیسی مجرمانہ ذہنیت ہے کیسی گھٹیا۔ کیسی چھوٹی۔

اور کسی کو کیا کہیں۔ دنیائے اسلام کی مشہور ترین دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند ہی کے رسالے میں جس کے ٹائٹل پر مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی نگرانی کا اعلان ثبت ہوتا ہے دھڑلے سے یہی عملِ خیر جاری ہے۔ اتفاقاً نہیں معمولاً اور چھوٹے پیمانے پر نہیں بڑے پیمانے پر۔ اب کسے راہنما کرے کوئی۔

بعض جریدے حوالہ تو دیتے ہیں مگر ادھورا۔ مثلاً آخر میں باریک سا لکھوا دیا "تجلّی" یہ بھی غلط اور بالکل غلط ہے۔

رندکے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی

ایسے مصرعے کہیں کہیں تو چلتے ہیں مگر ہر جگہ نہیں۔ شرافت اور دیانت صرف یہ ہے کہ آدمی نقل کرے تو منقول عنہ کا واضح حوالہ دے۔ سوئی کی نوک سے محض "تجلّی" لکھوا دینا اور "دیوبند" تک کو صاف دبا جانا غیر موزوں ہے۔ اور یہ مت سمجھو یہ اخلاقی سبق بس معاصرین ہی تک محدود ہے۔ کسی مرحوم رسالے یا پرانی کتاب سے نقل کرو تب بھی حوالہ دو۔ اتنا بھی اگر تم سے نہیں ہو سکتا تو قلم کا دھندا چھوڑ کر کوئی اور کام کر لو۔ مغربی ممالک میں تو بلا اجازت نقل و اقتباس بھی جائز نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں اس کی کھلی چھٹی ہے تو کم سے کم واضح حوالہ تو دینا ہی چاہئے۔ بلا حوالہ نقل کر دینا تو پرائے مال پر ہاتھ صاف کرنے کے ہم معنی معلوم ہوتا ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

انشاء اللہ العزیز اگلے ہی شمارے سے مولانا مودودی سے متعلق

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

ایک مبسوط، مفصّل، بصیرت افروز اور معلومات افزا تنقیدی جائزہ شروع کیا جا رہا ہے جو متعدد قسطوں میں چلے گا۔ نئے حضرات ابھی سے اپنی کاپی ایجنٹ کے یہاں بُک کرا لیں یا پرچہ حاصل کرنے کا کوئی اور انتظام کریں۔ اندیشہ ہے کہ بعض پچھلی اشاعتوں کی طرح یہ اشاعت بھی پَر لگا کے اُڑ جائے گی۔

عامر عثمانی

فاروقِ اعظمؓ

(نازش پرتاپگڑھی)

سموم گرمی نے ایسے ایسے پھول کمہلائے
کہ جن کی یاد میں گلشن ہمیشہ اشک برسائے

سبھی نظریں ہیں کجلائی، سبھی چہرے ہیں سنولائے
اسی کا نام ہے جینا تو ہم جینے سے باز آئے

بجا فرطِ الم، تسلیم سوز و درد پنہانی
مگر یوں بھی نہ رو اے دل کہ غیروں کو ہنسی آئے

کبھی یوں تھا کہ لاکھوں غم پہ بھی آنسو نہ بہتے تھے
اور اب یوں ہے کہ غم کوئی نہ ہو اور آنکھ بھر آئے

مبارک ہو سحر لیکن چمن والو یہ خدشہ ہے
کہ سورج کی تمازت سے کہیں گلشن نہ جل جائے

نکھارا ہے جنہیں شبنم نے ساری رات رو رو کر
قیامت ہے انھیں غنچوں کو شبنم پر ہنسی آئے

نہ ہوں ارباب ویرانہ پہ طعنہ زن چمن والے
جو ٹھوکر دیں یہ دیوانے تو گلشن سر کے بل آئے

زمانے کی نظر سے گرنے والا جی بھی سکتا ہے
مگر وہ کیا کرے جو اپنی ہی نظروں سے گر جائے

ستاروں کی تنک تابی کو حد سمجھا ہے دنیا نے
رخِ خورشید سے ظلمت کی چادر کون سرکائے

تجلس کر راکھ ہوتا جا رہا ہے عالمِ امکاں
ضرورت ہے کوئی ابرِ ترحم پھر سے گھر آئے

کہیں باقی نہیں عدل و مساوات آج دنیا میں
کوئی ایسا نہیں جو قسمتِ جمہور چمکائے

زمانہ منتظر ہے اُس بلند انساں کی آمد کا
جو ظلم و جور کے مارے ہوؤں پر لطف فرمائے

یہ دنیا ڈھونڈتی آج ایسا پاسباں اپنا
جو دے اسوقت پہرا اٹھ کے جب دنیا سو جائے

اک ایسا شاہ جو گردان لے مجرم خود اپنے کو
قلمرو میں کسی جانب جو کوئی اونٹ کھو جائے

اک ایسے عادل و منصف کی حاجت ہے زمانے کو
پسر کی پشت پر جو اپنے ہاتھوں دُرّے برسائے

قدم انصاف کی مسند پہ جب رکھے تو یوں رکھے
کہ بدلہ مصر کے عامل سے اک نادار پا جائے

مساواتِ بشر کا جس کے دل میں ہو خیال اتنا
قصاص اک مفلس و نادار کو شاہوں سے دلوائے

دیانت دار ایسا ہو، امینِ قوم ایسا ہو
کہ بیت المال کی دمڑی نہ اپنے صرف میں لائے

علالت میں ذرا سے شہد کی جب آ پڑے حاجت
تو لوگوں سے اجازت لیکے استعمال فرمائے

امیر ایسا کہ روم و شام دیتے ہوں خراج اُس کو
خود اُس کے تن پہ لیکن خلق بوسیدہ عبا پائے

شدید اتنا کہ حق کے واسطے لڑ جائے اپنوں سے
اور ایسا رحمدل جو اپنے قاتل پر ترس کھائے

ہو ایسی سادگی کپڑے بھی اپنے خود ہی دھوتا ہو
اور ایسا رعب ہو سارا جہاں ہیبت سے تھرائے

اگر ہو بھوک سے بیتاب کوئی شہر سے باہر
تو اپنے دوش پر غلہ اٹھا کر خود ہی لے جائے

خیالِ آدمیت جسکو ہو اِس حد آخر تک
بٹھا کر اونٹ پر خادم کو خود پیدل چلا جائے

سفر میں ساتھ ہو سامانِ آسائش نہ کوئی بھی
ببولوں پر بھی چادر کو تانے اور سو جائے

[illegible] اس کا مگر انساں ہو دکھلانے کو — اسے کشور کشائی کو تو نصرت سے گلے مل آئے
وہ شاہ [illegible] لیٹ جائے جو مسجد میں — مگر کسریٰ کا قاصد سامنے جا کر لرز جائے
[illegible] انسان کا یوں ہے اس زمانے میں — کہ اک نادار لڑکے اور نہ ماتھے پر شکن آئے

ہمیں پھر مل سکے اے کاش کوئی راہبر ایسا
کوئی آئے کاش پھر فاروقیت کی شان دکھلائے

سلام اے حضرت فاروقؓ جس پر عدل اترائے — قیامت تک خدا مرقد پہ تیرے نور برسائے
سلام اے وہ رسول اللہؐ جس پر ناز فرمائے — سلام اے صاحب ایماں کہ شیطاں تجھ سے گھبرائے
جہاں والے نہ ابتک شان یہ تیری سمجھ پائے — کہ نامہ بھیجدے اور نیل میں سیلاب آجائے
تری ہیبت سے دل کسریٰ کے اور قیصر کے تھرائے — تری سطوت نے سارے قصر استبداد کے ڈھائے
نشاں بدکاری و شر کا نہ باقی رہ گیا ہرگز — ترے شمشیر زن جب قلعۂ باطل سے ٹکرائے
پرستاران ظلمت کانپتے تھے یوں ترے آگے — کہ جیسے زلزلہ آئے تو دھرتی کانپتی جائے
ترے ماتھے پہ بل آئے تو گمراہی لرز اٹھے — تصور سے ترے شمشیر باطل کند ہو جائے
وہ رفعت تو نے دی اسلام کے عالی نشانوں کو — زمیں پر آسمانوں کی بلندی کو بھی رشک آئے
دلائے گی اذاں تا حشر تیری یاد دنیا کو — رسول حق کو اکثر مشورے تیرے پسند آئے
تعالی اللہ تیری ہستئ عالی کے کیا کہنے — خدا سے مانگنے کے بعد تجھ کو مصطفیٰ پائے
فضائل کا ترے اللہ اکبر کیا ٹھکانہ ہے — کہ اپنا بھی کرے تعریف بیگانہ بھی گن گائے
یہ دنیا جو بھٹکتی پھر رہی ہے آج ظلمت میں — کرے تقلید اگر تیری تو بیڑا پار ہو جائے

خدا نا آشنا کو تیری پیروی کی طاقت دے
ارادت کیش کو تیرے ترا ایمان مل جائے

ماہنامہ نئی راہ کے چند خاص نمبر

قرآن نمبر مولانا آزاد، علامہ رشید رضا، علامہ جوہری طنطاوی علامہ موسیٰ جار اللہ جیسے شہرہ آفاق حضرات کے مضامین پر مشتمل ۱۱۹ سورتوں کا منظوم ترجمہ بھی سیماب اکبرآبادی کے قلم سے شامل اشاعت ہے۔ رعایتی قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ربیع الاول نمبر رسول اللہ صلعم ولادت مبارکہ پر علامہ شبلی، مولانا آزاد، علامہ موسیٰ جار اللہ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جیسے فاضلین کے مقالات جامعہ۔ سوا دو روپے (مجلد)

اولیاء اللہ نمبر خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور اقوال کے علاوہ تصوف اور مشائخ چشت کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رعایتی قیمت بارہ آنے۔

حکمت نمبر قرآن اور کمیونزم، قرآن اور سائنس، قرآن اور جہاد، قرآن میں جماعت کی اہمیت، قرآن میں حقوق العباد اور قرآن میں آداب مجلس جیسے اہم مضامین۔ ایک روپیہ

پیغمبر اسلام رسول اللہ کے بارہ میں ۶۶ غیر مسلم مشاہیر و فضلاء کا اظہار عقیدت۔ قیمت ایک روپیہ۔

بشریت کا مقام بلند محمد اجمل خاں، مہر محمد خاں اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے تین تحقیقی مضامین۔

مولانا آزاد کی چند کتابیں

تذکرہ	مجلد	سات روپے
آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی	"	چھ روپے
صبح امید (خاص مضامین)	"	چھ روپے
نقش آزاد (خطوط کا مجموعہ)	"	چھ روپے
مسلمان عورت	"	چار روپے
مسئلہ خلافت	"	ساڑھے تین روپے
مقالات آزاد	"	دو روپے
مضامین آزاد	"	دو روپے
خطبات آزاد	"	تین روپے
شہید اعظم (واقعات کربلا)	"	ڈیڑھ روپیہ

ملفوظات آزاد	مجلد	ڈھائی روپے
انسانیت موت کے دروازے پر	"	ساڑھے تین روپے
مسلمانوں کا راستہ		چھ آنے
ولادت نبوی		چھ آنے
امر بالمعروف		ڈیڑھ روپیہ
عیدین		ڈیڑھ روپیہ
دعوت حق		ڈیڑھ روپیہ
اسلامی جمہوریہ		سوا روپیہ
حقیقت الحج		ایک روپیہ
حقیقت الزکوٰۃ		دس آنے
فسانۂ ہجر و وصال		آٹھ آنے

نوٹ:۔ ان کتابوں کو ایک ساتھ منگانے پر دو آنے فی روپیہ رعایت دی جائے گی۔

بھائی بھائی شیعہ سنی اتحاد کی خاطر ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی ایک علمی کوشش۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔

امام ابوحنیفہؒ کی تدوین قانون اسلامی مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ کے قلم سے۔ آپ جامعہ عثمانیہ (دکن) میں استاذ قانون بھی رہ چکے ہیں۔ ۱۲

مناجات مقبول مولانا اشرف علیؒ کا مرتب فرمودہ مقبول ترین مجموعۂ دعا و مناجات۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمہ و تشریح کے ساتھ۔ قیمت مجلد دو روپے۔

گلدستۂ نعت بڑے بڑے شاعروں کا منتخب نعتیہ کلام چند مقالات بھی بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ صفحات ڈھائی سو سے زیادہ۔ قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ۔

رحمتِ عالمؐ سیرت پر مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب جسے پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ قیمت دو روپیہ

خطبات مدراس تین روپے۔

نو ایمان افروز کتابیں نماز کے فضائل پندرہ آنے۔ سچے رسول کی سچی تعلیم ڈیڑھ روپیہ معلم نماز ۸ر صاحب خدا کی نمازیں ۱۲ر حضرت فاطمہ ۱۰ر

صحابیات قربونؓ کی دعائیں ۱۴ر حضرت ابوبکر صدیقؓ ۱۲ر حضرت خدیجہؓ ۶ر حضرت بلالؓ ۸ر۔ ان کتابوں کی مجموعی قیمت ساڑھے ایک آنہ ہوتی ہے لیکن

تجلّی کی ڈاک

سوال :- از محمد حسین ۔ مشرقی پاکستان وہی حکمت عملی کی بحث

حکمت عملی کی بحث کے سلسلہ میں اب تک فریقین کی طرف سے جو کچھ بھی لکھا جاتا رہا ہے اس کا حرف حرف میں دیکھ چکا ہوں ۔ خود آنجناب نے وقتاً فوقتاً جو کچھ تحریر فرمایا وہ اگرچہ اپنے دائرے میں محکم اور وزن دار رہا ' لیکن کاش آپ پوری بحث کا تفصیلی جائزہ لیتے ۔ میں اور میری ہی طرح اور بہت لوگ آپ کے اندازِ نگارش کے بیحد دلدادہ ہیں اور اگرچہ جوش اور طیش کی حالت میں تلخ و تند الفاظ لکھ جانے کا عیب آپ کے یہاں ضرور پایا جاتا ہے ' لیکن ادر ہر لحاظ سے آپ کی تحریریں دلپذیر و دقیع ہوتی ہیں ۔ مولانا مودودی نے جواباً جتنا کچھ لکھا وہ دلنشین ہونے کے باوجود مختصر اور تشنہ ہے غالباً وہ تفصیلی بحث کی فرصت نہیں پاسکے ۔ آپ اگر کچھ تفصیل اختیار فرمائیں تو خاص و عام کو یقیناً نفع پہنچے گا ۔

جواب :-

حکمت عملی کی بحث کا تفصیلی جائزہ لینے میں ہمیں بوجوہ تامل رہا ہے ۔ اولاً یوں کہ بفضلہٖ تعالیٰ مولانا مودودی حیات ہیں اور گنجائش کی حد تک ہر لائقِ التفات اعتراض کا جواب بھی دیتے جا رہے ہیں ان کے جوابات معترضین کی تحریروں کے مقابلہ میں جغرافی اعتبار سے چاہے تصیر و مختصر ہی ہوں ' لیکن مغز اور گیرائی کے لحاظ سے انکی بلاغت و جامعیت میں کوئی شبہ نہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم جیسے ناکارہ اور محروم عمل لوگ تو بہت آسانی سے کسی بھی بحث میں کتاب کی کتاب لکھ مار سکتے ہیں ' دھیلے کو گھس گھس کے پیسہ بنا سکتے ہیں ۔ شوشے میں شوشہ نکال کر طولِ شبِ فراق کو مات دے سکتے ہیں ہمیں عملی دنیا میں کچھ نہیں کرنا ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ حسین نظریات و معتقدات کو فعل و عمل کے جو کھٹوں میں فٹ کرنے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کیسی کیسی بے ڈھنگیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ ہم حسین و دلکش باتیں کر کے نکتے تراش کے ' علم و منطق کی دکان سجا کے اپنے کو بقراط و ارسطو باور کرانے کی فکر میں ہیں ' ہمیں کافی فرصت ہے کہ قلم کی نوک سے دودھ کی نہریں کھودیں ' انگلیوں کی جنبش سے زہد و تقویٰ کے محل کھڑے کر دیں اور خطبہ و وعظ کے دھارے میں عامۃ الناس کو بہالے جائیں ' لیکن مولانا مودودی ایسا نہیں کر سکتے وہ کسی فلسفے کے منادِ اور کسی نظری فارمولے کے نقیب بنکر گھر سے نہیں نکلے تھے ' وہ تو اینٹ اور پتھر کی ٹھوس دنیا سے سر ٹکرانے میدان میں آئے تھے ۔ اس ٹکراؤ میں اسلام کو فائز المرام کرنے اور باطل کو ہزیمت دینے کی خاطر انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے ۔ جس جس محاذ پر انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا قلم معمار کے اوزار یا مجاہد کی تلوار کا کام دے سکتا ہے وہیں وہیں انھوں نے اس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور دفتر کے دفتر تیار ہوتے چلے گئے ۔ لیکن جہاں کہیں انھیں اندازہ ہوا کہ اب یہ قلم بس گیند کا بلّا بن کے رہ جائے گا وہیں ہاتھ روک لیا ۔ انھیں حقیقی افادیت مطلوب تھی نہ کہ بحث و مناظرہ ۔ انھیں عمل کے میدان میں بہت کچھ کرنا تھا جو قدرت کی دی ہوئی گنجائش کے مطابق انھوں نے کیا اور آج بھی جب کہ گرد و پیش کے احوال میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے وہ حقیقی افادیت ہی کے زاویۂ نظر سے اپنی استطاعت کے مطابق سعی و جہد میں مصروف ہیں ۔ "حکمت عملی" کی بحث کو معترضین نے جس قدر طولانی بنا دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ۔ اصلی نقطۂ بحث گم ہو کر رہ گیا اور ضمنی و ذیلی مباحث پوری فضا پر گھر بن کر چھا گئے ۔ جو اختصار اور تشنگی آپ یا بعض اور حضرات مولانا مودودی کے جوابات میں محسوس فرما رہے ہیں اس کی جڑیں اس گھر میں ہیں نہ کہ جوابات میں ۔ جوابات تو اپنی جگہ اتنے مکمل اور جامع ہیں کہ جو شخص مغز اور اساس و اصول کی قدر و قیمت جانتا ہو اور سوءِ ظن کا شکار نہ ہو وہ ان سے پوری طرح مطمئن ہو جائے گا ۔

کم سے کم ہم اپنے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ معترضین کی تمام تحریروں کو نہایت حسن اعتقاد، جذبۂ عدل و دیانت اور ذہنی غیر جانبداری کے ساتھ پڑھنے کے باوجود ہم نہیں سمجھ سکے کہ وہ کونسا حقیقی مسئلہ درپیش ہے جس کی گتھیاں سلجھانے کیلئے یہ غیر مختتم بحث ضروری ہوگئی ہے۔ محض خیالی خطرے، نظری واہمے اور دور از کار نکتہ سنجیاں۔ ہماری ہی سمجھ اگر موٹی اور ہماری ہی بصیرت اگر بے نور ہے تو اور بھی ضروری ہے کہ ہم کان دبائے پڑے رہیں اور تفصیلی نقد و نظر کا تصور بھی نہ کریں۔

دوسری وجہ تامل کی یہ رہی کہ معترضین نے ذیل در ذیل اور شاخ در شاخ کا تانا بانا پھیلا کر گیسوئے سخن کو اتنی درازی دیدی ہے کہ اس کی مشاطگی کے لئے تجلی کے ایک خاص نمبر ہی کا شانہ چاہئے۔ یہ شانہ اگر ہمیں بہ آسانی دستیاب ہو سکتا تو "خلافت نمبر" ہی کیوں ادھورا نکلتا۔ واقعہ یہ ہے کہ متعدد اسباب کی بنا پر ہم ایک ضخیم شمارہ اس بحث کی نذر کردینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

راقم الحروف کی تحریروں میں جوش اور طیش کے جس عیب کی نشاندہی جناب نے فرمائی ہے یقین کیجئے اس کے احساس سے میں خود بھی بیگانہ نہیں ہوں۔ میں — عامر عثمانی اپنے اس عیب کو خوب جانتا ہے اور اس پر اللہ سے ہزار بار عفو طلب کرتا ہے کہ بارہا کوشش کے باوجود اپنے قلم کو جذبے اور جوش کی گلکاریوں سے بچا نہیں پاتا۔ لیکن انصاف پسند حضرات اگر ان افراد و اشخاص کی جارحیت اور ان نظریات و دعاوی کی اشتعال انگیزی کو بھی نظر میں رکھیں جن کے بالمقابل یہ نا اہل گرم ہو اٹھتا ہے تو شاید میرا جرم و عیب کچھ ہلکا پڑ جائے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو مدِ مقابل کے لگائے ہوئے چرکوں اور چبھوئے ہوئے کانٹوں کی خلش سے بے پروا ہو کر ہر مرحلے میں سپاٹ اور غیر جذباتی زبان میں گفتگو کر سکیں۔ یہ باتیں میں "عذر گناہ" کے طور پر نہیں کر رہا، بلکہ اس پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ کسی بھی معاملہ میں کوئی رائے قائم کرتے ہوئے سارے ہی منفی و مثبت گوشوں پر نظر رکھنی چاہئے۔

آپ مجھ سے تفصیل کی فرمائش کرتے ہیں۔ میرے بھائی مطلوبہ موضوع پر اگر میں نے بات شروع کردی تو زلف سخن درازی در از ہوتی چلی جائے گی۔ بے شمار احباب شاکی ہیں کہ یہ نالائق ہمارے سوالوں کا تو جواب چھاپتا نہیں اور دوسرے ہی قصوں میں صفحے بھر ڈالتا ہے۔ ایسی حالت میں مناسب یہی ہے کہ صبر کر لیا جائے۔ ہاں اگر کوئی ایسا وقت آیا کہ اس بحث میں پڑنے میں دین و ملت کا کوئی حقیقی مفاد محسوس ہوا تو انشاء اللہ کوئی عذر کوئی مانع ناچیز کے قلم کو نچلا نہیں بیٹھنے دیگا۔

ویسے بطور تبرک تاریخ کا ایک واقعہ ضرور سنتے چلئے۔

آٹھویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہے۔ تاتاریوں کی ہولناک تاخت نے مسلمانوں کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ اب دمشق پر انکی یلغار ہونے والی ہے۔ شامی و مصری فوجیں مقابلے کے لئے دمشق سے چند میل فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں ابھی ٹکراؤ نہیں ہوا ہے۔ عین اسی عالم میں رمضان شروع ہوجاتا ہے اور قرآن کے حکم قطعی کے مطابق مسلمانوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ روزے رکھیں۔ نہ وہ سفر میں ہیں نہ مریض۔

لیکن ذرا دیکھئے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کیا اعلان فرما رہے ہیں۔

"لوگو! جب تک جنگ سے فارغ نہ ہوجاؤ روزہ مت رکھو!"

اے واہ صاحب کیوں نہ رکھیں؟ روزہ تو فرض عین ہے۔ اللہ نے کہاں کہا ہے کہ جنگ ہونے والی ہو تو روزے چھوڑ دو۔ رسول اللہ نے کہاں فرمایا ہے کہ زمانۂ جنگ میں ترک صوم جائز ہے۔ صحابۂ کرامؓ میں سے کس نے اجازت دی ہے کہ متوقع جنگ کی خاطر روزے جیسی عبادتِ مکتوبہ کو مؤخر کردو۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ صحابہ و تابعینؒ نے عین میدان کارزار میں تلواروں کی چھاؤں اور تیروں کی برسات میں روزہ رکھا ہے۔

پھر یہ نہیں کہ ابن تیمیہؒ نے یہ فتویٰ صرف اُن مجاہدین کیلئے دیا ہو جو جنگاہ میں خون کی ہولی کھیل رہے ہوں، جو حریف سے دست و گریباں ہوں۔ ابھی تو جنگ شروع ہی نہیں ہوئی ہے۔ ان کا فتویٰ عام تھا۔ پورے دمشق کے لئے تھا اور یہاں تک اس پر زور دے رہے تھے کہ متعدد امیروں اور سالاروں کے پاس جاتے اور ان سے کھانے پینے کی کوئی چیز مانگ کر کھاتے تاکہ سب جان جائیں وہ روزے سے نہیں ہیں۔ کتنے ہی علماء نے اس فتوے پر سخت اعتراض کیا۔ آج کی طرح اس زمانے میں بھی ایسے علماء کی کمی نہیں تھی جو پیر پھیر

[illegible] کے معیار عمل نہیں رکھتے تھے۔ جو روحِ شریعت اور حکمتِ عملی کے مابین اعلیٰ درجہ کا توازن قائم رکھنے پر قادر نہیں تھے۔ جن کی ذہنی گرفت علمی حقائق کے لطیف و غامض گوشوں پر مضبوط نہیں تھی۔

لیکن مزاج دانِ شریعت' امام ابن تیمیہؒ ان کے اعتراض کو غیر حقیقت پسندانہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"سفر کی معمولی تکان کی رعایت سے اگر باری تعالےٰ روزہ مؤخر کردینے کو حلال قرار دیتے ہیں تو دشمن سے لڑنے کی طاقت بحال رکھنے کے لئے روزہ چھوڑ دینا کیوں حلال نہ ہوگا۔ حلال ہی نہیں' نہ رکھنا افضل و اولیٰ بھی ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے۔ امام ابن تیمیہؒ نے کسی آیت' کسی حدیث' کسی اثر کے تحت نہیں' بلکہ محض قیاس' محض ذاتی تفکر' محض انفرادی صوابدید کے تحت روزے جیسی عبادتِ مفروضہ کا ترک افضل قرار دیا۔ جنگ کے لئے توانائی قائم رکھنے کو اہم تر مقصد مانا اور ہم پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا "حکمتِ عملی" پر مبنی یہ قیاس اور فتویٰ بالیقین درست تھا اور اسے خلافِ شرع سمجھنے والا یا تو جاہل ہے یا غبی یا متعصب۔

اب یاد کیجئے مولانا مودودی کیا کہہ گئے ہیں۔ ان کا رسالہ پاس نہ ہو تو چند فقرے میں یاد دلاتا ہوں:۔

"ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے حکمتِ عملی ہی نہیں حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔" (ترجمان القرآن دسمبر ۵۶ء)

پھر ترجمان القرآن مئی [illegible]ء میں بطور توضیح فرمایا:۔

"میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ نظری حیثیت سے تو ہر صحیح اصول قائم کرنے کے لئے ہے اور ہر غلط چیز ترک کردینے اور مٹا دینے کے لائق ہے' لیکن عملی زندگی میں خیر و شر کی کشمکش کے درمیان انسان کو بہت سے مواقع پر ایسے حالات سے سابقہ پیش آجاتا ہے جس میں ایک چھوٹی بھلائی پر اصرار کرنے سے ایک بڑی بھلائی کا نقصان ہوتا ہے یا ایک چھوٹی برائی ترک کردینے سے ایک بڑی برائی لازم آتی ہے۔ ایسے مواقع پر عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایک کم قیمت چیز پر زیادہ قیمتی چیز کو قربان نہ کیا جائے اور شریعتِ الٰہیہ میں جو حکمت معتبر ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بڑی برائی سے بچنے کے لئے چھوٹی برائی کو گوارا کرلینا چاہئے اور چھوٹی بھلائی کی خاطر بڑی بھلائی کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ اس معاملہ میں میں صرف عقل کو کسوٹی بنانے کا قائل نہیں ہوں کہ آدمی جب چاہے عملی ضروریات کی بناء پر اسلام کے اصول و قواعد اور احکام میں سے جس بندش سے چاہے نکل جائے' بلکہ یہ بات میرے اس فقرے سے ظاہر ہے کہ میں اس حکمتِ عملی کا قائل ہوں جو خود اسلام کے دیئے ہوئے معیار سے جانچ کر یہ دیکھتی ہے کہ کس چیز کی خاطر کس چیز کو گوارا کرنا اور کس حد تک قربان کرنا ناگزیر ہے۔"

کیسی صریح و محکم بات۔ کتنی صاف' بے غبار اور جچی تلی توضیح۔ لیکن اعتراضات کا دفتر بے پایاں اٹھا کے دیکھئے' محسوس ہوگا کہ مولانا مودودی نہ جانے کیا کفر بک گئے ہیں۔ کیا زندقہ پھیلا دیا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی کہے ابن تیمیہؒ نے قرآن کے حکمِ ناطق سے استثنا نکالنے میں خود قرآن ہی سے دلیل لی ہے۔ قرآن ہی نے تو مسافر اور مریض کو رخصت دیکر یہ اشارہ کیا ہے کہ جسمانی احوال روزے کے حکمِ قطعی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں تو جنگ کیلئے جسمانی قوتوں کو بحال رکھنے کی جتنی شدید ضرورت ہے اس کے پیشِ نظر روزوں کو مؤخر کر دینا دینِ شریعت کے عین مطابق ہے۔

بات خوبصورت ہے' لیکن ذرا وہ تمام تحریریں تو اٹھا کر دیکھئے جو مولانا مودودی نے "حکمتِ عملی" کے سلسلہ میں سپردِ قلم کی ہیں کیا ان میں کہیں یہ بھی انھوں نے رقم فرما دیا ہے کہ امیرِ جماعت بلا دلیل و حجت کے بس من مانے طور پر جس حکمِ شرعی کو چاہے معطل کر سکتا ہے جس اصولِ دین کو چاہے استثناء کی لحد میں دفنا سکتا ہے' جس تقاضائے شریعت کو چاہے محض آرڈر یا آرڈیننس کہتے ہوئے حکمتِ عملی کے پیروں سے کچل سکتا ہے۔ ابھی آپ نے ان کی عبارت میں دیکھ ہی لیا کہ ترک و قبول اور اخذ و استثناء کیلئے وہ خود اسلام ہی کی دی ہوئی کسوٹی کو جج اور حرفِ آخر مان رہے ہیں۔ اسی طرح اس سلسلہ کی تحریروں میں متعدد جگہ وہ اشارۃً بھی اور صراحۃً بھی کہتے چلے آتے ہیں کہ ردّ و قبول اور اخذ و ترک کا حق غیر مشروط نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے

کہ امیر وقائد کی زبان ہی قانون بن جائے اور وہ شریعت کے کسی اصول، کسی حکم، کسی ہدایت میں بلا دلائل شرعیہ ہی حکمت عملی کی قینچی سے من چاہی کتر بیونت کرتا چلا جائے۔

ابن تیمیہؒ ہم عصر نہیں ہیں۔ وہ مر چکے اور مرحوموں کے لئے ہمارے دل بہت فراخ ہیں۔ ہر ممکن استدلال کے ذریعہ ہم کوشش کریں گے کہ ان کے مذکورہ فتوے کو ایک معقول قسم کا اجتہاد قرار دیں اور یہ بھی کوشش کریں گے کہ اس اجتہاد کے لئے "حکمت عملی" کا لفظ ہرگز نہ آنے پائے۔ لیکن مولانا مودودی ہم عصر ہیں ان کے حق میں ہماری ذہانت نیزہ و شمشیر ہی تلاش کرے گی، انھیں نیچ کرنے کے لئے ہم قرآن وحدیث اور پورے دینی لٹریچر سے ایسے ہی اجزا ڈھونڈ کر لائیں گے جن کی چھونک سے ان کا ناک میں دم کیا جا سکے۔ حالانکہ یہی وطیرہ اگر ہم ابن تیمیہؒ کے بارے میں اختیار کر لیں ـــ اور مزدہ ہو کہ اہل بدعت نے کبھی رکھا ہے تو کسی دلیل سے بھی ہمارا منہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کہیں گے قرآن کے حکم ناطق کو ٹھکرا کر یہ شخص گمراہ ہو گیا۔ ہم کہیں گے اگر قوت پیکار قائم رکھنے کے لئے روزے کی چھٹی ہو تو اللہ میاں کے لئے کیا مشکل تھا کہ مریض و مسافر کے ساتھ جنگ آزما مومنین کا بھی ذکر کر دیتے۔ ہم کہیں گے کہ ابن تیمیہؒ کا اجتہاد اگر صحیح تھا تو کیوں ایسا ہوا کہ بعض صحابہ اور بعض تابعین نے عین میدان کارزار میں روزہ رکھا۔ ہم کہیں گے ـــ اور زہد و تقویٰ کے تمام تر جلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہیں گے کہ لعنت ہے ایسی جنگی تیاری پر جس میں قرآن کے حکم صریح کو نظر انداز کر دینا پڑے۔ لعنت ہے تمام فرشتوں اور جنوں اور ساتوں آسمانوں کی ایسی حکمت عملی پر جو صحت مند مقیموں کو روزے کی رخصت عطا کر دے اور لعنت ہے ایسی زندگی، ایسی کامیابی، ایسی سیاست و تدبر پر جس میں ایک داعی حق عین رمضان کے دنوں میں سرعام منہ چلاتا پھرے!

گستاخی معاف۔ لعنت بازی کا کچھ ایسا ہی انداز تھا جو ہمارے بزرگ مولانا اصلاحی نے اپنے قلم پاروں میں استعمال فرمایا تھا۔ یہ ہے تو بہت شاندار۔ آپ دیکھ لیجئے کیسا تقوے کیسا زہد، کیسا عشق الٰہی ظاہر ہوتا ہے اس سے ـــ لیکن یہ ہماری ترکیب تازیاں نظریات و حقائق کی جنگاہ میں کوڑی بھر فائدہ نہیں دیتیں۔ ان کا مزا بس تسبیح و مصلیٰ تک ہے اور انکی افادیت پیرامن مسند وعظ ہی سے وابستہ ہے۔ پھر جب حقائق [illegible] ہے تو یہ ربڑ کے غباروں کی طرح پارہ پارہ ہو جاتی ہیں [illegible] کیے ابن تیمیہؒ پر تسبیح و مصلیٰ کے باب میں وہ بھی کسی سے کم نہ تھے لیکن جب حقائق نے ان کی مصفا ذہانت کو آواز دی تو انھوں نے تسبیح کو جیب میں رکھا، مصلے لپیٹ کر بغل میں دبایا اور ہاتھ بڑھا کر گھوڑے کی باگ تھام لی۔ اب نظریات و اصول کو حقائق کی رزم گاہ میں تلوار کی دھار پر تولنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہی زاہد شب زندہ دار جس کی زندگی احکام شریعت کی تلقین اور اتباع دین کی ترغیب میں کھپی ہوئی تھی پکار پکار کر کہتا ہے:۔

"لوگو روزہ مت رکھنا ـــ ہمیں دشمن سے لڑنے کے لئے توانائی کی ضرورت ہے۔ ہمیں حریف کو شکست دینی ہے"۔

اس کے برخلاف وہ علماء جنھوں نے اس مشورے، اس فتوے کو باطل قرار دیا، نہیں جانتے تھے کہ حکمت عملی کس چڑیا کا نام ہے۔ نہیں جانتے تھے کہ جب جنگ برپا ہوتی ہے تو بارہا مجموعی مفاد کی خاطر اپنے ہی بہت سے سپاہیوں کو کٹا دینا پڑتا ہے۔ اپنی ہی رسد میں کبھی کبھی چنگاری دکھلا دینی ہوتی ہے، اپنے ہی میگزین کے ایک حصہ کو دریا برد کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جن گذشتہ مجاہدین نے عین دوران جنگ میں روزے رکھے ان کی صلابت ایمان اور تاب وسکت سے موجودہ مجاہدین اور عامۃ المسلمین کے ایمان اور تاب و تواں کو کیا نسبت ہے۔ وہ تو بس اتنا ہی جانتے تھے کہ روزہ عبادت مکتوبہ ہے جسے حالت مرض اور عالم مسافرت کے سوا چھٹی دیدینے کا اذن قرآن نے کہیں نہیں دیا۔ ایسے مصالح وقت اور حکمت عملی کے طور پر چھوڑ دینے کا فتوے شریعت کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

بات لمبی ہو گئی۔ ہمیں بس اتنا ہی کہنا ہے کہ اسلام کے وہ اصول و احکام جنھیں عمل کے میدان میں کارفرمائی کرنی ہوتی ہے جو اپنے ظہور کے لئے عملی امثال و نظائر کے محتاج ہوتے ہیں، جیسے معیشت وتمدن کے مختلف شعبوں کی تعمیریں اٹھتی ہیں وہ پتھر کی طرح بے لچک، فولاد کی طرح سخت، بھونچال کی طرح بے رحم اور فلسفے کی طرح بے گداز نہیں ہوتے۔ ان میں کترنے اور پھیلنے کی گنجائش ہوتی ہے، وہ مقدم اور مؤخر ہو سکتے ہیں، ان کے

[illegible] بھی ممکن ہے اور ان کے استعمال میں قائدین و احرار کا اللہ افراست، دور بینی، تعمق اور حسین توازن ہی وہ بنیادی حال ہے جس پر ان کی افادیت اور بار آوری کا انحصار ہے۔ دیکھ لیجئے، ایک مریض زانی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ دیتے ہیں کہ اسے کھجور کی ایک ایسی ٹہنی مار دو جس میں سو شاخیں ہوں۔ حدِ زنا پوری ہو جائے گی۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ والی آیت میں بھی اس طرح کی رعایت کا کوئی اشارہ ہے؟ کیا قرآن میں اور کہیں سو کوڑوں کو کھجور کی ایک ٹہنی سے بدل دینے کا ایماء ملتا ہے؟ نہیں ملتا۔ پھر کیا چیز تھی جس نے پیغمبرؐ کی زبان وحی نظام سے ایسا فیصلہ صادر کرایا؟

خوب غور کیجئے۔ جتنا غور کریں گے یہی واضح ہوتا جائیگا کہ مولانا مودودی نے اپنے اندازِ پرداز اور اپنے سیاق و سباق میں جس حقیقت کو "حکمتِ عملی" کے تحت بیان کیا تھا وہ نہ کفر تھی نہ زندقہ۔ نہ گمراہی تھی نہ عیاری۔ نہ اس میں بے غبار دلوں کے لئے کوئی سفسطہ تھا نہ بے لاگ ذہنوں کے لئے تلبیس۔ سونے کی طرح کھری اور سچی بات جو سوءِ ظن کی منڈی میں تو پیتل قرار دی جا سکتی ہے لیکن عدل و آئین کے بازار میں سونا ہی ٹھیرے گی ــــ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

سوال ؎:۔ از جمیل احمد بستی منگلم۔ حادثۂ کربلا اور ماہ محرم

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ (سورہ توبہ)

مذکورہ آیات بتاتی ہیں کہ ماہ رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم جملہ چار مہینوں میں جنگ و جدل کرنا حرام ہے۔ کیا یہ احکام منسوخ ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو حادثۂ کربلا عین ماہ محرم الحرام میں واقع ہوا ہے۔ قرآنی احکام سے بخوبی واقفیت کے باوجود طرفین نے جنگ کی ہے اور عمداً حرمت کی پاسداری کی نہیں ہے۔ اسکا سبب کیا تھا؟ کیا طرفین کو خاطی و مرتکب حرام کہنا بجا ہے یا بے جا؟

جواب ؎:۔

آپ کے ذکر فرمودہ مہینے بلاشک اشہرِ حُرُم (ادب والے مہینے) ہیں اور ان کی یہ حیثیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ لیکن جس آیت کو آپ نے نقل فرمایا اس کی حیثیت مفہومِ لازم کے اعتبار سے کچھ ایسی ہی ہے جیسی:۔

لَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ

کی۔ بے حیائی کے کام، معصیت کوشی اور لڑائی دنگا ظاہر ہے سال کے بارہ مہینے ممنوع ہی ہیں۔ خاص حج کے دنوں میں ان سے روکنے کا منشاء یہ نہیں ہے کہ ان دنوں کے علاوہ ان کا جواز نہ ہو۔ اسی طرح اپنے اوپر ظلم کرنا یا ایک قوم کے مختلف افراد کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا ہمیشہ ہی ممنوع ہے نہ کہ صرف چار مہینوں میں۔

تو ثابت ہوا کہ خصوصیت کے ساتھ چاروں حرام مہینوں میں جس ظلم اور جنگ و جدل کی ممانعت آئی ہے وہ وہی ہے جو ان مہینوں کے علاوہ بھی ممنوع ہی ہے، لیکن ان مہینوں میں اس ظلمِ ممنوعہ کی مشغولیت چونکہ حج اور عمرے جیسی عبادات کے ضیاع کا سبب بن جاتی ہے اس لئے مزید قباحت و شناعت پیدا ہو گئی۔

جو جنگیں بجائے خود ممنوع و حرام نہ ہوں وہ ان مہینوں میں بھی جائز ہی ہیں۔ خود قرآن کہتا ہے کہ:۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ	ماہ حرام کا بدلہ تو ماہ حرام ہی ہے اور حرمتوں میں تو برابری کا لحاظ رکھا جائیگا

کفارِ عرب نے ایک سال ذیقعدہ کے مہینے میں مسلمانوں کو عمرے سے روک دیا تھا۔ اگلے سال اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کفار اگر ماہِ حرام کا لحاظ نہ کرتے ہوئے تمہارے درپئے آزار ہوتے ہیں تو تم بھی ماہِ حرام کا لحاظ کئے بغیر ان سے لڑو اور خوب خوب مزاج پرسی کرو۔ حرمت کا معاملہ تو برابری کا ہے۔ حریف اگر حرمت کی پرواہ نہیں کرتا تو تم بھی مت کرو۔

غزوۂ تبوک ماہ رجب ہی میں ہوا ہے جو ماہِ حرام ہے۔ گویا عملاً بھی اور قولاً بھی یہ بات ثابت ہے کہ کفار سے لڑنا ــــ بشرطیکہ اس کی ضرورت درپیش ہو حرام مہینوں میں بھی جائز ہے۔ اسی آیت کے متصل بعد جس کا آپ نے تذکرہ فرمایا ارشاد ہوا ہے:۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۔	اور مقاتلہ کرو اہل شرک سے ہر حال میں جیسے کہ مقاتلہ کرتے ہیں وہ تم سے ہر طرح

اس طرح یہ بات ذرا بھی مشکوک نہیں رہتی کہ اگرچہ حج و عمرے

ے مقاصد اور پُرامن کاروبار کی منفعت کے لئے چار مہینوں کو "حرام مہینے" قرار دیدینا اپنی جگہ نہایت عمدہ قرارداد ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ ان مہینوں میں حتی الوسع قتال وجدال سے بچے رہیں، لیکن اگر کوئی حریف انھی مہینوں میں حملہ آور ہوجائے یا سیاسی وعسکری مصالح شدت سے متقاضی ہوں کہ اسلامی فوجیں انھی مہینوں میں سے کسی مہینے میں حرکت میں آئیں (جیساکہ غزوۂ تبوک میں ہوا) تو مدافعت یا جوابی حملہ یا احتیاطی پیش قدمی کوئی گناہ نہیں رہتی اور ساتھ ہی یہ بھی طے ہے کہ حریف چاہے کافر ہو یا مسلمان۔ اس نے اگر صورتِ حال ایسی پیدا کردی کہ اسکے مقابلہ پر ہتھیار اُٹھانا، پیش قدمی کرنا اور خون بہانا حفاظت وسالمیت کے لئے ضروری ہوگیا تو ماہِ حرام کی حرمت کا لحاظ ساقط ہوجاتا ہے۔ یہی اصول ہے جسے اَلْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ کے جچے تُلے الفاظ میں واضح فرمایا گیا ہے۔ حریف ہی نے لحاظِ حرمت نہیں کیا تو فریقِ ثانی کیوں کرے۔

ان بنیادی توضیحات کے بعد حادثۂ کربلا پر نظر ڈالئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ دیانت داری کے ساتھ یہ گمان رکھتے تھے کہ یزید کے مقابلہ میں خود مَیں مسندِ خلافت کا زیادہ مستحق اور ملک وملت کے انتظام وانصرام کا زیادہ اہل ہوں۔ اس بحث کو چھوڑیئے کہ یزید فی الواقع کیسا تھا اور حضرت موصوفؓ کا گمانِ مذکور اُس دور کے مجموعی احوال میں کس حد تک حقیقت پسندانہ کہا جاسکتا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ حضرتؓ کے دل میں نیک نیتی کے ساتھ یہ گمان جاگزیں ہوگیا تھا اور جب ہزاروں کوفیوں کی طرف سے اعانت ونصرت کے وعدوں کی گونج کانوں میں پڑی تو اس گمان کی عملی کارفرمائی کے روشن امکانات اُبھر آئے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ آپ کس تاریخ کو عازمِ کوفہ ہوئے اور آپ نے ارکانِ حج کی کُلاً یا جزواً ادائگی کی تھی یا نہیں۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ کوفیوں کے بلند بانگ وعدوں سے فوری استفادہ ضروری تھا اور ماہِ حرام کی خاطر اس اہم ترین کام کو مؤخر نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پھر یہ پہلو بھی نظر میں رکھنا چاہئے کہ وہ مقاتلہ ومجادلے کے لئے نہیں چلے تھے۔ ان کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ حالات اچانک یوں منقلب ہوجائیں گے اور ہزاروں کوفیوں سے خلافت کی بیعت لینے کی بجائے خاک وخون ہی کے مراحل سے گذرنا پڑے گا۔ وہ تو چلے تھے یہ توقع لے کر کہ پُرامن حالات میں بیعتِ عامّہ کے ذریعہ کم سے کم کوفے کی حد تک ایک متوازی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا وہ ہو رہے گا۔

اس اعتبار سے ان کے اقدام پر ماہِ حرام کی پاسداری نہ کرنے کا گناہ لازم نہیں آتا۔ ویسے بھی چونکہ ان کی نیک نیتی اور دیانتداری کے تعلق سے ان کے اجتہاد کو ہم ایسے اجتہاد کا درجہ دیتے ہیں جو غلط ہونے پر بھی ایک ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور جسکی پیروی خود مجتہد کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کا اقدام بجائے خود فعلِ حرام نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے حرام مہینوں میں افعالِ حرام یعنی ظلم وطغیان ہی کی خصوصی ممانعت فرمائی ہے نہ کہ مباح وجائز اقدامات کی اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مرتکبِ حرام نہیں ہوئے تھے۔

رہا فریقِ ثانی۔ یعنی یزید۔ تو اس کی فوجوں نے جو چاہے کیا ہو لیکن مجرد یہ بات کہ اس نے حضرت حسینؓ کے اقدام کو ناکام بنانے کے لئے فوجوں کو حرکت دی ارتکابِ حرام کے دائرے میں نہیں آتی۔ جیساکہ واضح کیا گیا حُرُمات میں برابری ہے۔ حضرت حسین ہی ماہِ حرام میں پیش قدمی فرماچکے تو ایک حکمراں کی حیثیت میں یزید کے لئے ماہِ حرام کا لحاظ مشروع نہ رہا۔ یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسے معاہدوں میں ایک فریق عہد شکنی کرے تو دوسرے فریق سے ایفائے عہد کی پابندی آپ سے آپ اُٹھ جاتی ہے۔

علی ومعاویہ رضی اللہ عنہما

سوال ۱:— از سید تنویر حسن

محترم سلام مسنون۔ آپ کا مؤقر جریدہ تجلّی اکثر وبیشتر میرے زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں دسمبر ۸۵ء کے پرچہ میں آپ کا وہ مضمون جو حضرت علیؓ اور امیر معاویہ سے متعلق تھا مطالعہ میں آیا۔ آپ کے دلائل میری محدود عقل سے بالاتر ہیں۔ اس لئے کہ اس مسئلے پر جو کتب میری نظر سے گذری ہیں ان کے پڑھنے سے مجھے اس امر کا یقین ہے کہ یہ معاملہ سوائے دنیاوی اغراض کی تکمیل کے اور کچھ نہ تھا۔ تاریخی واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ جنگِ صفین کی بنیاد ہی امیر معاویہ کی بغاوت پر مبنی تھی جو انھوں نے حصول سلطنت کے لئے برپا کرائی۔ اس تاریخی ثبوت کے موجود

ہوتے ہوئے بھی ایک طبقہ اس بات کا قائل ہے کہ (۱) امیر معاویہ کو مثل اصحابِ جمل دھوکہ ہوا (۲) وہ مجتہد تھے اُن سے یہ خطائے اجتہادی سرزد ہوئی۔ یہ شبہ بھی ہے کہ بیعت منعقد نہیں ہوئی۔ (۳) خود صحابی تھے انھیں کے قبیل کے اور بھی صحابی انکے ساتھ تھے (۴) وہ طالب خلافت نہ تھے، بلکہ طالب قصاص خونِ عثمانی تھے۔ اور اس نکتہ پر آپ نے بھی تاریخی پہلو سے روشنی نہیں ڈالی اور نہ آپ نے معاویہ کی زندگی کے کل واقعات (یعنی ان کا طرزِ عمل لکھنا ضروری سمجھا) اور بلا اس کے ایک حقیقت پسند کوئی صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

پہلے لفظِ خلافت ہی کو سمجھ لینا چاہئے، ممکن ہے کہ لفظِ خلافت کا۔۔۔ کوئی مخصوص مفہوم آپ کے ذہن میں ہو، اسلئے جو منشاء اس لفظ کا آں حضرتؐ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں رہا اب اس کی مختلف طریقوں سے تاویل کی جا رہی ہے۔ ہمارے زیر نظر خلافت کا حقیقی مفہوم یہی ہے اور لفظ خلافت کے لغوی معنی جانشینی اور کسی کی جگہ پر اس کے بعد بیٹھنے کے ہیں۔ یہ لفظ خود اپنے مفہوم کو ظاہر کر رہا ہے کہ وہ ایک اصل کا سایہ اور ایک آئینہ کا عکس اور ایک حقیقی منصب کی قائم مقامی ہے۔ اس کو کبھی امام کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ دونوں لفظ خلیفہ اور امام ایک ہی شخص کی دو مختلف حیثیتوں کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ اپنے پیش رو کے نائب اور قائم مقام ہونے کے لحاظ سے وہ خلیفہ اور اپنے زمانہ کے پیروؤں کے لحاظ سے وہ امام اور پیشوا ہے۔ اسی بناء پر درحقیقت خلافت پیغمبر کی قائم مقامی اور اس کے بعد کی پیشوائی ہے۔ آنحضرتؐ کے ارشاد سے بھی کہ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں انبیاء اور پیغمبر سیاست کرتے تھے اور ایک پیغمبر کے بعد دوسرا پیغمبر پیدا ہوتا تھا، لیکن اب پیغمبری ختم ہو گئی ہے تم میں خلفا ہوں گے یہی واضح ہوتا ہے کہ خلافت پیغمبر کی نیابت اور قائم مقامی ہے اسی لئے خلیفہ میں دو حیثیتوں کا پایا جانا لابدی ہے (۱) ظاہری حیثیت میں اس میں سیاسی و انتظامی استعداد و صلاحیت (۲) اور اس سے بہت زیادہ اس کا باطن درست اور مصفا ہو۔ یعنی یہ دیکھنا پڑے گا کہ آنحضرتؐ کی صحبت کا اثر کتنا گہرا اور دیرپا پڑا ہے اور اس کے روحانی، علمی، عملی و اخلاقی فضائل اور مناقب کیا ہیں؟ آنحضرتؐ نے جن لوگوں میں ان دونوں حیثیتوں کا مکمل نمونہ دیکھا اشارات اور ارشادات کے ذریعہ سے ان کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر فرمایا۔ زمانہ کے انقلاب اور حالات کے تغیر نے اس لفظ کے مفہوم اور معیار کو بھی بدل دیا۔ آنحضرتؐ نے ظاہری صفات کے ساتھ مخصوص روحانی فضائل اور کمالات کو بھی ملاحظہ فرما لیا تھا اور ان ہی فضائل و کمالات کے لحاظ سے قرآن و احادیث میں ایسے مخصوص اور صریح ارشادات و اشارات پائے جاتے ہیں کہ جن سے خلافت حقیقی کے مستحق کو پہچاننا بالکل آسان ہے۔ اہلیت خلافت کے لئے جن مخصوص شرائط کی ضرورت ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) مسلمان ہونا (۲) عاقل و بالغ ہونا (۳) مرد ہونا (۴) متکلم و سمیع و بصیر ہونا (۵) شجاع ہونا (۶) عادل ہونا (۷) مجتہد ہونا (۸) قریشی ہونا (۹) مہاجرین اولین و حاضرین حدیبیہ و حاضرین نزول سورۂ نور و حاضرین بدر و تبوک و دیگر مشاہدہ عظیمہ ہونا (۱۰) بشر بالجنہ ہونا۔ (یعنی آنحضرتؐ نے اپنی زبانِ مبارک سے اس شخص کا نام لیکر بغیر کسی تعلیق کے اور شرط کے فرمایا ہو کہ فلاں شخص اہل بہشت سے ہے۔ (۱۱) امت کے اعلیٰ طبقہ سے ہونا یعنی صدیقین و شہداء و صالحین میں سے ہونا (۱۲) آنحضرتؐ کا اس کے ساتھ قولاً و عملاً وہ برتاؤ کرنا جیسے بادشاہ اپنے ولیعہد کے ساتھ کرتا ہے (۱۳) خداوند عالم نے جو وعدے رسولؐ سے کئے ہوں ان کا خلیفہ کی ذات سے پورا ہونا (۱۴) اس شخص کے قول کا دین میں حجت ہونا (۱۵) اس شخص کا اپنے عہد میں تمام امت سے افضل ہونا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ جناب امیر میں یہ سب شرائط بدرجۂ اتم موجود تھے۔ (ازالۃ الخفاء) اور اسی لئے آپ کے مستحق خلافت ہونے میں معاویہ یا اور کسی شخص کو کوئی گنجائش شک و شبہ کی نہ تھی۔ آیات قرآنی و احادیث صحیحہ صاف اور واضح طور سے یہ امر ظاہر کر چکی تھیں کہ خلافت کن حضرات میں ہو گی۔ مثلاً ہم دو آیتیں یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ناظرین کو سہولت ہو۔

(۱) وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ (سورۂ نور پارہ ۱۸)

(۲) اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (سورۂ حج پارہ ۱۷)

نزول آیات کلام اللہ سے کوئی پوشیدہ امر نہ تھا کہ جس کا علم معاویہ کو نہ ہوا ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ آیات ان کی نظر سے نہ گذری ہوں یا انھوں نے نہ سنی ہوں اس لئے ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ ضرور معاویہ

...احقہ' اس امر سے واقف تھے کہ خلافت حسب ارشاد جناب باری
...ن لوگوں میں ہو گی اس لئے اگر انعقادِ بیعت نہ بھی ہوتا تب بھی
اگر جناب امیر اپنی خلافت کا اعلان فرماتے اور کوئی دوسرا شخص کہ جسپر
اطلاق ان آیات کا ہو سکے مدعی خلافت نہ ہوتا' تو ایسی صورت میں
بھی معاویہ کو ان آیات کے موافق جناب امیر کو خلیفۂ برحق تسلیم کرنا
چاہئے تھا اس لئے کہ وعدۂ باری تعالیٰ کو حق سمجھنا ہر مسلمان کا فرض اور
ایمان ہے۔ اب ہم معاویہ کے چند واقعات یاد دلا کر بتا دینا چاہتے ہیں
کہ وہ کہاں تک صحابہ جلیل القدر تھے۔ جن کے برحق ثابت کرنے کیلئے
آپ نے اس قدر سعی لاحاصل فرمائی ہے اور ابن تیمیہ وغیرہ کی طرح
حق نمک ادا کرنے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

(۱) جناب امیر اور اہلبیت اطہار پر سب و شتم کا رواج دینا'
(ابو الفدا۔ عقد الفرید و تمدن اسلام تاریخ الامت وغیرہ)
(۲) حضرت امام حسنؑ کو زہر دلوانا اور اس پر اظہارِ خوشنودی
کرنا (استیعاب و مروج الذہب و تاریخ الخمیس و روضۃ الصفا
طبری۔ و طبقات ابن سعد وغیرہ) (۳) عبد الرحمٰن ابن خالد و
مالک ابن اشتر کو زہر دلوانا (عیون الانبیاء۔ روضۃ الصفا۔
تذکرۃ الکرام و خلفاء راشدین۔ مصنفہ مولوی شاہ معین الدین
ندوی وغیرہ) (۴) حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کو شہید
کر ڈالنا۔ (طبری و ابو الفدا و روضۃ الصفا و تاریخ الامت وغیرہ)
(۵) ایک شرابی اور فاسق و فاجر کو اپنی جگہ پر مسلمانوں کا حکمران بنانا
(تاریخ الخلفا و روضۃ الصفا) (۶) مسلمانوں پر کھانا اور پانی بند کرنا
(وغیرہ روضۃ الصفا و ارجح المطالب) (۷) آثارِ شریعت کو
مٹانے کی ہر امکانی کوشش کرنا اور بدعتوں کا رائج کرنا (ملاحظہ
ہو مندرجہ بالا کتب تاریخ و سیر)۔

تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ جنگِ صفین کے بعد معاویہ یہ شاید
بھول گئے تھے کہ حضرت عثمانؓ کوئی شخص بھی تھے یا نہیں۔ اور
انھیں لوگوں نے شہید بھی کیا تھا کہ نہیں۔ اگر معاویہ کی مراد جنگِ
صفین سے طلبِ قصاص ہوتی تو وہ اپنے زمانۂ حکومت میں ضرور
امکانی کوشش قاتلین کو سزا دینے کی کرتے۔ حضرت عثمانؓ کے قتل
سے معاویہ کی امارت تک چھ برس سے زائد کا زمانہ نہیں گذرا تھا۔
یہ کہنا کہ اس مدت میں قاتلینِ حضرت عثمان سب ختم ہو چکے تھے

بالکل لغو اور خلاف قیاس بات ہے جس کا کوئی ثبوت تاریخ میں
موجود نہیں اور مولانا آپ نے بھی اس پر سکوت ہی فرمایا ہے
ہے کوئی آپ کے پاس اس کا جواب؟
معاویہ نے جو خطبہ مدینہ طیبہ میں دیا تھا اس میں انھوں نے
کہا تھا کہ "میں دنیا کی طرف مائل ہوا اور وہ میری طرف جھک
پڑی میں اس کا بیٹا ہوں اور وہ میری ماں"۔ (عقد الفرید)
معاویہ کے تمام افعال خواہ وہ بعد جنگ صفین ہوں یا جمل صرف
ایک ہی اصول کے ماتحت سمجھ میں آسکتے ہیں کہ وہ بالکل سیاسی
انسان تھے اپنے مقاصد کے حصول میں انھوں نے کبھی کسی امر کو
مانع و حارج نہیں ہونے دیا۔ جس امر اور جس شخص کو وہ اپنی خواہش
حکومت میں خارِ راہ سمجھتے اس کو انھوں نے ہر ناجائز طریقہ سے
ہٹانے کی کوشش کی۔ معاویہ پکے دنیادار آدمی تھے اور انکا مطمح نظر
صرف دنیاوی حکومت تھا اور اس غرض سے انھوں نے کوئی کوتاہی
کسی معیوب سے معیوب فعل کے کرنے میں نہیں کی۔ جب جناب امیرؑ
پر سب و شتم صرف اس لئے جاری کیا گیا تھا کہ جو وقعت مسلمانوں
کے قلوب میں جناب امیرؑ و اہلبیت اطہار کی ہے وہ کم ہو جائے'
اس لئے کہ معاویہ اس امر کو بخوبی جانتے تھے کہ بنی امیہ کی حکومت
کے استقلال کے لئے یہ ضروری امر ہے کہ عوام کے قلوب سے وہ
وقعت اور عزت جو اہلبیت اطہار کی ہے محو کر دی جائے۔ تاکہ
عوام کو کوئی ہمدردی کسی قسم کی جناب امیرؑ و اہل بیت اطہار سے
باقی نہ رہے۔ خود معاویہ کا یہ فعل کہ وہ جناب امیر سے طالب قاتلین
حضرت عثمانؓ تھے اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ معاویہ جناب امیر کو
خلیفۂ برحق سمجھتے تھے' ورنہ بجائے جناب امیرؑ کے انھوں نے کسی اور
سے یہ مطالبہ کیوں نہ کیا؟ اس شخص کی خلافت منعقد نہ ہونے کا
قائل ہونا اور پھر اسی شخص سے بہ حیثیت خلیفہ طالب قاتلین حضرت
عثمانؓ ہونا صریحی نفسانیت نہیں تو اور کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس
صورت کے لئے بھی کوئی بڑا شاندار جھوٹ متوسلین بنی امیہ کو
وضع کرنا پڑے یا کوئی لغو تاویل پیش کی جائے اور یہ سب
مولانا آپ جیسے افراد سے بعید نہیں۔
حضرت عائشہؓ کو دھوکا دیکر کنویں میں گروانا دحبیب السیر
و مناقب مرتضوی مؤلفہ حکیم سنائی ترجمہ)

تاریخ ابن خلدون میں معاملہ استخلاف یزید میں مروان کا حضرت عائشہؓ کو دعوت کے لئے بلوانا اور گڑھے میں آلاتِ حرب بچھانا جس کے صدمہ سے حضرت عائشہؓ کا وفات پانا مذکور ہے۔ یہ واقعہ بھی زمانہ سلطنت معاویہ کا ہے۔

فخر الاسلام حسن نیروری لکھتے ہیں کہ معاویہ خلفاء میں نہیں تھے ملوک کے زمرے میں تھے اس حدیث کی بناء پر کہ آنحضرت نے فرمایا تھا کہ خلافت میرے بعد تیس برس تک رہے گی۔ پھر ایک درندہ بادشاہ ہوگا تیس برس حضرت امام حسنؑ کی صلح تک پورے ہو چکے۔ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ علماء کا قول یہی ہے۔ اب فرمائیے مولانا بھٹکنے کا کہیں آپ کو راستہ ہے؟

اور یہ وہم کہ عوام کے قلوب سے وہ وقعت و عزّت جس کے اہل بیت اطہار مستحق تھے اور ہیں، ہوا کر دی جائے اب تک برابر جاری ہے۔ معاویہ کی بحث تجلّی کے پرچہ میں اسی جذبے کے ماتحت ہے۔ مولانا آپ کو خواہ کتنا ہی بُرا معلوم ہو لیکن جس کو پروردگار عالم نے ہر طرح کی عزّت و وقار سے اور تمام اُمّت سے بعد رسول افضلیت دی ہے اس کو آپ اس کے منصب سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے چاہے آپ کی عمر حضرت نوحؑ کی برابر کیوں نہ ہو جائے۔ جب آپکے ولی نعمت برسوں کوشش کر کے بھی کامیاب نہ ہو سکے تو آپ کس شمار و قطار میں ہیں۔ جان بوجھ کے گمراہ ہونے اور دوسروں کو گمراہ کرنے سے فائدہ! جانتے ہیں آپ دوسروں کو راہ راست سے گمراہ کرنے والے کو کیا کہا جاتا ہے؟ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

حق مع العلی۔ حق علی ہی کے ساتھ رہے گا۔ معاویہ اس ذمہ سے بری نہیں ہو سکتے جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے۔ آپ سورج پر خاک ڈالتے رہیئے کوئی فائدہ نہیں۔ اہلِ تشیع کو تو آپ حضرات غلو کا فتویٰ دینے میں بہت کاریگر ہیں مگر جناب نے تو معاویہ کو تمام برائیوں سے بری الذمہ قرار دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ خود غلو کی منزل سے بھی آگے بڑھ گئے۔ مگر آپ بھی مجبور ہیں، معاویہ کی محبت آپ کو اسی طرح راہ راست پر نہیں آنے دیتی جس طرح بقول معاویہ کے اس کے رسوائے عالم فرزند یزید کی الفت خود اس کے لئے سدِّ راہ ثابت ہوئی۔

اب رہا تاریخی معاملہ جس پر تمام واقعات کا انحصار ہے، اس کے متعلق آپ نے بغیر ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ شیعی ذہن نے وہ سب کچھ جمع کر دیا ہے جس کے بل پر جس کو جوش اُٹھے معاویہ اور ان کے حامیوں کو غدار، لالچی، غلط کار، دنیا پرست اور فاسق جو چاہے ثابت کرتا چلا جائے۔ حقیقت میں وہ مستحق انہی الفاظ کے ہیں جو آپ کے قلم سے نکلے ہیں اور یہ اہلبیت اطہار کا معجزہ ہے جو یہ الفاظ آپ جیسے معتقدین کے قلم سے اُن لوگوں کے لئے نکلا کرتے ہیں۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔ پیشِ خدا آپ سے اس کا مواخذہ کیا جائے گا کہ آپ نے ایسے جلیل القدر صحابی کی شان میں ان الفاظ کو کیوں استعمال کیا۔ آپ کو ذرا سا بھی خوف نہ معلوم ہوا اور نقل قول کے طور پر سہی آپ کا قلم ذرا نہ جھجکا۔ یہ بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے۔

اب ذرا مہربانی فرما کر ان تاریخوں کا نام بتلا دیجئے جو شیعی ذہن سے ملوّث نہ ہوتی ہوں۔ آپ نے تو ان کا مطالعہ کیا ہی ہوگا مجھ کو بھی موقع مل جائے اور میں اپنے ذہن سے امور بالا کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دوں اور ان کی روشنی میں کوئی فیصلہ کروں۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ تاریخیں ایسی ہوں جو عالم کی نگاہ میں مستند ہوں۔ محض آپ کے لکھ دینے سے کہ تاریخیں شیعی ذہن سے متاثر ہیں، ایک پڑھا لکھا آدمی بہوش و حواس مطمئن نہیں ہو سکتا۔ آپ کی دیانت داری کا تقاضا ہے کہ آپ اس مضمون کو اپنے رسالہ میں ضرور جگہ دیں گے تاکہ ناظرین کرام کو تصویر کے دونوں رُخ دیکھ کر فیصلہ کرنے کا موقع ملے۔ ابن حجر مکّی، محمد ابن جریر طبری، ابن ماجہ اور ان کے قبیل کے دوسرے علماء آخر کچھ عقائد کے مالک تھے یا نہیں ان علماء کو آپ شیعہ تو نہیں کہہ سکتے۔ پھر آخر انھوں نے اپنی کتابوں میں معاویہ کے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے انکار کیوں؟ حسن بصری کا قول کہ معاویہ میں چار ایسی خصلتیں تھیں جن میں سے ایک بھی اس کی عاقبت خراب کر دینے کیلئے کافی تھی (رفع الحجاب مولوی محمد ایوب صاحب وکیل گونڈہ) کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

معجزہ تو اسے کہتے ہیں کہ باوجود برسوں ہزاروں ممبر و منبر پر اہلبیت رسول پر سب و شتم ہونے کے بعد بھی آج تاریخیں ان حضرات کے فضائل سے بھری پڑی ہیں اور قضا و قدر کے سامنے دشمنانِ اہلبیت کی ایک نہیں چل سکی۔ مولانا آپ دشمنِ اہلبیت کی عینک لگا کر واقعات کا مطالعہ کرتے رہیں۔ مگر آپ ان حضرات کا کچھ بگاڑ نہیں۔ اس زمانہ میں لوگوں کو دھوکہ دینا آسان نہیں ہے۔ کاش آپ کا مسخ شدہ ضمیر آپ کو راہِ حق دکھا سکتا اور آپ دوسروں کے گمراہ کرنیکے گھناؤنے

نقل سے باز رہ سکتے۔

گستاخی معاف! چاند پر خاک ڈالنے سے خود اپنا چہرہ گرد آلود ہو جاتا ہے۔ اہلبیت اطہار کے فضائل و مناقب حکومتیں نہ مٹا سکیں۔ آپ بھی کوشش کر دیکھیں۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد
کسے کو پف زند ریشش بہ سوزد

جواب:—

اگر تجلی اکثر و بیشتر آپ دیکھتے رہتے ہیں تو حیرت ہے، بحقیقت آپ کی نظروں سے کیوں پوشیدہ رہی کہ ہمارا روئے سخن آپ حضرات۔ یعنی شیعہ حضرات کی طرف نہیں رہتا، بلکہ سنی حضرات کی طرف رہتا ہے اور اسی لئے بعض ایسے اصول و مسلمات کی روشنی میں ہم گفتگو کرتے ہیں جو سنیوں کے یہاں متفق علیہ ہیں مثلاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا حضرت علیؓ سے افضل ہونا۔ فتح مکہ کے بعد کے ایمان لانے والوں کا ایمان معتبر ہونا وغیرہ ذلک۔ آپ حضرات سے اگر گفتگو ہوتی تو یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اچھے تھے یا برے۔ ظالم تھے یا عادل اور یزید ایسا تھا یا ویسا تھا۔ جو لوگ سرے سے گڑ ادرک ہی کے مٹھاس کے منکر ہوں ان سے گلگلوں کے مٹھاس پر کون گفتگو کرے گا۔ آپ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہی کو ظالم و غاصب قرار دیتے ہیں تو بیچارے معاویہؓ کس شمار میں ہیں۔

شکوہ یہ ہے کہ اپنے موقف و مسلک کا ایمانداری کے ساتھ اظہار کرنے کی بجائے آپ نے نفاق و تصنع کیوں برتا۔ مانا کہ آپ کے یہاں نفاق و تصنع اور مکر و دغا وغیرہ کو "تقیہ" کا ساحرانہ عنوان دے کر جائز و مستحسن بنالیا جاتا ہے، لیکن گفتگو جب ایک سُنّی سے کرنے چلے ہوں تو تقیہ کا موقع نہ تھا۔ اس تقیہ ہی نے آپ کی گفتگو میں ایک صریح تضاد پیدا کر دیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے۔ آپ پہلے شرائطِ خلافت میں ایک شرط بیان کرتے ہیں:—

"اس شخص کا اپنے عہد میں تمام امت سے افضل ہونا۔"

آگے حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:—

"جس کو پروردگار عالم نے ہر طرح کی عزت و وقار سے اور تمام امت سے بعد رسول افضلیت دی ہے اسکو آپ اس کے منصب سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

اس طرح بات بالکل صاف ہو گئی کہ آنجناب شیعیت کے اسی معروف و معلوم عقیدے کے حامل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کے اصلی مستحق حضرت علیؓ ہی تھے۔

لیکن ساتھ ہی اپنے خط کے ابتدائی حصہ میں آپ لفظِ خلافت کی بحث میں یہ الفاظ بھی لکھتے ہیں کہ:—

"جو منشا اس لفظ کا آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں رہا ..."

یہ "خلفائے راشدین" چہ معنی دارد؟ —— اگر واقعی حضرت علیؓ رسول اللہؐ کے بعد افضل الامت تھے اور بقول آپ کے ایسا ہی شخص خلافت کا حق دار بھی ہے تو آن لوگوں کو "خلفائے راشدین" آپ کس منہ سے کہہ رہے ہیں، جنھوں نے بعد الرسول مسندِ خلافت پر تمکن فرمایا اور اصل مستحق کو نظر انداز کر گئے۔ انھیں تو وہی تحقیر آمیز اور ذلت انگیز خطابات دینے چاہئیں جو آپ کے ہم مسلک لوگ برسرِ محراب و منبر دیتے چلے آئے ہیں۔ اگر یہ تقیہ اور دوغلاپن نہیں اور سچ مچ آپ پہلے تینوں خلفاء کو راشدین ہی گمان کرتے ہیں تو اپنے ذہنی تضاد و فساد کا علاج کرائیے۔

تماشے کی بات ہے کہ "خلافت" کے لئے آپ قرآن و حدیث کی دلیلِ صریح کے بغیر ہی جو چاہے شروطِ مخصوصہ اس انداز میں بیان فرماتے چلے جاتے ہیں گویا یہ تو مسلّمات و بدیہیات میں سے ہیں۔ حالانکہ اکثر ان میں کی من گھڑت ہیں۔ ایک ایک پر کلام کر کے ہم وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ صرف دو مقامات قرآن میں سے ناظرین کے آگے رکھنا چاہتے ہیں۔

اوّلاً سورۂ بقر کا رکوع چہارم۔

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتے بولے کہ کیا آپ اس فتنہ پرداز مخلوق کو خلیفہ بنانا پسند فرما رہے ہیں جو زمین میں فساد برپا کرے گی اور خون بہائے گی۔ درانحالیکہ ہم تو ہر دم آپ کی حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔ پروردگار نے جواب دیا، تم کچھ نہیں جانتے ہمیں ہی سب معلوم ہے۔

اس کے بعد اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے اور پھر یہی چیزیں فرشتوں کے روبرو کرکے پوچھا۔ اے فرشتو! اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ! ۔۔۔۔۔ فرشتے لاجواب ہو کر بولے۔ پاک ہے اے پروردگار تیری ذات۔ واقعی ہمیں ان چیزوں کے نام معلوم نہیں۔"

اس رکوع کو تھوڑا اور آگے تک پڑھ لیجئے۔ صاف طور پر معلوم ہوجائے گا کہ "خلافت" کے لئے زہد و عبادت، طاعت و تقویٰ اور دوامی نکوکاری کو ہرگز ہرگز اساسی و کلیدی اہمیت حاصل نہیں ہے، بلکہ زبردست کلیدی اہمیت "علم" کو حاصل ہے اور علم کا دائرہ قرآن و حدیث ہی کی روشنی میں فراست، معاملہ فہمی، تدبر، تفقہ، سیاست دانی اور بالغ نظری تک پھیلا ہوا ہے۔ زہد و طاعت ہی اگر کسی کو مستحق خلافت بنا سکتے تو فرشتوں پر اللہ میاں کی ڈانٹ نہ پڑتی۔ دیکھ لیجئے اللہ میاں نے فرشتوں کے اس اعتراض کی بھی تو تردید نہیں کی کہ اولادِ آدم زمین میں فتنہ و فساد برپا کرے گی، بلکہ اعتراض سے اغماض برتتے ہوئے تسلیم ہی کر لیا کہ ہاں وہ ضرور فتنہ و فساد برپا کرے گی مگر "خلافت" کا مدار مجسمۂ خیر ہونے پر نہیں "علم" پر ہے!

دوسرا مقام اسی سورۂ بقر کا تینتیسواں رکوع ہے:۔

جب بنی اسرائیل نے اپنے نبی (شموئیل علیہ السلام) سے درخواست کی کہ ہمارے لئے کوئی بادشاہ مقرر کر دیجئے تو نبی نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہنے لگے۔ ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کے پاس تو پیسہ ویسہ کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ تو خود ہمیں حکومت کے مستحق ہیں۔ نبی نے جواب دیا۔ اللہ نے تو اسی کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے۔

کیوں منتخب فرمایا ہے؟ اس کی دلیل نبی نے یہ نہیں دی کہ وہ آج کی دنیا میں سب سے بڑا نکوکار، متقی، زاہد و عابد اور افضل و اصلح ہے بلکہ دلیل دی:۔

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔	اور زیادہ فراخی دی ہے اللہ نے اسے علم اور جسم میں!

یہ دلیل خود باری تعالیٰ کی بیان فرمودہ ہے جس کا مطلب ہے کہ غبار سے بالاتر ہے۔ ویسے بھی اگر باعتبار مقاماتِ روحانی کے افضل و اعلیٰ ہونا دلیلِ خلافت و بادشاہت ہوتا تو خود نبی ہی کو خلیفہ بن جانا چاہئے تھا، لیکن دیکھ لیجئے اللہ نے طالوت کو خلیفہ بنا دیا اور اس لئے بنا دیا کہ اسے علم اور قوت مادی زیادہ دی گئی تھی۔

اِن آیاتِ صریحہ سے جو بنیادی نقطۂ نظر ہاتھ آتا ہے اسے دبانے اور مٹانے کے لئے کوئی کتنے ہی ظاہر فریب اور دیدہ زیب اصول بنالائے کوڑی بھر وقعت نہیں رکھتے۔

نمبر دیگر جو دو آیتیں آپ نے دی ہیں وہ بھی آپ کے حق میں مفید نہیں۔ جو کچھ ان کے ذریعہ ثابت فرمانا چاہتے ہیں وہ بھی دُور از کار ہی ہے۔ چونکہ آپ نے محض اجمالی ذکر پر اکتفا کیا اور واضح استدلال نہیں فرمایا اس لئے ہم بھی تفصیل و تشریح کی زحمت نہیں اُٹھاتے۔ ہاں یہ ضرور کہیں گے کہ جو شخص آیاتِ قرآنیہ کے حوالے سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا وعدۂ باری تعالےٰ تھا اور انھیں خلیفہ تسلیم نہ کرنا قرآن کو جھٹلانا ہے وہ اسی طرح ناقابلِ التفات ہے جس طرح مجنوں اور مجذوب۔ بھلا حد ہے اس جرأتِ رندانہ کی کہ لوگ بانگ نعوذ باللہ اپنے منھ کی بات اللہ کے منھ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مکروہ جرائم کی جو فہرست آنجناب نے نمبر دا میں پیش کی ہے ان پر علمائے سلف میں بہت بحثیں ہو چکیں۔ جن کتابوں کے آپ نے نام لکھے وہ قرآن کی طرح بے ریب ہیں نہ حدیث کی طرح حجت ۔۔ ان میں سے ہر ایک پر فرداً فرداً تو وہی بحث کرے گا جسے اس کے لئے ضخیم کتاب لکھنی ہوگی۔ ہم تو صرف یہ اصولی بات جانتے ہیں کہ دو خاندانوں کی معروف آویزش نے شروع ہی سے تاریخ کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور بعد میں ہزار کتابیں بھی لکھی جائیں تو ان سے ریب و تشکیک کی وہ دھند نہیں مٹ سکتی جس کے مٹے بغیر عقیدے اور یقین و وثوق کی عمارت نہیں اٹھ سکتی۔

حضرت معاویہؓ قاتلینِ عثمانؓ کو کہاں سے سزا دیتے۔ کیا کسی کی پیشانی پر لکھا تھا کہ "یہ قاتلِ عثمان" ہے یا معاویہؓ کو از روئے وحی معلوم ہوجاتا کہ فلاں فلاں بالیقین شریکِ سازش تھا۔ حضرت علیؓ سے مطالبۂ قصاص کے معقول وجوہ تھے جنھیں ہم ماضی قریب میں مفصلاً سپردِ قلم کر چکے ہیں۔ رہا یہ منطقی استدلال کہ حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ سے قصاصِ عثمانؓ طلب کرنا ہی اس بات پر شاہد ہے کہ وہ انھیں خلیفہ برحق سمجھتے تھے تو جنابِ والا اس سے تو معاویہؓ کی بلندی

ادراً آنجناب کے موقف کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے فضائل کی طرف سے حضرت معاویہؓ کی آنکھیں بند نہیں تھیں، وہ انھیں خلافت کے لئے نااہل نہیں سمجھتے تھے البتہ چونکہ قانونِ شریعت کے دلدادہ، انصاف کے شیدا، قرآن کے متبع اور دین کے حامی تھے اس لئے یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ جو شخص مسندِ خلافت پر جلوہ آرا ہو رہا ہے اور بیعت و اطاعت کا طلبگار ہے وہ قرآن کے حکمِ صریح کو نظر انداز کر دے اور توجہ دلانے پر ایسا جواب دے جس سے بدگمانیوں کو تقویت پہنچے۔

یہ ہم حضرت معاویہؓ کے نقطۂ نظر سے کہہ رہے ہیں ورنہ ہماری پچھلی بحثوں سے ہر شخص کو ہمارا ذاتی یقین معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت علیؓ شہادتِ عثمانؓ میں شریک نہیں تھے۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ مشیت کے پیدا کردہ حالات میں حضرت معاویہؓ اور اہلِ شام کے لئے ناگزیر طور پر ایسے اسباب و وجوہ پیدا ہو گئے تھے کہ قصاص عثمانؓ کے لئے ان کا بے چین ہو جانا اور حضرت علیؓ کے جواب کو حیلے بہانے پر محمول کرنا قدرتی اور فطری ہی تھا۔ آج سیکڑوں برس بعد بے جان کاغذ پر بے جان حرفوں کے ذریعہ واقعاتِ ماضی کا پڑھ لینا اور رقیبانہ جانبداریوں کے ساتھ فیصلے دے دینا بہت آسان ہے، لیکن جب آدمی خود جھمیلوں میں پھنستا ہے اور تلخ حقائق کے ناخن اس کے سینے میں پیوست ہوتے ہیں اس وقت پتا چلتا ہے کہ کس کے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

ہو سکتا ہے آپ کے نزدیک ایک خلیفۂ برحق کیلئے آئین و دستور اور قرآن و حدیث کی مکمل پابندی ضروری نہ ہو، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اسلام کی تعلیم دی تھی اس میں تو ایسی چھوٹ کہیں نہیں۔ اس میں تو رسولؐ کی بیٹی بھی اگر جرم کرے تو رسولؐ ہی فرماتے ہیں کہ اسے سزا دی جائے گی۔ معاویہؓ اور بے شمار لوگ اگر یہ دیکھ رہے تھے کہ قصاصِ عثمانؓ کے عینِ حق مطالبے کا جواب نئے خلیفہ کی طرف سے اطمینان بخش نہیں مل رہا ہے، بلکہ اُلٹا وہ طالبینِ قصاص ہی کو معزول و حقیر کر دینے پر آمادہ ہیں تو کس طرح وہ بیعت کے لئے ہاتھ بڑھاتے اور کیوں اپنی ذلت و مغلوبیت کے محضر پر خود ہی دستخط کر دیتے۔

کمال ہے آپ بھی "تیس برس خلافت رہنے" کی روایت پر اظہارِ اطمینان فرما رہے ہیں، حالانکہ آپ کے نقطۂ نظر سے تو ایک دن بھی خلافتِ راشدہ نہیں رہی۔ تین دن کیا تین منٹ بھی نہیں۔ رسول اللہؐ کے فوراً بعد حضرت علیؓ ہی خلیفہ بن جاتے تو بات بنتی۔

فخر الاسلام حسن بزدوی، حافظ سیوطی، ابن حجر مکی، ابن جریر طبری، ابن ماجہ اور ان جیسے بیس مزید نام کوئی لکھ دے جب بھی کسی ایسے قضیے کا دوٹوک فیصلہ نہیں ہو جاتا جس کی بنیاد ہی میں کوئی سقم پایا جا رہا ہو۔ خشتِ اول ٹیڑھی رکھی جائے تو اوپر چاہے کتنے ہی صالحین و مبصرین اینٹیں چنتے چلے جائیں دیوار ٹیڑھی ہی جائیگی۔

سوال یہ ہے کہ آج اگر دو بڑی شخصیتوں میں جنگ ہو اور دونوں ہی فریقوں کے متشدد حامی ایک دوسرے کے خلاف جی بھر کے ہفوات و مکذوبات پھیلا دیں تو ظاہر ہے پوست کندہ حقائق تو ہمیشہ کیلئے دفن ہو جائیں گے اور آنے والے مورخوں کو جو سرمایہ ملے گا وہ محرّف اور فاسد ہی ہوگا۔ اب ان مورخوں میں چاہے کتنے ہی بڑے بڑے علماء و فضلاء موجود ہوں، لیکن ان کا علم و فضل اُن مدفون حقائق کو تو عدم کی لحد سے نکال کر نہیں لا سکتا جو پہلے ہی گہرے دفن ہو چکے ہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ مؤرخین تحقیق و تعمق کے بعد جن روایا کو اصح اور قرینِ قیاس ٹھہرائیں ان کے بارے میں ہم بھی گمان کر لیں کہ درست ہو سکتی ہیں۔ ان سے اگر قرآن و حدیث کے عطا فرمودہ کسی عقیدے اور تصور کی تردید و تنقیص نہ ہوتی ہو تو ان پر یقین کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر کوئی شخص غور و فکر کے بعد دیانت کے ساتھ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں روایت قرآن و حدیث سے ٹکر کھا رہی ہے تو اسے نہ صرف حق ہے بلکہ اس پر واجب ہے کہ اس کو قبول نہ کرے۔ آخری اور فیصلہ کن بات یہ ہے کہ ان مشکوک چیزوں کا تعلق دین و ایمان سے کچھ نہ ہونا چاہئے اور اختلافات بس نظری و علمی ہی حدود تک رہنے چاہئیں۔ لعنت وہاں سے شروع ہوتی ہے جب ان چیزوں کو ایمان و عقائد کی بنیاد بنا کر دینی اصطلاحوں میں گفتگو شروع ہو جاتی ہے اور کفر و اسلام کے تحفے بٹنے لگتے ہیں۔

آخر میں آپ نے "اہل بیت" کے تعلق سے جو کچھ کہا وہ "نعرہ بازی" کے انداز کا ہے۔ اہل بیت کی عزت و حرمت ہمارے قلب میں بھی ہے اور جو شخص اہلبیت سے بغض و عناد رکھے اسے عذابِ آخرت کا مستحق سمجھتے ہیں، لیکن عزت و حرمت کو ہم نے رہبر کی طرح

... کر دیں سے حکم یہ نہیں بنڈہ لیا ہے۔ حرمت و عزت اپنی جگہ ہے اور دیگر مسائل اپنی جگہ۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ایک یہودی کے بالمقابل حضرت علیؓ کے حق میں قاضی نے ان کے بیٹے کی گواہی نہیں مانی تھی ـــ آپ وہاں ہوتے تو شاید قاضی کے سر پر اینٹ ملتے اور پکار پکار کے کہتے کہ لوگو دیکھو اس گستاخ کو اس نے حضرت امیر کے دعوے پر گواہی طلب کی ہے گویا کہ اس کے نزدیک حضرت موصوف جھوٹ بھی بول سکتے اور غلط دعوے بھی کر سکتے ہیں۔ دوسرے اس نے یہ غضب ڈھایا کہ آپ کے عالی مقام صاحب زادے یعنی رسول اللہؐ کے پیارے نواسے کی گواہی رد کر دی حالانکہ یہ وہم بھی فسق و زندقہ سے کم نہیں ہے کہ علیؓ کا بیٹا اور رسول اللہؐ کا نواسہ غلط گواہی دے سکتا ہے۔ تیسرے یہ اندھیر دیکھو کہ یہ سب کچھ ایک یہودی کافر کی خاطر کیا گیا ہے۔

کہیے نا آپ یہی ؟

اب اس کو کیا کہیئے کہ اسلام نے تو ایسے ہی بے لاگ عدل کا سبق دیا ہے اور اسی لئے قاضی مذکور کا فیصلہ نہ تو اس وقت کے اربابِ نظر میں گستاخی ٹھیرا نہ خود حضرت علیؓ اسے شرارت آمیز قرار دے سکے۔ قانون قانون ہے اور انصاف انصاف۔ آپ حضرات محبتِ اہلِ بیت کو ایک عجیب طرح کا ہمہ گیر فارمولا بناکر پورے دین و شریعت کو اسی کے محور پر گردش دینے کی سعی فرماتے ہیں اور اس طرح مختلف علمی و تاریخی اور دینی و دنیاوی مسائل اپنے اپنے خانوں سے نکل کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ علم، استدلال، عدل، بے تعصبی اور دیانت سب کا مُثلہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

مشرکیات

سوال ۱۲:- نامعلوم الاسم۔ حیدر آباد (دکن)

یہاں سے ایک صاحب نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر جاکر مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔ براہِ مہربانی ان اشعار کا مفہوم سمجھایئے اور یہ اسلام کی کن کن تعلیمات و اعتقادات سے براہِ راست ٹکراتے ہیں؟ نیز ایسے شخص کے متعلق شریعت کیا کہتی ہے؟ ایسے شخص کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں؟ اشعار یہ ہیں:-

سرورِ دلِ مصطفےٰ غوث اعظم + تجلیِ نورِ خدا غوث اعظم
بھلو کی تو ہوتی ہے ساری خدائی + بُروں کو بھلا کیجئے یا غوث اعظم
کہاں چھوڑتے ہیں گنہگار دامن + کہ وابستہ تیرے ہیں یا غوث اعظم
اغثنی اغثنی اغثنی اغثنی + مدد اپنے خادم کی یا غوث اعظم
نورِ الٰہی نورِ محمد نورِ محمد باد + نورِ عینیں نورِ محی الدین عبدالقادر جیلانی
باغِ رسالت زینت گلشن اہلبیت اطہار + پھول نہیں پھول محی الدین عبدالقادر جیلانی

مہربانی فرماکر ضرور تجلی کی قریبی اشاعت میں جواب دیجئے۔ بہت سے حضرات کو فائدہ ہوگا۔

جواب:-

مجرد یہ بات ہی ہمارے نزدیک دینی تعلیمات کے خلاف ہے کہ آدمی قبر پر نثر یا نظم میں طلبِ امداد کرے۔ قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے سوا اور کوئی ہدایت قرآن و سنّت سے نہیں ملتی۔ پھر طلبِ امداد کے الفاظ اگر غیر محتاط اور مبالغہ آمیز ہوں تو قباحت اور بڑھ جاتی ہے۔

نقل کردہ اشعار کا مطلب خود انھی لوگوں سے پوچھیئے جو انھیں پڑھتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں تو یہ ایسی تُک بندیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں جن کے پیچھے فاسد تصورات و معتقدات کام کر رہے ہیں۔ چلئے مطلب بھی دیکھ لیجئے:-

سرورِ دلِ مصطفےٰ غوث اعظم

اس کا کوئی حقیقی مفہوم تصور میں نہیں آتا۔ بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاہ جیلانیؒ چونکہ بہت بڑے بزرگ تھے اور اس طرح کی ہستیاں اللہ کے رسول کو محبوب ہیں لہٰذا "سرورِ دلِ مصطفےٰ" کہدیا گیا ـــ لیکن اس صورت میں شاہ صاحبؒ ہی کی کوئی خصوصیت نہیں رہتی۔ حضرت ابوبکرؓ سے لیکر آج تک کے تمام صالحین کے لئے یہی استعارہ بولا جاسکتا ہے۔

تجلیِ نورِ خدا غوث اعظم

اس مصرعہ کی تخلیق میں شاعر کی یہ تمنا کام کر رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح شاہ صاحبؒ کو اللہ کی صف میں لے آیا جائے ـــ ویسے بطور تاویل کہہ سکتے ہیں کہ "تجلی" سے مراد "مظہر" ہے یعنی شاہ صاحبؒ نورِ خدا کا مظہر تھے۔ یہ تاویل اس مفہوم میں تو ٹھیک ہے جس مفہوم میں قرآن "آیاتِ الٰہی" کا ذکر کرتا ہے۔ یا جس مفہوم میں ہم یوں کہتے ہیں کہ یہ چاند یہ سورج یہ ستارے یہ زمین و آسمان یہ سمندر یہ پہاڑ خدائے برتر کی صنعت و قدرت اور عظمت و شوکت کے مظہر ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ شریعتِ نبوری کے

دل۔ اذکان اس طرح کے صاف وسادہ مفاہیم سے دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ ان کے ذہنوں میں تو شاہ صاحبؒ اور دیگر اولیاء اللہ کیلئے اور ہی قسم کے پر اسرار تصورات جاگزیں ہیں۔ بہرحال یہاں "تجلی نورِ خدا" کے جو بھی معنی ایسے لئے جاسکیں جو شریعت کی رو سے درست و جائز ہوں ان کے دائرے میں تمام انبیاءؑ تمام صحابہؓ تمام صلحاء آجاتے ہیں۔ شاہ صاحب کی کوئی خصوصیت نہیں رہتی۔

بُرے کو بھلا کیجے یا غوث اعظم

شاہ صاحبؒ صدیاں گذریں دارِ فانی سے رخصت ہوگئے وہ جب تک زندہ تھے بیشک انھوں نے لاتعداد انسانوں کو بُرائی کی دلدل سے نکال کر صراطِ حق پر گامزن کیا۔ قول و عمل سے تعلیمِ حق دی اور ان کی تبلیغ و ارشاد کا فیض خوب خوب جاری ہوا۔ لیکن اپنی مدتِ حیات ختم کرنیکے بعد وہ نہ کسی بُرے کو بھلا بناسکتے ہیں نہ کسی کی کوئی مدد کرسکتے ہیں۔ "بُرے کو بھلا کرنا" تو ویسے بھی جاہلانہ طرزِ کلام ہے۔ کہنا یوں چاہئے کہ:۔

"ہم بُرے ہیں لیکن ہمیں بے یار و مددگار مت چھوڑیئے۔
ہم سے مُنھ نہ موڑیئے وغیرہ"۔

لیکن کس سے کہنا چاہئے ۔۔۔ ؟ مرحوموں سے ! ۔۔۔ جی نہیں زندوں سے۔ یہ بات کوئی سیاہ کار آدمی ایک زندہ مرشد سے تو کہہ سکتا ہے اور اس کا مقصود صرف یہ ہوگا کہ میں اپنی سابقہ بداعمالیوں سے توبہ کرتے ہوئے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اعمالِ نیک کی تعلیم دیجئے اور صفائیِ باطن کے طریقے بتایئے۔ یہ مردہ بزرگوں کی قبروں پر آوازیں لگانا دعائیں کرنا اور مدد مدد پکارنا اپنی حقیقت اور آئیڈیالوجی کے اعتبار سے کم و بیش ویسا ہی عمل ہے جیسا بت پرست لوگ دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کے آگے کرتے ہیں، بلکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے بت پرستوں کا نظریہ یہ نہیں ہوتا کہ یہ پتھر کے بُت بھگوان ہیں، بلکہ وہ ان بتوں کو بھگوان کا تصور کرنے اور دھیان جمانے کا ایک درمیانی واسطہ خیال کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف قبر پرستوں کا گمان یہ ہوتا ہے کہ اہلِ قبور فی الحقیقت زندہ ہیں اور ایسی عجیب و غریب طاقت قدرت انھیں حاصل ہے کہ نہ صرف ہمارے ارادوں اور خواہشوں سے باخبر رہتے ہیں، بلکہ انھیں پورا کرنے نہ کرنے کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ گمان ۔۔۔ جو عقیدۂ راسخہ کی شکل اختیار کرچکا ہے بُت پرستوں کی منطق سے بھی گیا گذرا ہی ہے۔

کہاں چھوڑتے ہیں گنہگار دامن
کر وابستہ تیرے ہیں یا غوث اعظم

اس کا حقیقی مطلب کچھ بھی نہیں۔ کھینچ تان کے جو چاہے کہہ لو۔

اغثنی اغثنی اغثنی اغثنی

یہ طلب امداد کی رَٹ ایک ایسے بزرگ کی قبر پر جسے مرے صدیاں گذر گئیں اُنھی لوگوں کے لئے قابلِ فہم ہوسکتی ہے جن کی عقلِ سلیم تو ہم کیشی و عجوبہ پرستی سے فاسد ہوگئی ہو۔ عالمِ اسباب کی حد تک ہر شخص دوسرے شخص کی مدد کرسکتا ہے، لیکن جب عالمِ اسباب سے معاملہ گذر گیا تو سوائے خدائے واحد القہار کے اور کوئی معین و مددگار نہیں۔ آخری رسولؐ نے، سابق انبیاءؑ نے، صحابہؓ و تابعین نے، علماء و اتقیاء نے، ائمہ و فقہاء نے صراحت و تاکید کے ساتھ یہ اور صرف یہ ہدایت کی ہے کہ غائبانہ مدد اللہ ہی سے مانگو، کیونکہ اللہ ہی ہے جو ہر جگہ موجود ہر خفی و عیاں کو جاننے والا ہر شے پر قادر اور ہر ذی روح کا پروردگار ہے۔

نورِ الٰہی نورِ محمد نورِ محمد یاد
نور ہمیں نورِ محی الدین عبدالقادر جیلانی

سوائے اس کے کہ شاہ جیلانیؒ کو اللہ میاں کی لائن میں لانے کا جو کھیل "تجلی نورِ خدا" میں کھیلا گیا تھا وہی شاعر اب بھی کھیل رہا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی منشاء اور مطلب نہیں اس شعر کا۔

نورِ الٰہی کو بعینہٖ نورِ محمد کہنا کھلا شرک ہے، اور الزامِ شرک سے بچنے کے لئے اس کی جو کچھ بھی تاویل کی جائے گی وہ اُسی قسم کی ہوگی جیسی عیسائی حضرات تثلیث کو توحید کا ہم معنی دکھلانے کے لئے کرتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح اللہ کی مخلوق ہیں جس طرح اور مخلوق۔ وہ آدم ہی کی اولاد ہیں اور آدم مٹی اور پانی سے بنائے گئے تھے۔ قرآن نے اگر کہیں آپؐ کو "نور" کہا ہے تو تمام مستند مفسرین اور علماء اس پر متفق ہیں کہ بطور استعارہ کہا ہے نہ کہ اس کے ذریعہ کوئی سائنسی حقیقت بیان کی گئی ہے "نور" قرآن بھی ہے کیونکہ اس سے ہدایت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ احادیثِ صحیحہ بھی "نور" ہیں۔ گویا "نور" بول کر وہ فیضان و افادہ مراد لیا جاتا ہے جو کسی شے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ورنہ جہاں تک نورِ الٰہی کا

تعلق ہے تو قرآن ہی میں دیکھ لیجئے کہ اس کا تو ہلکا سا پرتو بھی پہاڑوں کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو نورِ الٰہی اس مفہوم میں تو کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ نے جس دین کی تعلیم دی وہ اللہ ہی کا دین ہے اور حضورؐ کی تعلیم پر جو چلا وہ اللہ ہی کی تعلیم پر چلا۔ لیکن اس مفہوم کا اظہار اللہ تعالےٰ نے قرآن میں استعاروں اور کنایوں میں نہیں کیا ہے، بلکہ صاف صاف کہا ہے مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بات کہنے کا وہی ڈھنگ پسندیدہ ہے جو غلط اور گمراہ کن تصورات کا محرک نہ ہو۔

پھر "نور" کے کچھ بھی معنی لیجئے یہ کہنا مبالغہ اور غلو ہی ہوگا کہ نوروں میں نور ــــ یعنی سب سے ممتاز اور اصلی نور بس شاہ جیلانی ہی ہیں۔ ہر جائز و معقول مفہوم کے اعتبار سے صحابۂ کرام اور متعدد تابعین شاہ جیلانیؒ سے ارفع و اعلیٰ "نور" قرار پائیں گے۔

پڑھے لکھے ناظرین شاید خفا ہو رہے ہوں گے کہ ہم نے بھی کن عامیانہ باتوں میں وقت کھپایا۔ ہم عرض کریں گے کہ بیشک باتیں تو عامیانہ ہی ہیں، لیکن عجوبہ یہ پیش آگیا ہے کہ ہزاروں پڑھے لکھے دانا و بینا لوگ ان عامیانہ باتوں کے چکر میں پڑ کر عاقبت برباد کئے ہوئے ہیں اور ضرورت ہے کہ انھیں بار بار چونکایا جائے توجہ دلائی جائے۔ مردہ پرستی کی وبا اس بری طرح پھیلی ہوئی ہے کہ اسلام مُردوں کا دین ہو کے رہ گیا ہے۔

سوال ۵ ــــ از محمد مصطفےٰ کمال الدین صدیقی۔ سلطان آباد

مسجد کے معاملات

(۱) تقریباً دو سال ہوئے کہ بغرض تکمیل ضروریات و انتظامات مسجد ایک کمیٹی تشکیل دے کر چندے کا ایک فنڈ بھی قائم کیا گیا۔ ابتدا میں وصولی چندہ کی رفتار خاطر خواہ تھی۔ قیام کمیٹی کے تین ماہ بعد موازنہ مسجد میں متوقع آمدنی کے پیش نظر امامت و مؤذنی و معلمی کے معاوضہ کی گنجائش رکھی جا کر معاوضۂ خدمت ادا کیا جاتا رہا، لیکن سال حال میں غیر معمولی طور پر چندے کی آمدنی متأثر ہوگئی جس کی وجہ سے آمدنی سے زیادہ اخراجات ہونے لگے اور لامحالہ مسلک سال گذشتہ کو متاثر کرنا پڑا۔ چونکہ کمیٹی نے عوام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ محصلہ چندے سے مسجد عالمگیری کو جو دفاتر سرکاری سے چند قدم کے فاصلے پر ہے جس کو اب عیدگاہ سے معنون کیا جاتا ہے اس میں اوقات دفاتر کی حد تک کم از کم ظہر اور عصر کی ادائی نماز کے لئے ضروری تعمیر و ترمیم کرے گی اور جامع مسجد سے ملحقہ آراضی بغرض ضروریات مسجد خریدی گئی اور قبرستانوں کے اطراف خندق کھدوائے گئی، لیکن اب بحالت موجودہ موازنہ میں خسارے کے پیش نظر کمیٹی عوام سے کئے ہوئے وعدوں کی تکمیل سے قاصر ہے۔ اس خصوص میں بعض حضرات نے یہ تحریک پیش کی کہ پیش امام صاحب کو دیگر ذرائع آمدنی کے علاوہ مدرسۂ دینیات سے بھی معاوضہ ادا کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بحیثیت پیش امام وہ ذبیحہ کی آمدنی سے بھی مستفید ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں بچت شدہ چندے کی رقم سے مسجد عالمگیری کی ضروری تعمیر و ترمیم تک اور استحکام مالیہ تک تقریباً تین چار ماہ بلا معاوضہ خدمت امامت انجام دیں تو مناسب ہے، تاکہ اس اثناء میں تعمیری کام انجام پا سکے، لیکن پیش امام صاحب نے کھلے طور پر یہ اعلان کر دیا کہ وہ تیس سال سے بکرے ذبح کر رہے ہیں اس آمدنی کو مسجد سے کوئی تعلق نہیں اور میں بلا معاوضہ نماز نہیں پڑھاؤں گا اور استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ملازم سرکار بلا معاوضہ خدمت اہلکاری انجام دے تو میں بلا معاوضہ خدمت امامت انجام دوں گا، جب کہ امام کا نظریہ یہ ہو کہ وہ صرف پیٹ پالنے کے لئے امامت کر رہا ہے اور پست ذہنیت کا یہ مظاہرہ ہو کہ وہ امامت کے منصبِ جلیل کو بلا معاوضہ ادا نہ کرے گا، بلکہ چند ٹکوں کی خاطر وہ خدا کے سامنے سر جھکائے گا اور ذبیحہ کی آمدنی سے بھی دستکش نہ ہوگا تاکہ دوسرا شخص ذبیحہ کی آمدنی پر اکتفا کرتے ہوئے خدمت امامت انجام دے سکے تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز جائز ہو سکتی ہے؟ کیا ایسی ذہنیت کا امام لائق امامت ہے؟

(۲) خطبے کی کتاب میں اکثر طباعت کی غلطیاں واقع ہوئی ہیں، گو پیش امام صاحب عربی سے ناواقف ہیں لیکن غلطیٔ طباعت کا علم ہونے کے باوجود کسی اہلِ علم سے اس کی اصلاح کی طرف مائل نہیں، ملاحظہ ہوں چند اغلاط ملک الموت کے خطاب ھادم اللذات کے بجائے ھاذم اللذات طبع ہوا ہے۔ سلف صالحین کی پیروی سے متعلق واقتدوا بھداھم کے بجائے واھتدوا طبع ہوا ہے۔ حدیث شریف قدسی فکیف لا یستحیی من شاب فی الاسلام ان یعصی اللہ تعالیٰ میں من شاب کے بجائے من تاب طبع ہوا ہے

ایسی ہی غلطیاں ہیں جن سے نہ صرف معنی میں معمولی تبدیلی واقع ہوتی ہے بلا تغیر فاحش واقع ہو جاتا ہے۔ لیکن امام صاحب اپنی مداہنت کی وجہ سے بعذر ناواقفیت عربی غلط خطبہ پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا تو کیا ایسی صورت میں امام صاحب کا عذر ناواقفیت عربی غلط خطبہ پڑھنے کے جواز کو ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ خطابت کے لائق ہیں؟

۳۔ امام صاحب کی قرأت کی بے اعتدالیوں کے علاوہ امام صاحب کے مذکورہ معلنہ نظریہ اور استدلال کی وجہ سے راقم استفتاء کو موصوف کی اقتداء میں مذکورہ شرعی کوتاہیوں کی وجہ سے کراہت محسوس ہو رہی ہے۔ چنانچہ راقم نے دو تین جمعہ ترک کر کے مکان میں ظہر پڑھ لی۔ لیکن بعض حضرات کو یہ اعتراض ہے کہ کم از کم جماعت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے شریک جماعت ہو کر بعد میں ظہر پڑھ لی جائے۔ کہاں تک درست ہے؟ جبکہ بموجب حدیث تحریم ابوداؤد لا تقبل الله صلاة من تقدم قوماً وهم له كارهون

۴۔ بعض حضرات کا یہ اعتراض بھی ہے کہ بکرے وغیرہ ذبح کر کے قصابوں سے معاوضہ لینا منصب امامت کی بلاشبہ شان کے مغائر ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

۵۔ مسجد کمیٹی نے اپنی روئیداد میں تعمیر مسجد عالمگیری کو موخر بتلا کر دیگر امور یعنی قبرستان کے اطراف خندق کھدائی اور مسجد کے لئے آراضی زراعتی کی خرید کو مقدم بتلا کر تعمیر مسجد عالمگیری سے گریز کر رہی ہے۔ حالانکہ دو سال سے نہ تو قبرستان کے اطراف میں خندق کھدائی گئی اور نہ بحالت موجودہ کوئی آراضی بیع ہو رہی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ کمیٹی محض [illegible] چندے کی رقم کو تعمیری کاموں میں صرف کرنے کے بجائے صرف پیش امام صاحب کی تنخواہ پر صرف کرنا چاہتی ہے تو کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ تعمیر مسجد کا موخر ہے اس کی ضرورت نہیں کس حد تک صحیح فیصلہ ہے؟

جواب :—

یہ معاملات دراصل اس قسم کے ہیں کہ ان میں کسی اسلامی ریاست کا قاضی ہی صحیح اور لائق نفاذ فیصلہ دے سکتا ہے۔ مفتی بیچارہ سوائے اظہار رائے کے اور کیا کر سکتا ہے۔

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ جس کمیٹی کے ہاتھ میں امام کے عزل و نصب کا اختیار ہے کیا اس کے اراکین حکم شریعت کی تعمیل پر آمادہ ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو ظاہر ہے کہ مفتی کا فتویٰ ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا اور اگر آمادہ ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ذکر کردہ احوال اگر درست ہیں تو انھیں جن پیش امام صاحب کا تعارف کرایا گیا ہے انھیں ان کی جگہ قائم رکھنا منشائے شریعت کے خلاف ہے۔

غلط خطبہ پڑھنا اور باوجود توجہ دہانی کے صحت کی سعی نہ کرنا مجرمانہ ذہنیت کا کھلا مظاہرہ ہے۔ عذرِ ناواقفیت اوّل تو باقی کہاں رہا جب واقف کرا دیا گیا کہ خطبہ غلط چھپا ہوا ہے۔ اب ضروری ہو گیا کہ یا تو اسی کی تصحیح کسی عالم سے کرالی جائے یا دوسرا صحیح چھپا ہوا مجموعہ خرید لیا جائے۔ دونوں میں سے کوئی بھی صورت مشکل نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر غفلت برتی جا رہی ہے تو صاف مطلب یہ ہے کہ امام صاحب عبادت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اللہ کے خوف سے بے نیاز ہیں۔

امامت کی اُجرت کو فقہاء نے ناگزیر مصالح کی بناء پر جائز قرار دیا ہے اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جو شخص بلا اُجرت امامت سے انکار کرے وہ لائقِ ملامت ہے لیکن جو صورت بیان کردہ حالات میں پیش آرہی ہے وہ عارضی ہے۔ امام صاحب کو اسے گوارا کر لینا چاہئے۔

ایک الجھن سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ تو کہتے ہیں کہ امام صاحب بحیثیت پیش امام ذبیحہ کی آمدنی سے مستفید ہو رہے ہیں، لیکن امام صاحب کا فرمانا ہے کہ میں تو تیس سال سے بکرے ذبح کر رہا ہوں اس کا تعلق مسجد سے کچھ نہیں ہے۔ بظاہر امام صاحب ہی کی بات وزنی معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو کسی کو اس آمدنی سے تعرض کا حق نہیں اور اگر یہ درست نہیں ہے بلکہ ذبیحہ آمدنی کا رشتہ امامت ہی سے جڑا ہوا ہے تو صاف سا علاج یہ ہے کہ امام صاحب کا انکار تسلیم کر لیا جائے۔ وہ بلا معاوضہ خدمتِ امامت انجام نہ دیں گے تو ذبیحہ آمدنی آپ سے آپ ان کا ساتھ چھوڑ دے گا اور جو نیا امام انکی جگہ رکھا جائے گا اس کے حصہ میں آجائے گا۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ جو چندہ کسی خاص مسجد کے نام پر کیا گیا ہے وہ اسی مسجد کا حق ہے دوسری مساجد میں صرف نہیں ہونا چاہئے۔ اور جو چندہ مسجد عالمگیری کی تعمیر و ترمیم یا خندق کی کھدائی کے نام پر کیا گیا وہ انہی کاموں میں لگنا چاہئے۔

[illegible] سے معلوم ہوتا ہے تو دا تعی منصب امامت کی [illegible] عظمت کی شان کے خلاف۔ لیکن تنہا یہ بات امام کو لائق عزل نہیں ٹھہراتی۔ اصل جرم انکا وہ ہے جو آپ نے شق ۲ میں بیان کیا ہے یعنی غلط سلط خطبے پڑھنا اور باوجود توجہ دہانی کے اصلاح پر مائل نہ ہونا۔ یہ بہت برے باطن اور کمزور کردار کا پتا دیتا ہے۔

ہاں یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ ملازمت چاہے آذان کی ہو یا نماز پڑھانے کی۔ اگر کوئی شخص بلا تنخواہ کے اس پر راضی نہیں ہو رہا تو اسے یہ کہکر ذلیل نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ پیٹ کا بندہ ہے اور چند ٹکوں کی خاطر خدا کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر رہا ہے۔ یہ غیر ضروری تذلیل ہے۔ جب فقہاء نے اُجرت کو جائز قرار دیا اور کوئی شک نہیں کہ اس جواز میں خیر کا پہلو شر کے پہلو پر غالب ہے تو ہر شخص کو حق ہے کہ اس جواز سے فائدہ اُٹھائے منصفانہ بات یہ ہے کہ کمیٹی اگر تنخواہ دینے کی پوزیشن میں نہیں اور امام صاحب بلا تنخواہ کے امامت کرنے پر تیار نہیں تو شرافت کے ساتھ انھیں سبکدوش کر دیا جائے۔ لیکن اگر اُن کاموں کو روک کر جو اس مسجد سے متعلق نہیں ہیں تنخواہ دی جاسکتی ہے تو تنخواہ دینی چاہیئے۔ غیر متعلق کام بروک دینے چاہئیں۔ مسجد میں امام رکھنا مقدم تر ضروریات میں سے ہے اس پر کسی اور کم درجہ کی ضرورت کو فوقیت نہیں دینی چاہیئے۔

ہم نے سوال کی کئی جزئیات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اسلئے کہ ان کا متوازن اور عادلانہ جواب اُسی شخص کو زیب دیگا جو مقامی حالات سے پوری طرح واقف ہو۔ بعض حالات میں ظاہری اور سطحی صورتِ حال کچھ ہوتی ہے اور پوست کندہ حقیقت کچھ اور۔ بس اتنا ہی ہم اور کہیں گے کہ کسی معین مسجد کی کمیٹی اگر مسجد کے نام پر چندہ جمع کرے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسی مسجد کی ضروریات کو ہر چیز پر فوقیت دے۔ اوّل تو مسجدِ معین کے نام کا چندہ کسی اور محل میں صرف نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسرے نئی تعمیرات اور نئی خریداری کو مسجدِ موجود کی ضروریات پر ترجیح نہیں دینی چاہیئے۔ مسجد عالمگیری کی تعمیرِ ترمیم اور خندق کی کھدائی کے لئے اگر کوئی خاص رقم معین طور پر جمع نہیں کی گئی ہے بلکہ [illegible] مسجد ہی کی کمیٹی نے اسی مسجد کے نام پر چندہ جمع کرتے ہوئے ضمنی طور پر مذکورہ دونوں کاموں کا وعدہ کیا ہے تو اس وعدے کا ایفا بھی ہو سکتا ہے جب پہلے اس مسجد کی ضروریات پوری کر دی جائیں۔ امامت کی تنخواہ ضروریات ہی میں سے ہے۔ لہٰذا بغیر تنخواہ کا امام نہ ملے تو تنخواہ دار امام رکھنا ضروری ہے چاہے اس وجہ سے مذکورہ وعدوں کے ایفا میں خلل پڑ جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوال ۲:۔ نام و مقام ندارد۔ غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ۔

(۱) وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ - اس کا ترجمہ مولانا مودودی لکھتے ہیں:۔

"اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو"

حاشیے پر لکھتے ہیں:۔

"اس کا اطلاق اس جانور کے گوشت پر بھی ہوتا ہے جس کو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو اور اس کھانے پر بھی ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر بطور نذر کے پکایا جائے"

اب یہ سمجھا دیجئے کہ نذر و نیاز تو یقیناً غیر اللہ کے لئے لوگ کرتے ہیں، لیکن اس کھانے پر سوائے اللہ کے کلام کے دوسری چیز نہیں پڑھتے اور اللہ ہی کے نام پر فاتحہ وغیرہ پڑھتے ہیں تو کیا کسی بزرگ وغیرہ کا فاتحہ کیا ہوا کھانا یا مٹھائی وغیرہ بھی حرام ہے؟

(۲) آٹھویں پارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ

اس آیت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جانور خواہ عمر بھر غیر اللہ کے نام پر پلا ہو، لیکن ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لے لیا جائے تو اس کا کھانا جائز ہوگا۔ اسی طرح وہ کھانا جو بطور نذر کے پکایا جائے اس کا بھی کھانا جائز ہونا چاہیئے جبکہ اس پر اللہ کا کلام پڑھ لیا گیا ہو۔

جواب:۔

جہاں تک قرآن و حدیث کا تعلق ہے اس میں شمہ برابر بھی شک اور ابہام کی گنجائش نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کے لئے جانور نامزد کرنا پھر اسے ذبح کر کے کھانا حلال نہیں ہے۔ لیکن اہلِ بدعت نے اولیاء اللہ

کی بے جا عقیدت و نیاز مندی میں جہاں اور واہی عقائد و تصورات قائم کر کے غلط حرکات کا مظاہرہ کیا وہیں یہ کام بھی کر گذرے کہ جانور تک بعض بزرگوں کے نام کے پالے اور ٹھیک مشرکین سابق کی طرح یہ تصور قائم کر لیا کہ نذر و نیاز کا یہ طریق ہمارے لئے ثواب کا باعث ہوگا اور جن بزرگوں کے نام پر ہم یہ سب کر رہے ہیں وہ خوش ہو کر ہماری فلاح دارین کا وسیلہ بنیں گے۔ اب مشکل یہ تھی کہ قرآن غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور کو صاف طور پر حرام قرار دے رہا ہے تو کس طرح حلت کی راہ نکالی جائے۔ ترکیب سمجھ میں آئی کہ بوقت ذبح اللہ کا نام لے لو بس معاملہ صاف ہے۔ اس ترکیب کو ظاہر فریب بنانے کے لئے ہر وہ آیت تلاش کی گئی جس سے کچھ مدد مل سکے اور حکم قرآنی کی حکمت و علت کو نظر انداز کر کے ظاہری الفاظ سے استدلال کیا گیا۔ نتیجہ وہی برآمد ہوا جو نظر کے سامنے ہے۔

حالانکہ عقل اور نقل دونوں طرح ثابت ہے کہ افعال میں اصل قابل لحاظ چیز نیت ہے۔ مشہور و مسلم حدیث ہے کہ الاعمال بالنیات لکل امرء ما نوی۔ اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ ہر شخص ویسی ہی جزا پائے گا جیسی نیت ہوگی۔ جانور کو پالنا تو کسی بزرگ کی نذر کے طور پر اور ذبح کرتے ہوئے اس پر زبان سے اللہ کا نام لے دینا ایک ایسی سطحی حیلہ طرازی ہے جسے اللہ سے مذاق تصور کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے بے شک کہا ہے کہ:۔

"کھاؤ ان جانوروں جن پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو۔"

لیکن اول تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ آیت کس محل کے لئے نازل ہوئی تھی اور آپ اسے استعمال کس محل میں کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن اٹھائیے۔ صاف معلوم ہو جائے گا کہ آیت دراصل اُن کفار کی تردید میں نازل ہوئی ہے جو یوں کہا کرتے تھے کہ یہ مسلمان اُس جانور کو تو حرام کہتے ہیں جو آپ سے آپ مر جائے یعنی اسے اللہ میاں مار دیں اور اُس جانور کو حلال کہتے ہیں جسے خود ذبح کریں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے جب آپ سے آپ مرا ہوا حرام ہوا تو ذبح کیا ہوا بھی حرام ہی ہونا چاہئے اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے نادانو! جس پر اللہ کا نام "ذکر" کر دیا گیا ہے اسے کھاؤ اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا — اور کیا وجہ ہے کہ تم نہیں کھاتے اُس

ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ — جانور میں سے جس پر اللہ کا نام ذکر کر دیا گیا اور وہ اللہ واضح کر چکا ہے جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے مگر جبکہ مجبور ہو جاؤ اسکے کھانے پر۔

+ + + +

صاف ظاہر ہے کہ یہاں مقابلہ اُن جانوروں سے ہے جو آپ سے آپ مر گئے ہوں یا انھیں غیر اللہ کے لئے پالا گیا ہو۔ پہلے ہی بتا دیا گیا کہ:۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ — جز نیست کہ حرام کر دیا تمہارے اُوپر مردار اور لہو اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا جائے۔

+ + + +

گویا جو لوگ ذبیحۂ مومن کو بھی مُردار ہی کی صف میں شمار کر رہے تھے انھیں تنبیہ کی گئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو جانور پالے تو گئے ہیں کسی غیر اللہ کے نام پر اور ان کے ذبح سے مقصود بھی نذر و نیاز ہی ہے تو کیا ان پر صرف زبان سے اللہ کا نام لے لینا معتبر ہو سکتا ہے؟ تو قرآن کا ہر ہوشمند ۱
قاری جانتا ہے کہ اللہ جب لفظِ "ذکر" استعمال فرماتے ہیں تو اسمیں "یاد" اور نیت اور مقصد و ارادہ سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ اس حد تک شامل ہوتا ہے کہ بسا اوقات خود فعل و عمل ہی کو "ذکر" کہدیا جاتا ہے۔ مثلاً:۔

إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ — جب صلوٰۃ جمعہ کے لئے آذان دی جائے تو ذکر اللہ کیطرف پیش قدمی کرو اور خرید و فروخت کا سلسلہ منقطع کردو۔

کیا یہاں "ذکر" خود نمازِ جمعہ اور اس کے قریبی متعلقات ہی کے لئے نہیں بولا گیا۔ کیا کوئی شخص آذانِ جمعہ سنکر بس زبان سے اللہ اللہ کرنے لگے اور نمازِ جمعہ کی طرف پیش قدمی نہ کرے تو اسے اس آیت کی تعمیل کرنے والا کہا جا سکے گا؟

(۲) رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله —
(۳) ومن يعش عن ذكر الرحمٰن (۴) لا تلهكم اموالكم ولا اولادكم عن ذكر الله (۵) ومن يعرض عن ذكر ربه
(۶) بل هم عن ذكر ربهم معرضون (۷) الا بذكر الله

تطمئن القلوب۔

ان آیات میں دیوانوں کے سوا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا کہ لفظ "ذکر" بس زبانی تذکرے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے بلکہ متفق علیہ طور پر ذکر الٰہی سے مراد یادِ الٰہی ہے اور یادِ الٰہی کا مفہوم قرآن ہی سے یہ ثابت ہے کہ اللہ رسول کے بیان فرمودہ احکامات کی عملی پیروی کی جائے اور منکرات سے بچا جائے تو گویا قرآن لفظِ "ذکر" کو خالی زبانی تذکرے اور رَٹ کے معنی میں ہرگز نہیں بولتا' بلکہ دلی یاد اور قصد و نیت کے ساتھ کئے ہوئے نیک اعمال و افعال اور اقوال و اذکار کے مفہوم میں بولتا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ

تمھاری لغو قسموں پر اللہ تعالیٰ تمھیں نہیں پکڑتا' لیکن جنھیں تم نے مضبوط باندھا ان پر ضرور پکڑتا ہے۔

دیکھئے۔ جو قسمیں بلا قصد و نیت کے یوں ہی عادۃً زبان سے نکل جائیں انھیں اللہ تعالیٰ بھی لائق مواخذہ نہیں قرار دیتا گویا ان کا وجود ہی معتبر نہیں۔

لیکن اہل بدعت کا معاملہ بہت زیادہ گیا گذرا ہے۔ اُنکے اس فعل کی مثال کہ نامزد تو کیا جانور کسی اور کے نام اور ذبح کے وقت لے دیا اللہ کا نام منافقین کے فعل و قول کی سی ہے۔ منافقین کا یہی تو وطیرہ تھا کہ دل میں کفر و زندقہ اور زبانوں پر اللہ اللہ۔ زبانوں ہی پر نہیں، بلکہ اعمال میں بھی مسلمانوں کی پیروی کرتے نظر آتے تھے' لیکن کیا ان کا قول و فعل معتبر ٹھیرا؟ کیا ان کی دو رنگی کو جہنم کے زیریں ترین طبقے کا مستحق قرار نہیں دیا گیا۔

صریح اور واضح تمثیل دیکھئے:-

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ

اے محمد! جب تمھارے پاس منافقین آتے تو انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں تم اللہ کے رسول ہو ___ (تو اے محمد) اللہ جانتا ہے کہ تم یقیناً اللہ کے رسول ہو اور (پھر بھی) وہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

+ + + +

اب ذرا اندازہ فرمائیے۔ بنیادی و جوہری اعتبار سے اِس صورتِ حال میں اور ذبیحہ کی زیرِ بحث صورتِ حال میں کیا فرق ہے؟

آپ نے دیکھ لیا زبانی شہادت کو چاہے وہ قطعاً سچی ہی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ جھوٹ ہی قرار دیتے ہیں جب تک نیت اور باطنی عزم و ارادہ اس کے مطابق نہ ہو۔ جب جانور پالا تو گیا یا خریدا تو گیا اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر۔ نیت رہی نذر لغیر اللہ کی۔ اُمید باندھی گئی کہ جن کے نام کا یہ جانور ہے وہ ہم سے خوش ہوں گے اور ان کے ذریعہ ہماری مرادیں پوری ہوں گی اور محض حرمت سے بچنے کی خاطر وقتِ ذبح اللہ کا نام لے لیا گیا تو کیا یہ اسی طرح کذب اور حیلہ اور فریب قرار نہیں دیا جائے گا جس طرح منافقین کی شہادتِ رسالت کو اللہ نے مردود قرار دیا ہے۔ کیا اس سے زیادہ صریح کوئی بات ہو سکتی ہے؟

غیر اللہ کے لئے قربانی کا جانور پالنا ایک معنی میں تو جائز ہے۔ وہ یہ کہ مثلاً ہم اپنے والد کے لئے ایک جانور پالیں یعنی نیت یہ ہو کہ اسے اللہ کے نام پر ذبح کریں گے اور اس کا ثواب ہمارے والد کو مل جائیگا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ والد صاحب کو ثواب پہنچے یا نہ پہنچے یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے' لیکن شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں' کیونکہ کسی طرح کا شرک اس میں شامل نہیں نہ یہ والد صاحب کی بارگاہ میں نذر و نیاز کا درجہ رکھتا ہے۔ نہ اس سے کسی غیر اللہ کی قربت و خوشنودی مقصود ہے بلکہ ویسا ہی ہے جیسے دس فقیروں کو کھانا کھلا کر اس کا ثواب کسی اور کو دیئے جانے کی دعا کر لی جائے۔

مگر زیرِ بحث معاملہ کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ مردہ بزرگوں کے نام پر جانور خریدنے اور پالنے والے لوگوں کے قلوب میں یہ وہم بھی نہیں گذرتا کہ اس جانور کو اللہ کے نام پر قربان کر کے اس کا ثواب اپنے ممدوح کو پہنچانا ہے۔ تو بہ کیجئے۔ وہ تو یہ گمان کرتے ہیں کہ اس سے وہ بزرگ خوش ہو جائیں گے اور ہماری مرادیں پوری ہوں گی۔ اس گمان میں اور اُس عقیدے میں کوئی جوہری فرق نہیں جو دیوی دیوتاؤں کے لئے قربانی کرنے والے مشرکین و کفّار رکھتے تھے اور شاید آج بھی رکھتے ہیں۔

اللہ کے سوا کسی کے لئے بھی جانور بطور نذر پالنا یا خریدنا فعلِ حرام ہے اور اس جانور کا گوشت بھی مسلمان کے لئے حرام ہے۔ تب سوچئے کیا مال حرام پر ___ مثلاً سود یا قمار یا فحاشی کے مال پر اللہ کا نام لینے' فاتحہ پڑھنے یا وظیفے دُہرانے سے یہ مال پاک ہو جائے گا۔ یقیناً آپ پورا قرآن بھی پڑھ دیں تو سوائے اس کے کہ قرآن ہی کی توہین کے مرتکب ہونگے

یہاں ذرا بھی پاک نہ ہوگا۔ تب کیا فائدہ کہ غیر اللہ کی نذر کا جانور اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جائے۔

رہا یہ سوال کہ "کیا کسی بزرگ وغیرہ کا فاتحہ کیا ہوا کھانا یا مٹھائی وغیرہ بھی حرام ہے؟" — تو اس کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر مطلب یہ ہے کہ کھانے پر کسی بزرگ آدمی نے فاتحہ پڑھدی ہے تو ہمارا مسلک یہ ہے کہ بالذات تو یہ کھانا حرام نہیں ہوا مگر کھانوں پر آیات پڑھنا اور اسے مستقل رسم بنالینا چونکہ بدعت ہے اور ایسے کھانے کھالینے سے بدعت کی ہمت افزائی اور تحسین ہوتی ہے اس لئے ان سے پرہیز لازم ہے۔

اور اگر مطلب یہ ہے کہ کھانوں پر کسی پیر، ولی، شہید وغیرہ کی نیاز دی گئی ہو تو ایسے کھانے بالذات ہی حرام مطلق ہیں۔ نذر و نیاز کا مستحق اللہ کے سوا کوئی نہیں اور "نیاز" کے نام پر جو عجوبے ایجاد کیے گئے ہیں ان کی تو دین میں کوئی اصل ہی نہیں ہے۔ ہوتی کہاں سے اسلام توحید کا پیغامبر ہے۔ نیاز کی جڑوں میں شرک پایا جاتا ہے اسلام کیسے اسے گوارا کرے گا۔

یہ مختلف دیار و امصار میں، فلاں صاحب کی دیگیں، فلاں صاحب کے کھیر، فلاں صاحب کے روٹ، فلاں صاحب کے گلدانے وغیرہ ان کی حیثیت اُن پرشادوں کی سی ہے جو غیر مسلمین دیوی دیوتاؤں بتوں اور خیالی اوتاروں کی نیاز کے طور پر پکاتے، کھاتے اور تقسیم کرتے ہیں۔ جسے توحید عزیز ہو، ایمان پیارا ہو، قرآن و سنت محبوب ہو وہ ان چیزوں کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا اور اگر پھٹکا تو سمجھ لیجئے کہ اس کے عقائد کی بنیادوں میں کہیں نہ کہیں کوئی اینٹ ٹیڑھی رکھی ہوئی ہے۔

سوال:— از وجیہ الدین۔ لکھنؤ۔

مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے فرمودات

سیوہارے کی سیرت کانفرنس میں کی ہوئی مولانا محمد طیب صاحب کی تقریر کا خلاصہ روزنامہ الجمعیۃ میں قسط وار شائع ہو رہا ہے، آپ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ تعجب ہوا کہ سیرت کی تقریر میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر چھینٹے اُڑانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے ذمہ دار رہنماؤں کے اخلاق اور احساسِ ذمہ داری کا جب یہ حال ہے تو اور کسی کی کیا شکایت کی جائے۔ آپ ان کے ارشادات کو ملاحظہ فرما کر تجلی میں کچھ اظہار خیال فرمائیں تو بہتر ہو۔

جواب:—

الجمعیۃ میں برابر دیکھتا ہوں۔ سیرت کانفرنس کی گئی گذری تقریروں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسی لئے انھیں بالاستیعاب پڑھنا ضروری نہیں خیال کرتا۔ تاہم جس روز جناب کا گرامی نامہ ملا اسی دن ۱۰ر جنوری کا شاٹے ایڈیشن میرے سامنے تھا اور اس میں مذکورہ تقریر کی قسط نمبر ۲ موجود تھی۔ اسے پڑھا تو ہنسی بھی آئی اور آہ سرد بھی نکلی۔ تعجب بالکل نہیں ہوا۔ اس لئے نہیں ہوا کہ تقریر دواعظین کی نفسیات کا مجھے بہت دنوں سے علم ہے وہ سماں باندھنے کے لئے سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ ان کے فرمودات کو عقل و منطق کے میزان میں نہیں جذبات اور ہنگامی مصالح کی ترازو میں تولنا چاہئے حالے کہ وہ علامہ ۔۔۔ بھی جو تنقید و جرح میں بڑے متشدد اور عقل و درایت کے بے حد مؤید تھے جب منبرِ وعظ و خطابت سے کلام کرتے ہیں تو جذباتی بہاؤ سے دامن نہیں بچا پاتے۔

مطلب یہ ہے کہ مہتمم صاحب نے تقریر میں جو کچھ فرمایا اس پر حیرت نہیں کرنی چاہئے۔ ہاں ہنسنا اور رونا دونوں برحق ہیں۔ ہنسنا یوں کہ اس طرح کے سستے طنز و طعن میں جیسا کہ موصوف نے اختیار فرمایا بڑی معصومیت اور بچکانہ پن ہے۔ رونا یوں کہ اتنے بڑے آدمی کو اتنی نیچی سطح پر نہیں اُترنا چاہئے۔

آپ نے دیکھا ہوگا قبوری حضرات آئے دن مولانا اشرف علیؒ مولانا قاسمؒ، مولانا اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ وغیرہ پر اس طرح کے واہی الزامات دھرتے چلے جاتے ہیں کہ یہ لوگ رسول اللہؐ کو بڑے بھائی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ یہ لوگ نماز میں گدھے اور بیل کے تصور کو رسول اللہؐ کے تصور سے بہتر خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے انبیاء کو چمار کہدیا۔ ان کے نزدیک اللہ میاں جھوٹ بول سکتے ہیں۔ وغیر ذلک۔

اب لاکھ بار توضیح مراد کر دیجئے۔ جواب دیدیجئے سمجھا دیجئے لیکن مرغے کی ایک ٹانگ جوں کی توں رہے گی۔ یہی حال جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے معترضین کا ہے۔ کچھ زیادہ دن نہیں گذرے کہ معیاریتِ صحابہ کی بحث میں معترضین کے تمام لغو و لاطائل اعتراضات کے قلعوں کو زمین کا منھ دیکھنا نصیب ہو چکا ہے۔ حد ہے کہ مہتمم صاحب قبلہ ہی کے ایک خط (مطبوعہ دعوت دہلی) سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ حقیقت میں تو اہل دیوبند اور جماعت اسلامی کے مابین ضابطہ

[illegible] خیال کا کوئی بھی اختلاف نہیں ہے، لیکن محض ہٹ دھرمی، تعصب، خود پرستی اور انانیت نے جماعت اسلامی کے خلاف طومار کھڑا کر دیا ہے، لیکن پھر وہی ڈھاک کے تین پات

مہتمم صاحب کس معصومیت سے فرماتے ہیں:۔

”تعجب ہے آج کل کے بعض مدعیانِ اصلاح صحابہؓ کے
مقتدائے دین ہونے کا انکار کرتے ہیں“

اور اس کے بعد اپنے بے معنی اور بے مغز دعوے کو جذباتی ملمع دینے کی خاطر صحابہؓ کی شان میں ایسا قصیدہ شروع کر دیتے ہیں جو سامعین کو یہ تاثر دے کہ گویا مذکورہ مدعیانِ اصلاح تو صحابہؓ کے ان مناقب و فضائل کو مانتے ہی نہیں، بلکہ ان کی مذمت کرتے ہیں!۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

بے سند علماء پر بھی تیر چلایا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ بھی وہی چبایا ہوا لقمہ ہے جس کی حقیقت بارہا واضح کی جا چکی۔ ہم پوچھتے ہیں مولانا مودودی کی سند تلاش کرنے والے مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی سند کیوں نہیں تلاش کرتے؟ کیا مہتمم صاحب میں اتنی جرأت ہے کہ مولانا آزاد کے بارے میں بھی یہ فرما سکیں کہ چونکہ ان کے پاس سند نہیں تھی اس لئے ان کے علوم و معارف کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

ہم مولانا مودودی کے علم و فراست کے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ اس سے ہمارے بزرگوں کو چڑ ہوتی ہے، لیکن مولانا آزاد کے بارے میں ضرور بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ بے سند کے اس عالم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے تو دوسرے پلڑے میں آج کے ہزاروں سند والے علماء بھی بے وزن ہی نظر آئیں گے۔ علم مالِ میراث نہیں ہے جو مہتمم صاحب ثبوتِ نسب کی غیر منطقی دلیل دے رہے ہیں۔ مالِ میراث تو احمق اور بد نہاد بیٹے کے حصے میں بھی اتنا ہی آتا ہے جتنا زیرک اور نیک نہاد بیٹے کے حصے میں، لیکن علم کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ علم ایک استاد کے دو شاگرد ایک کتاب کے دو قاری، ایک کلاس کے دو طالب علم یکساں نہیں پاتے اس کی تقسیم متعین حصوں میں نہیں ہوتی۔

بہر حال مہتمم صاحب نے اگر تقریر سیرت کے ذیل میں بلا وجہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے چٹکیاں لینا ضروری خیال کیا ہے تو اسے عبث نہ سمجھئے۔ وہ بہت معاملہ فہم، مصلحت شناس اور حکمت طراز بزرگ ہیں۔ ضرور ہے کہ حاضرین جلسہ کے دل کی دھڑکنوں نے ان سے کسی ایسے ہی شر کا تقاضا کیا ہوگا ورنہ بے شر کی الاپ کے وہ قائل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ عادی مقررین و واعظین کو دورانِ خطابت میں کبھی کبھی ترنگ بھی آ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں کچھ پھلجھڑیاں بھی برائے رونقِ محفل چھوٹ جاتی ہیں۔ ان کی پروا نہ کیجئے۔ یہ تو کھیل کود کے درجے کی چیزیں ہیں۔ اور تو اور اِن سیرت کانفرسوں اور میلاد النبی کے جلسوں ہی کی حیثیت میلے ٹھیلے سے زیادہ کیا رہ گئی ہے۔ مصارف دیکر مقررین کو بلایئے، پنڈال سجایئے، نشستند و گفتند و برخاستند کا نغمہ گایئے اور خوش ہو جایئے کہ بڑا کارنامہ انجام پایا، مگر کردار و سیرت کی جس تعمیر کے لئے فخر کائنات سرورِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر و بیان مفید ہو سکتا ہے اس میں کوئی اضافہ ہونا تو در کنار کچھ پچھلی ہی اینٹیں گرتی نظر آئیں گی۔ وجہ ظاہر ہے۔ سامع اور مقرر دونوں کا مطمحِ نظر جشن اور گرمیٔ محفل سے زیادہ کچھ نہیں۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

دل و دماغ کی سطح پر تو ضرور دین و ایمان کا رنگ ہوگا لیکن گہرائیوں میں نہ پوچھئے کیا کیا ہوتا ہے!

سوال ۶:۔ نام و مقام نامعلوم — معصیت اور فسق

ایک سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ داڑھی رکھتے ہیں، نماز پڑھ لیتے ہیں، مگر صاف قرآن نہیں پڑھ سکتے نہ ہی اعمال اچھے ہیں۔ ہمیشہ مقدمہ بازی میں رہتے ہیں۔ دوسرے کا کھیت ناجائز طور پر دبائے ہوئے ہیں۔ دین کا علم بھی ناکافی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا شخص ہے جو عمر میں ان سے چھوٹا ہے، دین کا علم بھی کافی رکھتا ہے اور اس پر عمل پیرا بھی ہے، مگر کسی مجبوری کے باعث داڑھی نہیں رکھتا گو اس عمل سے خوف زدہ بھی ہے اور خدا سے ڈرتا ہے۔ اب بتلایئے ان دونوں میں امامت کا مستحق کون ہے؟

جواب:۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی منصب امامت کے لائق نہیں، لیکن کوئی تیسرا ان سے بہتر نہ ہو تو اوّل الذکر ہی کو ترجیح دیں گے بشرطیکہ وہ الفاظ قرآن کی صحیح ادائیگی کر سکتے ہوں۔ صحیح ہے

مطلب مع تجوید نہیں، بلکہ حروف کا جو تلفظ معروف ہے اسے ادا کردیں۔

مستقل مقدمے بازی ہے تو لغو ہی چیز، لیکن بہرحال اسکے بالذات حرام ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ کسی کا کھیت ناجائز طور پہ دبا رکھا ہے۔ یہ بھی آپ کا دعویٰ ہے نہ کہ اُن کا اعتراف، لہٰذا اسے بھی بغیر اثباتِ نام کے بنیادِ فیصلہ نہیں بنایا جا سکتا۔ دین کا علم ناکافی ہے۔ یہ بھی امامت کا قادح نہیں۔ اگر نماز کے واجبات وسنن اور طریق ادا کا علم ہے تو یہی امامت کیلئے کافی ہے دوسرا شخص چاہے کیسا ہی نکوکار ہو لیکن داڑھی مونڈنا فسق ہے یعنی گناہ جلی معصیت اعلانیہ۔ جس وقت وہ امامت کر رہا ہے اس وقت بھی اس کا گناہ سب کے سامنے ہے۔ لہٰذا اس کی امامت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فسق کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ داڑھی مونڈنے کی کیا مجبوری پیش آگئی۔ داڑھی رکھنا تو سرکاری دفاتر میں بھی جرم نہیں سمجھا جاتا۔ پھر بھی اگر واقعی کوئی مجبوری ہے تو شریعت میں اس کا لحاظ نہ ہوگا۔ نیز اس مجبوری سے تمام مقتدی تو واقف نہیں ہیں، ان کا اقتداء برضا مندہونا بہرحال فسق کو گوارہ کرنے اور اس کی ہمت بڑھانیکے مرادف ہوگا۔ یاد رکھئے۔ اگر مذکورہ سن رسیدہ بزرگ واقعۃً بھی منکرات میں اسیر ہیں، جھوٹے مقدمے لڑتے ہیں۔ بُرے اعمال سے پرہیز نہیں کرتے۔ قرآن زیادہ بہتر نہیں پڑھ سکتے تب بھی بحالت امامت ان کی بداعمالیاں نشر نہیں ہو رہی ہیں۔ اس کے برخلاف داڑھی مونڈنے والے کا گناہ بحالت امامت بھی منہ سے بول رہا ہے۔ گویا اس کی امامت قبول کرنا آنکھوں دیکھے مکھی نگلنا ہے جب کہ اوّل الذکر کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم۔

سوال ؎ (ایضاً) غلہ کی زکوٰۃ

غلہ پر زکوٰۃ کب دی جانی چاہئے اور کس مقدار میں؟

جواب ؎:—

کھیتی کٹنے کے فوراً بعد۔ جن زمینوں میں پانی قیمتاً دیا جاتا ہے ان کی پیداوار میں بیسواں حصہ زکوٰۃ ہے اور مفت پانی ملنے والی زمینوں میں دسواں حصہ۔

سوال ؎ (ایضاً) قصر

میرا پہلا پیدائشی گھر الف ہے مگر اب وہاں کوئی نہیں رہتا بلکہ سب لوگ مقام ب پہ چلے گئے ہیں اور ہمیشہ یہیں رہتے ہیں اور میں مقام ت پر رہتا ہوں تو بتلایئے کہ مقام الف یا ب پر میں جاؤں تو قصر پڑھنی چاہئے یا نہیں؟

جواب ؎:—

مقام ب پر جانے میں تو قصر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اہل وعیال کی اقامت کے باعث یہ تو آپ کا گھر بن گیا۔ اب مقام الف کے بارے میں دیکھنا ہے کہ کیا آپ نے وہاں سے تمام علاقے توڑ لئے ہیں۔ کیا وہاں اب ایسا کوئی عزیز قریب نہیں رہا ہے کہ جائیں تو اس کے یہاں قیام وطعام ہو۔ کیا وہ مقام ت سے تقریباً ۴۶ میل کے فاصلے پہ ہے۔ اگر ان سب کا جواب اثبات میں ہے تو قصر پڑھی جائے گی ورنہ نہیں۔ ویسے اس باب میں اور بھی کچھ تفصیلات ہیں جنھیں کتب فقہ میں دیکھنا چاہئے۔

سوال ؎:— از ولی بھائی۔ گجرات۔ طلاق مکرہ

الف:۔ زید اپنی بیوی ہندہ کے ساتھ خوش وخرّم زندگی گذار رہا ہے، کسی قسم کی باہمی نااتفاقی اور ناچاقی نہیں ہے نہ کسی قسم کی کبیدہ خاطری ہے۔ رات ڈھائی تین بجے چند آدمی دونوں میاں اور بیوی کو پکڑ کر اور موٹر میں لاد کر ایک خاص مقام پہ لے گئے۔ دونوں کے ہاتھ باندھ کر خوب جی کھول کر مارا پیٹا۔ یہانتک کہ دونوں کا جسم ورم کر آیا اور زید سے کہا اپنی اس بیوی کو طلاق دیدو۔ وگرنہ تم کو جان سے ماردیں گے۔

غرض زید کو اس قدر مارا پیٹا کہ اس کا سارا جسم ورم کر گیا۔ اور زید سے جبراً طلاق لکھوائی گئی۔ جب زید سے ہندہ کو طلاق لکھوالی تو اسے ظلم سے نجات ملی۔ زید نے علماء سے تحقیق کی کہ کیا اس طرح جبر واکراہ اور مار ڈالنے کی دھمکی دیکر طلاق لکھوائی گئی ہو تو طلاق لگتی ہے یا نہیں۔ علماء نے کہا جبر واکراہ سے طلاق دلوائی جائے وہ طلاق نہیں لگتی۔ اب زید اپنی بی بی ہندہ کو لے کر دوسری جگہ رہتا ہے اور دونوں میاں بیوی آرام سے زندگی گذار رہے ہیں۔

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی ہندہ کو جو انتہائی ظلم وجور، مار پیٹ اور جان سے ماردینے کی دھمکی دے کر رات کو ڈھائی تین بجے طلاق لکھوائی گئی تو کیا یہ طلاق لگے گی یا نہیں؟

(ب) لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق (الحدیث) کا مدلول کیا ہے اور درصورت جبر واکراہ تلفظ اور تقریر و تحریر کا حکم ایک ہی ہے یا جُدا جُدا؟

جواب :۔

ویسے تو فقہ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ احناف کے نزدیک طلاقِ مُکرہ (اُس شخص کی طلاق جسے مجبور کیا جا رہا ہو) واقع ہو جاتی ہے اور شوافع اسے نہیں مانتے۔ دونوں مسلکوں پر خوب خوب بحثیں ہوئی ہیں اور جس طرح آپ نے طلاق واقع نہ ہونے کیلئے روایت کا حوالہ دیا ہے اسی طرح احناف بھی روایت ہی کے حوالے سے وقوعِ طلاق ثابت کرتے ہیں۔

لیکن یہاں ان بحثوں کا اس لئے موقع نہیں کہ مُکرہ کی تحریری طلاق کو تو احناف بھی نہیں مانتے۔ چاہے وہ طلاقنامے پر دستخط کرے یا خود ہی طلاق نامہ لکھے کسی بھی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔ فتاویٰ قاضی خاں اور عالمگیری وغیرہ میں اس کی تصریح ہے۔ صورتِ مسئولہ میں کسی بھی امام کے نزدیک طلاق نہیں پڑی۔

سوال :۔ از عباس خاں۔ ضلع آکولہ۔ **قشقہ**

صوبہ بمبئی کے مسلمان وزیر صاحب کو جن کا نام قاضی سید غیاث الدین ہے، اکثر مقامات پر نئی نئی عمارتوں کے اُدگھاٹن (افتتاح) کے لئے بلایا جاتا ہے تو با قاعدہ ہندو مذہب کے مطابق ان کی پوجا کی جاتی ہے اور قشقہ ماتھے پر لگایا جاتا ہے۔ بعد ازاں کھانے کی محفل میں بھی دوبارہ قشقہ لگایا جاتا ہے۔ اسلام کے اصول کے مطابق وزیر صاحب کے لئے قشقہ لگوانا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں جب کہ بھارتی حکومت لادینی ہے تو حکومت کے کام ہندوانہ طریقے سے نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر وزیر صاحب ہندو لوگوں کو اس حرکت سے منع کریں تو حکومت کے احکام کے خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔ وزیر صاحب کا خوشی سے یہ عمل قبول کرنا قشقہ کی اجازت دینا دوسرے مسلمانوں پر بُرا اثر ڈال سکتا ہے۔ کیونکہ وزیر صاحب مسلمان ہیں اور قاضی بھی۔ جب یہ قشقہ لگانا عیب نہیں سمجھتے تو دوسرے مسلمان بھی قشقہ لگوانا عیب نہیں سمجھینگے یہاں ابھی تک یہ رواج ہے کہ مسلمان ہندوؤں کی محفل میں شریک ہوتے ہیں مگر مسلمانوں کے قشقہ لگایا نہیں جاتا۔ وزیر صاحب کے قشقہ لگوانے سے اب ہندو بھائی دوسرے مسلمانوں کو بھی قاضی صاحب کی مثال دیکر قشقہ لگوانے پر زور دینے لگے ہیں۔ اُمید ہے کہ آنجناب قشقہ کی نسبت وضاحت سے اپنے رسالہ تجلی میں اظہار خیال فرمائیں گے۔ اگر آپ نے صرف اس وجہ سے سکوت فرمایا کہ کانگریس حکومت ہے تو یہ بلا تمام مسلمانوں میں عام ہو جائے گی۔

جواب :۔

میرے بھائی آپ کے خط میں کونسی ایسی بات ہے جس کا جواب میرے بس میں ہو۔ قشقہ شعارِ کفر ہے۔ میرؔ نے کہا تھا۔

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو تم اس نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

غالباً پہلا مصرعہ ہمیں ٹھیک یاد نہیں رہا مگر دوسرا بہرحال ٹھیک ہے۔ معلوم ہوا کہ قشقہ کھینچنا اہل کفر کا کوئی معمولی شعار نہیں، بلکہ اہم ترین اور مخصوص ترین شعار ہے۔ ایک میرؔ کے شعر کی بات نہیں، ہندوستان کے کونے کونے میں پھر کر جاہل، عالم ہر ایک سے پوچھ جائیے یہی بتائے گا کہ قشقہ ہنودیہی کا قدیم شعار ہے جس کے پیچھے مذہبی اعتقادات کام کرتے ہیں۔

جب مسلّم طور پر یہ شعارِ کفر ہوا تو کسے علمائے اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ اور فتویٰ نہیں معلوم کہ شعارِ کفر کا اختیار کرنا ہلکے سے ہلکے لفظوں میں معصیتِ کبیرہ ہے اور اپنے لازمی اثرات و عواقب کے اعتبار سے پرلے سرے کا فسق جو اسلام کے چہرے پر سیاہی مَلنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ جو قشقہ لگائے یا زُنّار پہنے یا سادھوؤں پر جا کر اہلِ ہنود کی سی تقدیس و تکریم کے ساتھ پھول اور نذریں چڑھائے اسے دنیا میں تو چاہے وزارت نہیں بادشاہی اور صدارتِ عظمیٰ مل جائے لیکن آخرت میں توقع نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی نگاہِ التفات کا سایہ تک پا سکے۔ اللھم حفظنا۔

رہی یہ بات کہ ایک سیکولر لازم کی مدعی حکومت کے کام کسی ایک مذہب کے مخصوص شعار اور کلچر کے رنگ میں نہیں رنگے جانے چاہئیں تو بے شک ہمارا دستور و آئین یہی کہتا ہے اور کانگریسی حضرات کی زبانوں پر بھی دعوے اسی کے ہیں لیکن عملی حقائق

اس کے خلاف ہوں اور منافقت کا کیڑا اندر ہی اندر دیانت و امانت، ضمیر، کردار سب کو چاٹتا چلا جائے تو اس میں مفتی یا مجیب کیا کر سکتا ہے۔ سورج کی طرح ظاہر ہے کہ کانگریس کی حکومت میں ہندوستان کی امتِ مسلمہ کو زخم ہی زخم ملے ہیں۔ کیا اردو کی مظلومیت کیا ملازمتوں کا تناسب، کیا اسکولوں کے دیومالائی نصاب، کیا آئے دن ہونے والے قتل و غارت۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اب ایسی حکومت کے جو مسلمان منصب دار ہوں گے ان سے اس کے سوا کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ حکومت کے حقیقی رجحان و میلان کی رعایت ہی میں اپنی عافیت سمجھیں گے۔ کوئی کم کوئی زیادہ کوئی ذرا پردہ داری سے کام لے لیگا کوئی بالکل کپڑے اُتار دے گا یہ نہیں کہ تمام ہی اللہ کے بندے اسی قدر نفس پرست ہیں۔ نہیں ایسے اللہ کے بندوں کا بھی فقدان نہیں جو کفر و شرک کے طوفانوں میں بھی سفینۂ دین و ایمان کو سلامت روی کے ساتھ کھے رہے ہیں لیکن بات غالب اکثریت کی ہو رہی ہے۔ ناممکن ہے کہ کسی حکومت کا عملی رُخ تو کسی اور طرف ہو اور اس کے اِکا دُکا اقلیتی منصب دار کسی اور طرف مُنھ کر کے چل سکیں۔

قاضی صاحب سے ہم اتنا ہی کہہ سکیں گے کہ یہ وزارت ہی نہیں یہ زندگی ہی پانی کا بلبلہ ہے۔ آج نہیں تو کل پھوٹا۔ مرنے کے بعد کی پوچھ گچھ کا اگر یقین ہے اور دوزخ و جنت کو افسانہ نہیں سمجھ رکھا ہے تو قشقہ لگوانا چھوڑ دیجئے۔ یہ وسیع القلبی نہیں گمراہی ہے۔ رواداری نہیں بے حمیتی ہے۔ اخلاق نہیں نفسانیت ہے۔

تنہا آپ ہی کا معاملہ ہوتا تو زیادہ فکر کی بات نہیں تھی لیکن آپ بڑے آدمی ہیں آپ کا اسوہ دوسروں کے لئے گمراہی کے دروازے کھولے گا۔ مسلمان عوام بیچارے بہت کم علم ہیں، پھر قبوری شریعت کے فروغ و شیوع نے ان کے دل و دماغ کو ویسے بھی ترکیا کا چوں چوں بنا رکھا ہے۔ آپ جیسے ممتاز مسلمانوں نے اگر علی الاعلان قشقہ کھینچنا یا کھنچوانا جاری رکھا تو نہ جانے کتنے مسلمان اپنی تمام تر بابلانہ معصومیت کے ساتھ آپ کی تقلید کریں گے اور ان سب کا وبال آپ پر ہوگا — گو وہ خود بھی عذابِ آخرت سے نہ بچ سکینگے۔

ہم تمام مسلمان بھائیوں سے صفائی کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ غیر مسلمین سے شریفانہ مراسم رکھنا اور ضرورت پڑنے پر ان کے لئے جان تک قربان کر دینا بالیقین ان کا فریضہ ہے کیونکہ اسلام تمام انسانوں سے حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا ہے، لیکن یہ جائز نہیں کہ ان کے ایسے شعاروں کو اختیار کیا جائے جو مذہبی نوعیت رکھتے ہوں۔ وما علینا الا البلاغ۔

چند عمدہ کتابیں

مناسکِ حج شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے گوہر افشاں قلم سے حج کے اہم ترین موضوع پر معتبر ترین کتاب قرآن وحدیث کے لعل وجواہر کا گنجینہ۔ افادیت کیلئے ایک اور بزرگ کے افاضات بھی ہمرشتہ ہیں۔
قیمت مجلّد تین روپے۔

اسلامی فقہ زمانۂ حاضر کی سلیس وشگفتہ زبان میں لکھی گئی مفید ترین کتاب۔ حصّہ اوّل طہارت، نماز، روزہ اور صدقۂ فطر وغیرہ کے جملہ ضروری مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپے سات آنے۔ حصّہ دوم زکوٰۃ اور حج کو حاوی ہے۔ قیمت ایک روپیہ پانچ آنے۔
حصّہ سوم چار روپے۔ حصّہ چہارم ساڑھے تین روپے۔
مکمل سیٹ رعایتاً گیارہ روپے

کتاب الوسیلہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی ایک زبردست عربی تصنیف اردو لباس میں۔
قربت الٰہی کے لئے جس وسیلے کی تلاش کا حکم قرآن نے دیا ہے وہ کیا ہے؟ اس کا شافی وکافی جواب بہترین دلائل کیساتھ اس گرانمایہ کتاب میں دیا گیا ہے۔ شرک وبدعت کی بیخ کنی اور سنت کی تائید
قیمت مجلّد نو روپے۔

ابن ماجہ اور علم حدیث "ابن ماجہ" صحاح ستہ کی رفیع کتاب ہے اس کے جامع ابن ماجہؒ بڑے پائے کے محدث گذرے ہیں۔ ان کی تفصیلی سوانح کے ساتھ اس کتاب میں تدوین حدیث کی مفصل تاریخ اور ان جاں فشانیوں کی روداد پیش کی گئی ہے جو محدثین نے جمع حدیث کے سلسلہ میں کیں کثیر معلومات کا خزانہ۔ مجلّد آٹھ روپے۔

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ سے متعلق بہترین محققانہ اور سیر حاصل مقالات کا بیش بہا مجموعہ۔ اس کتاب کا ذکر گویا اپنی زریں تاریخ کے ایک

اہم باب سے ناواقف رہنا ہے۔ جو بہت بڑی محرومی ہے۔
مجلّد چار روپے۔

کتابِ زندگی امام بخاری کی الادب المفرد کا اُردو ترجمہ۔ بہترین اخلاقی تعلیمات پر مشتمل احادیث کا مفید ترین مجموعہ جس کے جامع امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔
قیمت مجلّد آٹھ روپے۔

عظیم تاریخ اسلام از اکبر شاہ نجیب آبادی: تین ضخیم جلدوں میں مکمل۔ یہ مشہور زمانہ تاریخ تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ پاکستان میں عمدہ کاغذ اور روشن طباعت وکتابت کیساتھ چھپی ہے۔ قیمت فی سیٹ مکمل و مجلّد چھتیس ۳۶ روپے

حیات وحید الزماںؒ احادیث کے نامور مترجم علامہ وحید الزماںؒ کے علمی وعملی کارناموں کا مفصّل تذکرہ۔ جیسا کہ اہل علم کے تذکروں میں ہوتا ہے ضمناً بہت کچھ قیمتی معلومات بھی ہم رشتہ ہیں۔
قیمت چار روپے۔

عربی کا معلّم عربی سیکھنے کیلئے اب تک جتنی کتابیں ترتیب دی گئیں ان سب سے بہتر کتاب۔ یہ صرف ہماری رائے نہیں، بلکہ مولانا مودودی، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور نہ جانے کتنے اور مستند حضرات کی رائے ہے جو پوسٹر کی شکل میں چھپ چکی ہے۔ حصہ اول سوا روپیہ۔ دوم سوا روپیہ۔ سوم ڈھائی روپے۔ چہارم تین روپے۔ مجموعی قیمت آٹھ روپے۔

رفیقِ سفر یعنی شریعت کی روشنی میں سفر کے آداب واحکام قیمت صرف آٹھ آنے۔

مکتبہ تجلّی دیوبند۔ یوپی

ہندوستان کے مسلم رہبروں کے نام

ہوسکتا ہے بعض حضرات کو فاضل خطیب کے انداز خطاب اور بعض مطالب سے اختلاف ہو لیکن خطاب چونکہ دلی درمندی اور خلوص پر مبنی ہے اسلیئے اخلاص اور دوستی ہی کی اسپرٹ سے دیکھے جانے کا مستحق ہے۔ عامر عثمانی۔

نوٹ :۔ ذیل کی تمام تحریر میں کسی صاحب کی ذات خاص سے خطاب نہیں کیا گیا ہے روئے خطاب اجتماعی حیثیت رکھتا ہے

ساجد حسین شمسی

جناب والا۔ آپ کے مقبول عام جریدہ کے ذریعہ ہندوستان کے مسلم ناخداؤں سے کچھ گزارشات ہیں۔ چند ضروری باتیں ہیں تکلیف دہ باتیں۔ جن کا اظہار اور جن پر غور وخوض وقت کا لازمی تقاضا ہے۔ اور یہ وہ تقاضا ہے جکو ملت اسلامیہ کے ہر ایک صاحب فکر اور سمجھدار انسان کو واقعات اور حالات زمانہ کی روشنی میں سمجھنا ہوگا اور اس کی ضروریات کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بروئے کار لانا ہوگا۔ آپ یا میں یا کوئی مسلمان دینی تقاضوں کے ہوتے ہوئے اللہ کی دی ہوئی ذمہ داریوں سے انحراف نہیں کر سکتے۔ رہبران ملت اگر حالات و واقعات سے صحیح طور پر باخبر نہ ہوں گے یا قوم وملت میں اصلاح و بہبود کی عملی جدو جہد کو سہواً یا قصداً فراموش کر دیں گے۔ یا ان غیر منقطع ریشہ دوانیوں کا علاج تلاش نہ کریں گے جو غیر مسلم فرقہ پرستوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہیں تو وہ لوگ جو قوم وملت کی سرپرستی اور رہنمائی کا دم بھرتے ہیں بری الذمہ نہیں ہو سکتے بلکہ پوری ملت کی موجودہ اور آئندہ ہر ممکن بربادی کے یہی لوگ ذمہ دار قرار پائینگے

قیادت اور ناکامی

ریل گاڑی کے تمام ڈبے اُسی سمت چلا کرتے ہیں جس طرف انجن ان کو لیجایا کرتا ہے مسلمانوں کی اقتصادی ناکہ بندی کیجارہی ہے مسلمانوں کی علمی ناکہ بندی زوروں پر ہے اسکولوں میں مسلمان بچوں کو شرع اسلامی کے خلاف عقائد کی تعلیمات ان کی ہر درجہ کی اردو، ہندی اور انگریزی کی درسی کتب سے صاف ظاہر ہے۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے جگہیں مفقود ہیں ان کے لئے سرکاری امتحانات میں کامیابی کے دروازے بند ہیں۔ ان چیزوں کا اظہار ہمارے اخبارات آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف خود مسلمانوں کی اندرونی حالت نہایت ابتر ہے ہر اعتبار سے وہ دوسری قوموں سے گرے ہوئے اور پسماندہ ہیں ہر صورت سے وہ پچھڑے ہوئے اور کمزور ہیں ان کا معاشرہ اسلامی دور کے معاشرے سے بالکل مختلف ہے، ہمارے طور وطریق ہماری تقریبات ہمارے اخلاق وعادات ہماری معیشت و معاشرت اور بالآخر ہماری سیاست کی۔ ناکامی و نامرادی اور بربادی کی جو منحوس صورتیں ہمارے سامنے آرہی ہیں ان سب کی ذمہ داری تنہا عوام پر یا عامتہ المسلمین پر نہیں رکھی جاسکتی کیونکہ موجودہ مسلمان پچانوے فیصدی اب تک ہندوستانی علماء کی زیر سرپرستی رہے اور ہیں وہ اسی راستہ پر چلتے رہے ہیں جس پر علماء چلنے کا حکم دیتے رہے وہ اسے عین ثواب اور موجب نجات سمجھکر اختیار کئے ہوئے تھے کہ یہ ہمارے دینی علماء کا متفق علیہ راستہ ہے — اب ذرا غور فرمائیے کہ آپ نے اس پانچ کروڑ کی عظیم اقلیت — مگر ملک میں سب سے زیادہ پسماندہ، بدحال اور مصیبت زدہ قوم کو کہاں لاکر چھوڑا ہے ؟ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں قوم وملت کی رہنمائی کی باگ ہے اپنی بھاری ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں وہ ناواقف اور انجان نہیں بن سکتے، افراد کا قصہ چھوڑ دیئے، پوری قوم کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے مگر اللہ کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا وہاں ہر بات کا مواخذہ ہوگا حقوق العباد کا حساب دینا ہوگا۔

آپ کب تک فکر نہ کریں گے آپ بھی سب کے ساتھ اسی ایک ناؤ میں سوار ہیں۔ بیچ سمندر میں ہیں اور طوفانی تھپیڑوں کا مقابلہ ہے مگر غلطی اُن

ناخداؤں کی ہے جو اس طوفان خیز راستے سے لاتے ہیں اُن مسافروں
کا کیا قصور جو دین اسلام کے نام پر اپنے رہبروں کے "مقدس فرمانوں"
کی پیروی کرتے رہنے کا نتیجہ بھگت رہے ہیں، وہ کام اصل میں درحقیقت اسلام
کا نہیں تھا — تو نہ ہو — نام تو دین اسلام کا تھا جس کے سہارے یہ
تباہی کا کھیل کھیلا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقی اور سچی کتاب قرآن جسکو دنیا کا ہر ایک
مسلمان بنیادی طور پر فلاح و بہبود کا حقیقی سرچشمہ سمجھتا ہے صاف طور
پر کیا حکم دیتی ہے ملاحظہ ہو آل عمران رکوع سوم اور چھٹے پارے کا
آخری رکوع —

آزادی بری چیز نہیں ہے بلکہ ضروری ہے لیکن مسلمان اور ان کے رہنما
اپنے تمام سابقہ طریق کار پر غور کریں تو یقیناً ثابت ہوگا کہ انھوں نے
اسلام کے حقیقی اور بنیادی تقاضوں کو فراموش کیا ہے اور خود ساختہ
پالیسیوں کے ذریعہ کلام اللہ کے حکیمانہ احکامات سے انحراف برتا ہے
عام مسلمانوں کی نہ صرف تعلیمی بدحالی، نہ صرف اقتصادی تباہی بلکہ سیاسی
بحران، اخلاقی زوال تمدنی اور تہذیبی پستی — یہ سب آخر کیوں ؟
تمام تر الزام عام مسلمانوں پر نہیں رکھا جاسکتا — کیوں نہیں فرماتے۔
آپ صرف سیاست کو لیکر چلے تھے — بجائے اقامت دین کے آپ نے
محض "آزادی وطن" کو مکمل ایکسو برس تک اپنا تنہا موضوع جدوجہد
قرار دے رکھا تھا۔ کہیں جہاد کے نام سے، کہیں اسلامی جدوجہد کے
نام سے، کبھی حریت کے مقدس تصورات سے، اور کبھی "وطن پرستی"
کے نعروں سے — میں آزادی یا وطن دوستی یا وطن کی ترقی کا ہرگز مخالف
نہیں بلکہ وطن کی ترقی کے ساتھ تمام اہل وطن ہندوستانیوں کی ترقی اور
خوشحالی کا دل سے خواہش مند ہوں۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر
ہندوستانی مسلمان ترقی اور صحیح خوشحالی حاصل نہیں کرسکیں گے تو
ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی ناممکن ہے۔ میں آزادی اور وطن کی
خوشحالی کو خلق خدا کے لئے فلاح و بہبود کی ایک شاندار کڑی سمجھتا ہوں
مگر اسے فلاح کی بنیاد نہیں جانتا — خصوصاً مسلمانوں کیلئے۔
اسلام نے جس طریق کار اور قوم کے جس مقصدِ حیات کی ابتدا سے
تعلیم دی ہے یعنی خالص تبلیغ دین، نشر و اشاعت اور خالص جدوجہد
اسلامی بلا شرکت غیرے خصوصاً برائے اقامتِ دین کے
ان سب اصولوں کو ان کی ضروری اہمیت اور ان کی حقیقی جگہ سے
ہٹا کر بالائے طاق رکھ دیا گیا اور سیاست محض کے پیچھے اڑتے

چلے گئے۔ پھر آج کس لئے شکایت ہے قوم و ملت سے — کہ
اُن کے گھروں میں قرآن حکیم کی جلدیں بالائے طاق رکھی رہتی ہیں اور وہ
دینی علوم سے بے بہرہ رہتے ہوئے علماء یا مولویوں سے بری طرح بدظن ہیں

تعلیم ۔ اقتصادیات ۔ فسادات

حالی مرحوم نے
کیا غلط کہا تھا
کہ مسلمان سے چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے ؛ سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے
ہمارے ان رہبروں نے مسلمانوں کو چھتیں پاٹنے کا حکم نہ دیا۔ باراں
کی آرزو کرتے رہنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی، قوم کی نمائندگی کرتے
ہوئے باراں کے لئے مجاہدے کئے — اسلئے پوری قوم کو لیکر بجائے
اسلامی سفینہ بنانے اور بنا کر مکمل و طاقتور کرنے کے — طوفان سے
آٹکرائے — طوفان، بھیانک و مسلسل طوفان کے نتیجے آپ کے ہمارے
سب کے سامنے ہے۔ آزادی کے بارہ سال میں مسلمانوں پر جو بے پناہ
ظلم توڑے گئے ہیں اور فصل آتے پر برابر توڑے جاتے ہیں۔ اُن
سے کوئی ناواقف نہیں، سب جانتے ہیں اور مسلمانوں کی کس مپرسی کو
بھی سب پہچانتے ہیں۔ کیا آج کل کے مسلمانوں کی حالت اسپین،
پرتگال، اور جنوبی فرانس کے چودھویں صدی کے مسلمانوں سے بھی
زیادہ خراب نہیں ہے[1] جن کو ایک ایک جگہ سے وہاں کے عیسائی دشمنوں نے
نکالا یا قتل کردیا وہاں اب نہ کوئی مسلمان ہی باقی ہے اور نہ ان کے
عظیم الشان نشانات، ان کے مدرسے، مسجدیں، خانقاہیں، قبرستان
کتب خانے، رسد خانے وغیرہ یکے بعد دیگرے توڑ کر زمین کے برابر کردیئے
گئے۔ یہ وہاں کا حال ہے جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک خلافت
کی تھی اور وحشی یورپ کو تعلیم دے کر انسان بنایا تھا۔ دنیا کے عظیم
مورخین جن کا آج بھی لوہا مانتے ہیں — مگر وہ کیوں نابود ہو گئے غور کا
مقام ہے کہ اس آٹھ سو سالہ خلافت اسلامیہ کی تباہی اور مکمل نیستی کی
ذمہ داری محض عیسائی دشمنوں پر نہیں رکھی جاسکتی۔ خود مسلمان ان کے
لیڈر، ان کے نمائندے ان کے رہبران اور ان کے سیاسی و مذہبی
پیشوا — سب کے سب خدائی لعنت میں گرفتار اور اپنی غلط روش
کے سبب عذاب میں مبتلا تھے۔ جو عیسائی قوم کے ہاتھوں نازل ہوا۔
خود رہبران قوم و ملت عیش پرور اور لاپرواہ تھے جو اس کے سب
سے بڑے ملزم و مجرم ہیں۔ بالکل اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں
کی کبھی تباہی و بربادی کی ذمہ داری محض ہندو بھائیوں کے سر تھوپنا

[1] یہاں فاضل خطیب جذبات کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ خدا نہ کرے ہندی مسلمانوں کا حشر اسپین جیسا ہو۔ ع

عقلمندی نہیں ہوسکتا، حق و انصاف نہیں ہوسکتا، یہاں کے مسلمان ان کے لیڈر، ان کے نمائندے ان کے رہبران اور ان کے سیاسی و مذہبی پیشوا سب کے سب اپنی جگہ ذمہ دار اور اس کے ملزم و مجرم ہیں۔ جن میں مذہبی و سیاسی رہبرانِ قوم سب سے بڑے مجرم ہیں جو نصف صدی تک اس چکر میں پھنسے رہے کہ انگریزی پڑھنا کفر، دہریت اور الحاد ہے اور ان کے اعلیٰ دینی درسگاہوں کے فارغ التحصیل صاحبان اپنی عملی زندگی میں اقتصادی بدحالی کے شکار رہے اور آج بھی افلاس کی ہولناک تباہ کاریوں کے برابر شکار ہیں کیا دینِ اسلام دنیاوی علوم و فنون حاصل کرنے کو منع کرتا ہے؟ کیا اسلام صنعت اور دستکاری کے خلاف ہے؟ کیا شرعِ محمدی اسقدر محدود اور تنگ ہے (نعوذ باللہ منہا) کہ مسلمان جوق در جوق صرف دینی تعلیمات ہی اپنے بچوں کو دلائیں اور دنیا میں وہ کمانے کھانے کیلئے مجبور اور دوسروں کے دست نگر ہوں کیا مومن کی زندگی اسقدر محدود اور مسدود ہے؟ قوم و ملت کے یہ نونہال جب اعلیٰ اسلامی درسگاہوں سے فارغ ہو کر نکلیں تو وہ دنیا کے کسی کام کے نہ ہوں، ان کا وجود عضوِ معطل ہو کر رہ جائے ان کی معاشی بدحالی خاندان پر عذاب رہے اور وہ مسجد و خانقاہ یا معمولی بدحال مکتبوں میں چپک کر تنگدستی اور بدحالی کو تقدیر سمجھکر، تمام عمر کے لئے افلاس و مصائب کی بندشوں میں جکڑ جائیں — کیا اسلام کی یہی تعلیمات ہیں؟ سوچ فرمائیے حضرات مولانا محترم؟ آپ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں!؟ آج آپ کے فارغ التحصیل علماء، فضلاء، حفاظ، قاری، خطیب وغیرہ وغیرہ — اور تو کیا — خود کلام اللہ اور احادیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تراجم، مطالب، تشریح، تبلیغ، مسائل جد و جہد اور عربی فارسی دانی تک سے محروم اور عملی زندگی میں ناکام نظر آتے ہیں وہ کلام پاک ضرور پڑھ سکتے ہیں کچھ خاص آیتوں کے مطالب بھی وہ جانتے ہیں مگر وہ ان تمام علمی خزانوں سے یکسر بے بہرہ اور ناواقف رہتے ہیں جو اللہ جل شانہ نے اس میں قیامت تک کے لئے بھر دیئے ہیں۔ یہیں دیکھ لیجئے ہر ہفتہ جمعہ کے دن منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ جمعہ کو طوطے کی سی رٹن پڑھ کر سنا دیا جاتا ہے ہزاروں لاکھوں خطیب اس موقعہ پر خطبہ جمعہ پڑھتے ہیں لیکن ان میں سیکڑوں بھی ایسے نہیں ہیں جو خود اتنا بھی سمجھتے ہوں کہ وہ خطبہ جمعہ کے ذریعہ عام مسلمانوں سے کیا خطاب کرتے ہیں وہ ان کے سامنے کیا کچھ پڑھا کرتے ہیں، اس کا مقصد اور اس کا متن کیا ہے اس کا مطلب کیا ہے اور کس فائدے کے لئے ہے؟ یہ کثیر تعداد میں خود ہی ناواقف ہیں — عام مسلمان تو ان خطبوں کے حقائق کو کیا سمجھیں کیونکہ عربی اور علوم اسلامی کے اِن خود ساختہ ناخداؤں نے تمام اسلامی علم کو — جسقدر انھوں نے حاصل کیا ہے — صرف اپنی ذات خاص تک محدود کر رکھا ہے اور اس معاملے میں وہ عیسائی پادریوں اور یہودیوں راہبوں سے پیچھے نہیں ہیں[1] — ہفتہ وار خطبوں کی اصلیت کو خود سمجھنے اور عوام و عامۃ المسلمین تک اسلام کا حقیقی پیغام پہنچانے میں فی الحقیقت ان لوگوں نے بخل — اور یقیناً بخل کیا ہے اور کوتاہ نظری اور لاپرواہی سے کام لیا ہے یہ سلسلہ برابر اب بھی جاری ہے عام مسلمان اسلام کے حقیقی پیغام سے اور اسلام کے سچے اور ضروری تقاضوں سے قطعاً ناآشنا اور ناواقف رہ گئے۔ کہئے حضرت یہ ذمہ داری کس کی تھی؟ اس کے لئے کون جواب دہ ہے؟ قدرت کے یہاں اس کا کون ذمہ دار ہے؟ قوم کے کثیر ناخواندہ یا معمولی سی پڑھے لکھے حرف شناس عام مسلمانوں کے ذہنوں میں ہندوستان کے مولویوں کا تصور — ایک بھیانک، مکروہ اور نفرت انگیز صورت میں کیوں ہے؟ آخر اسباب کیا ہیں؟ افراد پاگل ہوسکتے ہیں پوری کی پوری قوم پاگل نہیں ہوسکتی۔ اے میری اس بدقسمت قوم کے لیڈر — اے ہمارے عظیم رہنما — اللہ کا واسطہ دیکر گذارش کرتا ہوں کہ سابقہ اور موجودہ حالات و واقعات کے نشیب و فراز پر غور و فکر کے ساتھ نظر ڈالیئے۔ یقین کرتا ہوں کہ آپ ضرور اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمائیں گے تاکہ نہ صرف مجھ خادم کو بلکہ پوری امت مسلم کو فوائد حاصل ہوں۔

انتشار اقتصادی اور علمی بدحالی کا مختصر حال عرض کرچکا ہوں۔ اب رہا مسلمانوں میں خطرناک بدنظمی کا سوال — تو خیاب والا — مسلمانوں کا پورا کا پورا معاشرہ اس وقت خانہ جنگی اور ابتر حالی کی لعنتوں میں مبتلا ہے افراد کے مابین، خاندانوں کے درمیان، مسلم فرقوں میں اور مسلمانوں کی

[1] یہاں بھی فاضل خطیب حد سے گذر گئے۔ ع

کیا یہی دینِ اسلام ہے؟ آج زمانے ... ٹھنڈے دل سے سوچئے۔ ذرا روشن ضمیری کی گہرائیوں میں اتر جائیے اور غور کیجئے کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانے میں ایسے ہی قاری، مولوی، حاجی، علماء، خطیب، حفاظ، درویش پیر اور صوفی پیدا کرتے تھے کیا اس زمانے میں بھی ایسے مرید ہوا کرتے تھے جو "سود" جیسی حرام چیز کا بے خوف و خطر لین دین کرتے رہتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ بد اخلاقی۔ لعن و تشنیع۔ حق تلفی۔ ناانصافی۔ گالی گلوچ، دوسروں کا مال غصب کرنا۔ مقدمہ بازی ناجائز دباؤ ڈالنا — جن کی عادت ثانیہ بن چکا ہو؟

دینی و دنیاوی تعلیم

اگرچہ میں دینی تعلیمات کا ہرگز ہرگز مخالف نہیں ہوں اور نہ علوم دینیہ کے مقابلے میں انگریزی یا دنیاوی علوم کا اندھا دھند مقلد یا مداح — مگر — اب وہ زمانہ نہیں رہا جب ہندوستانی علماء یہ کہکر ٹال دیا کرتے تھے کہ انگریزی پڑھنے والے کافر ہو جاتے ہیں دہریئے اور ملحد ہو جاتے ہیں اب تو خود علماء کی اولادیں انگریزی تعلیمات اور دنیاوی علوم سے بہرہ مند ہو رہی ہیں اور کب تک نہ ہوتیں — زمانے کے تقاضوں اور وقت کی ضرورتوں کو فراموش کرنے والی قوم زندہ درگور ہو جاتی ہے اور دنیا میں کوئی اس کا یار و مددگار نہیں ہوتا، خود اللہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انھیں کی امداد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ خدا اس ہی قوم کی حالت بدلتا ہے جو خود اپنی حالت بدلنے کو تیار ہو جو قوم باوجود اپنے رہبروں کے اپنی حالت بدلنے کو تیار نہ ہو، خدائی لعنتوں میں گرفتار ہو جاتی ہے دینی مدارس اور درسگاہوں میں دین کے ساتھ ساتھ کیا آپ نے ابھی تک انگریزی اور ہندی کو نہیں اپنایا — آخر آپ کب تک نہ اپنائیں گے؟ یقیناً ایک نہ ایک دن آپ خلا محسوس کریں گے اور آپ کو اپنانا ہی ضروری معلوم ہوگا۔ (بہت سے علماء کے فرزند خلاف شرع لباس اور فیشن کے دلدادہ اور خلاف شرع مشاغل میں ملوث نظر آتے ہیں — یہ تعلیم کا نقص نہیں، ان کی بنیادی خرابی گھر کا غلط ماحول اور غلط تربیت ہے۔ ان کے والدین کے

دینی جماعتوں میں — کسی طرح کا متحدہ اور مستقل انتظام باقی نہیں ہے جس کے زیر اثر مسلمانوں کو اخلاقیات، دینی امور کی تعلیم اور سیرت و کردار کی فلاح کیلئے منظم طور پر پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوں اور دیگر ہندوستانیوں کی طرح وہ بھی خوشحال ہو سکیں۔ ہمارے سماج میں انتشار و تفریق کی ایک غیر معمولی اور ناقابل فراموش حد تک خصوصیت بن چکی ہے مسلمانوں کے علاوہ ملک کی ہر دوسری قوم پہنچنے اور ترقی کرنے اور خوشحال بن جانے کی کامیاب کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہے مسلمانوں میں کوئی باقاعدہ کامیاب اور ہر دلعزیز تنظیم نہ ہونے کے باعث ہر گروہ اپنی ڈفلی الگ بجا رہا ہے اپنی راگنی الگ گا رہا ہے کہیں سیاست کے نام پر، کہیں الیکشن کے سہارے کہیں مذہب کے نام پر کہیں کسی طریقے سے، کہیں کسی جذب ہمدردی کے نام پر کہیں کسی طریقے سے۔

مذہبی پیشوا

حافظوں، قاریوں، مولویوں، عالموں، خطیبوں، درویشوں، پیروں اور صوفیوں کے نام سے مسلمانوں کے بہت سے گروہ ہیں لیکن ذرا بتا دیجئے کہ ان میں سے کونسا گروہ اسلامی نقطۂ نظر سے عوام یا عامۃ المسلمین کی صحیح خدمت انجام دے رہا ہے لعن و تشنیع، زجر و توبیخ، نفرت، بے رخی، لاتعلقی یا بددلی — ان لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے کیا اسلام کی تبلیغ اسی طرح ہوتی ہے؟ کیا مسلمانوں کی غیر اسلامی رسوم غیر اسلامی طور و طریق سے مٹائی جا سکتی ہیں؟ کیا اصلاح المسلمین کا یہی طریقہ ہے؟ کیا ان کو ان کے دینی مدارس اور درسگاہوں میں نفرت انگیزی کی تعلیم دی جاتی ہے؟ کیا مسلمان قوم کی فلاح و بہبود کا یہی صحیح طریقہ ہے؟ جو ان لوگوں نے اپنے ناروا سلوک سے دنیا پر عیاں کر رکھا ہے؟ افسوس کہ کسی نے کبھی تنقیدی نظر ڈالی تو نفرت، زجر و توبیخ اور لعن طعن کے ہتھیاروں سے گھائل کر دیا گیا یا اس کی ایسی خبر لی گئی کہ پست ہمت ہو کر ہمیشہ کی دست برداری کی غافل نیند سو گیا — صد ہزار افسوس — یہ کیا دھاندلی ہے

محض گمراہ خیالات کا ردِعمل ہے جو ان کی غلط انفرادی آزادی کا نتیجہ ہے) تقدیر کو بیکار سمجھ کر بیٹھے رہنا اور حسنِ عمل، حسنِ تدبیر، جد وجہد اور ترقی کے لئے کوشش وکاوش سے غافل ہو جانا عین گمراہی ہے — اسلامی طریقہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دینِ اسلام، اہلِ اسلام کو جمود اور سکوت کی تعلیم نہیں دیتا۔ لیکن

جمود

محترم! غور فرمایئے آج مسلمانوں پر جمود وسکوت کی کیفیت طاری ہے آخر کیوں؟ وہ خود کو بے بس، لاچار و مجبور کس لئے خیال کرتے ہیں؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ جمود وسکوت اور یہ بیچارگی کی کیفیت کس طرح دور کی جا سکتی ہے ہم اور ہمارے رہبر اس کے لئے کیا کر رہے ہیں اور کیا کرنا چاہیئے؟

تحفظ حقوق

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں اقلیتوں کے ہر طرح کے حقوق ان کی فیصد تعداد کے لحاظ سے تعلیم، ملازمتوں اور دیگر سارے سرکاری شعبوں میں سرکاری سطح پر محفوظ ہیں ہندوستان میں سب سے بڑی اقلیت ہوتے ہوئے آپ نے اپنے یہ تمام حقوق کیوں محفوظ نہیں کرائے؟ کس لئے آپ نے مسلمانوں میں کس مپرسی کو فروغ دے رکھا ہے مسلمانوں کو قابلیت اور اہلیت کے باوجود آج کوئی بھی نہیں پوچھتا آخر کس لئے؟ ان کی فیصد تعداد کے لحاظ سے ان کے واجب حقوق کے سرکاری سطح پر باضابطہ تحفظ کیلئے آپ نے کیا نمایاں کام انجام دیئے اس میں آپ کہاں تک کامیاب رہے ہیں؟

محکمہ قضات

تمام مسلمانوں کے انفرادی واجتماعی نظم ونسق کو شرعِ اسلامی کے دستور العمل کے مطابق چلانے کیلئے آپ پر لازم تھا کہ آپ سرکاری سطح پر محکمہ قضات قائم کرتے اور اسے باضابطہ طور پر اپنے دستِ اختیار میں لیتے اور اس طرح مسلمانوں کی حیات ملی کا شیرازہ منتشر نہ ہونے دیتے اگر یہ آپ کی ذمہ داری نہیں تھی تو پھر کس کی تھی؟

جماعتیں

آج تمام ملک میں غیر مسلم قومیں جو اپنے "دھرم بھید" کی بنا پر ایک دوسرے سے قطعاً متفرق تھیں، آج باہم متحد اور منظم نظر آتی ہیں — اتحاد بُرا نہیں ہوتا — کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کا وہ عظیم ترین مذہب "اسلام" جس کے آپ علمبردار ہیں — متفرق جماعتوں یا پارٹیوں یا جمعیتوں میں منقسم، منتشر اور مختلف ہو گیا ہے۔ حضور والا کیا اسلام کی یہی تعلیمات تھیں؟ اسلام اپنے ماننے والوں کو کیا انتشار اور تفرقہ کا سبق دینے آیا تھا — یا — اتحاد واتفاق کا؟ خطاوار کون لوگ ہیں؟ ان کا علاج کیا ہے؟ آپکی کیا رائے ہے؟

محترم المقام

میں کسی جماعت یا جمعیت سے متعلق نہیں ہوں اور نہ کسی سیاسی پارٹی کا ممبر ہوں۔ میں صرف ہندوستانی مسلمان ہوں جو تمام ہندوستانیوں کی فلاح وبہبود کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بھی ترقی اور خوشحالی چاہتا ہے اور اس کے لئے فلاح وبہبود کے سامان کا متلاشی ہے کیا مسلمانوں کو آپ کے علمی وعملی خزانوں سے یہ سامان فراہم ہو سکتا ہے؟ آپ کسی بھی شک وشبہ سے بے نیاز ہو کر خادم کی معروضات پر غور فرمائیں۔ میں بے حد متفکر ہوں اور اپنی معروضات کا تسلی بخش جواب چاہتا ہوں۔ مجھے قوی امید ہے کہ آپ یقیناً اپنے خیالاتِ عالیہ کا اظہار فرمائیں گے اور میری آہ وبکا — صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی[۱]۔ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ چند ضروری گذارشات ہیں جو میں مسلم ناخداؤں کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور ان سے ٹھنڈے دل سے سوچنے اور اطمینانِ قلب سے غور وفکر کرنے کی اپیل کرتا ہوں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

مخلص سید ساجد حسین شمسی سیوہاری
ایم۔اے۔ علیگ۔

۱؎ ممکن ہے یقین ہے کہ صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ کیوں؟ اسپر حاشیہ میں بحث کرنا مشکل ہے ع۔

مسجد سے میخانے تک

از ملّا ابن العرب مکّی

ستم ظریفی پینتیسویں قسم پر ہے، لیکن چھتیسویں قسم یہ بھی دیکھئے کہ اجمیر شریف کی درگاہ سے وہاں کے سجادے صاحب نے ایڈیٹر تجلّی کو دعوت نامہ رسید کر دیا ہے اور اس دعوت نامے کے بطن سے ایک سینتیسویں قسم بھی برآمد ہوئی۔ منی آرڈر فارم! اس پر "پانے والے" کی جگہ انگریزی میں یہ پتا چھپا ہوا ہے:۔

"صاحبزادہ سید الطاف احمد چشتی نظامی۔ نیازی منزل۔ نزد جھالرا۔ اجمیر شریف۔"

اور اس منی آرڈر فارم کی دعوت نامے میں بایں الفاظ درج ہے

"اور اگر کسی وجہ سے حاضری نہ ہو سکے تو حسب توفیق رقم ذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر گھر بیٹھے عرس کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوں۔

قبول نذر ہو مقبول بندگی ہو جائے
نہ حاضری ہو تو اس طرح حاضری ہو جائے

دیگر عقیدتمندان کو بھی توجہ دلا کر حضورؒ کی فاتحہ خوانی کے لئے ذریعہ منی آرڈر رقم دعاگو کے پتے پر ارسال کرا دیجئے گا آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی مگر اس کا صلہ حضور غریب نوازؒ کی جناب سے ضرور بالضرور ملے گا۔"

میں نے ایڈیٹر تجلّی سے پوچھا:۔

"آپ جائیں گے یا رقم بھیجیں گے؟"

وہ بیزاری سے بولے:۔

"جاؤ اپنا کام کرو۔"

میں سمجھ گیا وہ اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ دعوت نامے کو صرف ایک سرسری نظر ڈال کر انھوں نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ میں ان کی طرح خشک وہابی تو ہوں نہیں کہ اتنے ایمان افروز موضوع کو یونہی ٹل جانے دیتا۔ دعوت نامہ ادب سے اُٹھایا اور نامۂ دلدار کی طرح اللہ بسم اللہ کر کے پڑھا۔ از بسکہ ایک ایک سطر سے عاقبت روشن ہوتی چلی گئی اور دل بے اختیار مچل اُٹھا کہ ایڈیٹر تجلّی پر بھی چودہ نہ سہی دو چار طبق تو روشن کر ہی دیئے جائیں۔

"یہ اجمیر القدس کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے مطبوعہ دعوت نامے کے سرنامے سے گفتگو چھیڑی۔ انھوں نے جیسے سُنا ہی نہیں، بس ایک خشمگیں سی نگاہ ڈال کر رہ گئے۔ مجھے جھینپ بھی ہوئی اور جھلاہٹ بھی۔ آپ خود سوچئے کتنے رنج کی بات ہے کہ جو شخص دوسروں کو دنیا بھر کے مسئلے بتلائے وہ ہمارے سوال کا جواب تک نہ دے۔ پیرایہ بدل کے پوچھا:۔

"شاید ایک فرشتے کا بھی تو نام روح القدس ہے؟"

"ہوگا؟" وہ بے توجہی سے بولے۔

"تو گویا آپ کو قرآن میں بھی شک ہے۔ یہ نام تو قرآن میں آیا ہے۔"

انھیں ضبط کے باوجود تبسّم آگیا۔ اب میری ہمت کھلی۔

"ہوسکتا ہے اجمیر القدس، روح القدس کے بھائی کا نام ہو۔ آپ کی کیا تحقیق ہے؟"

"بکے جاؤ گے ___ جاؤ کام کرنے دو۔"

میں گھُٹ کے رہ گیا۔ دعوت نامے کے کئی فقرے دماغ میں کیچوؤں کی طرح کُلبلا رہے تھے اور محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اگر معدے میں اُتر گئے تو استفراغ ہو جائے گا۔ مجبوراً کاتب صاحب کی طرف رُخ کیا جو چور نظروں سے دعوت نامے کی طرف دیکھتے جا رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر مجرمانہ تبسّم تھا جو اس بات کا نشان تھا کہ انھیں اپنی پچھلی رنگین زندگی یاد آرہی ہے۔ پہلے وہ خالص اہلسنت والجماعت تھے۔ کلیر اور اجمیر وغیرہ کی گلی گلی دیکھے ہوئے تھے۔ ایک ایک

بیان ہے کہ نجشا خہ قوالی انھی کی ایجاد ہے۔ پھر نہ جانے کیا افسوں ہوا جماعت اسلامی کے کسی جادوگر نے ان پہ جادو کا ڈنڈا پھیر دیا اور اب عرصے سے ایڈیٹر تجلی کے ساتھ وہابیت کی سنگلاخ وادی میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

"کاتب بھیا۔ لو تمھاری عاقبت روشن کردوں۔ سنو کیا لکھا ہے:"

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مچلے۔ قلم کو بندوق کی طرح ترچھا کرکے خاموش دھمکی دی مگر جس کے کلیجے میں چھتیسوں ستم ظریفی کچوکے لگا رہی ہو وہ ان کی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا کہاں تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا:۔

"جہاں ماہِ رجب المرجب کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس ماہ کی ۲۷ تاریخ کو حضور سرکار دو عالم کو معراج حاصل ہوئی وہاں یہ بھی ہے کہ حضور خواجۂ خواجگان معین الدین حسن چشتیؒ کا عرس مبارک یکم رجب المرجب تا چھ رجب انعقاد ہوتا ہے۔"

ایڈیٹر تجلی چلتا ہوا قلم روک کر سر پکڑ کے بیٹھ گئے تھے۔ کاتب صاحب بولوں کی طرح منھ پھاڑے شاید یہ سوچ رہے تھے کہ منہوں یا دہاڑیں ماروں۔ میں نے انھیں جھنجوڑا:۔

"لیجے داد دو نا۔ دونوں مصرعے کتنے برابر کے ہیں؟"

"جی۔۔۔جی۔۔۔" وہ ہکلائے۔

"کیا جی جی" ایڈیٹر صاحب یکلخت برسے "اس گدھے کی ساتھ تم بھی لگ گئے کام کرو۔"

کاتب صاحب کے ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا۔ اسے سنبھالنے کے لئے ہڑبڑا کے جو ہاتھ بڑھایا تو دوات الٹ گئی "استغفراللہ" کہہ کر دوات سنبھالنے لگے تو ناک کی عینک ڈیسک پر گری، اور ایک شیشہ اللہ کو پیارا ہوا۔

"اور نہ دو داد۔"

میں یہ کہہ کر بھاگ پڑا۔ بھاگنے ہی میں سلامتی تھی۔ کیونکہ اگر ایڈیٹر صاحب اجمیر القدس کے پورے پورے معنی سمجھنے پر آجاتے تو وصیت کا موقع بھی کس گدھے کو ملتا۔

راستے میں صوفی تاثیر علی مل گئے۔

"اماں کہاں بھاگے جا رہے ہو؟"

"اجمیر القدس۔۔۔۔ ار رر کہیں نہیں کہیں نہیں۔"

میں نے قدم سست کر دیئے۔ ان کے چہرے پر حیرت اچک آئی۔

"کیا کہا اجمیر القدس۔۔۔۔ یہ نام آپ کو کہاں سے معلوم ہوا؟"

"آپ" انھوں نے طنزاً کہا تھا ورنہ اُن کا تو پرانا مقولہ ہے کہ جو شخص وہابی بدبختوں سے آپ سے بولے وہ بسبب تعظیم الوہابیہ کے کافر جہنمی ہوا۔ بیوی طلاق کھا گئی۔ باپ کا ورثہ بھی نہیں پائے گا۔

"یہ نام آپ کو پسند ہے"؟ میں نے سوال کیا۔ وہ جھنجلا کے بولے:۔

"اسے تم یہ بتاؤ کہ کہاں سے معلوم ہوا؟"

"ان کے بھائی صاحب سے۔"

"کن کے بھائی صاحب سے؟"

"بس ایک ہی تو ان کے بھائی ہیں اور کس سے۔"

"اماں کن کے۔ کیا ہانک رہے ہو؟"

"تعجب ہے آپ کیوں نہیں سمجھ رہے۔ روح القدس کے سوا اجمیر القدس کا کون بھائی ہے۔ بھائی بھائی کا نام بتا دے تو کیا عیب ہوا۔"

"عیب کون مردود کہتا ہے مگر۔۔۔ ہائیں یعنی کیا کہا روح القدس؟"

"جی بے شک روح القدس۔ آپ کو اعتراض ہے؟"

"اماں اعتراض پتراض نہیں۔ یہ نام ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا۔ کیا داتا اجمیری کے کوئی بھائی صاحب بھی تھے؟"

میرا بھیجا بھک سے اڑ گیا۔ اس قابلیت کا صوفی بھیجا کیا کھوپڑی تک اڑا سکتا ہے۔ بہت ہی پیار سے کہا:۔

"مائی ڈیر صوفی آپ نے قصہ اگر گل پڑھا ہے؟"

"ہاں ہاں دو دفعہ۔"

"اور قصہ چہار درویش؟"

"وہ بھی دو دفعہ۔"

"اور گل بکاولی؟"

"وہ بھی دو دفعہ۔"

"تو اب دو دفعہ آپ میرا گلا گھونٹ دیجئے قصہ پاک ہو جائیگا"

"جانے کیا ایڈی بینڈی باتیں کرتے ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اب کی تمھیں بھی دعوت نامہ پہنچا ہے۔"

"پہنچا تو ہے، مجھے نہ سہی ایڈیٹر تجلّی کو سہی۔"

"ارے اُس اکفر کو کس نے بھیج دیا؟"

"پوچھ کے بتاؤں گا۔ اب کی تو میرا بھی ارادہ چلنے کا ہے۔"

"نہیں۔ قسم کھاؤ ۔ ۔ ۔"

"آپ کے سر کی قسم ۔ ۔ ۔"

"قسم قرآن کی ضرور چلو۔ دنیا بدل جائے گی۔ وہ وہ مزے کراؤں گا کہ عمر بھر یاد کرو گے۔"

"مزے ۔ ۔ ۔ یعنی؟" میں نے انھیں گھورا۔ انھوں نے دانت نکال دیئے۔

"یہاں کیوں بتائیں۔ تم قسم کھاؤ تو کان میں بتائینگے۔"

"کیا مطلب؟ کوئی نازک بات ہے؟"

"ارے اللہ کی قسم کیا پوچھتے ہو۔"

پھر وہ قسم لینا بھی بھول گئے اور سرگوشی کے انداز میں کچھ ایسی باریک باتیں بتانے لگے کہ میں ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے اُفق کے اُس پار پہنچ گیا۔ اُفق کے اُس پار بڑے نایاب منظر ہیں۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کو تو یہاں بس حسن و عشق ہی ٹہلتے نظر آئے۔ میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ صوفیوں اور صوفیا نیوں کے غول ہرنوں کی طرح کلانچے لگاتے اُڑے چلے جا رہے ہیں۔ ایک لمبی زلفوں والے بزرگ سے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ جواب ملا تم بھی آؤ آج پرمٹ کا دن ہے۔

"پرمٹ" میں بڑبڑایا "کس چیز کا۔"

"اماں جنت کا اور کاہیں کا۔ وہابی ہو گیا؟"

وہ ٹھٹک گئے۔ مشتبہ نظروں سے مجھے گھورا اور پھر ایسے زور کا دھکا دیا کہ اُفق پار سے لڑھکتا ہوا میں اپنے صوفی تاثیر علی کی گود میں آ گرا۔

"اماں اماں ہوش میں بھی ہو" انھوں نے مجھے جھنجھوڑا۔

"اوہ ۔ ۔ ۔ ارے معاف کیجئے گا میں ذرا اُفق کے اُس پار چلا گیا تھا۔ تو کیا کہہ رہے تھے آپ عشق مجازی ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں عشق مجازی۔ بس اب چپ رہو گھر پہ باتیں کرینگے۔"

"اچھا۔ بس ایک بات اور بتا دیجئے۔"

میں نے جیب سے دعوت نامہ نکالا۔ اس میں "جنتی دروازہ" کی سُرخی دے کر یہ الفاظ لکھے گئے تھے:۔

"جنتی دروازہ مسلسل چھ دن تک کھلا رہتا ہے۔ اہلِ عقیدت کا ہجوم اور انبوہِ کثیر کو دیکھ کر خانۂ کعبہ کا تصور آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔"

"اس دروازے کا کیا مطلب ہے؟"

وہ فخریہ انداز میں مسکرائے پھر کھنکھر کے بولے:۔

"ارے یہی تو ہے داتا کی دین۔ اس میں داخل ہو جاؤ تو سارے پچھلے اور ایک سال کے اگلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

"واللہ؟"

"نہیں تو کیا۔ جبھی تو کہتے ہیں وہابیت سے توبہ کر لو ۔ ۔ ۔"

"میں اب بھی آپ کو وہابی نظر آتا ہوں؟" میں نے شکایت کی۔

"ارے نہیں یہ تو ہم نے یونہی کہہ دیا تھا۔ مگر تجلّی مردود میں مضمون کیوں لکھتے ہو۔"

"مضمون۔ آپ بھی غضب کرتے ہیں، وہ مضمون ہوتا ہے؟"

"ارے تو اور کچھ ہوگا۔ شاید مقالہ کہتے ہوں۔"

"جی ہاں جی ہاں۔ میں در اصل تجلّی کا منھ کالا کرنا چاہتا ہوں سمجھے نا آپ؟"

"مقالے سے منھ کالا کیسے ہوگا؟"

"ارے دیکھتے نہیں ہیں مزار شریفوں اور صوفیوں درویشوں کے کتنے قصّے لکھتا ہوں۔ ایڈیٹر تجلّی آدھے اہلِ سنّت تو بن گئے ہیں۔ بس والجماعت کی کسر ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ ہاں یار میں بہت دنوں سے والجماعت کا مطلب پوچھنا چاہ رہا تھا۔ ہم تو اہلِ سنت والجماعت ہی ہیں نا؟"

"سولہ صدی۔ والجماعت کا مطلب کیا مشکل ہے۔ یہ سب مجمع جو عرسوں میں لگتا ہے کچھ کم والجماعت ہے۔"

ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"توبہ - ہمارا تو دھیان بھی ادھر نہیں گیا تھا۔" وہ خوش ہو گئے
"اب پوچھے کوئی دیا بجرا۔"
"کیا کسی نے پوچھ لیا تھا؟"

"جی ہاں - ایک دفعہ ریل میں ایک بدمعاش مل گیا تھا۔ باتوں باتوں میں عرسوں کی بات آگئی تو ہم نے کہدیا کہ تم سب کافر، اصلی اہل سنت والجماعت تو ہم ہیں خبردار جو اولیاؤں کو بُرا کہا --- اس نے پوچھا والجماعت کا کیا مطلب ہے؟ ہم نے کہا تمھیں کیوں بتائیں۔ اُس نے کہا بتانا پڑے گا نہیں تو زنجیر کھینچ لوں گا۔ ہم نے کہا زنجیر کھینچ لو گے تو رپٹ لکھوا دیں گے۔ اُس نے کہا رپٹ لکھوانے گے تو گاڑی سے باہر پھینکدوں گا۔ ہم نے کہا گاڑی سے باہر پھینکدو گے تو جواہر لال جی سے شکایت کرکے جیل بھجوا دیں گے۔ اُس نے کہا جیل بھجوائیں گے تو کفر کا فتویٰ لگوا دوں گا۔ ہم نے کہا تم کیا فتوے لگواؤ گے تم خود کافر تمہارا خاندان کافر۔ تمہاری سات پیڑھی کافر.... اماں - اماں کہاں چلے۔"

انھوں نے مجھے گلی میں مڑتے دیکھ کر کہا۔ میں گھر سے دراصل دودھ لینے چلا تھا۔ ایک مہمان آئے بیٹھے تھے جن کے لئے چائے تیار ہونی تھی۔ بیوی نے چلتے چلتے تنبیہ کی تھی کہ دیکھئے دس منٹ سے زیادہ نہ لگیں --- لیکن اب پون گھنٹہ گذر چکا تھا۔

"پھر ملیں گے، صوفی صاحب آپ میرے لئے سیٹ ریزرو کرا رکھیں اجمیر ضرور چلنا ہے۔"

---

۱۷ جنوری سنہ ۶۶ء: --- اسکولوں کالجوں کے زندہ دل طلباء کے ترقی یافتہ ایجیٹیشنوں میں اب کوئی ندرت نہیں رہی کہ ان کے ذکرِ جمیل سے رونقِ محفل کا فائدہ اٹھایا جائے لیکن ایک تازہ ایجیٹیشن ایسا نفیس سامنے آیا ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنا از بس کفرانِ نعمت ہو گا۔

خبر ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے بالغ نظر طلباء نے ایک سینیر پروفیسر کے خلاف اس الزام کے تحت شور برپا کر دیا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی کسی طالبہ سے عشق بازی کر رہے ہیں۔

لطف یہ کہ انھوں نے جب غیر جانبدارانہ تحقیق کا مطالبہ کیا تو وائس چانسلر صاحب نے رد کر دیا اور یونیورسٹی غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دی گئی۔

غرض یہ ہے کہ بات کیا ہوئی؟ عشق کرنا فطرت اور حکومت کسی کے بھی آئین میں صرف طالب علموں کی جاگیر نہیں ہے۔ اس میں بوڑھا جوان، دھوبی نائی، ادیب، تاجر، آپ سب برابر کے شریک ہیں۔ پروفیسر اگر چار ہاتھ پیروں والی ہی کسی مخلوق کا نام ہے تو کون مائی کا لال ہے جو اس سے عشق لڑانے کا حق چھین سکتا ہے۔ یہ اچھی زبردستی ہے کہ عشق جیسی جمہوری اور بے پناہ حد تک عوامی چیز کو طلباء اپنا ہی حق سمجھ لیں۔ نہ پروفیسر بیچارے کا حقہ پانی بند کیا جائے۔ بڑا اچھا کیا وائس چانسلر صاحب نے کہ تحقیقات کا مطالبہ ٹھکرا دیا۔ نہ ٹھکراتے تو کل کلاں کو یہ الزام بھی ضرور کسی پروفیسر کے خلاف اُٹھتا کہ یہ صاحب مونگ کی دال کھاتے ہیں۔ ارے بھئی کھاتے ہیں تو آنجناب کا کیا بگڑتا ہے۔ مونگ کی دال تو پھر بھی اتنی مقبول عام اور جمہوری نہیں ہے جتنا عشق ستم پیشہ۔ پروفیسر کو عشق ہوا ہے تو ویسے بھی وہ ترس کھانے کے قابل ہیں کہ چچا غالب نے اسی دن کے لئے کہا تھا:-

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

اب اگر طلباء چچا غالب تک پر اعتبار نہیں کرتے تو سمجھ لینا چاہئے کہ قیامت قریب ہے۔

دیکھو بھیا طلباء! یہ پروفیسر تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔ تمہاری ہی طرح یہ بھی ایک دن طالب علم تھے۔ ساتھی لڑکیوں کی صحبت میں جو سبق تم آج پڑھ رہے ہو وہی کل یہ بھی پڑھ چکے ہیں۔ جو کل پُرزے تمہارے بدن میں ہیں ان کے بھی بدن میں ہیں، جو احساس، جو پیاس، جو اثر پذیری تمہارے اندر ہے وہی سب انکے اندر بھی ہے۔ آنچ پاکر پگھلنے کی جو صلاحیت تمہارے دل و دماغ میں ہے اس سے ان کے دل و دماغ بھی محروم نہیں ہیں۔ پھر یہ کیا کہ تم تو عشق کرو اور وہ صبر کریں۔ زمانہ بہت آگے گیا اب کون یقین کرے گا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

سوچو خرابی کی جڑ کہاں ہے؟

تم کیا سوچو گے بڑے بڑے افلاطون --- آج کے افلاطون بغل میں لٹھ کا لئے شہر میں ڈھنڈورا پیٹتے پھر رہے ہیں۔ آؤ تمھیں دکھاؤں۔ امریکہ ہے نا سائنس دانوں، مدبروں، انسانیت دوستوں کا ملک۔ وہی جسے تم پیار سے چچا سام کہتے ہو۔ اس کے معاشرتی

حضرات نے کبھی دیکھی تمھاری نگاہ مطالعہ سے گذرے ہی ہوں گے گذرے ہوں تو ابھی تقریباً دو سال پہلے کی چھپی ہوئی امریکہ ہی کی ایک ذمہ دار کمیٹی کی وہ رپورٹ اٹھا کر پڑھ لو جس کی خوفناک تفصیلات کا حاصل وصول یہ ہے کہ امریکن معاشرے کی ڈکشنری میں "عصمت مآب خاتون" اور "جوئے شیر" کے معنے ایک ہی ہو گئے ہیں۔

دور کیوں جاؤ تو تازہ رپورٹ دیکھو۔ یہ معاشرتی اصلاح کی ایک امریکی ایسوسی ایشن نے عصمت فروشی کے کاروبار کے بارے میں تیار کی ہے۔ اس کے مطابق امریکہ کے ہر ایک لاکھ کی آبادی کے شہر میں ایک ہفتہ کے اندر کم از کم ۴۱۹ افراد طوائفوں کے پاس جاتے ہیں۔

پھر یہی رپورٹ شرح سود کی طرح شرح بدکاری نکالتے ہوئے سوال کھڑا کرتی ہے:۔

"آخر ملک کی ۱۷ فی صدی بالغ آبادی پیشہ ور طوائفوں کے پاس جانے کے لئے کیوں آمادہ ہوتی ہے؟ آخر لوگوں کا اخلاقی احساس اس حد تک کیوں مُردہ ہو گیا ہے کہ وہ عصمتوں کے نیلام گھر میں سودے چکانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے؟"

ذرا خیال تو دوڑاؤ جب "لائقِ حساب" بدکاریوں کا یہ عالم ہے تو "نالائقِ حساب" بدکاریاں کتنی بے شمار ہوں گی۔ مگر فدوی کو اس سے بحث نہیں۔ دکھانا تو اُس افلاطونی کا ہے جو اس سوال کے جواب میں پیش کی جا رہی ہے۔ وہاں کے اصلاح پسند معاشرتی کارکن ——— جو ظاہر ہے منوں عقل اپنے بھیجوں میں منوں علم اپنے دماغوں میں اور منوں خلوص اپنے دلوں میں رکھتے ہوں گے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ امریکہ کی آبادی جنسی دیوانگی کا شکار ہو گئی ہے۔

ٹھیک فرمایا ہو گئی ہے، مگر یہ جواب کیا ہوا۔ یہ تو آپ نے الفاظ بدل کر سوال ہی کی جگالی فرما دی۔ خیر سے کچھ اور بھی مزے مزے کی نکتہ سنجیاں کی گئی ہیں جنھیں یہ بقراطِ زماں تشخیص اور نباضی کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ ان لوگوں کا حال مسٹر گمنام علی جیسا ہے۔ گمنام علی کی بات میں تمھیں سناؤں۔

ایک گاؤں والے کا چاندی کا روپیہ سڑک پر گر گیا۔ گمنام علی پاس ہی کھڑے تھے نظر بچا کے بوٹ اس پر جما دیا اور لگے پوچھنے کہ بھئی کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ اُس نے کہا روپیہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہنے لگے دیکھو نالی کی طرف ڈھلاؤ ہے اس میں چلا گیا ہوگا۔ اسنے نالی چھان ماری تو بولے۔ ممکن ہے کنڈا کھا کر دور جا گرا ہو دس بیس گز اِدھر اُدھر بھی ڈھونڈو۔ اس بیچارے نے یہ مشورہ بھی مانا، تو اب ہاتھ کی صفائی میں کیا دیر تھی۔

یہ امریکن سقراط — بلکہ تہذیب مغرب کے متوالے سارے ہی ملکوں کے سقراط بقراط روپے کو جوتے تلے دبا کر ڈھلاؤ اور گندے کی سائنس جھاڑتے ہیں۔ خوب کہا تھا بیر رحمتہ اللہ علیہ نے "بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈورا۔"

انھوں نے آگ اور پٹرول کو کھل کھیلنے کا ہر ممکن موقع مہیا کیا اور اب شعلے بھڑک رہے ہیں تو خوردبینوں سے مطالعہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ پٹرول کمبخت میں جلنے کا جنون پیدا ہو گیا ہے!۔ ہزار باتیں بتائیں گے، لاکھ منطقیں چھانٹیں گے مگر اصلی وجہ — سورج سے زیادہ روشن وجہ پر انگلی نہیں رکھیں گے کہ ہم نے خود ہی "عورت" کو گھر سے نکال کر یہ گل کھلائے ہیں۔ ہم نے خود ہی جنسی فسطائیت کا دہانہ کھولا ہے۔ ہم اپنی ہی بوئی ہوئی کھیتی کاٹ رہے ہیں۔

تو پیارے طالب علمو! پروفیسروں کو بھی عشق کرنے دو۔ تم بھی دل کھول کے کرو۔ ہمارے بعض بے حد بڑے لیڈروں نے بڑے کام کی بات کہی ہے کہ جب تک عورتیں برقعے اور گھونگٹ اُٹھا کر مردوں کے دوش بدوش زندگی کے اسٹیج پر کام نہیں کریں گی کام نہیں بنے گا۔ فھو المراد۔

۱۸ر جنوری ۱۹۶۶ء:۔ کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" پر ایک طرف تو یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ اس کے مصنف نے صدہا سال کے متفقہ اعتقادات و تصورات کے خلاف ایک نیا باطل فکر پیش کیا ہے اور اس کی کتاب کے مطالب اہل سنت والجماعت کے متفق علیہ معتقدات کے یکسر خلاف ہیں۔ اب دوسری طرف ایک اس سے متضاد قسم کا الزام ملاحظہ ہو۔ ایک سُنی صاحب تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"کتاب کا ماخذ (خلافت معاویہ ویزید کا) بڑی حد تک
ایک عالم کے حواشی ہیں ..... منہاج السنۃ (ابن تیمیہ)
بے نظیر کتاب ہے اور اہل سنت والجماعت کی طرف سے
حجت ہے۔ منہاج السنۃ کا مختصر خلاصہ امام ذہبی نے
"المنتقی" کے نام سے لکھا ہے ..... اس کتاب میں جگہ جگہ
محب الدین خطیب نے نوٹ اور حواشی کا اضافہ کیا ہے انہی
حواشی کو مصنف (محمود احمد عباسی) نے اپنی کتاب کا اصل
موضوع بنایا ہے اور بغیر نام بتائے اور کسی قسم کی نشاندہی کے
شیخ محب الدین خطیب کی تمام کاوش کو اپنی علمی وتحقیقی
کاوش ثابت کرنے کی ذلیل کوشش کی۔ جب ہم نے المنتقی
اور اس کے ان حواشی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ "خلافت معاویہ
ویزید" کے فاضل مصنف نے غالباً ایک لفظ بھی اپنی طرف
سے نہیں لکھا ہے، بلکہ انہی حواشی کا ترجمہ اور چربہ لے لیا
ہے۔" (روزنامہ انقلاب بمبئی ۱۸ر نومبر بحوالہ صدق جدید)

چلئے اُس بلند بانگ اور ہولناک الزام کا تو تصفیہ ختم ہوا جو
مصنف پر پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ لگایا جا رہا تھا کہ اس نے
کہنہ تصورات کے خلاف کوئی نئی بات کہی ہے۔ یہ الگ بات ہے
کہ موصوف نے اس الزام کے جواب میں صاف صاف کہا ہے کہ
میں نے المنتقی اس سے قبل دیکھا بھی نہیں تھا اور یہ قطعاً افترا ہے
کہ میری کتاب کے جملہ مطالب ومضامین بعینہ وہی ہیں جو المنتقی
کے حواشی کے ہیں۔ چلئے مصنف کے انکشاف کو خلاف واقعہ تسلیم کر لیجئے
لیکن اس الزام نے کیا دو اور دو چار کی طرح یہ حقیقت منکشف نہیں
کردی کہ "خلافت معاویہ ویزید" میں پیش کیا ہوا فکر ومواد انوکھا نہیں
ہے۔ نیا نہیں ہے۔ طبعزاد نہیں ہے، بلکہ صدیوں پہلے بھی ایسا ہی
نقطۂ نظر رکھنے والے علماء موجود رہے ہیں اور علماء بھی معمولی نہیں،
کتاب ابن تیمیہ کی، خلاصہ حافظ ذہبی کا اور حواشی محب الدین
خطیب کے۔ یہ کچھ معمولی اجتماع ہے۔

معلوم ہوتا ہے یہ "تبصرہ نگار صاحب کچے سنی ہیں جو
انھوں نے ابن تیمیہ کی منہاج السنۃ کو اہل السنۃ والجماعۃ کی
طرف سے حجت لکھ دیا، ورنہ جو پکے اور اصلی مادر زاد اہل السنۃ
والجماعۃ ہیں انھیں تو ابن تیمیہ کے نام سے جاڑا چڑھتا ہے۔ وہ
تو انھیں گمراہ اور وہابی اور دشمن اولیاء قرار دیتے ہیں۔ وہی ہیں جن کے
پیٹ میں "خلافت معاویہ ویزید" کی اشاعت ومقبولیت سے
سب سے زیادہ مروڑ ہوا ہے۔ وہ کبھی نہیں مان سکتے کہ منہاج السنۃ
حجت ہے۔

آپ کو خبر ہے یہ حافظ ذہبی کون تھے جنھوں نے المنتقی
پیش کی ہے۔ ایک ایسے امام وقت جن کے کمالِ علم وتبحر پر علمائے حق
کا اجماع ہے اور جن کے مرتبہ ومقام کا خلاصہ طبقات الکبریٰ
میں علامہ تاج الدین سبکی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"وہ ذہبی جملہ علوم وفنون میں ایسے کامل تھے کہ جیسے
ایک ہی شخص میں تمام امت جمع ہوگئی ہو۔"

بات اتنی خشک ہوگئی کہ آپ بور ہو رہے ہوں گے۔
غرض کرنا مقصود یہ ہے کہ ایک دو جگہ ممنوع الاشاعت قرار دیئے
جانے سے نہ تو "خلافتِ معاویہ ویزید" کے جملہ مطالب غلط قرار
پا سکتے ہیں نہ اُن دو چار نقیدوں سے جن میں اس کے بعض حوالوں
کو محرّف اور سقیم ظاہر کیا گیا ہے اُس فکر واستدلال کی پوری
عمارت گر سکتی ہے جسے عقل ونقل کی مضبوط بنیادوں پر اٹھایا
گیا ہے۔

۱۹ر جنوری سنہ ۶۶ء:۔ آپ یقین نہیں کریں گے ایڈیٹر تجلی کی
ناک کے نیچے یعنی ان کے گھر کے پہلو ہی میں پیر دنگئی شریف رحمۃ اللہ
علیہ کا مزار ہے۔ اس مزار پر چراغاں نہیں ہوتا، میلہ نہیں لگتا،
پھول نہیں چڑھتے۔ صوفی گل بکاؤلی کو بڑا غم تھا کہ اتنے بڑے
بزرگ کا مزار سونا پڑا ہے۔ میں نے پوچھا:۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ بڑے بزرگ تھے؟"——
آنکھیں پھڑپھڑا کے فرمایا:۔
"معلوم کی کیا بات ہے۔ آخر پیر تھے۔"
"پیر تو میں بھی ہوں۔ بس کمی اتنی ہے کہ زندہ ہوں۔ مر جاؤں گا
تو ایمان لاؤ گے۔"
"اجی جاؤ وہابی کے تو فرشتے بھی پیر نہیں ہو سکتے۔"
"فرشتے پیر ہو کے کیا کریں گے۔ انھیں قوالی سے دلچسپی
نہیں ہوتی۔"

"کیوں نہیں ہوتی" وہ تڑخے "ہم نے خود ایک رات فرشتوں کی محفل دیکھی ہے حوران بہشتی بھوسلے قوال والی قوالی گا رہی تھیں۔"

"اور عزازیل صاحب طبلہ بجا رہے تھے" — میں نے فقرہ پورا کیا۔

"عزازیل یعنی کہ موت کا فرشتہ؟" انھوں نے سٹپٹا کے پوچھا۔ میرے کلیجے میں شعلہ لپکا۔

"آپ نے فارسی تو پڑھی تھی؟"

"کیوں نہیں گلستاں بوستاں سب پڑھی ہے۔"

"شیخ سعدیؒ کا یہ شعر یاد ہے:-

تکبر عزازیل را خوار کرد

بہ زندانِ لعنت گرفتار کرد"

انھوں نے ایک منٹ سوچا پھر بڑبڑا کے بولے:-

"اماں لاحول ولا قوت۔ یہ تو شیطان کا نام ہوا۔ قرآن کی قسم تم وہابی بڑے چالباز ہوتے ہو۔ بھلا محفلِ سماع میں ابابیل کا کیا کام۔"

"عزازیل —" میں نے تصحیح کی" ابابیل کے انڈے تو دوا میں کو بھی نہیں مل رہے۔"

"نہ ملیں۔ عزازیل کے بچے ہوگے تم۔"

"میں نے کبھی طبلہ نہیں بجایا۔۔۔"

تو اسی طرح کے اہم مکالمے میرے اور ان کے درمیان کئی مرتبہ ہوئے تھے۔ مجھ سے مایوس ہو کر انھوں نے ایک اور راگ پھیلایا۔ محلے کے دو چار ٹوٹے پھوٹے مسلمانوں کو تاک کے ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے لگے۔ بہانہ حقہ پینے کا ہوتا۔ پھر مرحوم بزرگوں کی کرامتوں کے قصے سنانے لگے تو بہانے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ ان قصوں پر محلے کے پڑھے لکھے مسلمان تو شاید انھیں مار بیٹھتے کیونکہ یہ سب خیالات کے اعتبار سے ایڈیٹر تجلی ہی کے بھائی بند تھے مگر ان کے تاکے ہوئے اَن پڑھ مزدور پیشہ مسلمان کراماتِ الاولیاءؒ پر دم مارنے کی جرأت کہاں کر سکتے تھے۔ وہ جھوم جھوم اٹھتے تھے اور جب عقیدتوں کی بہار پوٹے جوبن پہ آگئی تو صوفی صاحب نے ایک دن آنسوؤں کی برسات میں ہچکیاں لیتے ہوئے ان سے کہا "خدا کا قہر نازل ہونے والا ہے اس محلے پر۔ ہائے میں کیا کروں۔"

مریدین — یعنی ٹوٹے پھوٹے مسلمان سٹپٹائے۔

"جی کیا ہوا صوفی جی؟"

"کچھ نہ پوچھو چھ دن سے برابر ایک ہی خواب دیکھ رہا ہوں آج تو معاملہ بالکل صاف ہو گیا۔"

مریدین گذشتہ اسباق سے خوب جان چکے تھے کہ "رویائے صادقہ" پر ایمان لانا بھی اللہ و رسول پر ایمان لانے کی طرح ضروری ہے۔ گھبرا کے بولے "کیا خواب تھا جی؟"

صوفی جی نے ایک درجن ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لیں پھر دردناک لہجے میں نوا پیرا ہوئے:-

"چھ دن سے روز رات کو پیر دستگیر رحمۃ اللہ علیہ خواب میں آکر کہہ رہے ہیں کہ بکا دلی! ان محلے والوں سے کہو اب بھی ہوش میں آجائیں خدا کا قہر جوش میں آنے والا ہے۔ میں ہاتھ جوڑ کے جواب دیتا ہوں قطب صاحب صاف بتائیے کیا بات ہے۔ وہ غضبناک ہو کے کہتے ہیں۔ مردود پوچھتا ہے کیا بات ہے۔ ارے ہم نذر نیاز فاتحہ سے ترسے پڑے ہیں۔ اندھیرے میں جی گھٹا جا رہا ہے۔ چراغ جلاؤ، نیاز کرو، عرس بلاؤ۔ ہم سے اللہ میاں نے کہا تھا کہ پھونک دو ان بدبختوں کو۔ ہم نے ترس کھا کے جواب دیا تھا کہ ذرا سمجھا لیں۔ پھر بھی نہ مانے تو پھونک دینگے اب ہم تمھیں سمجھا رہے ہیں۔ تم محلے والوں کو سمجھاؤ —— تو یہ خواب چھ روز سے نظر آرہا تھا۔ ہمیں ڈر لگا کہ عرس کی بات زبان سے نکالی تو آپ لوگ ناراض ہو جائیں گے۔ آپ لوگوں کو وہابیوں نے بہکا رکھا ہے۔"

"وہابی!" کئی مخلص بڑبڑائے "یہ کیا چیز ہوتی ہے۔"

"بڑی گندی چیز۔ گلستاں اور پند نامے وغیرہ میں صاف لکھا ہے کہ قیامت کے دن دوزخ کی آگ وہابیوں ہی سے جلائی جائیگی۔ یعنی جیسے چولھا جلاتے ہیں کہ چپٹیں رکھیں اور ماچس دکھا دی۔"

مریدین نے ایک دوسرے کو خوف اور حیرت سے دیکھا۔

"آج کے خواب میں پیر صاحب نے صاف کہا ہے" صوفی صاحب نے کراہتے ہوئے کہا "کہ اب برداشت نہیں ہو سکتا۔

یا تو میرے مزار شریف کو اس کا حق ادا کرو ورنہ لاتا ہوں سارے محلے پر عذاب "

مریدین تھر تھر کانپ گئے۔ ایک بڑے میاں تو مارے ہیبت کے اتنی زور سے حقے میں کش لگا گئے کہ حقے کا پانی منھ میں آگیا اور ہڑبڑا کے کلی کی تو صوفی صاحب کا منھ دھل گیا۔

اس حقانی کانفرنس کا نتیجہ ظاہر ہے وہی ہوا جو صوفی صاحب چاہتے تھے۔ سب ایک وفد کی شکل میں ایڈیٹر تجلی کے سر پر جا دھمکے۔ مزا آگیا ایڈیٹر صاحب نے سلام دعا کر کے سب کو بٹھایا تو چھوٹتے ہی نبی بخش بولا۔ یہ ادھیڑ عمر کا قصاب تھا

" مولوی جی کیا آپ وہابی ہیں؟"

اور سب کی آنکھوں میں بھی یہی سوال جھانک رہا تھا۔

ایڈیٹر موصوف نے پہلے ان سب پر طائرانہ نظر ڈالی اور پھر صوفی جی کے چہرے پر جما دی۔ وہ کلبلائے۔ چہرہ ایسا ہی بنا رکھا تھا جیسے معاملات حاضرہ سے غیر متعلق ہوں اور سب کے ساتھ یونہی بطور دُم کے تشریف لے آئے ہوں۔

" تو آپ ہیں؟" ایڈیٹر صاحب نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا۔

" جی ۔۔۔ جی میں تو ویسے ہی ۔۔۔"

" کیا ویسے ہی ۔۔۔" موصوف دہاڑے۔" ہاں صاحبان آپ بتائیں کیا قصہ ہے؟"

" بتاؤ نا صوفی جی "۔ سب نے کہا۔

بیچارے صوفی جی پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔ انھوں نے بمشکل ہکلا ہکلا کے خواب بیان کئے۔ میں یقین کئے بیٹھا تھا کہ خواب سُن کے ایڈیٹر صاحب کا پارہ ہزار ڈگری چڑھ جائے گا، بلکہ تھرمامیٹر ہی کو توڑ پھوڑ کے افق کے اُس پار پہنچ جائے گا مگر یہ کیا۔ وہ تو بڑے اطمینان سے سُنتے رہے اور جب سُن چکے تو نہایت شگفتہ آواز میں بولے :-

" تو کم بخت ابلیس بازی لے ہی گیا "۔

" جی ۔۔۔ کیا ۔۔۔" ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ سب کے چہروں پر حیرت کی کوچی پھرتی چلی گئی تھی۔

" کچھ نہیں۔ میں اگر کاموں کی مصروفیت میں بھول نہ جاتا تو صوفی صاحب کو کبھی یہ خواب نہیں آتے "۔

ایڈیٹر صاحب اتنا کہہ کر ٹھنڈی آہ بھر کے چپ ہو گئے لیکن ابھی سب کے لئے نہیں خود میرے لئے بھی ایک ہزار برس سے کم نہیں تھی۔ اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر کئے گوش برآواز تھے کہ دیکھئے کیا شگوفہ چھوٹتا ہے۔ موصوف نے کھانسی کے دو چار ٹھسکے لیتے ہوئے، جو یقینی مصنوعی تھے لب کشائی کی :-

" آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ یہ سب شیطان کی کارستانی ہے۔ ابھی پچھلے مہینے گجرات سے غوث اکبر حضرت قطب الدین چشتی کا آدمی میرے پاس آیا تھا ـــ آپ حضرات تو جانتے ہیں نا انھیں؟

" جی ہاں جی نہیں ۔۔۔۔" حاضرین بڑبڑائے۔ انکے فرشتوں نے بھی کبھی یہ نام نہیں سنا تھا۔

" ارے بھئی وہی جنھوں نے پیدل حج کیا تھا۔ جن کے کئی ہزار مریدین بغداد اور سمرقند۔ اور بخارا وغیرہ میں بھی ہیں۔ امام الاولیاء "۔

" اچھا۔ جی ہاں۔ پیدل حج کیا تھا؟"

" اور کیا۔ خیر تو انھوں نے خاص طور سے یہی کہلانے بھیجا تھا کہ اپنے محلے سے ہوشیار رہو ہمیں کشف کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ شیطان لعین تمھارے محلے کے نیک اور سیدھے سچے مسلمانوں کو بہکانے کی تاک میں ہے۔ خبردار ایسا نہ ہو۔ وظیفہ بتاتا ہوں وہ مہینے تک ہر جمعرات کو اسے پڑھنا شیطان کی کاٹ ہو جائیگی ـــ اس حکم کی تعمیل میں میں نے دو جمعراتوں کو تو وظیفہ پڑھا تھا مگر پچھلی جمعرات کو بھول گیا۔ اسی دن شیطان پیر دنگلی رحمۃ اللہ علیہ کے بھیس میں خواب میں آیا اور چڑانے لگا کہ دیکھو اب ہم کیا تماشہ کرتے ہیں "۔

حاضرین منھ پھاڑے ایڈیٹر صاحب کا منھ تک رہے تھے۔ صوفی صاحب کبھی منھ بناتے کبھی دیدے نچاتے۔

" تو بھائیو۔ شیطان گمراہی پھیلانے کے لئے ایسی ہی حرکتیں کرتا ہے اور یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ ہمارے پیارے رسول کے علاوہ وہ ہر بھیس میں آسکتا ہے "۔

" ہاں جی یہ تو بڑوں سے سُنتے آئے ہیں "۔ ایک بڑے میاں نے کہا۔

" بس تو سمجھ لو۔ اس لعین کو یہ بات بہت کھل رہی تھی کہ تم

... اپنے کاموں میں لگے
رہتے ہو۔ صبح سے شام تک محنت کر کے رزقِ حلال کماتے ہو۔
اللہ کا شکر کرتے ہو۔ مزاروں درگاہوں پر نہیں جاتے شرک
نہیں پھیلاتے۔ اس نے یہ ترکیب نکالی کہ خواب میں صوفی صاحب
کو آدبوچا تاکہ وہ تمھیں ورغلائیں اور تم قبر کی پوجا شروع کر دو۔ اب
دیکھ لو شیطان کا کہا مانوگے یا اللہ رسول کا۔"

"لعنت ہے شیطان خبیث پر" بھوندو پیپی والا لہرایا۔
"اپنے اللہ رسول پر ہم جان دیدیں گے۔"

"جبھی تو میں کہوں یہ نیا کھیلا کیا کھڑا ہوا" نبی بخش
گھنایا "اجی صوفی جی اب کی آئے تو مارنا سسرے کو اتنا کہ
ٹانگ ٹوٹ جائے۔ پھر دیکھیں گے کیسے بہکانے جاتا ہے۔"

"ارے اور کیا" سلو پہلوان اکڑا "میرے خواب میں
آئے تب دیکھوں بدمعاش کو۔ مار مار کے بھرکس نہ نکال دوں
تو حلال کا نہیں۔"

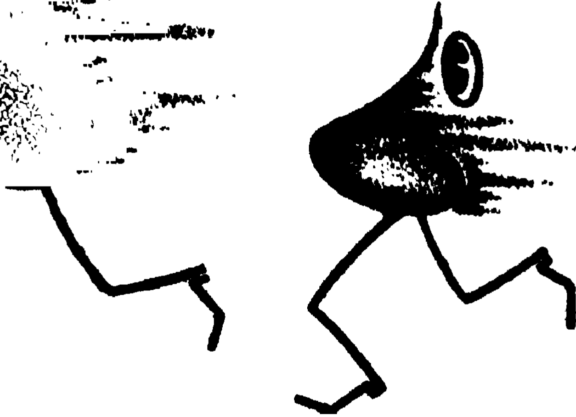
صوفی صاحب زبانِ حال سے یہ مصرعہ گنگنا رہے تھے۔

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

اور اس طرح پیر دنگی رحمۃ اللہ علیہ کا عرس ہوتے ہوتے
رہ گیا۔ صوفی صاحب باہر نکل کے تو بہت بھرے ہونگے لیکن
ایڈیٹر تجلی سے ان کا دم ہمیشہ ہی نکلتا ہے۔ اس وقت دم سادھے
یوں بیٹھے رہے کہ جانتے تھے وہ قرآن و حدیث شروع کر دیں گے
اور اپنے گلستان اور پند نامہ وغیرہ کے ریڈی میڈ حوالے غوطے
کھاتے رہ جائیں گے۔

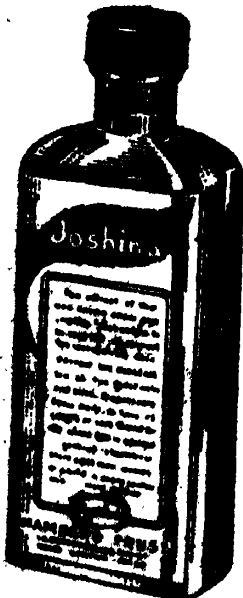
یہ تو ہوا۔ سوال یہ ہے کہ علاج بالمثل کا یہ طریقہ جائز
بھی تھا؟ میں نے ایڈیٹر صاحب سے بعد میں پوچھا تھا تو انھوں
نے جواب دیا تھا کہ عزیزم! ہر چیز کا ایک محل ہے، ایک وقت
ہے کبھی چٹکلے وہ کام کرتے ہیں جو بڑے سے بڑا استدلال نہیں کر سکتا
اب کیا میں ان معصوموں کو الف بے پڑھانے بیٹھتا شیطان
جس انداز کا حربہ لایا تھا میں نے اسی انداز کی ڈھال سے حملہ
واپس کر دیا ہے۔ (ملا زندہ صحبت باقی)

STOP RUNNING NOSES



With —

Joshina



جوشاندہ کے جو اجزا دو ہزار سال سے کامیابی سے استعمال ہوتے آرہے ہیں
جوشینا انہی اجزا کا ایکسٹریکٹ ہے، یہ جوشاندہ سے زیادہ مؤثر اور استعمال میں زیادہ سہل ہے۔

جوشاندہ کو پکانے، چھاننے اور شکر ملانے کا قدرے طویل عمل **"جوشینا"** کی ایجاد سے ختم ہوگیا۔

نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش اور نزلی بخار میں **"جوشینا"** کی ایک خوراک تھوڑے سے گرم پانی یا چائے میں ملا کر پی لیجیے۔ گرم پانی یا چائے موقع پر نہ ملے تو ایک خوراک یوں ہی چاٹ لیجیے۔

"جوشینا" ہر جگہ، ہر وقت اور ہر موسم میں سب کے لیے یکساں مفید ہے۔



ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی - کانپور - پٹنہ

اے خدا اتنی گری ہے قیمتِ خونِ حسینؑ!

جب جذبے کو منطق اور رسم ورواج کے سانچے میں ڈھالکر مستقل مذہب بنا لیا جائے تو آنسو اور آہیں، ماتم اور بَین سب مذاق بنجاتے ہیں۔ رنج والم کی چوٹ کھاکر آنکھوں سے آنسو نکل پڑنا مین فطرت ہے، لیکن یہی عمل جب جشن اور میلے میں تبدیل ہوجائے تو اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز چیز کوئی نہیں۔ عامر عثمانی

اہلِ ماتم خندہ زن؟ ماتم سرا بزمِ نشاط؟ — قہقہے اور چہرۂ رنجیدہ و محزون سے؟
چشمِ شاعر! منظرِ عبرت ہے، — مہندی کا جلوس — قوم ہولی کھیلتی ہے — کربلا کے خون سے!

اللہ اللہ، کس قدر دلچسپ ہے، یہ امتزاج — ہُوْل گنج اور سینہ کوبی — کربلا اور جوشِ جنگ
حُرملہ کا تیر اُدھر اصغر کی گردن کے لئے — بام سے دل پر، ادھر چشمِ طوائف کے خدنگ

اُس طرف، سیر و نمائش کے لئے نیزوں پہ سر — اس طرف "تفریحِ خاطر کو ہے علموں کی برات
اُس طرف، وقف محن آلِ رسول واہلبیت — اِس طرف، — محوِ تماشہ مومنین و مومنات!

موت کے سائے میں رقصِ دلفگاراں اُس طرف — مستیوں کی حد میں جشنِ سوگواراں اِس طرف
شومیِ بختِ شہیداں — خوبیِ تقدیرِ قوم — بارشِ خوں اُس طرف فصلِ بہاراں اِسطرف

پنکھڑی میں گُل کی جیسے چُبھ رہی ہے، نوکِ خار — مل رہا ہے جیسے پانی میں تمنا کا لہو
کس قدر دلسوز نظارہ ہے 'اے پروردگار — پیاسے وہ، سیراب یہ 'وا العَطَش' یاں 'اشربو'!

گریۂ پیہم مسلسل قہقہوں کے رنگ میں — مرثیہ کی لَے میں — آہِ نارسا ہنستی ہوئی
نینوا! آشوب گاہ حشر! — یہ انبوہِ جشن — مضطرب دل مسکراتا — چشمِ نم ہنستی ہوئی

خندہ زن یہ رات ہے — اُس بیکسی کی رات پر — روح ہے "مردانِ جہد وکار" کی سوئی ہوئی
جمگھٹے میں مشعلوں کی رَو قطار اندر قطار — روشنی میں کربلا کی تیرگی کھوئی ہوئی

چشمِ گریاں، اور امواجِ تبسم، ساتھ ساتھ
نامۂ غم، اور شہنائی کا نغمہ — بین بین
الاماں! اس درجہ ارزاں عصمتِ ابنِ رسول؟
اے خدا! اتنی گری ہے — قیمتِ خونِ حسین؟

کھرے کھوٹے

معذرت جن حضرات کو یہ شکایت ہے کہ ہماری کتابوں پر جلدی تبصرہ نہیں کیا گیا۔ ان کی خدمت میں ادب کیساتھ گذارش ہے کہ وہ ہماری مجبوریوں پر بھی نظر فرمائیں۔ تبصرے کے صفحات آپ کے سامنے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم سرسری تبصروں کے عادی نہیں مفصل تبصروں کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے اور پوری کتاب کا مطالعہ وقت چاہتا ہے۔ اُن چند کتابوں کو چھوڑ کر جن کا پورا پڑھنا ہمارے بس میں نہ ہو باقی سبھی کتابوں کا ہم ورق ورق پڑھتے ہیں، لہٰذا ہر شخص کا یہ توقع کر لینا کہ ہماری بھیجی ہوئی کتاب پر فوراً تبصرہ ہو جائے گا اور جب یہ توقع پوری نہ ہو تو شکایتی خطوط لکھنا معصیت تو نہیں مگر ستم ظریفی ضرور ہے۔ ہم بڑی عاجزی کے ساتھ التماس کرتے ہیں کہ آپ حضرات بے ضبط نہ ہو جایا کریں۔

ویسے جن حضرات کے لئے صبر ممکن نہ ہو انھیں صاف لکھ دینا چاہئے کہ پڑھو یا نہ پڑھو ہماری کتاب پر تبصرہ کر دو۔ تو ایسے حضرات کی دلداری کے لئے ہم تعارف پیش کر دینے پر اکتفا کر لیا کریں گے۔

اب فی الوقت تبصرے کے لئے آئی ہوئی کتابوں میں چند اہم کتابیں حسب ذیل ہیں جن کے تبصرے میں اسی لئے تاخیر ہوئی ہے کہ پوری پڑھے بغیر ان پر تبصرہ کرنا تبصرے کا نام بدنام کرنا ہوگا۔ اور پڑھنے کے لئے ابھی وقت نہیں مل سکا۔

(۱) ابن تیمیہؒ

اس عظیم الشان شخصیت کا نام لیتے ہوئے زبان پر بے اختیار یہ شعر آتا ہے:۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

گذشتہ تیرہ سو سالوں میں یوں تو امتِ مسلمہ میں ہزاروں —بلا مبالغہ ہزاروں شخصیتیں ایسی ہو گذریں جن میں سے ہر ایک کو مہر و ماہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ امتِ مسلمہ کی تاریخ بلاشبہ لعل و جواہر کی ایک ایسی مالا ہے جس کا ہر موتی اپنی جگہ کوہِ نور سے کم نہیں، لیکن اِن بیش بہا موتیوں میں جن چند موتیوں کی آب و تاب سب پر فوقیت لے گئی' انھیں میں سے ابن تیمیہؒ بھی ہیں' بلکہ حق یہ ہے کہ صحابہؓ کے بعد اِس پائے' اِس مرتبے' اِس عبقری انفرادیت' اِس آن بان کے انسان معدودے چند ہی گذرے ہیں اور اِن میں بھی ابن تیمیہؒ بہت ممتاز' بہت نمایاں' بہت رفیع الشان اور بعض حیثیتوں سے وحید و فرید ہی نظر آتے ہیں۔ ہمارا مُنہ کیا ہے جو ان کی تعریف کر سکیں۔ یہ محض خوش عقیدگی نہیں بلکہ حقیقت ہے — ایسی حقیقت جو سورج کی طرح روشن اور پہاڑ کی طرح اٹل ہے کہ ابن تیمیہؒ اپنے وقت کے امام تھے۔ نہ صرف اپنے وقت کے' بلکہ ان کے بعد آج تک ایسی منفرد خصوصیات' ایسی عجیب و غریب استعداد' ایسی حیرتناک صفات کا بطلِ جلیل شاید ہی امتِ مسلمہ کی کوکھ سے پیدا ہوا ہو۔ جانتے ہیں آپ اِن کے عظیم المرتبہ معاصرین نے ان کے بارے میں کیا کیا کہا ہے۔ حالانکہ معاصرت وہ بلا ہے کہ اچھے سے اچھا عالم بھی اپنے کسی ہم عصر عالم کی توصیف و مدح میں عموماً بخل ہی کرتا ہے اور اسی لئے حبرالامت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:۔

"قسم اللہ کی علماء میں باہم اس سے بھی زیادہ مغائرت اور لاگ ہے جتنی جنگلی بکروں میں ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے باڑے میں ہوں"

لیکن جب سورج کی چمک آدمی کی آنکھوں کو چکا چوند کر دے' جب ہیرے کی تابش پکار پکار کر اپنا مول منوا لے اس سے انکار کون کہاں تک کرے گا۔

حافظ ذہبی کہ جن کی شخصیت اہل علم کی نظروں میں نجم سحر سے کم نہیں اور جن کی بیکراں عظمت و مرتبت پر علماء محققین کا اتفاق ہے۔ ابن تیمیہؒ کی جلالت و رفعت کا حال جھوم جھوم کر لکھتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو پکار اُٹھتے ہیں:۔

وھو اکبر من ان ینبّہ علی سیرتہ مثلی و واللہ لو حلفت بین الرکن والمقام انی ما رأیت بعینی مثلہ وانہ ما رأی مثل نفسہ لما حنثت۔	وہ ابن تیمیہ اس سے کہیں بلند و برتر ہیں کہ مجھ جیسا آدمی ان کی سیرت و مرتبت کا بیان کر سکے۔ خدا کی قسم اگر میں رکن و مقام کے مابین کھڑا ہو کر قسم کھاؤں کہ میری آنکھ نے ان جیسا کوئی نہیں دیکھا اور خود انھوں نے اپنا جیسا کوئی نہیں دیکھا تو میں جھوٹی قسم کا مرتکب نہیں ہونگا

\+ + + +

\+ + + +

پھر ایک حافظ ذہبیؒ ہی نہیں۔ یہ بات کہ:۔

"نہ میں نے ان جیسا کوئی دیکھا نہ خود انھوں نے اپنا جیسا کوئی دیکھا"

اور بھی اتنے بڑے بڑے محققین و متبحرین نے کہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک امتِ مسلمہ کا شیخ و امام سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً شیخ عماد الدین واسطی، ابن دقیق العید، ابن سید الناس، حافظ ابو الحجاج مزّی۔ ابن حجی، حافظ برزالی، مقدسی۔ ان میں سے کون ہے جسکی بالغ نظری، وسعتِ علم، دیانت داری، تبحر اور شان و شکوہ سے کوئی صاحبِ علم انکار کر سکے۔

حافظ عینی حنفی جن کی شرح بخاری حافظ ابن حجر کی فتح الباری کے بعد سب سے اچھی اور مبسوط شرح تسلیم کی جاتی ہے لکھتے ہیں:۔

"جو شخص ابن تیمیہ کے اعلیٰ ترین مرتبۂ علم و عمل، اجتہاد و امامت اور فضل و رفعت سے انکار کرتا ہے سمجھ لو وہ یا تو دیوانہ بے عقل ہے یا حد درجہ بے وقوف اور غبی یا سخت فتنہ پرداز اور شریر۔"

ابنِ تیمیہ کے دور میں صدہا — بلا مبالغہ صدہا بڑے بڑے علماء و ائمہ موجود رہے ہیں لیکن جو مقامِ بلند ابنِ تیمیہ کا تھا اُس تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

ہمارے دور کے بے نیازِ تعارف عالم مولانا ابو الکلام آزادؔ رحمۃ اللہ علیہ جس والہانہ عقیدت و ارادت کے ساتھ ابن تیمیہؒ کا ذکر کرتے ہیں وہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ صرف چند الفاظ مدح ذکر کرتا ہوں جو انھوں نے اس بطلِ جلیل کیلئے استعمال فرمائے ہیں

(۱) نادرۃ الارض (۲) اعجوبۃ الدہر (۳) آیۃٌ من آیات اللہ (۴) حجۃٌ من حجج اللہ (۵) سند الکاملین (۶) شیخ المصلحین (۷) امام العارفین (۸) وارث الانبیاء (۹) قدوۃ الاولیاء (۱۰) حضرت شیخ الاسلام۔

مولانا آزادؒ کی تحریر و تقریر پر نظر رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ وہ کسی کی تعریف کرنے اور اس کے لئے القاب و آداب استعمال کرنے میں رسمِ عام کے خوگر نہ تھے۔ اس کے باوجود اگر وہ ابن تیمیہ کے لئے یہ القاب و آداب استعمال کرتے ہیں اور والہانہ دلبستگی کے ساتھ ان کی عظمت و جلالت، ان کی انفرادیت، ان کے علم، ان کی عبقریت اور ان کے فضل و کمال کا تذکرہ فرماتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ شدتِ تأثر ہی کا نتیجہ ہے اور آزاد جیسے بحر العلوم کو بہت ہی غیر معمولی شخصیت اس طرح متأثر کر سکتی تھی۔

بات لمبی ہو گئی۔ ہم کہنا یہ چاہ رہے تھے کہ "امام ابن تیمیہؒ" کے نام سے افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری صاحب نے ۶۷۲ متوسط صفحات کی کتاب تالیف کی ہے جو تبصرے کے لئے آئی ہوئی ہے۔ اس پر جب پہلی نظر پڑی تھی تو نہیں کہہ سکتے ہمارے قلب و دماغ پر کیف و ابتہاج کی کیسی بارش ہوئی تھی۔ یہی لگا تھا جیسے ایک حور اپنے بے پناہ حسن و جمال کی تمام طلعتیں لئے ہوئے سامنے آکھڑی ہوئی ہے اور اس کی قبائے حریر سے رنگ و ریشم کی پھواریں چھوٹ رہی ہیں۔

لیکن مشاغل کی مہربانی اور فرائض کی فراوانی کو کیا کہیں کہ بایں ہمہ شوق اب تک اس گرانمایہ کتاب کے مطالعہ کی سعادت نصیب نہیں ہو سکی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کی نوبت آئیگی اور تبھی تبصرہ بھی کر سکیں گے۔ فی الحال تعارف میں اتنا سُن لیجئے کہ مجلّد کی قیمت دس روپے ہے اور مکتبہ تجلّی کے لئے بھی برائے فروخت منگائی جا رہی ہے۔

(۲) عثمانؓ

یہ مصر کے مشہور نقاد اور نامور محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی

تالیف ہے جس کا ترجمہ مولانا عبدالحمید نعمانی نے کیا ہے۔ صفحات ۲۰۶ قیمت چھ روپے۔

(۳) علی نفر

اس کے بھی مؤلف و مترجم حضرات مذکورہ ہی ہیں —— صفحات ۲۹۱ خورد۔ قیمت ساڑھے سات روپے۔

ان دونوں کتب پر بھی تبصرہ بعد مطالعہ ہی ہوگا تاہم انکی اہمیت کے پیشِ نظر انھیں بھی برائے فروخت مکتبہ تجلی منگا رہا ہے' ان سطور کے چھپنے تک شاید مذکورہ تینوں ہی کتابیں آچکی ہوں۔

نئے کردار | تعمیری افسانوں کا مجموعہ ● ازجناب مائل خیرآبادی ● صفحات ۱۲۰ ● لکھائی چھپائی پسندیدہ ● قیمت ایک روپیہ ● ناشر مکتبہ فردوس، ہمایوں باغ کانپور۔

دس مقصدی کہانیوں کا یہ گلدستہ اپنے پیغام اور مطالب کے لحاظ سے پاکیزہ اور عطر بیز کہا جاسکتا ہے۔ خوشی کی بات ہے، کہ مصنف کے فکری زاویئے اسلامی اقدار و تصورات کے رنگ و بو میں رچے ہوئے ہیں۔ انھیں بات کہنے کا سلیقہ بھی ہے اور مرکزی خیال کو پلاٹ کے تلنے بلنے میں سمونا بھی جانتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے' انھوں نے اپنا مخاطب خاص ہی حلقوں کو بنایا ہے اور اسی لئے زبان اور داخلی خطوط کو بے حد "عام فہم" بنانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کے اکثر افسانے ٹکنیک اور بیک گراؤنڈ پس منظر) کے اعتبار سے "افسانے" کی بہ نسبت "حکایت" سے زیادہ قریب ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اصلاحی مقاصد کے پیش نظر لکھے ہوئے افسانوں کو بچوں اور عورتوں اور کم استعداد مردوں کے دائرے سے آگے بڑھا کر عام ادبی لٹریچر میں مقبول بنانا اور رواج دینا ہے تو ان کی فنی اور ادبی سطح کو بلند کرنا ضروری ہے۔ جو ڈائرکٹ ایکشن (براہِ راست عمل)، "نئے کردار" کے بیشتر افسانوں میں پایا جاتا ہے وہ خاص حلقوں کی حد تک تو خوبی ہی شمار ہوگا، لیکن ترقی یافتہ فن اور عام ادبی لٹریچر میں اسے خامی قرار دیا جائے گا۔ مقصد اور مرکزی خیال اگر کرداروں کے خدوخال اور سناریو (منظرنامے) کے بین السطور کی بجائے خود مصنف کے منہ سے بول پڑا تو اس کی فنی وقعت گر جائیگی اور افسانے سے زیادہ اسے "وعظ" قرار دیں گے۔ افسوس صفحات میں گنجائش نہیں ورنہ ایک ایک افسانے کا تجزیہ کرکے یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ کہاں کہاں فن اور مقصد میں جنگ ہوگئی ہے۔ کہاں کہاں پلاٹ وعظ کی سرحد میں گھس گیا ہے اور کہاں کہاں کردار کی عوض خود مصنف بول پڑے ہیں۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ فاضل مصنف افسانے کے ترقی یافتہ فن کا مطالعہ کرکے آئندہ زیادہ بہتر زیادہ بلند اور زیادہ فنکارانہ شہ پارے پیش کرسکیں گے۔ موجودہ افسانے مفید و قیع ضرور ہیں، لیکن محدود نقطۂ نظر سے۔

پہلے افسانے میں ایک معیاری مسلمان کا نوجوان مجاہد اپنی بیوی ہی کے بارے میں یہ کہنا کہ:۔

"میرے مکان میں عرب کی بہترین حسینہ غزالہ میرا انتظار کررہی ہوگی"

غیر فطری ہے۔ بیوی جنت کی حور بھی ہو لیکن اس طرح کا جملہ اس کے لئے نہیں کہا جاسکتا۔ پھر ایک اجنبی جوان کے سامنے شالی اور معیاری مسلمان اپنی بیوی کا ذکر اس "اشتہار انگیز" انداز میں کبھی نہ کرے گا۔

"ان پڑھ" میں صفحہ ۴۴ پر:۔

"عمل کرتی رہیں تو ایمان کی روشنی بڑھتی رہی۔ پھر لگی دعوتِ تبلیغ کی آگ۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔ یہ آگ جب لگتی ہے تو تمناؤں کے سارے کھلیان کو جلا کر خاک کردیتی ہے"

یہاں "آگ" کا استعارہ اکھڑا ہوا ہے اور "تمناؤں" کا حسین لفظ "خواہشات نفس" کی جگہ استعمال ہوگیا ہے جو افسانوی ذوق پر یقیناً گراں ہوگا۔

"اس نے مردانہ لباس پہنا' داڑھی مونچھ چہرے پر لگائے اس پر ڈھانا باندھا" (ص ۶۵)

"لگائے" غلط ہے "لگائی" ہونا چاہئے۔ "ڈھانا" شاید کتابت کی غلطی ہو صحیح "ڈھاٹا" ہے۔

"اصل میں میرا یہ فعل اس ذہنیت کا نتیجہ تھا جو دنیا پرستی کی پیداوار ہوتا ہے" (ص ۹۴)

"ہوتا ہے" کا موقع نہیں تھا۔ "ہوتی ہے" کہنا چاہئے کیونکہ "اس" حرفِ صلہ لفظ "ذہنیت" پر داخل ہوا ہے جو مؤنث ہے لہٰذا موصول میں بھی صیغے مؤنث ہی کے ہونے چاہئیں۔

صفحہ ۹۵ پر پیشانی کے نشانِ سجدہ کو "گھٹا" لکھا گیا ہے۔

صحیح لفظ "گنا" ہے۔ چونکہ یہ دو جگہ اسی طرح آیا ہے اس لئے شاید کتابت کی غلطی نہیں ہے۔

حاصل تبصرہ یہ ہے کہ افسانوں کا یہ مجموعہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اور مصنف نے اگر اپنا معیار قدرے بلند کر لیا تو افسانوی لٹریچر کو وہ خاصے کی چیزیں دے سکیں گے۔

رسید کتب

تبصرے کی جو کتابیں ابھی تک محروم تبصرہ ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن کے دو دو نسخے وصول ہوئے ہیں۔ ان پر تو جب بھی توفیقِ مطالعہ نصیب ہوئی تبصرہ ہو ہی جائے گا۔ دوسری وہ جن کا بس ایک ایک نسخہ وصول ہوا ہے۔ ان پر تبصرہ نہ ہو سکے گا الّا یہ کہ بھیجنے والے مزید ایک ایک نسخہ بھیج دیں۔ دونوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

اوّل (جن کے دو نسخے وصول ہوئے)

(۱) درسِ اسلام (۲) کتاب الطہارت (۳) اسلامی بیت المال (۴) شاہراہِ ترقی (۵) بچوں کی ریاست (۶) تعمیرِ نو ہائی اسکول کا پہلا سال (۷) گلدستۂ مضامین اُردو تین حصّے (۸) پیامِ جاوید (۹) سہل تجوید (۱۰) طلوعِ حق (۱۱) اقتصادی تعاون (۱۲) اقتصادی سامراج (۱۳) موجِ کوثر (۱۴) اقبال اور عشقِ رسالت مآبؐ۔

دوئم (جن کا ایک ہی نسخہ وصول ہوا)

(۱) سراج البلاغت (۲) رہبرِ اسلام (۳) چشمۂ بصیرت (۴) مولانا ابوالکلام آزاد (۵) طبیہ کالج میگزین کا شیخ الرئیس نمبر (۶) عام معلومات (۷) حقیقت (۸) تفہیم الکلیات (۹) ردِّ یزید۔ (۱۰) احمدیہ جماعت کی چھ کتابیں (۱۱) مسلمان کی پہچان۔

باب الصحت

قبض رفع کرنے کی تدابیر

(از بیگم حکیم محمد عظیم زبیری - امروہہ)

قبض کی شکایت عموماً غیر متوازن غذا کے استعمال سے لاحق ہوتی ہے گندم کو مشین میں پسوایا جاتا ہے جس سے آٹا ضرورت سے زیادہ باریک ہو جاتا ہے اس پر طرہ یہ کہ گھر کی عورتیں اپنی نادانی اور طبی ناواقفیت کے سبب اس باریک آٹے کو بھی باریک چھلنی میں چھان کر اچوکر (بھوسی) نکال دیتی ہیں جو صحیح معنوں میں قبض کشا ہے آنتوں کی نفلاد دھکیلنے والی قوت کو قوی بناتا ہے۔ اگر پتے دار سبزیوں دودھ۔ اور پھلوں کا استعمال زیادہ کیا جائے گوشت اور دالیں کم استعمال کی جائیں۔ گندم کو دستی چکی میں پسوا کر کھایا جائے تو قبض اور اس سے متعلقہ امراض مثلاً اختلاج القلب۔ درد سر چکر۔ بواسیر ریاح۔ تبخیر اور عورتوں و مردوں کے مخصوص پوشیدہ امراض سے بہت حد تک امن مل سکتا ہے۔ ذیل میں وہ تدابیر لکھی جاتی ہیں جن پر عمل کرنے سے نہ صرف دائمی قبض رفع ہوگا بلکہ بیمار اور کمزور اشخاص کی صحت بھی بہتر بن جائے گی۔

جہاں تک ہو سکے آٹا بغیر چھانے استعمال کیجئے بلکہ آٹے میں مزید آٹے کا چوتھائی وزن چوکر ملا لیجئے۔ شلغم۔ گاجر۔ پالک بتھوا۔ سلاد۔ توری زیادہ کھایئے۔ سبزیوں میں چند ایسے کیمیاوی اجزا شامل ہوتے ہیں جن سے معدہ اور آنتوں کو ہضم کرنے والی رطوبت میں امداد ملتی ہے پھلوں کا روزانہ مسلسل استعمال دائمی قبض دور کرنے کے لئے بہت مفید ہے۔ آم خربوزہ۔ انگور امرود کھجور ارنڈ خربوزہ۔ انجیر وغیرہ قبض کشا پھل ہیں۔ کھانا کھانے کے درمیان حسب خواہش تھوڑا بہت پانی ضرور پینا چاہیے پھر غذا کے دو تین گھنٹہ بعد تو ضروری مناسب مقدار میں پانی پئیں دوپہر کی غذا کے دو تین گھنٹہ بعد دو تین گلاس پانی پینے سے آنتوں میں فاسد مادہ جمع ہونے نہیں پاتا۔ جب سبزیوں کا استعمال کم آلو۔ گوشت اور دالوں کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور پانی بھی کم پیا جاتا ہے تو جسم میں فاسد مادے جمع ہونے لگتے ہیں جس سے خون میں سمیت شامل ہو کر اختلاج کی شکایت ہو جاتی ہے قبض کی شکایت میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ غذا کے دو تین گھنٹے بعد خوب پانی پیا جائے۔ کھانا خوب چبا کر کھایئے دماغی سکون کو برقرار رکھ کر کھایئے جن کو قبض کی شکایت آئے دن رہتی ہو ان کو دودھ۔ پتوں دار سبزیاں۔ پھل اور پانی کا استعمال زیادہ کرنا چاہیے اور ماش۔ مسور۔ آلو۔ کچالو۔ اروی۔ کیک پیسٹری حلوہ پوری کچوری اور میدہ کی بنی دوسری چیزیں اور بازاری مٹھائیاں۔ گوشت نہایت کمی کے ساتھ کھانا چاہیے ایسے لوگ بکثرت ملیں گے جو قبض کش متوازن غذا کھاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ دن بھر بد پرہیزیاں کرتے ہیں اور سوتے وقت قبض کشا دوا کھا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چلو چھٹی ہوئی لیکن ایک دن ان سب بدپرہیزیوں کا نتیجہ بدلہ ضرور لیتی ہے قبض رفع کرنے کیلئے مسہل یا قبض کشا دوائیں کھانے سے یہ بہتر ہے کہ معدہ و جگر اور آنتوں کے فعل کو قوی کرنے والی دوا جیسے جوارش سفرجل لطیف حب اصل السوس استعمال کیجائے۔ ان کے مسلسل کچھ عرصہ استعمال سے آنتوں کی حرکت تیز ہو جاتی ہے قبض کی شکایت جاتی رہتی ہے قبض کی شکایت سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ اگر ایک وقت گوشت۔ مچھلی۔ انڈا۔ آلو۔ اروی۔ بھنڈی اور دالیں کھائی جائیں تو دوسرے وقت دودھ پھل اور سبزیاں استعمال کی جائیں جو لوگ اپنی صحت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور برباد شدہ تندرستی کو درست کرنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ ہمارا تازہ لٹریچر وہ محافظ شباب منگا کر پڑھیں مرد وں کی صحیح رہنمائی کیلئے یہ نہایت ہی کار آمد کتاب مفت تقسیم کر رہا ہوں لہٰذا ضرور آپ بھی اس مفید لٹریچر کا مطالعہ کریں اگر آپ نے منگانے میں تاخیر کی تو ایسی مفید کتاب آپ کو پھر دیر تک نہ مل سکے گی۔ بازاری فحش لٹریچر نہیں ہے اسمیں تو حسن جوانی اور صحت کو برقرار رکھنے اور بگڑی تندرستی کو سنوارنے کے سنہری اصول لکھے گئے ہیں اور نصیحت آمیز خطوط درج کئے گئے ہیں

نوٹ:- مردانہ۔ زنانہ اور بچوں کا ہر قسم کی بیماری کے متعلق مفت مشورہ لیجئے لیکن جواب کیلئے ٹکٹ یا پتہ لکھا لفافہ رکھنا نہ بھولئے۔ میرا پتہ یہ کافی ہے۔ بیگم محمد العظیم زبیری۔ امروہہ ضلع مراد آباد (انڈیا)



نفیس دینی و علمی کتابیں



کتابیں طلب کرنیوالے چند باتوں کا لحاظ ضرور رکھیں

(۱) تحریر اتنی صاف ہو کہ آرڈر کی تفصیل اور آپ کا پتہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو (۲) مجلد اور غیر مجلد کی بھی وضاحت کر دیجئے (۳) تقریباً بیس روپے سے زائد کتابیں منگانے کی صورت میں ریلوے پارسل میں کفایت رہتی ہے۔ اگر یہ کفایت مطلوب ہو تو اپنا اسٹیشن لکھئے۔ پارسل ریل سے اور بلٹی کی رسید ڈاکخانہ سے وی پی بھیجی جائے گی (۴) اگر آپ نئے نئے خریدار ہیں تو بیس روپے یا اس سے زائد کے آرڈر پر کچھ روپے پیشگی روانہ فرمایئے جنھیں وی پی میں کم کر دیا جائے گا (۵) ڈاکخانہ سے وی پی کی اطلاع ملتے ہی چھڑوا لیجئے، دیر کرنے سے واپس ہو جاتی ہے (۶) اگر آپ کو گمان ہو کہ وی پی توقع سے کچھ زائد رقم کی ہے تو اسے واپس نہ کریں، بلکہ وصول کرلیں۔ آپ کے اطلاع دینے پر مکتبہ یقیناً ہر شکایت کا ازالہ کرے گا۔

قرآن مترجم و معریٰ

قرآن بدو ترجمہ (۱) شاہ رفیع الدینؒ (۲) مولانا اشرف علیؒ متوسط سائز میں مجلد کریج کا ھدیہ ساڑھے بارہ روپے۔ بہت بڑے سائز میں مجلد کا ہدیہ پچیس روپے (اس کی لکھائی بہت جلی ہے)

قرآن بیک ترجمہ مولانا اشرف علیؒ۔ مجلد کریج کا ہدیہ ساڑھے دس روپے۔

قرآن بلا ترجمہ جلی قلم، روشن حروف عکسی مجلد کا ہدیہ آٹھ روپے

قرآن مترجم ترجمہ حضرت شیخ الہند۔ تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مطبوعہ بجنور۔ مجلد چرمی پشتہ پچیس روپے

قرآنی تفسیریں

تفسیر ابن کثیر احادیث کی روشنی میں آیات کا مفہوم ظاہر کرنیوالی وہ تفسیر جو دنیا بھر میں مشہور و مقبول ہے۔ ترجمہ سلیس، لکھائی چھپائی پسندیدہ۔ پانچ جلدوں میں مکمل۔ ہدیہ مجلد چھپن روپے۔ کوئی بھی جلد علیحدہ نہ مل سکیگی۔

تفسیر موضح القرآن شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کی یہ تفسیر اردو تفاسیر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے کلاں سائز۔ ہدیہ مجلد اعلیٰ بیس روپے۔ غیر مجلد سولہ روپے۔

تفسیر بیان القرآن مولانا اشرف علیؒ کی یہ عظیم تفسیر اپنا جواب آپ ہے۔ دو قسموں میں مہیا کی جا سکتی ہے۔

● بہت بڑا سائز۔ بارہ حصوں میں مکمل۔ ہدیہ غیر مجلد ساٹھ روپے۔ دو جلدوں میں مجلد ستر روپے ● تجلی جیسا سائز تیس پاروں میں مکمل غیر مجلد ساٹھ روپے۔ پانچ جلدوں میں مجلد پینسٹھ روپے۔ دوسری قسم کا ہر پارہ الگ بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔ فی پارہ دو روپے

تفسیر حقانی مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کی تفسیر نایاب ہو گئی تھی اب ہر ماہ ایک پارہ چھپ رہا ہے۔ اب تک اکیس پارے چھپ چکے ہیں۔ فی پارہ دو روپے (صرف پارۂ اول چھ روپے جو تین حصوں پر مشتمل ہے)۔

تفہیم القرآن اول و دوم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وہ تفہیم بالقرآن تفسیر جو غیر ضروری تفصیلات سے بچاتے ہوئے آپ کو براہ راست مغز قرآن تک پہنچاتی ہے۔ دل نشیں۔

مستند اور ذہن میں اتر جانے والی۔ ابھی پہلی اور دوسری جلدیں فراہم کی جاسکی ہیں۔ جلد اوّل مجلد ساڑھے بارہ روپے۔ جلد دوم مجلد...

علوم قرآنیہ

البیان فی علوم القرآن "مشہور تفسیر حقانی" کے مصنف مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کی عظیم الشان کتاب وہی ہے جس کی توصیف میں علامہ انور شاہ صاحبؒ جیسے علامہ نے یہ الفاظ لکھے کہ "اگرچہ اس کی نظیر ممکن ہے، لیکن واقع نہیں" خدا کی ذات وصفات تناسخ ملائکہ جزاء وسزا، قبر جنت، دوزخ، نبوت، ناسخ ومنسوخ، استعارہ وکنایہ اور اختلاف قرأت کی بحثیں، صفحات ۴۳۸ کاغذ لکھائی چھپائی معیاری۔ قیمت چودہ روپے (مجلد پختہ سولہ روپے)

قصص القرآن قرآن کے بیان فرمودہ قصص پر لاجواب کتاب عظیم معلومات کا خزانہ مستند اور محققانہ تفصیلات سے مالامال۔ حصہ اوّل سات روپے۔ حصہ دوم چار روپے حصہ سوم ساڑھے پانچ روپے۔ حصہ سوم ساڑھے پانچ روپے — حصہ چہارم سات روپے۔ مکمل سیٹ منگانے پر قیمت تیئس روپے۔ (مجلد مطلوب ہوں تو ایک پختہ جلد پر ڈیڑھ روپیہ بڑھ جائے گا)۔

لغات القرآن قرآنی لغات کی تشریح آسان زبان میں جو لوگ قرآن کو بلا ترجمہ سمجھنے کی خواہش اور شوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بڑی مدد فراہم کرتی ہے۔ مجلد چار...

علم الحدیث

مؤطا امام مالکؒ (مترجم عربی مع اردو) احادیث وآثار کا وہ مجموعہ جو بخاری سے پہلے مرتب ہوا سلیس ترجمہ کے ساتھ عربی متن بھی ہے۔ ہدیہ بارہ روپے مجلد کرمچ تیرہ روپے (مجلد اعلیٰ چودہ روپے)۔

بخاری شریف (خالص اردو) قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب بخاری کا سلیس اردو ترجمہ تین جلدوں میں مکمل ہدیہ چوبیس روپے۔ مجلد پختہ ستائیس روپے۔ مجلد اعلیٰ تیس روپے (مجلد کا مطلب تین الگ الگ جلدیں ہیں)۔

مشکوٰۃ شریف (خالص اردو) اردو ترجمہ دو جلدوں میں حاضر ہے۔ ہدیہ سولہ روپے۔ مجلد پختہ اٹھارہ روپے مجلد اعلیٰ بیس...

ترمذی شریف (خالص اردو) سفید عمدہ کاغذ حصہ اوّل مجلد نو روپے۔ حصہ دوم مجلد نو روپے (دونوں حصے بیک وقت طلب کرنے پر سولہ روپے

مشارق الانوار (مترجم) بخاری ومسلم کی صرف قولی احادیث کا نفیس انتخاب۔ ترتیب فقہی ابواب پر ہے جس سے یہ معلوم کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ کونسا مسئلہ کس حدیث سے نکلا ہے۔ ترجمہ کیساتھ تشریح بھی ہے اور عربی متن بھی ہدیہ چودہ روپے۔ مجلد پندرہ روپے (مجلد اعلیٰ سولہ روپے

بلوغ المرام مشہور امام فن حافظ ابن حجرؒ کی یہ کتاب بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور دیگر کتب معتبرہ سے منتخب کئے ہوئے دینی احکام کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ ترجمہ مع عربی متن مجلد آٹھ...

ترجمان السنّہ احادیث کی بہترین تفہیم وتشریح پر مشتمل اردو زبان میں اپنی قسم کی واحد کتاب، اشتہار میں اس کی خوبیوں کا اجمالی تعارف بھی مشکل ہے۔ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جلد اول دس روپے (مجلد بارہ روپے) جلد دوم نو روپے (مجلد گیارہ روپے) جلد سوم دس روپے آٹھ آنے (مجلد بارہ روپے آٹھ آنے)

صحیفہ ہمام بن منبہ بخاری ومؤطا امام مالک سے بھی قدیم وہ کتاب حدیث جو مشہور صحابی ابوہریرہؓ نے اپنے شاگرد ابن منبہ کے لئے مرتب کی۔ ہدیہ ساڑھے تین روپے...

بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی ایمان افروز کتاب کا اردو ترجمہ۔ بلند پایہ محدثین کے حالات اور خدمات وتالیفات کا پاکیزہ تذکرہ۔ مجلد پانچ روپے۔

ابن ماجہ (اردو) صحاح ستہ کی کتاب ابن ماجہ کا مکمل اور سلیس ترجمہ۔ شائقین حدیث کیلئے نادر تحفہ۔ صفحات ۶۶۰ ہدیہ مجلد بارہ روپے۔

عِلم الحدیث فلسفۂ علم الحدیث کی عمدہ تحقیق۔ قیمت سوا روپیہ

حضرت صدیق اکبرؓ

ازمولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ جس میں آپ کے ذاتی حالات و سوانح، عظیم الشان کارناموں، دینی و سیاسی خدمات جلیلہ، اخلاق و مکارم اور عہد صدیقؓ کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کے علاوہ اس دور کے اہم دینی، سیاسی، فقہی اور تاریخی مباحث و مسائل پر بڑی جامعیت اور تحقیق سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے۔ مجلد کہر پیچ آٹھ روپے

الفاروق

امیر المومنین خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات و سوانح پر علامہ شبلیؒ کی یہ کتاب دنیا بھر میں مشہور ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی

ازمولانا مناظر احسن گیلانیؒ ساڑھے پانچ سو سے زائد صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع پر لاجواب ہے قیمت مجلد بارہ روپے

حیات امام ابوحنیفہ یعنی سیرۃ النعمان

علامہ شبلیؒ کے قلم سے فقیہ اکبر امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے مفصل حالات زندگی، دلچسپ اور ایمان افروز قیمت تین روپے (مجلد چار روپے)

تجلیات عثمانی

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی علمی زندگی کے مفصل حالات آپ کے علم تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، منطق، فلسفہ، مناظرہ، تقریر، اردو، فارسی، عربی ادب اور سیاسیات پر سیر حاصل تبصرہ، بڑے ۷۱۲ صفحات جلد پر حسین سہ رنگا گرد پوش۔ قیمت مجلد ساڑھے دس روپے۔

سیرت اشرف

حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کی مفصل سیرت صفحات ۱۱۵۰ مجلد بارہ روپے۔

حیات ولیؒ

شاہ ولی اللہؒ اور ان کے آباؤ اجداد اولاد اور اساتذہ کا تذکرہ۔ مجلد کی قیمت چھ روپے۔

حیات امام احمد بن حنبلؒ

مصر کے مایہ ناز محقق ابوزہرہ کی معرکۃ الآراء کتاب "ابن حنبل" کا نفیس اردو ترجمہ۔ امام احمدؒ پر یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے قیمت دس روپے

محمد بن عبدالوہابؒ

ازمولانا مسعود عالم ندوی۔ بارھویں صدی ہجری کے مشہور مصلح شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی سیرت اور دعوت پر علمی و تحقیقی تصنیف جس میں شرق و مغرب کے تمام ماخذ پوری طرح کنگھال کر غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ قیمت ڈھائی روپے

الغزالی

امام غزالیؒ پر مولانا شبلی نعمانیؒ کی محققانہ تالیف جو آجکل کمیاب ہے (کاغذ رف) غیر مجلد دو روپے۔

سیرت عمر ابن العزیزؒ

اس جلیل القدر ہستی کی سوانح اور حالات جس کی خلافت کو اکثر علماء نے پانچویں خلافت راشدہ سے تعبیر کیا ہے۔ مجلد کی قیمت تین روپے۔

ردّ شرک و بدعت

تقویۃ الایمان (اردو)

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی وہ مشہور زمانہ کتاب جس نے اہل بدعت میں ہلچل ڈال دی۔ قیمت چار روپے (مجلد پانچ روپے)

الشہاب الثاقب (اردو)

بدعات کے رد میں ایک مفید کتاب قیمت پونے دو روپے

کتاب التوحید

ردشرک و بدعت میں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی نفیس کتاب قیمت مجلد تین روپے

بدعت کیا ہے؟

مولانا عامر عثمانی اور تین دیگر حضرات کے مضامین کا مجموعہ جو شرک و بدعت اور توحید و سنت کے فرق و امتیاز پر لاجواب مواد پیش کرتا ہے۔ مجلد تین روپے۔

ردّ عقائد بدعیہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب تھا یا نہیں؟ اس پر مفصل و مدلل بحث۔ قیمت ایک روپے

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ پر اہل بدعت کے ہوائی الزامات کا کافی و شافی رد۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ (مجلد دو روپے)

فیصلہ کن مناظرہ

مجلد ڈیڑھ روپے

[illegible]

اصلاح الرسوم مسلمانوں میں رائج شدہ رنگ برنگی رسموں کی شرعی پوزیشن کیا ہے؟ اسکا تحقیقی جواب۔ مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

تعلیم الدین دین کی تعلیم سے متعلق عمدہ تنبیہات و معلومات پر مشتمل۔ مجلد ایک روپیہ بارہ آنے۔

دعوات عبدیت مولانا اشرف علیؒ کے چند مواعظ کا مجموعہ جو عرصے سے نایاب تھا اس کے نو حصے مکمل ہو چکے ہیں۔ ہر حصہ مجلد اور ہر حصہ کی قیمت پونے دو روپے

عقائد و فقہ

بہشتی زیور مولانا اشرف علیؒ کی وہ شہرہ آفاق کتاب جو روزمرہ کے تمام دینی مسائل کے علاوہ سیکڑوں مفید مضامین پر مشتمل ہے۔ قسم اول مکمل مدلل مجلد پندرہ روپے۔ قسم دوم غیر مدلل مجلد سات روپے دونوں قسموں میں فرق یہ ہے کہ قسم اول میں تو حاشیہ پر عربی کتب کے حوالے دیئے گئے ہیں اور قسم دوم میں حاشیہ نہیں ہے۔ اصل مضمون دونوں کا ایک ہے۔

دین کی باتیں اسلام، ایمان، عمل صالح، ارکانِ اسلام، اخلاق حقوق، سیاست اور خدمتِ دین کے طریقوں پر نہایت دلنشیں اور ایمان افروز گفتگو۔ بلاک کی عمدہ چھپائی۔ قیمت پونے دو روپے

عقائد الاسلام قاسمی اسلام کے جملہ اصولی عقائد کو سہل زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ خطاب اگرچہ بچوں سے ہے لیکن بڑوں کے لئے بھی کتاب بہت مفید ہے کیونکہ تمام اصولی عقائد سے بڑے بھی کم ہی باخبر ہیں۔ ڈھائی روپے (مجلد تین روپے)

ادبیات

شاہنامۂ اسلام جدید حصہ اول از مولانا عامر عثمانی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصالِ مبارک اور اس کے بعد پہلی خلافتِ راشدہ کا قیام۔ خلیفۂ اول کا انتخاب کیونکر عمل میں آیا۔ جنگی اصول، معرکہ آرائیاں۔ تاریخ کی روشن

[illegible] صداقتیں زبانِ شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت مجلد [illegible] روپے

دیوان غالب نفیس ایڈیشن جس میں غالب کی تحریر کا عکس، ان کی تصویر اور بعض ایسے اشعار شامل ہیں جو دوسرے ایڈیشنوں میں نہیں پائے جاتے۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے

بیان غالب شرح دیوان غالب از آغا محمد باقر (ایم۔ اے)
اپنی شرح کے ساتھ حسب ضرورت دوسروں کی رائے بھی پیش کر دی ہے۔ جس کے باعث مجموعی حیثیت سے اچھی شرح ہو گئی ہے کتابت و طباعت اچھی، کاغذ سفید۔ مجلد مع کور، ضخامت ۴۲۸ قیمت چھ روپے

کلیات اقبال ڈاکٹر اقبالؔ کے اردو کلام کا انتخاب۔ قیمت مجلد پانچ روپے

آتش گل شہنشاہِ غزل جگر مراد آبادی کا نیا مجموعۂ کلام۔ جس پر حکومتِ ہند نے انعام دیا۔ مجلد مع کور قیمت پانچ روپے

فردوس ماہر القادری کی وجد انگیز نظموں کا دلپذیر مجموعہ قیمت ساڑھے تین روپے۔

اُردو کے چاند تارے اردو کے تقریباً تمام باکمال شاعروں کا مصور تذکرہ اور نمونۂ کلام۔ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے

نبضِ دوراں ہند و پاک کے مشہور شاعر جناب انورؔ صابری کا مجموعۂ کلام۔ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے

مختلف علوم و فنون

اصح السیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تاریخی واقعات پر مشتمل بہت نفیس، مفصل، مستند اور دلچسپ علمی و تحقیقی کتاب "سیرۃ النبی" کی ضخیم مجلدات کے سوا اردو میں کوئی کتاب سیرۃ اس کے پلے کی نہیں۔ مجلد دس روپے

حصنِ حصین (مترجم) دعاؤں، مناجاتوں، وظیفوں، اور جامع کلمات کا مشہور مجموعہ قیمت مجلد آٹھ روپے

مقدمہ ابن خلدون یہ شہرۂ آفاق کتاب اردو ترجمہ ہو کر آگئی ہے۔ مجلد پشتہ
قیمت پندرہ روپے (مجلد اعلیٰ سترہ روپے

اساسِ عربی عربی سیکھنے کے لئے عربی صرف و نحو کے قواعد کی عمدہ کتاب۔ پانچ روپے (مجلد چھ روپے)

ملفوظاتِ آزاد دینی، علمی، ادبی، سیاسی، تفریحی، تنقیدی اور تعریفی مسائل کے سلسلہ میں۔ ڈھائی روپے

فتوح الغیب (اردو) ایمان، تقویٰ، صبر، فقر، خیر و شر، جبر و قدر، سنت و بدعت اور شریعت و طریقت وغیرہا کے عنوانات پر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رح کے مشہور و معروف مقالات کا مجموعہ جس میں مولانا عبد الماجد دریابادی کا مبسوط تعارفی مقالہ بھی شامل ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

حکایاتِ صحابہ رض صحابی مردوں اور عورتوں وغیرہ کے سبق آموز واقعات جن کے مطالعے سے روح تازہ اور سینہ کشادہ ہوتا ہے۔ قسم اول مجلد تین روپے۔ قسم دوم سوا دو روپے۔

تحریک اخوان المسلمین مصر کی مشہور اسلام پسند جماعت "اخوان المسلمین" جس کے کئی رہنماؤں کو پھانسیاں دیدی گئیں۔ کیا ہے؟ اس سوال کا معتبر اور مفصل جواب حاصل کرنے کیلئے مصر کے محمد شوقی کی یہ قابلِ اعتماد کتاب ملاحظہ فرمائیے جس کا سلیس اردو ترجمہ سید رضوان علی نے کیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے

عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی وہ کتاب جو فرنچ اور دیگر زبانوں میں بھی بے شمار چھپی۔ عجیب کتاب ہے متعلقہ نقشے اور بدر، خندق، اُحد اور دیگر تاریخی مقامات کے چونتیس ۳۴ فوٹو بھی منسلک ہیں
قیمت ڈیڑھ روپیہ (مجلد دو روپے)

اُسوۂ حسنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ پر ایک نفیس کتاب جسے پڑھ کر باطل شکنی اور حق دوستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں بعض ایسی مفید باتیں ملیں گی جو عام طور پر کتبِ سیرت میں نہیں ملتیں۔ سوا دو روپے (مجلد سوا تین روپے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات شاہانِ عالم، عرب حکمرانوں، قبائلی سرداروں اور عاملوں کے نام دربارِ رسالت کی خط و کتابت اور معاہدات، ضروری تشریحات اور اصل خطوط کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ قیمت سوا دو روپے۔

حدیث اور قرآن از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ حدیث کا تعلق قرآن سے کیا ہے۔ دین میں حدیث کو کیا حیثیت حاصل ہے۔ رسالت کسے کہتے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس طرح کے سوالات کے دل نشین اور مدلل جوابات، یہ کتاب خالص تبلیغی نقطۂ نظر سے چھاپی گئی ہے۔ چنانچہ سفید کاغذ کے ڈیڑھ سو ۱۵۰ صفحات کی قیمت صرف بارہ آنے۔ ٹائٹل رنگین نفیس۔

مکاتیب سید سلیمان ندوی قیمت مجلد سوا تین روپے۔

کتاب الصلوٰۃ "نماز" پر امام احمد ابن حنبل رح کی مشہور کتاب ترجمے کے ساتھ امام صاحب کے اثر انگیز حالات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

اسبابِ زوالِ اُمت علامہ امیر شکیب ارسلان کی معرکۃ الآراء تصنیف۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

صراطِ مستقیم از شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ۔ نیا ایڈیشن عمدہ کتابت و طباعت۔ ڈھائی روپے۔ (مجلد تین روپے)

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں اشتراکیت کی عملی ناکامی پر ایک محققانہ کتاب۔ قیمت تین روپے۔

احسن الصلوٰۃ نماز، وضو، تیمم اور غسل کے فرائض و واجبات، سنن مستحبات اور مفسدات و مکروہات کو نہایت وضاحت سے درج کیا گیا ہے۔ صفحات ۴۸ صرف پانچ آنے۔

رحمۃ اللعالمین غیر مسلموں کی مدلل شہادتوں سے رسول اللہ صلعم کی عظمت و سطوت کا ثبوت صفحات ۳۲۔ تین آنے

محکمات قرآن کی بعض آیات اور ان کی تفسیروں پر علامہ عبد اللہ العمادی کا عالمانہ تبصرہ و محاکمہ۔ دو روپے بارہ آنے۔

اُردو کا مقدمہ اُردو کے بارے میں ادیبوں، شاعروں، سماجی کارکنوں، سیاسی لیڈروں اور اہلِ علم و فضل کی شہادتوں پر مشتمل دلچسپ ڈرامہ، جو پُر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو کے حق میں دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک روپیہ۔

حقیقت جماعت اسلامی پر کئے گئے بعض اعتراضات پر مولانا عامر عثمانی کی مفصل تنقید۔ قیمت دس آنے۔

[illegible] ... معاہدات ... از [illegible] ... مجلد [illegible] روپے۔

انسانیت موت کے دروازے پر
(از مولانا آزاد)

اس میں جن ۲۹ مشاہیر عالم کے آخری سبق آموز لمحات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:-
چاروں خلفائے راشدین رض۔ حضرت حسن رض حضرت حسین رض۔ حضرت معاویہ رض۔ حضرت سلمان فارسی رض۔ حضرت عمرو بن العاص رض۔ امام شافعی رح۔ مامون الرشید اور حجاج بن یوسف وغیرہ (تاریخ کربلا بھی شامل ہے۔ اسے منگانے والے "شہید اعظم" نہ منگائیں)
قیمت مجلد ساڑھے تین روپے

سنتِ رسول
مصنفہ:- مترجمہ:- ملک غلام علی۔ مقدمہ: مولانا مسعود عالم ندوی
"سنت" کے موضوع پر بے حد قیمتی کتاب۔ مجلد سوا دو روپے

آئینۂ حقیقت نما
اس قیمتی کتاب میں مشہور مؤرخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اُن تمام الزامات کی مدلّل صفائی پیش کی ہے جو متعصب حضرات فاتحین اسلام پر لگاتے رہے ہیں۔ طرز تحریر بے حد دلچسپ۔ استدلال محکم۔ نقد مضبوط۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب معیاری۔ مجلد بارہ روپے

جمہوریت اور مغربی تحریکیں
یورپ میں جمہوریت پر کیا بیتی اور انسانیت کے بلند نصب العین تک پہنچنے میں کیا کیا رکاوٹیں پیش آئیں؟۔ اس پر اونچے علمی انداز کا تبصرہ۔ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے۔

رہنمائے مدینہ
مدینہ منورہ کی مختصر تاریخ اور مقاماتِ ماثورہ کی تشریح۔ قیمت ایک روپیہ۔

تصانیف مولانا منظور نعمانی۔

اسلام کیا ہے؟ (مجلد ڈھائی روپے)
دین و شریعت (مجلد تین روپے)
آپ حج کیسے کریں (مجلد دو روپے)
معارف الحدیث حصہ اول (مجلد سوا پانچ روپے) حصہ دوئم (مجلد ساڑھے پانچ روپے)

مولانا [illegible]

جنت کی کنجی [illegible] (تین روپے)
دوزخ کا کھٹکا (سوا دو روپے) خدا کی باتیں (ڈھائی روپے)
ایمان کی باتیں (پونے دو روپے)

کتبِ لغت

مصباح اللغات
عربی اُردو لغت کی عظیم الشان کتاب۔ پچاس ہزار سے زائد الفاظ کی تشریح۔ المنجد، قاموس، تاج العروس، نہایہ، منتہی الارب اور اسی پائے کی دیگر لغات کا نچوڑ۔ مجلد سولہ روپے۔

کریم اللغات
عربی و فارسی کے جو محاورات اور الفاظ اُردو میں رائج ہیں ان کی اُردو تشریح۔ یہ لغت اچھی اُردو لکھنے اور سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ قیمت دو روپے (مجلد ڈھائی روپے)

القاموس الجدید
جدید اُردو عربی لغت۔ اب تک ایسی کوئی ڈکشنری نہیں تھی جو اُردو سے عربی بنانے میں کما حقہ مفید ہو سکے۔ جائے شکر ہے کہ ایک دیدہ ور محقق نے اس کمی کو بہترین طریقے پر پورا کر دیا ہے۔ چھوٹے ۷۶۴ صفحات کی اس ڈکشنری کی خصوصیات بہت ہیں صرف چند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں (۱) تیس ہزار اُردو الفاظ و اصطلاحات کی حروف تہجی پر ترتیب اور ان کا پچاس ہزار سے زیادہ عربی الفاظ محاورات میں لغوی اور اصطلاحی دونوں قسم کا ترجمہ (۲) تمام ہی شعبہ ہائے زندگی سے متعلق جدید اصطلاحات و تعبیرات کی تفہیم (۳) محل استعمال، طریق استعمال اور صلات و صفات کی توضیح (۴) مراسلت اور ترجمے وغیرہ کا مکمل مواد۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ جلد کرمچ سنہری ڈائی والی۔ قیمت سات روپے۔

اُردو ہندی لغت
سائنسی، سماجی، صنعتی، تجارتی، صحافتی، عدالتی اور دفتری۔ غرض جملہ قسم کے الفاظ کی توضیح۔ مفرد کے علاوہ مرکب الفاظ کی بھی تشریح ہے۔ ہندی سیکھنے والوں کیلئے مفید ترین چیز۔ مجلد ساڑھے تین روپے۔

[illegible] اب بھی مل سکتا ہے
ایمان و عمل کے مسئلہ

پر تفصیلی محققانہ بحث "نذر و نیاز" فاتحہ و عُرس اور سماع موتی وغیرہ کا جائزہ وغیر ذلک۔

اسی میں مولانا شبیر احمد کا مشہور مقالہ "مولانا مودودی اور تصوف" بھی شامل ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

نوٹ :- تنہا یہی نمبر منگانا ہو تو منی آرڈر سے ایک روپیہ بارہ آنے بھیجدیجئے۔ وی پی طلب کریں گے تو دو روپے دو آنے خرچ ہو جائینگے

مبتدیوں کی تجوید

قرآن پڑھنے اور پڑھانے والوں کیلئے بہترین ہے۔ تجوید کے طریقے آسان زبان میں پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف بارہ آنے۔

احکام القمار

جس میں جوے کی تعریف، اس کے اقسام اور احکام، حدیث و قرآن سے پیش کئے گئے ہیں۔ مستند عالم مفتی محمد شفیع صاحب کے قلم سے۔ قیمت صرف چار آنے

جلاء الابصار اردو ترجمہ نور الانوار شرح المنار

یہ ترجمہ عرصہ کے کیا ہے۔ اس کے چند نسخے مل گئے ہیں۔ ضرورتمند حضرات فوری توجہ کریں۔ دو جلدوں میں مکمل ہے۔ غیر مجلّد بارہ روپے اور مجلّد سولہ روپے۔

خلفائے راشدین

(از مولانا عبد الشکور صاحب ایڈیٹر النجم لکھنؤ) خلفائے راشدین کی سیرت پر بے نظیر کتاب ہے۔

عربوں کی گذشتہ تجارت
اور
انگلستان کی صنعت و حرفت

اس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں نے تجارت کی بدولت کس طرح اور کتنی ترقی کی۔ قیمت صرف آٹھ آنے۔

اشاعت اسلام

دنیا میں اتنی جلد اسلام کس طرح پھیلا؟ مخالفین اسلام اس سلسلہ میں کیا کیا کہتے ہیں؟ اور اس کا جواب کیا ہے؟ یہ سب کچھ ٹھوس دلائل کے ساتھ اس میں ملیگا۔ کاغذ، طباعت، کتابت سب عمدہ۔ قیمت چھ روپے۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

مشہور محقق عالم مولانا مسعود عالم ندوی کی شہرہ آفاق کتاب حضرت سید شہیدؒ کی چلائی ہوئی تحریک اور ان کے کارناموں پر تبصرہ و تنقید اور غیروں کی غلطیوں کی نشاندہی اور تردید وغیرہ۔ قیمت ڈھائی روپے۔

تاریخ عالم

حضرت آدمؑ سے لیکر رسول اللہ صلعم تک کے تمام انبیاء کے حالات مع تاریخ پیدائش و وفات اور مکمل تاریخ اسلام و دیگر اقوام عالم کی تاریخ کے علاوہ دنیا کے مشہور ممالک اور ریاستوں کی تاریخ۔ مجلّد ساڑھے چار روپے۔

اسلام اور انسانی قانون

علامہ عبد القادر عودہ شہید کی ایک نفیس کتاب ترجمہ سلیس ہے

قیمت صرف پندرہ آنے

سدِّ باب ذریعہ

علامہ ابن قیم کا ایک عجیب مضمون جس میں ۹۹ مثالوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو حرام کرتا ہے تو اس تک پہنچانے والے تمام وسائل و ذرائع کو بھی ممنوع کر دیتا ہے۔ قیمت دس آنے

تفسیر فیض الرحمٰن

بسم اللہ الحمد اور معوذتین کی تفسیر شاہ ولی اللہ اور دیگر اکابرین کی آراء کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔ ہدیہ دو روپے۔

تحفۂ اثنا عشریہ (اردو)

از حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی
ترجمہ :- مولانا سعد حسن خاں یوسفی۔

پیدائش و تاریخ مذہب شیعہ۔ اُن کی مختلف شاخیں۔ اُن کے اسلاف علماء اور کتب کا بیان۔ اُلوہیت، نبوت، امامت اور معاد کے بارے میں اُن کے عقائد، اُن کے فقہی مسائل فقہیہ، صحابہ کرام، ازواج مطہرات اور اہل بیت کے حق میں اُن کے اقوال و افعال اور مطاعن مکائدِ شیعہ کی تفصیل، ان کے اوہام، تعصبات اور ہفوات کا بیان

قیمت مجلّد مع حسین ڈسٹ کور بارہ روپے۔

ختم نبوت کامل ہر سہ حصہ

مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جس میں ایک سو سے زائد آیات قرآنی اور دو سو دس احادیث رسول اور اجماعِ اُمت اور سیکڑوں اقوالِ صحابہ و تابعین و ائمہ دین سے مسئلہ ختم نبوت کے ہر پہلو کو

داخل کیا گیا ہے اور شبہات کے شافی جوابات دیئے گئے ہیں۔
قیمت مع ڈسٹ کور چھ روپے

اصول تفسیر — شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے ایک قیمتی رسالہ کا سلیس اُردو ترجمہ مع حواشی مفیدہ۔ ایک روپیہ

تلاش راہِ حق — ایک طالب حق کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور میاں طفیل احمد کے خطوط۔ قیمت مجلد پونے دو روپے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات — آج کی شستہ اور دلکش زبان میں ان تعلیماتِ اسلامی کی تفصیل جن کی ہر مسلمان کو ہر وقت ضرورت ہے۔ قیمت سوا روپیہ۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات و خطبات — سیرت طیبہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ضروری ارشادات و تعلیمات کا خلاصہ۔ احادیث کی ایمان افروز تشریحات۔ ہدیہ مجلد ڈھائی روپے۔

تصویریں — (از اسعد گیلانی) دلچسپ افسانوی انداز میں پیش کردہ سبق آموز حقائق۔ مجلد سوا تین روپے۔

آدم کے تین بیٹے — (از اسعد گیلانی) ایک تمثیل جو دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ مجلد پونے دو روپے۔

تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو — (از اسعد گیلانی) موضوع نام سے ظاہر۔ بڑی دلکش اور ایمان افروز کتاب ہے۔ قیمت مجلد تین روپے۔

مبتدی مردوں، عورتوں اور بچوں کیلئے

سیرتِ رسول ﷺ	۱۰/	پیارے رسول ﷺ	۵/
سراپائے رسول ﷺ	۱۴/	حلیۃ النبی ﷺ	عہر
آداب النبی ﷺ	۸/	رسول اللہ ﷺ کے اخلاق مجلد	عہر
رسول اللہ ﷺ کے معجزے	عہر	رسول مقبول ﷺ کی دعائیں	۴/
رسول اللہ ﷺ کی نمازیں	۱۴/	حضرت خدیجہ رض	عہر
حضرت عائشہ رض	۱۰/	حضرت فاطمہ زہرہ رض	۱۰/
حضرت ابوبکر صدیق رض	۱۲/	حضرت عمر فاروق رض	عہر

حضرت عثمان غنی رض	عہر	حضرت علی رض	۱۲/
حضرت حمزہ رض	۱۲/	حضرت بلال رض	۸/
حضرت معاویہ رض	۷/	حضرت معاذ بن جبل	۵/
حضرت سلمان فارسی رض	۵/	حضرت ابوالدرداء رض	۴/
حضرت انس رض	۴/	ہمارے نبی ﷺ کے صحابہ رض	ایک روپیہ
خواتین اسلام	۸/	سید اسمٰعیل شہید	۷/
غوث الاعظم	۴/	مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی	۸/
آخرت کے فکرمندوں کے عجائب قصے	۶/	جہانگیر	سوا روپیہ
شاہجہاں	۸/	نادر شاہ (ڈرامہ)	۶/
[illegible]	عہر		

پاک بیبیاں (تمام ازواج مطہرات رض کی سوانح) عہر
رسول اللہ ﷺ کے دو محبوب حضرت زید رض اور حضرت اسامہ رض ۸/
عہد رسالت کے دو بچے حضرت عبداللہ بن عمر رض اور حضرت عبداللہ بن عباس رض عہر
درسگاہ رسول ﷺ کے دو طالب علم حضرت ابوہریرہ رض اور حضرت عبداللہ بن مسعود رض عہر
صحابہ کرام کس طرح زندگی گذارتے تھے آپکے معمولات کیا تھے؟ عہر

انجمن حمایت الاسلام لاہور کی کتب

اُردو کا قاعدہ	۲/	اُردو کی پہلی	۳/
اُردو کی دوسری	۷/	” تیسری	۱۰/
” چوتھی	عہر		

مولوی اسمٰعیل والی کتب

قاعدہ اُردو	۲/	اُردو کی پہلی	۳/
اُردو کی دوسری	۶/	” تیسری	۱۰/
” چوتھی	۱۲/	” پانچویں	عہر

تعلیم الاسلام عکسی مکمل در سہ حصہ۔ ایک روپیہ چھ آنے
تاریخ الاسلام در سہ حصہ مکمل بچوں کے لئے۔ دو روپے چھ آنے

ہماری دعوت	نو آنے	فیصلہ کن مناظرہ مجلد	ڈیڑھ روپیہ
نماز اخلاص	آٹھ آنے	نماز کی حقیقت از مولانا منظور نعمانی	۱۲/
سلاطین ہند کی علم پروری	عہر	کلمہ طیبہ کی حقیقت	چھ آنے
تقدیر کیا ہے؟ از مولانا اشرف علی	عہر	فضائل درود و سلام	عہر